قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہٰذا جن صفحات پر [illegible] کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

جلد 25 ○ شمارہ 07 ○ اگست 2015ء

مدیر اعلیٰ : معراج رسول

شعبہ اشتہارات

0333-2256789

0333-2168381

0323-2996520

0300-4214480

قیمت فی پرچہ 60 روپے ○ زر سالانہ 800 روپے

پبلشر و پرنٹر: معراج رسول

75500 کراچی

ڈاک کا پتہ ○ پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

شذرہ

قارئین کرام!

السلام علیکم!

خداوند قدوس کا جتنا شکر ادا کریں وہ کم ہے کہ اس نے رمضان کریم کی شکل میں نعمتوں، مغفرتوں، برکتوں، خوش بختیوں اور رحمتوں سے مالا مال ایک ماہ عطا کیا۔ عبادتوں کی راتیں سجی رہیں۔ ریاضتوں کا موقع فراہم کیا تاکہ ہم اپنی اصلاح کی کوشش کر سکیں۔ شکر ہے رب کریم کا کہ یک لخت پورا معاشرہ اصلاح کے سفر پر گامزن ہوا۔ عبادت و ریاضت، پارسائی اور فکر اخروی کے جذبات بیدار ہوئے۔ یہ ایک بہت بڑی تحریک ہے جو مسلسل تیس روز پر محیط ہے۔ یہ ایک بڑا اصلاحی انقلاب ہے۔ پھر بھی ہمارے اردگرد چند ایک خرابیاں پروان چڑھتی نظر آ جاتی ہیں۔ افطار کے نام پر عالیشان دعوتیں، بے تحاشا کھانے، پر تعیش محفلیں اس ماہ مبارک کی روح پر ضرب کاری ہیں۔ اشیائے ضروری کی قیمتوں کو بڑھا دینا، پھل، سبزی، دالیں، آٹا، تیل غرض ہر ایک چیز کی قیمتوں میں اضافہ کر دینا جس کی وجہ سے صائم کا دل عبادتوں ریاضتوں سے ہٹ جائے، گناہ کے زمرے میں آتا ہے اور یہ نظارے اس رمضان میں بہت زیادہ نظر آئے۔ سونے پر سہاگہ یہ کہ اس رمضان میں بجلی کا زبردست بحران سامنے آیا۔ نلکوں سے پانی غائب رہا، کم کم بجلی گر گیس بھی غائب رہی۔ جس کی وجہ سے عبادتوں پر فکر و پریشانی کا غلبہ رہا۔ ان امور میں کوتاہی برتنے والے کیا اپنے کندھوں پر گناہوں کے بوجھ میں اضافہ نہیں کرتے رہے کیونکہ عبادتوں میں خلل ڈالنا اصلاح کی راہ میں روڑے اٹکانا، اللہ رحیم و کریم کو چیلنج دے کر قہاری و جبر کا مطالبہ کرنے کے مترادف ہے۔ بقول ڈاکٹر افضل شاہین!

سارے انسان جلادوں کی طرح ہیں لیکن
تیری مخلوق میں کوئی تو بشر بھی ہو گا

معراج رسول

شہسوار مشق سخن

اکبرآباد (آگرہ) کے محلے نائی منڈی کی گلی کے اٹلی والے مکان میں خوب چہل پہل تھی۔ محلے کی کئی ایک عورتیں جمع تھیں۔ یہ مکان مولانا محمد حسین کا تھا جو ٹائمز آف انڈیا پریس کی شاخ کے افسر اعلیٰ تھے۔ وہ خود بھی مردانہ حصے میں جاگ رہے تھے۔ یہ جمادی الثانی 1299 مطابق 1885ء کی رات تھی جو آخری پہر میں داخل ہو چکی تھی۔ وہ بے چینی انداز میں جیسے کا کش پہ کش لے رہے تھے کہ اندر سے ایک باندی نے آواز دی۔ ”میاں جی لڑکا ہوا ہے۔ اذان دے دیں۔“ یہ ایک خوشی کی خبر تھی۔ انھوں نے بٹوے سے چاندی کا ایک روپیا کا سکہ نکالا اور اسے بطور انعام دے دیا۔ یہ ایک بڑی رقم تھی۔ باندی کی باچھیں کھل گئیں۔ اس نے بچے کو ان کی گود میں دے دیا۔

وقت گزرنے کے ساتھ یہ بچہ بڑا ہوتا رہا۔ سن شعور کو پہنچا تو اسے گورنمنٹ کالج اجمیر سے الحاق شدہ ”برانچ اسکول“ میں داخل کرا دیا گیا۔ پڑھنے لکھنے کا شوق اس کی سرشت میں تھا۔ اس نے ہر کلاس اچھے نمبروں سے پاس کی اور وہیں سے میٹرک کر لیا۔ کالج میں پہنچا تو وہاں مولوی سعید الدین قریشی اکبرآبادی، مولوی حسین علی اجمیری اور مولوی عابد حسین جیسے قابل اساتذہ ملے۔ ان اساتذہ کی رہنمائی ملی تو ذوق شاعری کو بھی جلا ملی۔ اس نے ذوق شاعری کی تسکین کی خاطر ایک نئی راہ ڈھونڈی۔ فارسی نصاب میں درج اشعار کا ترجمہ اردو میں نظم کر کے اپنے اساتذہ کے سامنے رکھ دیتا۔ ایک بار مولوی عابد کے سامنے اس نے بوستان کی ایک حکایت کا منظوم ترجمہ رکھا تو انھوں نے کاپی پر پنسل سے یہ شعر لکھ دیا۔ ”جب نہیں ہے شعر کہنے کا شعور۔ پھر بھلا ہے شعر کہنا کیا ضرور“ لیکن ساتھ ہی مسکرا کر یہ بھی فرمایا کہ کل پھر کسی فارسی نظم کا ترجمہ ضرور کر لانا۔ یہ شعر تنبیہ تھی کہ نظم کرنے میں کوتاہی ہو رہی ہے مزید مشق کی ضرورت ہے۔ اب اس نے عادت بنالی تھی کہ باقی، جامی، سعدی، عرفی، آنی وغیرہ کا ترجمہ نظم کرتا رہتا۔ ابھی وہ سترہ سال کا ہوا تھا اور ایف اے میں تھا کہ اسے پڑھائی چھوڑنی پڑی۔ یکا یک والد کا انتقال ہو گیا تھا۔ والد کے انتقال کی وجہ سے گھر کی ذمے داری اس کے سر پر آ پڑی تھی اور اسے سلسلہ معاش کے لیے کانپور منتقل ہونا پڑا۔ وہیں اس کی ملاقات حکیم ازل لکھنوی، بہجت لکھنوی کے علاوہ کانپور کے مقامی شعراء سے راہ و رسم پیدا ہوگئی۔ اس طرح ذوق کی تسکین کی راہ نکل آئی۔ اس زمانے میں حکیم سید ضامن علی، جلال لکھنوی کا کانپور میں طوطی بول رہا تھا۔ قریب ہونے کی وجہ سے کانپور پر لکھنؤ کا اثر غالب تھا مگر اس کی طبیعت فطرتاً دبستان دلی کی طرف مائل تھی۔ اس لیے 1898ء میں وہ فصیح الملک داغ دہلوی کے سامنے زانوئے تلمذ طے کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ داغ نے کلام کی گہرائی کو پرکھا اور اپنے شاگردوں کے حلقے میں اسے بھی شامل کر لیا۔ مگر دوسری یا تیسری غزل پر داغ نے لکھ دیا کہ ابھی آپ کو مشق کی ضرورت ہے۔ اس تنبیہ نے مشق سخن پر خوب محنت کرائی۔ ایک ایک شعر کو کئی کئی طرح سے باندھتے پھر خود ہی رد کر دیتے۔ یہ سلسلہ مہینوں جاری رہا۔ اسی دوران سول گنج (کانپور) میں ایک مشاعرے کا اعلان ہوا۔ اس مشاعرے میں پڑھنے کے لیے ایک غزل کہی ”دم نکلتا ہے کم نکلتا ہے“ اور اسے داغ دہلوی کی خدمت میں بھیج دی۔ اس وقت فصیح الملک داغ دہلوی حیدرآباد (دکن) میں مقیم تھے۔ وہیں انھوں نے غزل دیکھی اور غزل کی پیشانی پر سرخ روشنائی سے لکھ دیا۔ ”آفرین ہے کیا خوب غزل کہی ہے۔“ اس ایک جملے نے حوصلے بلند کر دیے اور طبیعت کی جھجک نکل گئی پھر تو لکھنؤ اور کانپور کے مشاعروں میں بے تکلف غزل سرائی کرنے لگے۔ داغ دہلوی کی وفات تک ان سے اصلاح لیتے رہے پھر جب داغ کا انتقال ہو گیا تو کسی اور کو استاد نہ بنایا۔ ان ہی کے ساتھ کانپور کے محلہ گوال ٹولی والے مکان میں نظر وارثی بھی رہتے تھے۔ ایک بار ان کے ساتھ دیوہ شریف چلے گئے۔ حاجی حافظ سید وارث علی پر نظر پڑی تو متوسل ہو گئے اور اسی وقت ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ کانپور میں رہتے ہوئے بیمار ہوئے تو آگرہ لوٹ آئے اور پھر وہاں سے بسلسلہ ملازمت اجمیر شریف جانا پڑا۔ پانچ سال وہاں گزار کر 1898ء میں آگرہ لوٹ آئے اور رسالہ ”مرقع“ کا اجرا کیا۔ پھر ٹونڈلہ (آگرہ) منتقل ہو گئے۔ ٹونڈلہ میں رہتے ہوئے ”آگرہ اخبار“ کی ادارت بھی کرتے رہے۔ پھر 1929ء میں مستقل طور پر وطنی مستقر آگرہ (اکبرآباد) لوٹ آئے اور مشق سخن میں بھی تیزی لے آئے۔ مشق سخن کے اس شہسوار کو لوگ سیماب اکبرآبادی کے نام سے پہچانتے ہیں۔

☆ انور عباس شاہ نے دریا خان بھکر سے تبصرہ کیا ہے۔ "جب تک شمارہ ہم تک پہنچے گا تو عید کا سیزن ہوگا۔ چنانچہ میری طرف سے آپ سب کو عید مبارک اور نیک تمنائیں۔ جناب شاہد جہانگیر شاہد کے لیے خصوصی دعائیں اور سلام۔ ہمیں صابر بگھوار، سلیم قیصر، قیصر عباس خان اور رانا محمد سجاد کو بھی بہت بہت عید مبارک۔ آفتاب نسیم اشرفی بھی پہلی عید اپنی بیٹی کے بغیر منا رہے ہیں۔ خداوند کریم آپ کو صبر دے اور آپ کی بیٹی کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ (آمین) ۔ رانا محمد شاہد بھی اپنی والدہ کے بغیر پہلی عید منا رہے ہیں۔ خداوند کریم ان کو صبح نعل و عیال صبر جمیل عطا فرمائے اور ان کی والدہ ماجدہ کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ (آمین) رمضان شریف کا مقدس مہینا شروع ہوتے ہی خورد و نوش کی اشیا بھی مہنگی ہونا شروع ہو گئیں۔ حکومت وقت نے ملک میں جگہ جگہ خوب صورت بینروں سے ناجائز منافع خوروں کو باز رہنے کا اعلان لگا تو دیا ہے لیکن یہاں پر بھی حالات سب کے سامنے ہیں۔"

☆ مجید احمد جائی کا خط ملتان شریف سے۔ "عید الفطر کی مبارک باد قبول ہو۔ دل رو رہا ہے۔ آنکھیں چھم چھم برس رہی ہیں۔ کئی سالوں سے ہماری عید بے مزہ ہو رہی ہیں۔ کبھی زلزلے کبھی خود کش حملے، ناگہانی حوادث ہماری خوشیاں کو ختم کر دیتے ہیں۔ ظلم و بربریت کا دور چل رہا ہے۔ میرے وطن کو نظر لگ گئی ہے۔ معیشت کی جان کراچی بدامنی کا شکار ہے۔ بوری بند لاشوں کا سلسلہ ختم ہوا تو بوڑھیں خون میں نہانے لگیں۔ بازار، گلیاں، دکانیں سب کی زد میں آ گئے۔ اب ہیٹ اور آفت آن پہنچی۔ زندگی موت سے لڑ رہی ہیں۔ روز لاشوں کی تعداد بڑھتی چلی جاتی ہے۔ سرد خانے فل ہو گئے ہیں۔ یہ بھی دشمن کی سازش ہے یا ہماری خطاؤں، ہمارے گناہوں کا ثمر ہے؟ جو بھی ہے میرے مالک معاف فرما! ہمیں معاف فرما دے۔ ہماری خوشیاں لوٹا دے۔ امن و سکون عطا فرما۔ میرے مالک تیرے ہاتھ میں سب کچھ ہے۔ تو عزت، ذلت دینے والا ہے۔ دل افسردہ ہے ساتھ سرگزشت ملا تو دل بہلا، رنج و غم سے سکون میسر آیا۔ شاہد جہانگیر شاہد صاحب کی وجہ سے سرورق کو تبدیل کیا ہے۔ سرورق کو دیکھ کر سمجھ آیا کہ ٹھنڈا ٹھنڈا سا سرورق چپنے آیا تو اداریے تک پہنچا۔ معراج رسول صاحب! ہمارے حکمرانوں نے قصیدے پڑھ رہے تھے۔ شیرشاہ سوری کا۔ ہمارے بزدل حکمرانوں کی بد بیرونی دشمن کے سامنے اپنا سر جھکا دیا ہے۔ اندر ہی اندر دشمن نے ہماری جڑوں کو کھوکھلا کر دیا ہے۔ نیب کے ہاتھوں سے بڑے بڑے مگرمچھ، میر جعفر، میر صادق کی اولادیں بے نقاب ہو رہی ہیں۔ بے ایمانی کا کام روک رہے ہیں۔ مرہ نے شہریوں نے بھارت سے کہا کہ ہم تو سب کو گرا دو شراب نوشی کرو۔ یہ سب اللہ سے بغاوت کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ رحم فرمائے۔ آمین۔ "بک کارنر" بہت اچھا لگا۔ مولانا صاحب نے ٹھیک کہا سب کچھ وقتی ہے۔ یہ سب بہرے نشہ پر دہکے اور اس مسرور ہوا۔ "شہر خیال" میں ہر دو محاسبین کی کرسی پر قبضہ کیے ہوئے دیکھ کر لوٹ پوٹ ہو گئے۔ جو لوگ تو کرسی کرسی کی گردان کرتے پھرتے ہیں ان کو بھی نصیب نہیں ہوتی۔ جن دوستوں نے شہر خیال میں پہلے خط اور دوسرے خطوط ارسال کیے ہیں۔ سلیم قیصر، محمد احمد انصاری، شاہد جہانگیر شاہد، ناصر حسین رند، صابر بگھوار کا مشکور و ممنون ہوں۔ فیروز علی ناصر خان کی پسندیدگی کا شکریہ۔ میرے اللہ آپ بھی جو سال سے سرگزشت پڑھ رہے ہیں۔ جنگلی لوڈ شیڈنگ کی بات چلی ڈائنوں اور جنگلی بلاؤں کے ذکر سے۔ لوٹ مار، سیاست، دولت میں ہم اپنی مثال آپ رکھتے ہیں۔ حکمران غائب، دولت کے اندھے، ملک پرست ہو گئے ہیں۔ رانا محمد شاہد، سلیم قیصر، منظور علی خان، قیصر خان، انور عباس شاہ، فیروز علی ناصر، ابوذر حسین سحر، عمران نقشبندی، شاہد جہانگیر شاہد، ناصر حسین رند، مختیار غلام حسین ضیا، صدرہ یاقوت آوری، احسان محر، صابر بگھوار کی آمد اچھی رہی۔ سبھی نے زبردست تبصرے کیے ہیں۔ کافی دوست غائب ہیں۔ ہمارے عزیز جی محمد عزیز ملک، وہاں حسین ساجد کہاں ہیں۔ شہر خیال کی محفل سونی سونی ہے۔ جلد آ جائیں۔ سچ بیانیوں میں "تنگ عمر" محمد سہیل نے طنز و مزاح سے تحریر کو ہر کمال کر دیا۔ معاشرے میں پھیلی برائیوں کو خوب نشتر لگایا ہے۔ جس جوانوں نے ساری دنیا کو ترا کر دیا ہے۔ ہماری کوتاہیاں ان کے ہاتھ چڑھ کر عزت تک کھو بیٹھی ہیں۔ ضیاء الحق کو نیست و نابود کرنے والے ہمارے ہیں بھی "تھر وفت" نے رلا دیا۔ "رسید تو لو" زبردست تحریر تھی۔ "انداز بیاں" آصف ضیاء احمد اور "آنو رواج" بے حد مزے کی۔ "ان کے پیچھے" آئی پی ایف نے کمال لکھا۔ دولت کی گھڑ بڑ اور یہ یاد کرتی ہے۔ عورت ہی اپنی عقل سے غور و فکر کرتی ہے۔ والدین اور غیر انسانی زبردست رہی۔ "سراب" خوب صورتی کی طرف کا سفر ہے۔ کہانی کا آدھا حصہ سامنے کل، مضبوط قوت ارادی خوب رہی۔ جنگ کا نمک کیا ہے سے لطف اندوز ہوئے اور معلومات کا خزانہ تو وہ۔ پرندوں کے بارے میں پڑھ کر خدا کی کاریگری کی تعریف کرنے لگے۔ جولائی کی شخصیت سلیم اختر فاروقی نے حق ادا کر دیا۔ السٹ کی شخصیت کا شکار رہے گا۔ پر ٹیپو حسین ایک بدقسمت اداکار، قسمت کے کھیل نرالے ہوتے ہیں۔ ذہن میں چند گردش کرنے لگا۔ "کیپیوٹر کا سفر" حسن رضا قی نے معلومات میں اضافہ کر دیا۔ آج کل کیپیوٹر کے بغیر تو ہی ادھورا ادھورا سا ہے۔ "تاریخ دانوں" نے ہمارے جذبہ سے دیکھا۔ نبیرا بتوں کی زندگی پڑھ کر حیرت زدہ رہ گئے۔ تیسرا باہر پاک کے بارے میں پڑھا۔ خوب رہا۔ آج ساری دنیا اس کے گن گا رہی ہے۔ دلچسپ معلومات فراہم کی گئیں۔ سرگزشت کا تقاضا ہے کہ ہمیں معلومات، واقعات، اخلاقی اقدار، غیر مرئی مخلوق، دنیا میں ہر جگہ کی سیر و سیاحت کراتا ہے۔ ہر موضوع کی تحریریں اس میں پڑھنے کو ملتی ہیں۔ اس نے دل جیت لیا ہے۔"

☆ رانا محمد سجاد کی آمد مظفر گڑھ سے۔ "السلام علیکم! سب سے پہلے تو آپ تمام قارئین کو عید کی خوشیاں مبارک ہوں۔ دو خطوط لکھ چکا ہوں۔ شمارے میں چھپتے تھے۔ ایک تو اپنی حوصلہ افزائی محسوس کی۔ دوسرا انہیں تو شہر خیال کے اوراق سے بندہ پچھے تھے۔ مجبوراً پر گزرے ہو گیا۔ تیسرا خط ارسال کیا تو وہ بھی نجانے کہاں چلا گیا۔ بس کیا کرتے صبر کر کے رہ گئے۔ اب یہ خط بھی اس امید کے ساتھ لکھ رہے ہیں کہ شاید تاب ملے۔ سب سے پہلے ادارے کو ایک درخواست کرنی ہے کہ ہماری طرف سرگزشت دیر سے آتا ہے۔ جولائی کا شمارہ بھی 29 کو ملا ہے۔ اب اس سے خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ کب پڑھیں اور کب اس پر تبصرہ کریں۔ براہ کرم اس مسئلے کو جلد از جلد دور کرنے کی کوشش کریں۔ "شہر خیال" میں مجید احمد جائی صاحب سے پہلے ہی تعارف حاصل ہو گیا۔ خوب صورت اور جامع تبصرہ تھا۔ رانا محمد شاہد صاحب کا خط بھی خوب صورت تبصرہ رہے ہوئے تھا۔ اللہ تعالیٰ آپ کی والدہ مرحومہ کی مغفرت فرمائے اور درجات بلند فرمائے۔ آمین۔ سلیم قیصر صاحب اپنی رہائی کی خوش خبری کب سنا رہے ہو؟ منظور علی خان کی بات سے ہم متفق ہیں مارشلاء پر جو انہوں نے

بات کی۔ انور عباس شاہ صاحب آپ نے ہمیں کیسے شہنشاہ و ہمہ خیال کہہ دیا؟ اس کے لیے تو ایاز حسین سنجرانی، شاہد جہانگیر، احمد خان تو جیدی ہی کافی ہیں اور ہمارے انقلابی سوچ سے تعلق رکھنے والی بہن طاہرہ گلزار ہیں۔ بہرحال شکریہ۔ شاہد جہانگیر، ناصر حسین رند، سعدیہ بانو اور گوری کا تبصرہ خوبصورت لگا۔ طاہرہ گلزار صاحبہ ایک بار پھر مخصوص انداز میں سردمہری پر چھائی کرتی نظر آئیں تو جناب آپ کے نظریات اس بارے میں کافی سخت ہیں، کیونکہ خواتین ان خصوصیات سے مستثنیٰ ہیں۔ ہمہ خیال کے بعد بلندِ اقبال پر پہنچے، ڈاکٹر ساجد امجد خوب صورت تحریر لے کر آئے ہمیشہ کی طرح، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ سبحان اللہ شاعری کے حوالے سے خاص طور پر نعتیہ شاعری کے حوالے سے تو بہت لطف آیا۔ کیا کہنے۔ اتنی خوب صورت تحریر دینے پر میری طرف سے مبارک باد۔ دوسری بہت خوب صورت تحریر "نصیب نام" ثابت ہوئی۔ مریم کے خان جب بھی آتی ہیں۔ ہمیشہ ایسی ہی تحریریں لاتی ہیں کہ جن کو قارئین ایک ہی نشست میں ختم کر کے دم لیتا ہے۔ "کیپیٹل کا سفر" اچھی اور کہانی ثابت ہوئی۔ "پرندے" مزید بہتر بنایا جا سکتا تھا بہرحال قابلِ برداشت تھی۔ جولائی کے حوالے سے سلیم الحق فاروقی کی تحریر خوب صورت تھی، اچھا سلسلہ ہے اس ماہ کے حوالے سے "پرتیگ" عمیمہ خوب صورت تحریر تھی لیکن جتنی بھی قسطیں اس میں ذکر ہوئیں ان میں سے کوئی بھی نہیں دیکھی اس لیے موزیت کی کوئی فلم یاد نہ آسکی۔ "بانگ کا نگ" خوب صورت سفرنامہ تھا، پسند آیا۔ آصف ملک کی تحریر "سایہ اجل" خوب صورت اور بہترین کی جا ستی نظر آئی۔ سچے معنوں میں ایک ایڈونچر ٹائپ کی تحریر تھی۔ شکاریات کے حوالے سے خوب صورت تحریر تھی۔ "سراب" اس شمارے کا ایک اور خوب صورت سلسلہ کاشف زبیر صاحب کی بہترین کہانی عرصہ دراز تک یاد رہے گی۔ علی آر مانگ میں اب کی بار کچھ مشکل ہے سوال بہرحال جواب تلاش کرنے کی پوری کوشش کریں گے۔ "پتھر لوگ" میں شاہ کے سسرال والوں کا رویہ کسی طور پر بھی انسانی ہمدردی کے اصولوں پر پورا نہیں اترتا کہانی کے آخری الفاظ ہی اداریے سے جڑے ہیں کہ "نجانے کتنے انسان ہیں جنہیں آخرت کی عدالت میں ان کی پیشی ضرور ہوگی۔" "وسیع قاتل" کوئی خاص تحریر نہیں تھی۔ اختر علی بھی اسی قسم کا رنگ لیے ہوئے تھی۔ شمارے کی آخری "سچ بیانی" بہت خوب صورت محسوس ہوئی۔ اگر اس سوال کا جواب ہوتا تو زیادہ بہتر ہو جاتی کہ وہ روح آخر اس گھر میں کیوں تھی، کیا چاہتی تھی آخر۔ بہرحال خوب صورت تحریر تھی۔"

☆ سید مجاہد حسین کاظمی ایڈووکیٹ اٹک سے رقم طراز ہیں۔ "السلام علیکم میں باسپار ماہنامہ سرگزشت کی جلد پر جولائی 2015 دیکھ پایا ہوں کیوں کہ پڑھتے کے دوران محسوس ہو رہا تھا کہ بیچ والیاں پہلے بھی آپ کسی شمارے میں دے چکے ہیں (اکثر حقیقی کہانیاں دیکھ کر لگتا ہے کہ پہلے بھی چھپی ہے پھر بھی ایسی کوئی کہانی ہو تو نشاندہی ضرور کریں۔ ممکن ہو تو فوٹو اسٹیٹ بھی ساتھ لگا دیں تاکہ لکھنے والے کے خلاف کارروائی کی جا سکے) لوسٹ آپ کا ڈائجسٹ اچھا ہے۔ بے شک ہمیں ڈائجسٹ وغیرہ پڑھنے کا وقت میسر نہیں لیکن سرگزشت ہر ماہ میرے پاس ضرور آتا ہے اور اسے تھوڑا تھوڑا پڑھا جاتا ہے جیسے کھانے کے بعد سوئیٹ ڈش۔ آپ کو خطوط بھیجنے والے تو صرف اپنا خط شائع کرانے کے لیے آپ کی تعریف کرتے چلے جاتے ہیں اور یہ خطوط آپ خود ہی Arange کرتے ہیں (ہمارے ادارے کے تمام پرچے کثیر الاشاعت ہیں تو ان کے پڑھنے والے بھی لاکھوں ہی ہیں۔ ہم ہر ماہ بڑی تعداد میں خطوط منتخب کرتے ہیں، ارینج کرنے کی ضرورت نہیں) ہر ماہ کی پہلی کہانی میں پاکستان کے یا دنیا کے اعلیٰ معیاری سانحات، قومی ہیرو وشہید کے متعلق تفصیلی شاہکاروں پر لکھا وقت کا ضیاع ہے (ہم ہر اہم شخصیت کو اہمیت دیتے ہیں۔ زندگی ہاری سے سوانح حیات لکھتے ہیں شاید آپ نے غور نہیں کیا۔ سانحات قومی ہیرو اور ادیب وغیرہ معاشرے کے معمار ہوتے ہیں) "سراب" قسط وار شائع ہو رہی ہے اس کو مختصر کریں۔ "سب رنگ" میں ایک قسط وار کہانی شائع ہوئی تھی وہ تلاش کریں یہی سے ملتی جلتی ہے (بازیگر کی کہانی اور تھی آپ دوبارہ پڑھیں)۔"

☆ قیصر خان، ویگی کلاں اٹک سے لکھتے ہیں۔ "بلوا پیش آپ ضربِ عضب کے حق میں تھے۔ جنگل کی بہر بھی دعا گو ہیں اللہ کامیابی دے۔ مجید صاحب کو صدارت مبارک ہو۔ تبصرہ اچھا لگا۔ جن کے تبصرے پسند آئے محمد احمد رضا، منظر علی خان، فیروز علی ناز، آپا سعدیہ، تنظیر اسلام حسین ضیا، وارث شاہ صاحب بہت اچھی بات ہوئی کہ حاضر تھے کہ ہمارے اسلاف کی تاریخ بڑے بڑے لوگوں سے بھری پڑی ہے صرف بیروی کی کمی ہے۔ محمد سلیم قیصر کے نیے بہت خوب صورت بات لکھی آپا سعدیہ نے۔ قسمت آپ کو فلاح دے گی لیکن دعا ہے ہوں اللہ خود آپ اپنی مخصوص رحمت سے جلد آپ کو اس مصیبت سے نکالے گا۔ آپ ہمت نہ ہاریں اللہ پر بھروسا رکھیں۔ ناصر حسین رند نے ایک اہم شخصیت وحید ریاست علی کی غیر حاضری پر توجہ دلائی کہ وہ اپنی حاضری لگائیں اور حضرت احمد رضا خان بریلوی پر لکھنے کی درخواست کی تھی۔ اس ضمن میں ہم بھی ساتھ دیں گے۔ ڈاکٹر صاحب جلدی سے شاندار تحریر لے آئیں۔ حاجی اعجاز صاحب آپ خود کسی سے دعائے رکھیں؟ آگاہ کر دیں۔ بات آپ کی بہت اچھی ہے اور ہمارے پیارے شاہد جہانگیر شاید صاحب تعلیم پر ہونے والے مظالم پر بات کر رہے ہیں۔ آپ کا کہنا بہت اچھا ہے لیکن حکومت بے بس ہے اس بھائی مافیا کے سامنے۔ احسان سحر صاحب جامع تبصرہ کے ساتھ حاضر تھے۔ آپا طاہرہ گلزار ہمیشہ کی طرح دلنواز تبصرہ کے ساتھ حاضر تھیں اور طاہر جاوید مغل کا سفرنامہ کے بارے میں مشکوک تھیں لیکن انتظامیہ کا صاف جواب پڑھ لیا ہوگا۔ بٹگرام کی ہردلعزیز شخصیت سید انور عباس شاہ حاضر تھے اور بہت خوب صورت جامع تبصرہ تھا۔ شفیق الرحمن خان تو جیدی، ڈاکٹر نفیسہ، ورقہ امین، عامر ساحل، رضا احمد، احسان بٹگرام سے غیرحاضر تھے تاخیر میں بھی نام نہیں تھا۔ اللہ ان پر کرم کرے آمین۔ "کارِ گرِ عالم" بہت خوب صورت تحریر تھی۔ "پرندے" شیر زمان خان نے بہت اچھے طریقے سے خوب صورت پرندوں کا ذکر کیا، بہت معلوماتی لگا آپ کا مضمون۔ سلیم الحق فاروقی نے بھی بہت خوب صورت لکھا۔ "پتھر لوگ" درندہ صفت لوگوں کی کہانی لگتی ہے، ہم کوئی چنگیز خان جیسے ظالموں کے دور میں جی رہے ہیں۔ "وسیع قاتل" ایک انا پرست سپاہی کی کہانی جو بدلہ کی آگ میں معصوم جانوں کا قتل کر رہا تھا۔ "دفن کے پیچھے" ان پچھتائے کیا ہوت ہے جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔ جناب کو اللہ پر توکل کرنا نہیں آیا اب سزا تو ملے گی۔ "فلحال" شرجیل ایک نفسیاتی مرد تھا بہت ہوا۔ والدین کی رضا پر راضی رہتا بہت اچھا رہا۔ مظلوم کو اس کا حق نہ دینا انتہائی ظلم ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ حقوق العباد معاف نہیں کرے گا۔ "ضمیر انسانی" ایسا واقعہ ہے پڑھتے وقت رونگٹے کھڑے

کردیا ہے۔"

☆ محمد یوسف ساہنول نے نور پور تھل سے لکھا ہے "یہ پرچہ کافی تاخیر سے موصول ہوا ہے۔ ماہنامہ سرگزشت میں میری پہلی حاضری ہے امید کرے کہ شرف قبولیت بخش جائے۔ سرگزشت کی مثال ایسی ہے کہ دو یا دو غیر میں کوئی اچھا مل جائے جیسے! سید انور عباس شاہ اور یزدان خان میرے چاچو کے ضلع کے رہنے والے ہیں۔ اچھا تبصرہ کرتے ہیں۔ سب سے زیادہ خوشی اپنے علاقے کے اعجاز حسین سکھاروی۔ پرتھل کو دیکھ کر ہوئی۔ سب سے پہلے کہانی ڈیتھ پڑھی۔ ارسطو، افلاطون، سقراط کے بارے میں بہت کچھ جاننے کو ملا۔ بلا شبہ ایک عمدہ تحریر تھی۔ سالگرہ کے دن کو بھی از حد شوق سے پڑھا اور خدا پر ایمان پختہ ہوا کہ موت سے کس کو رستگاری ہے۔ ہزاروں سال جینے کے بعد بھی موت ہی انسان کا مقدر ہے چاہے وہ جب آ سکے۔"

☆ سدرہ بانو ناگوری کراچی سے مرقوم ہیں۔ "اداریہ پڑھا لیکن کچھ لکھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ ابھی تو کراچی میں گرمی سے 1200 سے زائد افراد کی ہلاکتوں کا صدمہ کم نہیں ہوا ہے سو اس موضوع پر پھر کبھی سہی۔ مجید احمد جائی کو صدارت کی کرسی مبارک ہو۔ سلیم قیصر آپ کے لیے ڈھیر ساری دعائیں۔ امید ابھی رکھیے۔ قیصر خان دوراں کا شکریہ۔ شاہد جہانگیر دوراں کے خوب صورت تھے کہ آپ تو تشریف کم لیجیے۔ احسان سحر کی آمد اچھی لگی۔ ناصر حسین کا مکتوب پسند آیا۔ اب آتے ہیں طاہر گجرات کے شکوے کی طرف۔ انہوں نے لکھا کہ سدرہ بانو ناگوری تو ہم سے پیچھے پڑ گئی ہیں۔ ہائیں! آپ ذرا دوبارہ خط دوبارہ پڑھیے۔ آپ کیا لکھ رہی ہیں۔ جلالی کے جاسوسی میں 'پتا چلا' چاہے میں چھوٹی ہوں آپ بڑی۔ گستاخی معاف۔ آپ اپنی ناکام ازدواجی زندگی کا انتقام دنیا کے تمام مردوں سے لے رہی ہیں۔ میری دعا ہے کہ خدا آپ کو خوش رکھے۔ ڈاکٹر ساجد امجد نے "بانو اقبال" کے حوالے سے بے حد متاثر کیا۔ شیر اللہ خان کی زبانی دلچسپ پرندوں کا احوال اچھا لگا۔ مریم کے خان اس بار "تسمیہ نام" لے کر آئیں اور امریکا کا ذکر خیر کیا۔ منظر امام تحقیق کائنات کے حوالے سے مفید اور دلچسپ معلومات لے کر آئے اور کمال کر گئے۔ ہم آپ کو آپ کی لگن اور جستجو پر داد دیتے ہیں۔ ہم نے تو آپ کی ان معلومات کو اپنی ڈائری کے صفحات پر محفوظ کرلیا ہے۔ اگلے ماہ آپ کی تحریر کا انتظار رہے گا۔ "سراب" میں اس بار شوپی کی اس سوچ نے عرب والے کے ذہن میں تمام خدشات کو ایک بہت ہی نفرت میں بدل کر رکھ دیا ہے کہ عرب والا بھی صرف چہرے بدلنے پر یقین رکھتا ہے۔ وہ بھی جانتا ہے کہ بستی میں موجود گڈو پر انتقام غالب رہے۔ ہر بار انتقام بدلنے کی بات ہوتی ہے مگر صرف چہرے بدلتے ہیں نظام کی حفاظت کے لیے سب پارٹیاں اتحاد کرسکتی ہیں۔ "مشہور وقت اداری" میں بچے کی ہمت پر بتا کہنا کہ اس کی ذراسی غفلت اسے ایک بڑا حادثہ ہو لاتی۔ (تعریف ہے کہ کچھ نہیں، انسانیت کے بہتر رہتی ہے جنہوں نے کسی کے دکھ درد کو سمجھا) عروج جہاں میں کمال حسن نے غیر ملکیوں کی مقبولیت کا ذکر کیا مگر شاید وہ پاکستانیوں کا ذکر کرنا بھول گئیں۔ صرف دو تین شخصیات کا تذکرہ تھا شاید ہم اپنے ہم وطنوں کو وہ مقام نہیں دے پاتے جن کا حق ہوتا ہے جب کہ غیر ملکیوں کے ذکر کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں (اس کی ایک وجہ یہ بھی کہ ہم اپنے "ہیروں" کی قدر خود نہیں کرتے۔ آنے والی نسل کے لیے تاریخ نہیں لکھتے) "پتھر دل" ایک رومانی کہانی ہے مگر سنگدل لوگوں کی پتھر دلی نے رونے پر مجبور کر دیا۔"

☆ فیض الحسن کا خلوص نامہ کوٹ ادو سے۔ "عید الفطر کی خوشیاں مبارک ہو۔ میر خیال کے تمام ساتھیوں کو میرا محبت بھرا سلام۔ انکل سعد اور رسول کی باتیں اچھی لگیں۔ ملک پاکستان کے لیے ہر شخص دعا کرتا ہے۔ اے اللہ پاک! ہمارے ملک کو دہشت گردی کی لعنت سے محفوظ رکھ اور وطن عزیز کو امن و بھائی چارے کا گہوارہ بنا۔ آمین۔ "تسمیہ نام" مریم کے خان اور "تاریخ عالم" منظر امام کی تحریریں معلومات افزا تھیں۔ جگ بیتی میں کنگرو، سطل اور مدا نداتیاں اچھی لگیں۔ اداریہ میں لکھا شیخ احمد راز کا شعر ڈائری میں لکھ لیا۔"

☆ مظفر علی خان نے لاہور سے لکھا ہے۔ "تازہ شمارہ معلومات کا بے پناہ ذخیرہ ہے۔ تسلیم اقبال کا زندگی نامہ پڑھا۔ امریکا کے نام سے امریکا کی ریاست وجود میں آئی جو دراصل اٹلی کا باشندہ تھا۔ بعد میں اسپین منتقل ہوا۔ کیپٹن کا سفر خوب تھا۔ اٹلی، پرتگال اور اسپین کی جنگوں میں بہت اہم ہے۔ تاریخ عالم کے عنوان سے منظر امام کی تحریر مختصر رہی۔ اس کو وسعت دی جاتی تو زیادہ تسکین ہوتی۔ آدم و نوع انسانی کے حوالے سے بیس لاکھ سال کی ابتدا کو سائنس تسلیم کرتی ہے۔ موجودہ آدم کو تیرہ ہزار سال ہوئے سوا لاکھ سے سال ہوئے۔ جب کہ قرآن کے بہت سے آدم اس سے پہلے گزرے شاید کروڑوں سال پہلے مگر تاریخ خاموش ہے۔ آرکیالوجسٹ بھی بیس لاکھ سال تک کلام کرتے ہیں۔ بہر حال منظر امام صاحب اس سلسلہ تاریخ کو جاری رکھیے گا۔ بہت پسند آیا۔ پرندے جادوئی معلومات افزا تھے۔ ہانگ کانگ کتنی ترقی کر گیا۔ سفر نامہ خوب تھا۔ سفر ناموں کے سلسلے کو جاری رکھیے گا۔"

☆ رانا حبیب الرحمٰن کا خط لاہور چنیوٹ سے۔ "جناب عالی آپ سب ہم سے اس طرح چھوڑ کر ہونے پر پریشان تو نہیں ہوں گے پھر بھی آپ سب کو بتاتے رہتا ہوں لہو بھائی نہ جانے کب تک [illegible] کیا ہو سکا۔ دراصل وجہ یہ ہے کہ میں ڈائجسٹ کی دنیا میں تو بچپن سے تھا لیکن خط وغیرہ لکھنے کی کوشش 2010ء میں کی تھی جو کہ اب تک جاری رہی اور پھر چنیوٹ کی چادر یاری کے احمد [illegible] کی اور خطوں میں لکھا ہے کہ میری سب سے بڑی مجبوری کا قصہ [illegible] ہے جو بہت ہی مشکل سے [illegible] ہیں۔ آپ یقین کریں کہ مشہور عاشق فرہاد کو بھی شیریں کے لیے دودھ کی نہر نکالنے کے لیے اتنی مشکل نہیں ہوئی ہو گی جتنی مشکل مجھے [illegible] کے [illegible] ہوئی۔ یہی وجہ ہے کچھ عرصہ میں خط نہ لکھ سکا تھا۔ پھر بھی اس پرابلم کے باوجود میں لکھتا رہا وہ اس لیے کہ [illegible] تنہائی کاٹ رہا تھا۔ 20 سال کی عمر میں [illegible] اور آج تک میں نے کسی سے محبت نہیں کی لو دنیا نے ہی مجھے محبت دی ہے۔ سرگزشت میں شمولیت اسی لیے کی تھی کہ [illegible] تنہائی دور کرتا رہوں۔ پھر میں نے خط لکھے اور پھر بھی

والدہ کی اکثر باتیں یاد آتی ہیں تو یہ حقیقت جان لیتا ہوں کہ جو کچھ بھی تھیں شاعر ہونے کے باوجود وہ بھی دور اندیش تھیں کہ زندگی کی حقیقتوں کو اچھائی قریب سے جانتی تھیں۔ مجھ سے چھوٹی ہمشیرہ کی شادی 2006ء میں ہوئی۔ وہ جب بھی مجھ سے شادی کا کہتیں میں ٹال دیتا۔ ایک رات میں ان کے کندھے دبا رہا تھا، کہنے لگیں۔ بیٹا میری وجہ سے ہی باقی بہن بھائی تمہارا خیال کرتے ہیں۔ شادی کر لو۔ میرے بعد تمہیں کسی سے کہنا نہیں تمہاری شادی کرواؤ۔ میں چاہتی ہوں تمہاری بھی اپنی فیملی ہو اور تم بھی دوسرے بہن بھائیوں کی طرح زندگی گزارو۔ آخر ان کی دعائیں اور کوششیں رنگ لائیں اور 2012ء میں میری بھی شادی ہوئی۔ آج ماں کے جانے کے بعد زندگی کی تلخ حقیقتیں سامنے آ رہی ہیں تو سوچتا ہوں وہ کیسی تھیں ماں ...! زندگی کو جانتی تھیں۔ ماں ہی ہوتی ہے جسے اپنے سبھی بچوں کی خوشیوں کی خواہش ہوتی ہے۔ ان کی باتیں یاد آتی ہیں تو دل بھر آتا ہے اور آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگتے ہیں۔ محمد سلیم قیصر! اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے۔ قیصر خان، انور عباس شاہ، مجتبیٰ کا شکریہ۔ شہباز جہانگیر اور ناصر حسینی نے صحیح کہا آپ نے ماں کے بغیر گھر قبرستان ہی ہوتا ہے۔ سدرہ بانو، نادیہ گوری اور طاہرہ گلزار دعاؤں کے لیے شکر گزار ہوں۔ ڈاکٹر ساجد امجد نے بلند اقبال پیچھے چھوڑ کے شاعری کی زندگی کی جدوجہد کی کہانی جس دلچسپ انداز میں تحریر کی۔ ایک تحریر ہی نے غضب ہی ڈھا ڈالی ہیں۔ مریم کے خان، محسن رزاقی، منظر امام، شبیر خان اور سلیم انور فاروقی نے دلچسپ اور منفرد تحریروں سے معلومات میں اضافہ کیا۔ ایک تجویز ہے کہ سینئر کی توجہ سے بھی مضامین دیا کریں یعنی خاص دنوں کے حوالے سے جو قومی سطح کے بھی ہو سکتے ہیں اور بین الاقوامی سطح کے بھی۔ یوں قاری کی دلچسپی بڑھے گی۔"

☆ شاہد جہانگیر شاہد کی پشاور سے طویل آمد کی۔ "اداریہ حسب معمول مختصر لیکن بہت ہی جامع تھا۔ واقعی ہمارے ملک کو تازہ ہوا کی ضرورت ہے تاکہ ملک حقیقی معنوں میں ترقی کی راہ پر گامزن ہو سکے اور ہمارا شمار بھی دنیا کی خوش حال اور ترقی یافتہ اقوام میں ہو سکے۔ ڈاکٹر ساجد امجد صاحب کا بے حد مشکور ہوں کہ آپ نے اس بار مجھے اس عظیم شخصیت سے ملوا دیا جن کے متعلق جاننے کے لیے میں ایک عرصے سے بے قرار تھا۔ یعنی حضرت اقبال عظیم۔ ان سے میری بے پناہ عقیدت کا باعث ان کی وہ نعت ہے جس مدینے کا سفر ہے اور میں نم دیدہ نم دیدہ۔ ادب کا ایک ادنیٰ طالب علم ہونے کی وجہ سے مجھے بھی شاعری پڑھنے اور سننے کا ہمیشہ سے ہی شوق رہا ہے۔ اسی شوق کے باعث اردو ادب اور شاعری کے اکثر اساتذہ و شعرا اور ان کے اسلوب و انداز بیان سے کسی حد تک واقفیت ہو چلی ہے لیکن اقبال عظیم صاحب کی مذکورہ بالا نعت شریف نے میرے دل و دماغ پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ اتنی خوب صورت اور پاکیزہ الفاظ سے مزین نعت اردو کیا فارسی میں بھی میری نظر سے نہیں گزری۔ اس نعت شریف کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ نعت کے تمام اشعار کے قافیے فارسی زبان سے لیے گئے ہیں اور ان کا اتنی خوب صورتی سے استعمال کیا گیا ہے کہ بیان سے باہر ہے۔ یہ نعت جتنی رواں اور سادگی کا نمونہ ہے اتنی ہی خوب صورت اور بامعنی ہے۔ ایک ایک لفظ اپنی جگہ موتیوں کی طرح جڑا ہوا ہے۔ پوری عقیدت سے نعت کہنا اور کہیں بھی حد احترام کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دینا، یہی کمال کی بات ہے۔ میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ اگر حضرت اقبال عظیم اس نعت پاک کے علاوہ اور کچھ بھی نہ لکھتے تو یہی نعت ان کی مغفرت کے لیے کافی تھی۔ یہاں میں اگر نعت خواں صدیق اسماعیل کا ذکر نہ کروں تو بڑی زیادتی ہوگی کیوں کہ انہوں نے جس خوب صورتی سے یہ نعت شریف پڑھی ہے کہ نعت خوانی کا حق ادا کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ دونوں صاحبان کو جزائے خیر عطا فرمائے، آمین۔ مریم کے خان کی "تسمیہ نام" امریکا کے بارے میں ایک معلوماتی تحریر ہے۔ اسی طرح منظر امام صاحب کی تحریر "تاریخ عالم" بھی دنیا کی آفرینش سے لے کر موجودہ دور تک کے چیدہ چیدہ واقعات پر مبنی ایک مختصر اور جامع تحریر ہے۔ "پرندے" شیراز خان نے مختصر لفظوں میں پرندوں کی مختلف اقسام اور ان سے منسوب روایات کو خوب صورتی سے بیان کیا ہے۔ "جولائی" سلیم انور فاروقی نے ماہ جولائی کی مناسبت سے اہم اور عظیم شخصیات کے بارے میں بہت معلوماتی مضمون تحریر کیا ہے۔ وینٹرن فاروقی صاحب "پرنس اسٹیشن" انور فریدی کی یہ تحریر ان کی گزشتہ تحریروں کے مقابلے میں کمزور تحریر ہے۔ الطاف شیخ صاحب "ہانگ کانگ کا سفرنامہ" لے کر آئے ہیں جو ایک دلچسپ معلوماتی تحریر ہے اور سفرناموں کے شوقین حضرات ضرور پسند کریں گے۔ "چراغ" مسز جاوید کی یہ تحریر عورتوں کی درد کتھا اور ان کے مسائل کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور سچ کی ترجمانی کرتی ہے۔ "فراش" ایک عام سی تحریر ہے۔ ایسے واقعات اکثر ہمارے ارد گرد ہوتے رہتے ہیں جن سے واقفیت ضروری ہے۔ "سراب" اپنی دلچسپی کے باوجود اب اپنے منطقی انجام کی متقاضی ہے۔ اسے ایک خوب صورت موڑ دے کر منطقی انجام تک پہنچا کر کاشف زبیر صاحب کوئی نیا سلسلہ شروع کر دینا چاہیے۔ "قیر انسانی" نوشابہ کی یہ تحریر کرائے دار حضرات کے دکھوں اور مسائل پر مبنی ایک دکھ بھری تحریر ہے۔ مالک مکان حضرات کی لالچ اور خود غرضی کی یہ داستان بہت اداس کر دیتی ہے۔ "معیار خیال" میں اس مرتبہ کرسی صدارت مجید احمد جائی صاحب کے حصے میں آئی۔ بہت اچھا تبصرہ تھا، مبارک ہو۔ باقی دوستوں کے تبصرے بھی بہت جاندار تھے۔ سب کو میری جانب سے بہت بہت عید مبارک ہو۔"

☆ عبدالجبار رومی انصاری نے لاہور سے لکھا ہے۔ "ارے واہ شیخ محمد اسماعیل، کھاتے وقت بھی ہاتھ میں کتاب ہوتی اور وہ ما آج کی نسل ملاحظہ فرمائیں۔ کھانے کے وقت ہاتھ میں موبائل ہوتا ہے تو کیا یہ انکا پروانہ بیش کرے؟ شیخ اسماعیل کی سرگزشت اچھی لگی۔ "معیار خیال" میں بھی بہت سے اچھے تبصروں کے ساتھ موجود تھے۔ کتنا پیارا سندیسہ لیکن پہنچ ہی نہ پایا جولائی میں۔ خیر کوئی بات نہیں مجید احمد جائی صدارت مبارک ہو۔ کاش آپ کی یہ باتیں بھی ارباب اختیار کی نظر سے گزریں۔ آپ کی ایک اخبار میں تصویر دیکھی، اچھا لگا۔ راؤ محمد شاہد چوتے نے ہماری باتوں کے پیچھے عمل کا مشورہ ہوا ہے۔ بس ایسے … کی امید رکھ سکتے ہیں اور ماں کے بغیر عید؟ آپ کے جذبات سمجھ سکتے ہیں۔ ان کے لیے دعا کریں۔ آپ کا مختصر تبصرہ اچھا تھا۔ شکریہ محمد سلیم قیصر۔ اللہ آپ کو بدلہ دے۔ تبصرہ جاندار تھا۔ قیصر خان دکھ درد تو سب کے ساتھ ہوتے ہیں۔ انور عباس شاہ، پیچھے تو ہم واقعی بہت رہ گئے ہیں لیکن ابھی بھی خود کو سدھار لیں تو بہت آگے نکل سکتے ہیں۔ محسن فیروز … شکریہ ہے اب آپ ٹھیک ہیں۔ ڈاکٹروں کی غفلت کبھی کبھی جان لیوا ثابت ہوتی ہے۔ سدرہ

شاطر دماغ

ڈاکٹر ساجد امجد

یہ قصہ اس وقت کا ہے جب برصغیر افراتفری کے اندھیروں کے حصار میں مقید تھا، ہر جگہ زور بازو آزمائے جا رہے تھے۔ ہر صوبے میں ایک نیا حاکم تھا جو اپنی پڑوسی ریاست پر شب خون مارنے کی راہ تکتا رہتا تھا۔ ہر جانب مایوسیوں کا صحرا تھا۔ اک پاگل خوف نے ہر ایک کو جکڑ رکھا تھا۔ ایسے وقت میں سات سمندر پار سے ایک سرشت میں غداری سازش میں باریک بیں یہاں آ پہنچا۔ اس نے سازشوں کا ایک ایسا جال بچھایا کہ برصغیر کے تمام حکمران ایک دوسرے کے مزید خون کے پیاسے بن گئے۔ صرف دشمنی نبھانے کے لیے غیر ملکیوں کے بھی آلۂ کار بننے لگے نتیجہ یہ نکلا کہ وہی مسلمان حکمران جو برصغیر کے سیاہ سفید کے مالک تھے محکوم بنتے چلے گئے۔ اس سازش کے سرخیل کی مکمل داستان جسے اس کے وطن میں بھی خونریزی ملی۔

دونوں میاں بیوی میں کسی بات پر تکرار ہوئی تھی اور پھر ہمیشہ کی طرح جھگڑے میں تبدیل ہو گئی۔ وہ نہایت تند مزاج اور چڑچڑی طبیعت کا آدمی تھا۔ اسی لیے ذرا سی بات پر آپے سے باہر ہو جاتا تھا۔ ذرا سی بات بھی خود اس کی پیدا کردہ ہوتی تھی لیکن وہ اپنی غلطی ماننے کو تیار نہ ہوتا تھا۔ اس کی بیوی نہایت سمجھدار اور خوش مزاج تھی لیکن کبھی کبھی اسے بھی غصہ آ جاتا تھا۔ اس روز بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ بات اتنی بڑھ گئی کہ اس نے اپنے بچے کو اٹھایا اور کمرے میں بند ہو گئی۔ اس کا شوہر کچھ دیر تو بند کمرے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنا غصہ ہلکا کرتا رہا اور پھر خاموشی چھا گئی۔ گھر کے سناٹے نے جب زیادہ پاؤں پھیلائے تو اس کی بیوی نے دروازہ کھولا اور باہر نکل آئی۔ اس کا چہرہ دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ اس نے ہمیشہ کی طرح خود کو بہلا نہیں لیا ہے بلکہ اس نے کوئی فیصلہ کر لیا ہے۔ وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑا رہی تھی۔

"اس آدمی نے مذاق ہی بنا لیا ہے۔ جب چاہتا ہے مجھے ذلیل کرنے لگتا ہے۔ اب مجھ سے یہ سب برداشت نہیں ہوتا۔ میں برداشت کر بھی لوں تو میرا بچہ تین سال کا ہو گیا ہے۔ اچھا خاصا ہوشیار ہے۔ روز روز کے جھگڑوں سے اس پر کیا اثر پڑے گا۔ یہ بھی اپنے باپ کی طرح جھگڑالو نکلے گا۔" وہ ایک جھٹکے سے اٹھی اور کمرے میں جا کر اپنا سامان پیک کرنے لگی۔ اتنی دیر میں اس کا شوہر بھی گھر میں داخل ہوا۔ اس وقت اس کے چہرے سے لگتا تھا کہ غصہ کچھ کم ہو گیا ہے لیکن بیوی کو سامان پیک کرتے ہوئے دیکھ کر اس کے چہرے کا تناؤ لوٹ آیا تھا۔

"یہ کیا کر رہی ہو؟"

"سامان پیک کر رہی ہوں۔"

"کہیں جانے کا ارادہ ہے؟"

"ہاں، مانچسٹر جا رہی ہوں اپنی بہن کے گھر۔"

"ہمارے جھگڑے تو روز ہی ہوتے ہیں اس سے پہلے تو تم کہیں نہیں گئیں؟"

"اب بچہ بڑا ہو رہا ہے یہاں رہا تو تمہاری طرح جھگڑالو ہی بنے گا۔ میں اسے اپنی بہن کے گھر چھوڑنے جا رہی ہوں۔"

"تو تم یہ فیصلہ کر چکی ہو؟"

"ہاں۔" اس نے کہا اور دوبارہ سامان پیک کرنے لگی۔

اس کا شوہر کچھ دیر اس کی طرف دیکھتا رہا اور پھر اس کی جبلت لوٹ آئی وہ غصے میں دہاڑا۔

"جاتی ہو تو چلی جاؤ۔ مجھے نہ تمہاری پروا ہے اور نہ تمہارے بچے کی۔ چاہو تو تم بھی لوٹ کر مت آنا۔"

"میں کہاں جاؤں گی، تھک ہار کے لوٹ آؤں گی مجھے تو اپنے بچے کا مستقبل عزیز ہے۔"

"تمہارا جو جی چاہے کرو۔ میں نہ تو تمہیں جانے سے روکوں گا نہ آنے سے۔" اس نے کہا اور دوسرے کمرے میں منہ لپیٹ کر لیٹ گیا۔

اس کی بیوی نے وہ رات اپنے کمرے ہی میں گزاری اور یہ انتظار کرتی رہی کہ اس کا شوہر اسے روک لے گا اس نے پلٹ کر پوچھا تک نہیں، روکنا تو بڑی بات ہے۔ بیوی کا غصہ مزید بڑھ گیا۔

دوسرا دن طلوع ہوتے ہی وہ مانچسٹر جانے کے لیے گھر سے نکل گئی۔ اس کا بیٹا اس کی گود میں تھا۔ اس کا شوہر اسے دروازے تک بھی چھوڑنے نہیں آیا۔

وہ مانچسٹر پہنچی تو اتفاق سے اس کا بہنوئی مسٹر بیلی گھر پر ہی تھے۔ وہ حیران ضرور ہوئے تھے کہ وہ اپنے شوہر کے بغیر آئی ہے لیکن یہ حیرانی زیادہ دیر برقرار نہ رہ سکی کیونکہ اس کی سالی نے بیٹھتے ہی جو کچھ اس پر گزری تھی من و عن ان کے گوش گزار کر دیا۔

ان حالات کو سن کر بہن اور بہنوئی فکرمند ضرور ہوئے تھے لیکن وہ اپنی پریشانی کو ظاہر کرنے سے گریزاں تھے۔ وہ یہی سمجھ رہے تھے کہ دو چار دن میں غصہ اتر جائے گا۔ دو دن گزر گئے تو اس کی بہن نے اس سے بات کی۔

"تم نے واقعی طے کر لیا ہے کہ تم رابرٹ کو یہاں میرے پاس چھوڑ جاؤ گی؟"

"اگر تمہیں اعتراض ہے تو میں یہ فیصلہ بدل بھی سکتی ہوں۔"

"تم نے غلط سمجھا۔ رابرٹ مجھ پر بوجھ نہیں ہے کا تم جس طرح چاہو گی اس کی تعلیم و تربیت ہو گی۔"

"رابرٹ اب تمہارا بیٹا ہے۔ اس کی جو تعلیم مناسب سمجھو اسے دو۔ میں تم سے کچھ نہیں کہوں گی۔"

وہ انتظار کرتی رہی لیکن اس کا شوہر اسے لینے نہیں آیا۔ اس نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ وہ خود ہی تھک ہار کر اپنے گھر لوٹ گئی۔

وہ نہ تو غریب خاندان میں پیدا ہوا تھا نہ یتیم تھا لیکن اپنی ماں کی بجائے اپنی خالہ کے گھر میں رہنے پر مجبور کر دیا گیا۔ رابرٹ کلائیو نامی یہی شخص تھا جسے ہندوستان کا پہلا وائسرائے ہونے کا اعزاز حاصل ہونے والا تھا۔

رابرٹ کلائیو اپنی خالہ کے گھر پرورش پاتا رہا۔ وہ جیسے جیسے بڑا ہوتا گیا اس کی شرارتیں عروج پر پہنچتی گئیں۔ وہ جلد ہی جھگڑالو مشہور ہو گیا۔ کوئی بچہ ایسا نہیں تھا جو اس کے ہاتھوں پٹا نہ ہو۔ اس کی خالہ اس کی یہ حرکتیں دیکھ کر سخت پریشان تھی۔ اس نے تنگ آ کر اپنے شوہر مسٹر بیلی سے بات کی۔ بات یہیں پہنچی کہ جیسا باپ ویسا بیٹا۔

"وہ تو بالکل اپنا باپ ہے۔ اسی طرح کا بدمزاج اور چڑچڑا۔"

"یہ تو ہمارے لیے مصیبت بن جائے گا۔"

"الزام ہم پر آئے گا کہ ہم اس کی صحیح تربیت نہ کر سکے۔"

"اس کی ماں کو بتایا جائے کہ اس کا بیٹا کس طرف جا رہا ہے۔"

"وہ کیا کرے گی، جو کچھ کرنا ہے ہمیں کرنا ہے۔"

"ہم بھی تو غلطی کر رہے ہیں۔ ہمیں اس کو فوراً ہی کسی مدرسے میں داخل کروا دینا چاہیے۔ ہمارا کچھ تو بوجھ ہلکا ہو گا۔ اس کے استاد اس سے خود نمٹ لیں گے۔"

"سوال یہ ہے کہ کس اسکول میں داخل کروایا جائے؟"

"میرے ایک دوست ڈاکٹر اسٹین ہیں۔ ان کا ایک پرائیوٹ اسکول ہے۔ رابرٹ کلائیو جیسے شریر بچے کے لیے یہ جگہ بالکل ٹھیک رہے گی۔"

رابرٹ کلائیو کو اس اسکول میں داخل کر دیا گیا۔

مسٹر بیلی مطمئن ہو گئے تھے کہ اب اس کی شرارتوں میں کمی آ جائے گی لیکن کچھ بھی فرق نہیں پڑا۔ اسے اس اسکول سے اٹھا کر ایک دوسرے اسکول میں داخل کروا دیا گیا پھر ایک اور اسکول پھر ایک اور اسکول۔

ان سب مدارس میں بے پناہ جرات اور حکم عدولی رابرٹ کلائیو کی خصوصیات رہیں۔ لکھنے پڑھنے سے اسے کچھ سروکار نہیں تھا۔ اس نے اپنے جیسے بدمعاش لڑکوں کا غول اپنے گرد جمع کر لیا تھا۔ سب کا سرغنہ بھی رابرٹ کلائیو تھا۔

اس کا آخری اسکول ہرٹ فورڈ شائر میں مسٹر اسٹرلنگ کا پرائیوٹ اسکول تھا۔ اب وہ جوان ہو گیا تھا۔ اس

کی بدتمیزیوں سے اس کے اساتذہ خوف کھانے لگے تھے۔ وہ اس قدر دلیر تھا کہ کسی خطرے کی پروا نہ کرتا تھا۔ نہ کبھی گھبراتا تھا۔ جتنے بڑے خطرے کا سامنا ہوتا اتنے ہی زیادہ اس کے حواس قائم رہتے۔

جب وہ بیس سال کی عمر کو پہنچا تو اس کے باپ کو اس کے معاش کی فکر ہوئی۔ وہ تو یہ چاہتا تھا کہ وہ اتنی تعلیم حاصل کرلے جو عدالت کی مختار کاری کے لیے ضروری ہوتی ہے تاکہ وہ بھی اپنے باپ کا پیشہ اختیار کرسکے لیکن رابرٹ کو اُمید نہیں تھی کہ وہ تعلیم حاصل کرسکے گا۔ اس نے رابرٹ سے بات کرنے کا ارادہ کیا۔ وہ ابھی تک اپنی خالہ کے گھر تھا لہٰذا اس کا باپ مانچسٹر آیا۔

''تم نے خود کو اس قابل تو ثابت کیا نہیں کہ پڑھ لکھ سکو تو کوئی نوکری کرلو۔''

''مجھے عدالت کی مختار کاری سے کوئی دلچسپی نہیں۔''

''تم اس اہل عہدے کے لائق ہو بھی نہیں۔''

''میری شان کے مطابق کوئی نوکری ہو تو ضرور بتایئے گا۔''

''تم مجھے یہ بتادو کہ تمہاری شان کیا ہے؟''

''میں تو کوئی ایسی نوکری چاہتا ہوں کہ جس میں کوئی کارنامہ دکھانے کا موقع ملے۔''

''تمہاری مراد ایڈونچر سے ہے؟''

''بالکل۔''

''تو پھر کسی پہاڑ پر چڑھ کر چھلانگ لگادو۔ اس سے بڑا ایڈونچر اور کیا ہوگا۔''

''میں ناموری کی تلاش میں یہ بھی کرگزروں گا۔''

''تم دنیا میں کچھ نہیں کرسکتے۔ میری طرف سے بھاڑ میں جاؤ۔'' اس کے باپ نے کہا اور چلا آیا۔

وہ اپنے بیٹے کی طرف سے مایوس ہوچکا تھا کہ اُمید کی ایک کرن نمودار ہوئی۔ اس کا ایک دوست ایسٹ انڈیا کمپنی میں نوکری کرتا تھا۔ اس کے سامنے جب رابرٹ کا ذکر آیا تو اس نے ایسٹ انڈیا کمپنی میں ملازمت دلوانے کا وعدہ کیا۔

''آپ رابرٹ سے بات کرلیں۔ ہوسکتا ہے کہ وہ ہندوستان جانے پر تیار نہ ہو۔ اس ملازمت میں اسے ہندوستان جا کر رہنا پڑے گا۔''

''یہی تو ایک اچھی بات ہے کہ وہ اس معمولی کلرکی کو اہمیت دے نہ دے کیونکہ وہ ایڈونچر چاہتا ہے اور اس سے بڑا ایڈونچر کیا ہوگا کہ وہ اپنے وطن سے دور سات سمندر پار جاکر رہے۔ نئی سرزمین، نئے لوگ، نئی زبان یہ سب ایڈونچر ہی تو ہے۔''

''تو پھر آپ اس سے بات کرکے مجھے بتادیں۔ کمپنی کے ایک ڈائریکٹر میرے محسن ہیں۔ میں ان سے بات کرکے رابرٹ کو ہندوستان بھیجنے کا انتظام کرتا ہوں۔''

رابرٹ کے باپ نے رابرٹ سے بات کی۔

''تم نے ایسٹ انڈیا کمپنی کا نام ضرور سنا ہوگا؟''

''آپ مجھے جتنا بے خبر سمجھتے ہیں میں اتنا بے خبر ہوں نہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ یہ ایک تجارتی جماعت ہے جسے ملکہ انگلستان کے ایک فرمان کی رو سے پندرہ سال کے لیے ہندوستان سے تجارت کرنے کا اجارہ ملا تھا۔ بعد میں اس کمپنی کے معاملات و مسائل میں ملکہ نے بہت زیادہ دلچسپی لی۔ اس نے ایک نئے فرمان کی رو سے اس کمپنی کو مشرقی تجارت کا دوامی اجارہ دار بنادیا۔ کیا میری اتنی معلومات بہت ہیں یا کچھ اور بتاؤں؟''

''ارے واہ، تم تو بہت قابل نظر آنے لگے ہو۔''

''لیکن آپ اس وقت ایسٹ انڈیا کمپنی کا ذکر لے کر کیوں بیٹھ گئے؟''

''اس لیے کہ وہاں محرر کی جگہ خالی ہے۔ میں نے تمہارے لیے بات کی ہے۔ اگر تم تیار ہوجاؤ۔''

''معمولی سی محرری بھلا یہ کوئی ملازمت ہے۔''

''ہاں ایک اور بات بھی ہے۔ تمہیں اس ملازمت پر ہندوستان جانا پڑے گا۔''

ہندوستان کا نام سن کر وہ لالچ میں آگیا۔ اس سے اچھا ایڈونچر کیا ہوگا کہ وہ اپنے وطن سے دور اکیلا ہندوستان میں رہے گا جس کے بارے میں وہ طرح طرح کی کہانیاں سنتا رہتا ہے۔ ہندوستان اسے جادوئی سرزمین لگتا تھا۔ اس نے اس ملازمت کے لیے فوراً رضامندی ظاہر کردی۔

اس کے باپ کو تعجب ہوا تھا کہ وہ اس سے بہتر ملازمتیں ٹھکرا چکا ہے اور اب اس معمولی سی ملازمت پر تیار ہوگیا۔

رابرٹ کو خود نہیں معلوم تھا کہ وہ جس کام کے لیے تیار ہوچکا ہے وہ کتنا مشکل ہے اور جس ہندوستان کے خواب دیکھ رہا ہے وہ کیسا ہے۔

☆☆☆

ابتدا میں انگریزوں نے ساحل ''کارومنڈل'' کے

ایک معمولی مقام پر جو مدراس سے شمال میں پچیس میل کے فاصلے پر واقع ہے تقریباً 1625ء میں ایک کارخانہ قائم کیا تھا۔ اس سے تقریباً سات سال بعد ایک راجا نے انہیں ایک قطعہ زمین بطور عطیہ دیا۔ اسے وہاں کے لوگ چناپٹنم کہتے تھے لیکن انگریزوں نے اس کا نام مدراس رکھا جو آج تک چلا آرہا تھا مگر کچھ عرصہ قبل اسے دوبارہ چنائے کے نام سے موسوم کردیا گیا۔ انگریزوں نے یہاں اپنے گودام تعمیر کیے اور ان گوداموں کے گرد ایک قلعہ بنا کر اس کا نام "فورٹ سینٹ جارج" رکھا۔ اس قلعے کا نام تو بہت بڑا تھا لیکن دراصل یہ ایک چھوٹی سی چار دیواری تھی جس کی حفاظت کے لیے چار بہت چھوٹے برج اور چار مورچے بنے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ قلعے کی حفاظت کے لیے کوئی تعمیر موجود نہیں تھی۔ انگریزوں کی تعداد چند سو سے زیادہ نہیں تھی۔ جو انگریز فوجی تھے ان میں سے بھی چند ایسے ہوں گے جنہوں نے کبھی کوئی جنگ دیکھی ہوگی۔ بات یہ تھی کہ اس وقت تک انگریزوں کی نوآبادی محض ایک تجارتی نوآبادی تھی۔ اس وقت سیاسی حالات ایسے پیدا ہورہے تھے کہ انہیں تاجوری کا خیال آتا زیادہ سے زیادہ انہیں اپنا دفاع درکار تھا کیونکہ اسی ساحل پر مدراس سے جنوب مغرب کی طرف 86 میل کے فاصلے پر فرانسیسیوں کی نوآبادی تھی۔ انگلستان اور فرانس کے درمیان ہونے والی کبھی کبھی کی جھڑپیں انگریزوں کو مجبور کرتی تھیں کہ وہ اپنے دفاع کے لیے تیار رہیں۔

فرانسیسی تجار اس وقت فرانسیسی بورڈن نامی ایک مشہور شخص کے زیر قیادت تھے۔ بیجاپور کے بادشاہ نے ایک قطعہ زمین فرانسیسی تاجر کے ہاتھ فروخت کیا تھا۔ یہاں ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جسے مقامی لوگ پونڈیچری کہتے تھے۔ رفتہ رفتہ اس گاؤں اور اردگرد کے علاقے کو پونڈیچری کہنے لگے۔ گویا اس وقت انگریز مدراس میں اور فرانسیسی تجار پانڈیچری میں تھے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے کارندوں نے یہاں جو کارخانے قائم کرلیے تھے ان کے گرد چند مربع میل زمین تھی اور یہی ہندوستان میں اس کمپنی کا کل علاقہ تھا۔ دیسی حکومتوں کو اس زمین سے لگان ادا کیا جاتا تھا۔ ایک چھوٹی سی فوج بھی تھی جس میں زیادہ تر ہندوستانی سپاہی تھے جن کے پاس بہت معمولی سے ہتھیار ہوا کرتے تھے۔

کمپنی کی کل کائنات یہ تھی اور رابرٹ کلائیو نہ جانے آنکھوں میں کتنے خواب سجائے جہاز میں سوار ہوگیا۔ مشکلات یہیں سے شروع ہوگئی تھیں کیونکہ اس کا جہاز ایک مقام پر رک گیا اور نو مہینے پڑا رہا۔ کچھ عرصہ خلیج سینٹ سائمن میں رکا رہا۔ یہاں تک کہ 1744ء کے آخر میں وہ مدراس پہنچا۔ جس شخص کے نام وہ تعارفی خط لایا تھا وہ یہاں سے روانہ ہوچکا تھا۔ ایک سال تک مستقل جہاز میں رہنے سے اس کے چڑچڑے پن میں مزید اضافہ ہوگیا تھا۔ اس کے تمام خواب ایک ایک کرکے اس کی آنکھوں سے نکل کر زمین پر گر پڑے تھے۔ اس نے ساحل پر کھڑے کھڑے آسمان کی طرف دیکھا اور پھر گھبرا کر اپنی آنکھیں زمین پر رکھ دیں۔ اسے محسوس ہوا تھا کہ سورج نے زمین کی طرف سفر شروع کردیا ہے اور تھوڑی دیر میں زمین پر اتر جائے گا۔ وہ جس ملک سے آیا تھا وہاں سورج سے ڈرنے کی بجائے دھوپ اور سورج کی تمنا رہتی تھی۔ یہاں کی گرمی اس کے جسم میں خراشیں ڈال رہی تھی۔ ایک مقامی شخص اس کے قریب سے گزرا۔ اس کا پورا بدن سر کے بالوں کی طرح سیاہ تھا۔ وہ سیاہ فام اس کی سفید چمڑی کو پسندیدگی کی نظروں سے دیکھ رہا تھا جبکہ رابرٹ اسے دیکھ کر خوف زدہ ہوگیا تھا۔

سورج نے اس شخص کی کھال جلا دی ہے۔ کہیں وہ بھی اسی کی طرح سیاہ نہ ہوجائے لیکن پھر اپنے توہمات پر خود ہی ہنسنے لگا۔ اس نے جہاز پر مال لدواتے اور اتارتے ہوئے اپنے ہم وطنوں کو دیکھا۔ ان پر گرمی کی تمازت کا زیادہ اثر نہیں تھا پھر بھی یہاں کی گرمی اسے پریشان کررہی تھی۔

اس نے ساحل پر کام کرنے والے اپنے ہم وطنوں کی مدد لی اور کمپنی کی انتظامیہ کے دفتر میں پہنچ گیا۔ وہاں اس نے افسر بالا کے سامنے اپنا تقرر نامہ رکھ کر کام کی وضاحت چاہی۔ اس کا لہجہ ایسا ہی تھا جیسے وہ مدراس خریدنے آیا ہے۔ افسر نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا اور اس کی نوعمری کا خیال کرتے ہوئے مسکرا کر رہ گیا۔

جس خدمت پر وہ مقرر ہوکر آیا تھا وہ فقط محرری تھی۔ حسابات درست رکھنا، جہازوں میں مال بھرنا، ہفتگی روپیہ ادا کرنا اس کا فرض تھا۔ جہاز پر مال وہ لدواتا اور اس بات کی نگرانی کرتا کہ کمپنی کے اجارے میں کسی قسم کی مداخلت نہ ہونے پائے۔ یہ کام ہرگز اس کے مطلب کا نہیں تھا جبکہ ہندوستان کی آب وہوا بھی اس کے مطلب کی نہیں تھی۔ وہ جو بھی کام کررہا تھا اس کے پیچھے بے دلی اور شدید نفرت کا احساس چھپا ہوا تھا۔ اس کا اظہار اس طرح ہورہا تھا کہ وہ

اپنے ساتھیوں سے الگ تھلگ زندگی گزار رہا تھا۔ کسی سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ تمام لوگ فرصت کے اوقات میں خوش گپیوں میں دن گزارتے تھے لیکن وہ اپنے کمرے میں بند پڑا رہتا تھا۔ مشہور ہوگیا تھا کہ وہ کسی سے ملنا جلنا پسند نہیں کرتا لہٰذا دوسروں نے بھی اس سے ملنا جلنا بند کردیا تھا۔

کچھ دنوں بعد اس کی اسکول والی فطرت لوٹ آئی۔ ہر ایک سے لڑنا جھگڑنا اس کا معمول بن گیا۔ ایک دن اپنے ایک افسر سے الجھ پڑا۔ یہ اسکول تو تھا نہیں کہ اساتذہ اس سے ڈرنے لگتے۔ سخت ایکشن لیا گیا۔ بات گورنر تک پہنچی اور اسے حکم دیا گیا کہ وہ اس افسر سے معافی مانگے جس کی اس نے توہین کی ہے اور اسے معافی مانگنی پڑی۔

کسی سے معافی مانگنا خود اس کی توہین تھی۔ اپنی اس توہین کا اسے شدت سے احساس ہوا۔ اس نے خود کو کمرے میں بند کیا اور اپنی زندگی ختم کرنے کی ٹھان لی۔ اس نے پستول اپنی کنپٹی پر رکھا اور چلا دیا لیکن پستول نے دھوکا دیا۔ چلا ہی نہیں۔ اس نے پھر ٹریگر دبایا۔ اس مرتبہ بھی پستول نے چلنے سے انکار کردیا۔ اسی وقت اس کا ایک ساتھی کمرے میں داخل ہوا اور اس کے ہاتھ سے پستول لے لیا۔

''ارے دوست کچھ نہیں ہوگا۔ یہ چلتا کیوں نہیں ہے۔'' کلائیو نے کہا۔

اس کا ساتھی کھڑکی کے قریب گیا اور پستول کو کھڑکی سے باہر رکھ کر چلایا اور وہ چل گیا۔ یہ دیکھ کر کلائیو اچھل پڑا۔

''یہ پستول میری کنپٹی پر نہیں چل سکا اور کھڑکی کے باہر چل گیا۔ اس کا مطلب ہے کچھ بڑے کام میرے ہاتھ سے انجام پانے والے ہیں۔ اب میں بھی کوشش کروں گا کہ زندہ رہوں۔''

وہ زندہ رہنے کی کوشش کرنے لگا۔ بے دلی سے سہی اپنے کام انجام دیتا رہا۔ رفتہ رفتہ اسے یہ بھی احساس ہونے لگا کہ جب اسے یہاں رہنا ہے تو خود کو تکلیف پہنچانے سے کیا حاصل۔ وہ جیسے ایک دم سے اپنے خول سے باہر نکل آیا۔

اس میں ایک ایسی تبدیلی آئی کہ وہ اپنے ساتھیوں سے مل کر خوشی محسوس کرنے لگا۔ اس کے افسروں نے بھی اس تبدیلی کو محسوس کیا اور خیر مقدم بھی کیا۔ اس کے ایک ہمدرد افسر مسٹر موریس نے اس کی تنہائی دور کرنے کے لیے اسے اپنے وسیع کتب خانے میں مطالعہ کرنے کی اجازت دے دی۔

اسے جیسے ایک نئی دنیا مل گئی۔ وہ مطالعہ کا شوقین کبھی نہیں رہا تھا لیکن یہاں یہ کتابیں اسے قیمتی معلوم ہورہی تھیں۔ وہ اس نئی دنیا کی سیر کو نکل گیا لیکن باہر ایک نئی دنیا تعمیر ہورہی تھی جو اس کے حسب منشا تھی۔ ابھی وہ مطالعہ کی دنیا میں گم تھا کہ اسے نئی تعمیر ہونے والی دنیا کا سامنا کرنا پڑا۔

اورنگ زیب کے انتقال کے بعد ہی سے ہندوستان کی حالت ابتر ہوگئی تھی۔ نادر شاہ کے حملے اور دہلی کی تاراجی نے اس کیفیت کو انتہا تک پہنچا دیا۔ یہ ابتری پاؤں پاؤں چلتی ہوئی جنوبی ہند تک پہنچ گئی۔ یہی وہ علاقے تھے جہاں کلائیو موجود تھا۔

جب ابتری بہت بڑھ گئی تو صوبے دار جو کبھی مرکز کے تابع تھے اپنے اپنے علاقے دبا بیٹھے اور خود مختار ہوگئے۔ ایک علاقہ کرناٹک تھا جو براہ راست جنوبی ہند کے صوبے دار نظام الملک کے ماتحت تو تھا لیکن ایک خود مختار ریاست تھی یہی وہ ریاست تھی جس کے علاقے میں انگریزوں اور فرانسیسیوں کے اراضی مقبوضہ مدراس اور پانڈیچری شامل تھے۔

نظام الملک اور کرناٹک کے نوابوں کے درمیان چپقلش موجود تھی۔ نظام الملک کو یہ گوارا نہیں تھا کہ کرناٹک ان کے ماتحت تو ہو لیکن ان کے علاقے میں نہ ہو۔ اس کی خود مختاری ختم کرنے کے لیے وہ ہمیشہ کوشاں رہتے تھے۔ انہوں نے اپنے مقاصد پورے کرنے کے لیے مرہٹوں کو اپنے ساتھ ملا لیا تھا جو بار بار کرناٹک پر حملہ آور ہوتے تھے۔ کرناٹک کے نوابوں نے فرانسیسیوں کو اپنا حلیف بنا لیا تھا اور وقتاً فوقتاً انہیں مدد کے لیے پکار لیتے تھے۔

انگریز الگ تھلگ زندگی گزار رہے تھے مگر انہیں بھڑکانے کے لیے بھی ایک چنگاری انتظار میں تھی۔

اٹھارہویں صدی کے وسط میں جب انگریزوں اور فرانسیسیوں کے مفادات (سیاسی اور معاشی) ایک دوسرے سے ٹکرائے تو فرانس اور انگلستان کے درمیان جنگ کے آثار نظر آنے لگے۔ پانڈیچری کے گورنر ڈوپلے کو اطلاع ملی کہ انگلستان سے جنگ ہونے کا امکان ہے لہٰذا اخراجات میں کمی کی جائے اور پانڈیچری کے استحکامات کی تعمیر بند کروادی جائے۔

اس اطلاع کے بعد پانڈیچری کے گورنر کو ایک اور ہدایت دی گئی۔ ''جزیرہ فرانس کے حاکم کو احکام جاری

کر دیے گئے ہیں کہ جو بیڑہ وہ تیار کر رہا تھا اسے ہندوستان لے کر پہنچے تھے لہٰذا جو وہ نقصان اس مہم میں ہو چکا ہے اس کی بھرپور مدد دی جائے۔ ڈوپلے کو یہ ہدایت بھی دی گئی کہ وہ مدراس کے گورنر سے یہ طے کرے کہ یورپ کی جنگ کا اثر ان کے ہندی مقبوضات پر نہ پڑنا چاہیے۔

مابرت کو نیو کی مہم جوئی کے لیے قدرتی طور پر میدان تیار ہو رہا تھا۔

فرانس کی طرح انگلستان سے بھی ہدایات آئیں لیکن یہ ہدایات اس سے بالکل مختلف تھیں جو فرانس کے ڈوپلے کو ملی تھیں۔ مدراس کے گورنر مسٹر موریس کو جو ہدایت ملی اس کا مضمون بالکل مختلف تھا۔ اس میں کہا گیا تھا کہ اشتہار جنگ دے دیا گیا ہے اور کموڈور بارنیٹ کا بیڑہ بہت جلد مدراس کے سامنے پہنچنے والا ہے اور فرانسیسی تجارت اور ان کے مقبوضات کو تباہ کرنے کا کام اس بیڑے سے لیا جائے۔

گورنر ڈوپلے نے اپنے ملک سے ہدایت لینے کے بعد مدراس کے گورنر سے ملاقات کی اور پیغام دیا۔

”انگلستان اور فرانس کے درمیان بے شک جنگ چھڑ جائے لیکن اس کا اثر ہمارے مقبوضات پر نہیں پڑنا چاہیے۔ ہمیں اس جنگ سے دور رہنا ہوگا۔“

گورنر مدراس کو اس کے برخلاف ہدایت ملی تھی لہٰذا اسے مجبوراً انکار کرنا پڑا۔

گورنر مدراس کا جواب سن کر ڈوپلے کو سخت تشویش ہوئی۔ اسے یقین ہو گیا کہ انگریز اس موقع سے ضرور فائدہ اٹھائیں گے۔ اس سے پہلے کہ وہ وقت آئے اپنے دفاع کا انتظام کر لینا چاہیے۔ اس نے کرناٹک کے رئیس جو نواب ارکاٹ کہلاتا تھا کے دربار میں ایک عرضداشت پیش کی اور اپنی وفاداریوں کا یقین دلا کر اسے قائل کر لیا کہ وہ مسٹر موریس گورنر مدراس کو اس کے ارادے سے باز رکھے۔

نواب ارکاٹ نے گورنر مدراس کو آگاہ کر دیا کہ اس کی سرزمین پر دونوں قوموں کو نقض امن کی اجازت نہیں ہے۔ اس سرزنش کے بعد لگتا تھا کہ خطرہ ٹل گیا ہے۔ کموڈور بارنٹ کا بیڑہ آپہنچا لیکن پانڈیچری کے خلاف وہ کوئی قدم نہ اٹھا سکا۔ 1746ء میں بارنٹ مر گیا اور اس کی جگہ کموڈور پٹن آیا۔ اسے اپنے سابق کی جگہ لیے دو مہینے ہوئے تھے کہ اسے کچھ فرانسیسی جہازوں کی سمندروں میں موجودگی کی خبر ملی۔ اس نے خود ہی خیال کر لیا کہ یہ فرانسیسی بیڑہ ہے جو لابورڈنیس کی سربراہی میں پہنچا ہے۔ کموڈور پٹن آگے بڑھا

اور فرانسیسی بیڑے کو گھیر لیا۔ دونوں میں گولہ باری شروع ہو گئی۔ دن بھر کی لڑائی کے بعد انگریزی کموڈور کو علم ہوا کہ اس کے جہاز میں سوراخ ہو گیا ہے۔ وہ واپس ہو گیا اور لڑائی بند ہو گئی۔

فرانسیسی بیڑے کے سامنے اب کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ پہل خود انگریز کر چکے تھے۔ اس نے پانڈیچری کے گورنر سے مدد لی اور مدراس پر قبضہ کرنے کے لیے حملہ کر دیا۔ یہ قبضہ بڑی آسانی سے ہو بھی گیا۔ گورنر پانڈیچری نے شہر میں داخل ہوتے ہی تجارت کا جتنا سامان تھا ضبط کر لیا اور عہدے داروں کو اسیر جنگ بنا لیا۔ بعض ایسے بھی تھے جو بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے اور فورٹ سینٹ ڈیوڈ پہنچ گئے۔ یہ شہر گڈالور کے قریب اور پانڈیچری سے سولہ میل کے فاصلے پر جنوب میں واقع تھا۔ یہ علاقہ انگریزوں نے خرید لیا تھا۔

سینٹ ڈیوڈ پہنچنے والوں میں نوعمر رابرٹ کلائیو بھی تھا۔ وہ محض محرر تھا لیکن سینٹ ڈیوڈ پہنچتے ہی اس نے قلعے کی حفاظت کے لیے ایسے اقدام اٹھائے جیسے وہ کوئی ماہر جنگ ہو۔ یہ اسی کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ فرانسیسی اس ادنیٰ قلعے کو چار مرتبہ حملہ کرنے کے باوجود فتح نہ کر سکے یہاں تک کہ انگریزوں کی مدد کے لیے انگریزی بیڑہ آن پہنچا۔

ان ابتدائی معرکوں میں رابرٹ کلائیو نے اپنی دلیری اور شجاعت سے اس اعلیٰ فوجی اسپرٹ کا ثبوت دیا جو بتاتا تھا کہ آئندہ وہ کیا کرنا ہے۔ یہ اس کی خداداد صلاحیت تھی جس کا وہ مظاہرہ کر رہا تھا۔ اس نے کہیں سے فوجی تربیت نہیں لی تھی لیکن وہ تربیت یافتہ فوجی کی طرح معاملہ سنبھالے ہوئے تھا۔ اس کی شہرت اتنی ہو گئی تھی کہ ایک معرکے میں انگریزی فوج کی کمان اس کے ہاتھ میں دے دی گئی۔ اس کی کمان میں فوج نے حملہ کیا۔ دیوی کوٹہ کا قلعہ فتح کر لیا۔

حالات بڑی تیزی سے بدل رہے تھے۔ دہلی کے بادشاہ محمد شاہ کا انتقال ہو گیا۔ اس کا بیٹا احمد شاہ تخت پر بیٹھا۔ ایک ہفتہ بھی نہیں گزرا تھا کہ نظام الملک کا بھی انتقال ہو گیا۔ نظام الملک نے اپنی زندگی ہی میں اپنے بیٹے ناصر جنگ کو اپنا جانشین مقرر کر دیا تھا لیکن ان کی آنکھیں بند ہوتے ہی مرحوم کے نواسے مظفر جنگ دکن کی حکومت کے دعویدار بن گئے۔ بس یہیں سے اقتدار کے حصول کے لیے غیر ملکی طاقتوں کو اپنے ساتھ ملانے کا رواج جڑ پکڑ گیا۔ کسی نے فرانسیسیوں کو اپنا حلیف بنایا کسی نے انگریزوں سے کام لیا۔ مرہٹے بھی کرایے کے فوجی بنے ہوئے تھے۔ یہ حالات

ہی ایسے تھے کہ کلائیو کا ستارۂ عروج کی طرف گامزن ہوتا چلا گیا۔ خود کلائیو نے بھی سپاہیانہ زندگی بسر کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

مظفر جنگ نے فرانسیسیوں اور مرہٹوں کے ساتھ مل کر کرناٹک پر قبضہ کرلیا اور اپنی صوبہ داری کا اعلان کیا۔ نواب اراکاٹ کا بیٹا محمد علی جنگ سے بھاگا اور انگریزوں کے پاس پہنچ گیا۔ اب انگریزوں کے لیے ضروری ہوگیا کہ فرانسیسیوں کا اثر ختم کرنے کے لیے وہ محمد علی کی حمایت میں فرانسیسیوں سے جنگ کریں۔

ان تمام معرکوں میں کلائیو پیش پیش تھا۔ اسے اپنے کارناموں کی روشنی میں خود یقین آگیا تھا کہ وہ فوج کی سرداری کا اہل ہے وہ اپنی کلرکی سے قطعی خوش نہیں تھا۔ اس نے فوجی بھرتی کے لیے درخواست دے دی جو فوراً منظور ہوگئی۔ اس کی تقرری ان شاندار الفاظ میں کی گئی۔

"مسٹر رابرٹ کلائیو جو حال میں کئی جماعتوں کو جزائر تک پہنچانے میں مفید ثابت ہوچکا ہے اپنے آپ کو بلا کسی معاوضے کے جنگ میں شرکت کے لیے اس شرط پر پیش کرتا ہے کہ ہم اسے ایک کمیشن عطا کریں تاکہ وہ کپتان کے عہدے کا مستحق ہوسکے کیونکہ پانڈیچری کے محاصرے میں اور تقریباً دوران جنگ میں وہ ایک عہدیدار رہ چکا ہے اور کئی موقعوں پر اپنے آپ کو ممتاز بھی کرچکا ہے اس لیے خیال ہے وہ بہ حیثیت عہدہ دار مفید ثابت ہوگا لہٰذا حکم دیا جاتا ہے کہ باضابطہ پراسلہ تیار کرکے اس کے حوالے کردیا جائے۔"

اس تقرری کے بعد اسے حکم ہوا کہ فوج کا ایک حصہ لے کر دیوکوٹہ روانہ ہوجائے اور وہاں پہنچ کر کپتان کلارک کے احکام کی پابندی کرے اور کلائیو وہاں کی حالت کا اندازہ کرکے مسٹر سانڈرس (سپہ سالار) کو مطلع کرے۔

اب ترچنا پلی کے مقام پر حالت یہ تھی کہ ترچناپلی کی تسخیر کے لیے نواب کرناٹک چندا صاحب نے فرانسیسیوں کے ساتھ مل کر قلعہ کا محاصرہ کیا ہوا تھا۔ کلائیو نے جو جھلکی جنگ یہاں دیکھی وہ انگریزوں کی مایوسی تھی۔ انگریز سابقہ نواب کرناٹک محمد علی کو اس کا حق دلانے کے لیے لڑ رہے تھے اور اس کا حال یہ تھا کہ اس کا خزانہ خالی ہوچکا تھا۔

اس موقع پر کلائیو کی ذہانت نے وہ کارنامہ انجام دیا کہ انگریزوں کے قدم ہمیشہ کے لیے جم گئے۔ اس نے دیکھا کہ چندا صاحب نے اپنی کل فوج ترچنا پلی میں جمع کردی ہے۔ کرناٹک کے دارالحکومت ارکاٹ میں کوئی معتبر آدمی نہیں۔ چندا صاحب کی اس غلطی کو کلائیو نے بھانپ لیا۔ وہ طوفانی رفتار سے پلٹا اور سینٹ ڈیوڈ پہنچ کر گورنر مسٹر سانڈرس سے مشورہ کیا۔ سینٹ ڈیوڈ میں بھی اس وقت انگریزی فوج کی قلیل تعداد تھی اور ان میں بھی زیادہ تر ناتجربہ کار سپاہی تھے۔ اس نے انہی کو ساتھ لیا اور مدراس سے روانہ ہوا۔

یہی وہ مہم ثابت ہوئی جس نے اسے شہرت کی بلندیوں تک پہنچا دیا اور یہی مہم اس کے ہم وطنوں کو آئندہ شہنشاہی تک پہنچانے والی تھی۔

وہ وقت ضائع کیے بغیر کسی طوفان کی طرح ارکاٹ جا پہنچا۔ قلعے پر ہاتھ مارا، شہر پر قبضہ کرلیا اور وہ بھی اس صورت میں کہ اس کا ایک آدمی بھی ضائع نہیں ہوا تھا۔ آگے بڑھا اور ایک دوسرے قلعے (تیمری) پر قبضہ کرلیا۔ یہاں چھ سو ملکی سپاہی موجود تھے جنہیں پسپائی کے سوا کوئی راہ نہ سوجھی۔

یہ خبر جب ترچنا پلی پہنچی تو چندا صاحب اور فرانسیسیوں میں تشویش کی لہر پھیل گئی۔ ترچنا پلی میں محصور انگریزوں کے حوصلے بڑھ گئے۔

چندا صاحب نے اپنی فوج کے بہترین تین ہزار سپاہی اپنے بیٹے راجا صاحب کی مدد کے لیے بھیج دیے جو شمالی ارکاٹ میں موجود تھا۔

کلائیو کا مقصد پورا ہوگیا۔ ترچنا پلی میں غنیم کے حملے کا زور بہت کم ہوگیا۔ چندا صاحب کو ارکاٹ کی پڑ گئی ترچنا پلی پر کیا توجہ دیتا۔

اس عظیم الشان کامیابی کی وجہ سے جنوبی ہند کے تمام ہندوستانی فرماں روا کلائیو کی طرف رجوع ہوگئے اور وہ سب کے سب ایک آقا کی طرح اس پر جانیں نثار کرنے کے لیے تیار تھے۔

کلائیو نے دونوں قوموں کا قطعی پانسہ پلٹ دیا بعد ازاں تھوڑے ہی عرصے میں تمام ہندوستانی فرمانرواؤں سے اپنی بات منواتا چلا گیا۔ انگریزوں کے قدم ہندوستان میں جمتے چلے گئے۔ اب تک وہ محض تاجر تھے لیکن اب شہنشاہی کے خواب دیکھنے لگے۔

ارکاٹ کے معرکے کے بعد کلائیو کی توجہ فرانسیسیوں کی طرف ہوگئی تھی۔ اب وہ چاہتا تھا کہ فرانسیسی یہاں سے رخصت ہوجائیں تاکہ انگریز اکیلے حکمراں رہ جائیں۔ اس طرح جنوبی ہند کے فرماں رواؤں کی طاقت بھی کم ہوجائے گی اور وہ آپس کے جھگڑوں سے نمٹنے کے لیے انگریزوں

کے دست نگر بن جائیں گے۔ مقامی فرماں رواؤں کی نادانیوں نے اس کے مقاصد کو بہت جلد پورا کر دیا۔

فرانسیسیوں کے لیے بھی کلائیو ان کی جان کا دشمن بن گیا تھا۔ انہیں یہ ثابت کرنا تھا کہ وہ فرنگیوں سے زیادہ طاقتور ہیں تاکہ مقامی فرماں روا ان کے محتاج بنے رہیں۔ اسی لیے فرنگیوں سے ان کی جھڑپیں جگہ جگہ ہو رہی تھیں لیکن ہر جگہ کلائیو کی ذہانت اسے فتح سے ہمکنار کرتی جا رہی تھی۔ اس نے شمالی ارکاٹ دشمن سے خالی کروا لیا۔ اب اس کا رخ ترچناپلی کی طرف تھا جس پر اس کو قبضہ کرنا تھا۔

ترچناپلی پر بھی قبضہ ہو گیا۔ اس کے بعد اس نے کئی اور قلعے سر کیے۔ فرانسیسی فوج اور اس کے مابین آنکھ مچولی کا کھیل ہو رہا تھا۔ اسے اب کسی ایسے قلعے پر قبضہ کرنا تھا جس کے بعد فرانسیسیوں کی پیش قدمی رک جائے اور وہ محصور ہو کر رہ جائیں۔ اب صرف ایک قلعہ باقی رہ گیا تھا جو پے چھنڈا کہلاتا تھا۔ یہ دریائے کولرن کے شمالی ساحل پر واقع تھا۔

وہ جنگلوں، گھاٹیوں، جزیروں کو عبور کرتا ہوا آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ اس کے فوجی بری طرح تھک گئے تھے۔ قلعہ بھی اب قریب آ گیا تھا۔ وہ اپنے سپاہیوں کو لے کر ایک کھنڈر نما عمارت میں چلا گیا تاکہ کچھ دیر آرام کر لیں۔ تھکے ہوئے تو تھے ہی لیٹتے ہی نیند آ گئی۔ کلائیو بھی بے خبر سو گیا۔

فرانسیسیوں کے جاسوس قدم قدم پر پھیلے ہوئے تھے۔ انہوں نے فوراً اطلاع دی کہ کلائیو اور اس کے سپاہی فلاں مقام پر موجود ہیں اور بے خبر سو رہے ہیں۔

یہ خبر ملتے ہی حملہ آور فوج کے سردار نے کلائیو کو زندہ گرفتار کرنے کا تہیہ کر لیا۔ یہ فوجی قریبی گاؤں میں چھپے ہوئے تھے۔ کچھ ہی دیر میں سوتے ہوئے کلائیو کے سر پر آ موجود ہوئے۔ اس کی آنکھ کھلی تو دشمن کو سامنے کھڑا دیکھا۔ اس کے سپاہی غیر مسلح تھے اور بندوقوں کے زد پر تھے۔ وہ بری طرح پھنس چکا تھا۔ اس کی عادت تھی کہ جتنا بڑا خطرہ ہوتا تھا اس کے حواس اتنے ہی زیادہ مضبوط ہو جاتے۔ اس وقت بھی وہ تھوڑی دیر کے لیے گھبرایا اور پھر نارمل ہو گیا۔ موت اس کے سر پر کھڑی تھی اور وہ پوری طرح چوکنا ہو چکا تھا۔

"کلائیو تمہارا وقت ختم ہوا۔ ہتھیار ڈال دو اور ہمارے ساتھ چلنے کی تیاری کرو۔" یہ حکم سنتے ہی اس کا دماغ فوری طور پر بیدار ہو گیا۔ اس نے پورے اعتماد سے انہیں للکارا۔

"ہتھیار ڈالنا تمہارا کام ہے نہ کہ میرا۔ ذرا مڑ کر دیکھو تم کس طرح محصور ہو چکے ہو۔"

وہ چھ آدمی تھے کلائیو کا اعتماد دیکھ کر انہوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ بس اتنا وقفہ کافی تھا۔ کلائیو وہاں سے نکل بھاگا۔ اس کے کچھ سپاہی ایک دوسری عمارت میں موجود تھے۔ وہ وہاں پہنچا اور ان سب کو تیار کیا۔ رات بھر خاموشی رہی لیکن صبح ہوئی تو فرانسیسیوں کو صبر نہ ہوا۔ وہ میدان میں نکل آئے۔ کلائیو بھی یہی چاہتا تھا۔ اس نے ان کا استقبال گولی سے کیا۔ بارہ لاشیں زمین پر آ گریں۔ فرانسیسی سپاہیوں کے پاس بھاگنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا۔

لڑائی اب ختم ہونے کے قریب تھی۔ کلائیو نے پے چھنڈا پر قبضہ کر لیا۔ فرانسیسیوں کے لیے اب ہر راستہ بند تھا۔ ترچناپلی کی کل فرانسیسی فوج نے اپنے آپ کو لارنس کے حوالے کر دیا۔

کلائیو ان پے در پے کامیابیوں کے بعد فورٹ سینٹ ڈیوڈ واپس آ گیا اور سال کے ختم ہونے تک گردونواح سے ان مقامات کی تسخیر میں مشغول رہا جو اس کے حلیف نواب محمد علی خان کے خلاف تھے۔

اس نے ان مہمات میں ایسی جان توڑ محنت کی تھی کہ وہ بیمار رہنے لگا۔ اسے آرام کی اشد ضرورت تھی۔ وہ آرام کی غرض سے مدراس آ گیا۔

اس کی دوست میکلین اسے دیکھنے آئی تو حیران رہ گئی۔

"کلائیو تم کتنے کمزور اور دبلے ہو گئے ہو۔"

"میں خود دبلا اور کمزور ہو گیا ہوں لیکن میں نے اپنی قوم کو مضبوط اور توانا کر دیا ہے۔"

"تمہیں اپنا بھی خیال رکھنا چاہیے۔"

"اپنا خیال رکھنے ہی کے لیے تو مدراس واپس آ گیا ہوں۔ تمہارے بغیر میں خود کو ادھورا سمجھ رہا تھا۔"

"میں تمہارا پورا خیال رکھوں گی۔"

میکلین اس کے دوست کی بہن تھی۔ وہ جب ہندوستان آیا تھا اسی وقت میکلین سے اس کی دوستی ہو گئی تھی۔ وہ اس خاموش رہنے اور کسی قدر جھگڑالو نوجوان کی محبت میں گرفتار ہو گئی تھی۔ کلائیو چاہتا بھی یہی تھا کہ اس سے شادی کرے لیکن وہ ہر کام اپنے وقت پر کرنے کا عادی تھا۔ وہ سمجھتا تھا ابھی وقت نہیں آیا۔ پھر وہ خواب میں ہونے والی

جنگوں میں مشغول ہو گیا۔ ہندوستان واپس آنے کے بعد اب اس نے سوچا کہ وقت مناسب ہے اس نے میکگین سے شادی کر لی۔

شادی کے بعد بھی اس کی صحت روز بروز خراب ہوتی جا رہی تھی۔ اس نے یہی ضروری سمجھا کہ یورپ واپس پہنچ جائے۔ اسے ہندوستان میں آئے تقریباً دس سال ہو گئے تھے۔ وہ جب یہاں آیا تھا تو ایک معمولی محرر تھا لیکن اب ایک شاندار شکست اس کے نام کے ساتھ جڑی ہوئی تھی۔ انگلستان میں اب اسے ایک اپنے ہیرو کے طور پر جانا جا رہا تھا کہ اگر وہ نہ ہوتا تو فرانسیسی قوم ہندوستان میں اپنی شہنشاہیت قائم کرنے میں کامیاب ہو گئی ہوتی۔ اس نے اپنی ذہانت، قابلیت اور بہادری سے فرانس کے عزائم کو ناکام کر دیا تھا۔

ہندوستان سے رخصت ہوتے وقت یہ احساس اس کی روح میں بالیدگی پیدا کر رہا تھا کہ پوری انگریز قوم اس کی احسان مند ہے۔

انگلستان پہنچ کر جس طرح اس کا استقبال ہوا اور جو دعوتیں ہوئیں۔ حکومتی حلقوں میں جو پذیرائی ہوئی اس سے اسے اندازہ ہو گیا کہ اس کی خدمات مقبول ہوئی ہیں۔ استقبال کرنے والوں میں اس کا باپ بھی تھا جو یہ پیش گوئی کر چکا تھا کہ یہ لڑکا کچھ نہیں کر سکتا مگر اب اس نے وہ کچھ کر لیا تھا جو کوئی اور نہیں کر سکتا تھا۔ اب یہ فخر اس کے لیے کم نہیں تھا کہ وہ رابرٹ کلائیو کا باپ ہے۔

رابرٹ کلائیو اس ارادے سے آیا تھا کہ اب وہ ہندوستان واپس نہیں جائے گا۔ اس نے ہندوستان میں اتنی دولت ضرور جمع کر لی تھی کہ وہ انگلستان میں چین کی زندگی بسر کر سکتا تھا۔ اس نے پارلیمنٹ میں داخل ہونے اور قسمت آزمائی کا فیصلہ کر لیا۔ یہ خیال اسے اس نے دیا۔ اس کے انگلستان پہنچنے کے ایک سال بعد پارلیمنٹ برخاست ہوئی تھی اور اسے شرکت کا موقع مل رہا تھا لیکن جب اس نے کوشش کی تو مجلس عوام کی جانب سے اس کی مخالفت کی گئی۔ اس کی بہت سی رقم بھی ڈوبی اور مایوسی نے بھی اسے گھیر لیا۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ واپس ہندوستان چلا جائے گا۔ اس نے مجلس نظما سے درخواست کی کہ اسے ہندوستان جانے کی اجازت دی جائے۔ مجلس نظما نے نہ صرف اسے اجازت دی بلکہ حکومت سے اس کی سفارش کر کے شاہی فوج میں لیفٹیننٹ کرنل کا عہدہ بھی دلوایا اور اسے عہدے کے لیے سینٹ ڈیوڈ کا گورنر اور سپہ سالار نامزد کیا گیا۔

وہ اپنے ساتھ تین سو سپاہی اور توپ خانے کے تین دستے لے کر ہندوستان روانہ ہو گیا۔

اسے یہ بھی ہدایت کی گئی تھی کہ وہ اپنے ساتھ فوج لے جا رہا ہے اسے بمبئی لے جائے اور وہاں سے مرہٹوں کو اپنے ساتھ ملا کر فرانسیسیوں کو دکن سے نکالنے میں اپنی پوری قوت صرف کرے۔ وہ جب فورٹ سینٹ ڈیوڈ پہنچ کر بمبئی جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ اسے اطلاع ملی کہ ساحل کارومنڈل پر انگریزوں اور فرانسیسیوں نے آپس میں معاہدہ کر لیا ہے کہ ہندوستانی فرماں رواؤں کی لڑائیوں میں وہ قطعی شریک نہ ہوں۔ ہندوستان کی مہم کا خیال ترک کرنا پڑا۔

٭٭٭

انگریزوں کے بڑھتے ہوئے قدم بنگال تک پہنچ گئے تھے۔ یہ بنگال کا صوبہ ہی وہ دولت خانہ تھا جو انگریزوں کو روپے کے خزانے تھے۔ انگریزوں اور فرانسیسیوں کی لڑائیاں صرف دکن تک محدود تھیں۔ بنگال ان لڑائیوں سے بے خبر تھا۔ علی وردی خان کی موجودگی میں پوری طاقتیں بنگال کو اپنی عملداری کا شکار نہ بنا سکی تھیں۔ لیکن یہ نہیں کہ وہ خود بے خبر نہیں تھا وہ دوسری قوموں کے عزائم سے بخوبی آگاہ تھا چنانچہ جب اس کی موت کا وقت قریب آیا تو اس نے اپنے جانشین سراج الدولہ کو ان الفاظ میں وصیت کی۔

"مغربی قوموں کی اس قوت کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا جو انہیں ہندوستان میں حاصل ہے۔ ایک ہی وقت میں تینوں قوتوں کو تباہ کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ سب سے پہلے انگریزوں کی قوت کو توڑنا۔ خبردار، انہیں سپاہی رکھنے اور قلعہ تعمیر کرنے کی اجازت نہ دینا۔ اگر ایسا ہوا تو بنگال تمہارا نہیں رہے گا۔"

سراج الدولہ کو اس وصیت پر عمل کرنے کی زیادہ جلدی نہیں تھی لیکن انگریزوں نے خود اسے مواقع فراہم کر دیے۔ جب وہ تخت نشین ہوا تو کسی تحائف تک نہ بھیجے۔ انہوں نے دربار سے تمام تعلقات منقطع کر لیے۔ کمپنی کے ملازم تاجرانہ مراعات سے ناجائز فائدہ اٹھاتے جس سے سراج الدولہ کے خزانے پر اثر پڑ رہا تھا۔ انگریزوں نے کلکتہ کے قلعے کو نواب کی اجازت کے بغیر مستحکم کرنا شروع کر دیا اور بہت سی نافرمانیاں تھیں جو وجود میں آتی چلی گئیں۔ ان حرکتوں نے نواب سراج الدولہ کو مجبور کر دیا کہ

وہ انگریزوں کو اپنی مملکت سے نکال باہر کرے۔ وہ قاسم بازار کی فیکٹری پر قابض ہو گیا۔ فیکٹری زیادہ مستحکم نہیں تھی۔ یہاں سپاہیوں کی تعداد بھی بہت کم تھی۔ نواب سے مقابلہ کرنا غیر ممکن تھا۔ ایک کارتوس ضائع کیے بغیر فیکٹری پر اس کا قبضہ ہو گیا۔ اب سراج نے کلکتے کا رخ کیا۔

سراج کی فوجوں کو آتا دیکھ کر کلکتے کے انگریز تاجروں نے وہاں کی مقامی آبادی کے ساتھ وہ سلوک کیا جو کسی بھی مہذب قوم سے توقع نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مقامی آبادی کے گھروں کو نذر آتش کر دیا گیا۔ یہ دلدوز منظر دیکھ کر سراج الدولہ کا عزم اور پختہ ہو گیا۔ انگریزوں کو یہاں سے نکالنا چاہیے۔ اس نے اپنی فوجوں کو حکم دیا اور فورٹ ولیم پر حملہ کر دیا گیا۔ یہ حملہ کامیاب رہا انگریز اس کا مقابلہ نہ کر سکے۔ فورٹ ولیم سراج کے قدموں پر تھا۔

قلعے میں پناہ گزین انگریزوں کی طرف توجہ کرنے کے بجائے سراج الدولہ نے اپنی توجہ چین خیال کیا اور یہ سوچ کر مرشد آباد چلا گیا کہ انگریز... بنجاروں کی طرح زندگی گزارتے ہیں۔ یہ جلد ہی واپس چلے جائیں گے۔ جاتے جاتے وہ راجا مانک چند کو قلعہ کا حاکم اعلیٰ مقرر کر گیا تھا۔

قاسم بازار اور کلکتے کی شکستوں کے بعد مدراس کونسل میں ہیجان پیدا ہونا لازمی تھا۔ انگریزوں نے فیصلہ کر لیا کہ وہ کثیر فوج سے کلکتہ فتح کرنے کے بعد نواب کے خلاف سازش کا بازار گرم کریں گے۔ سوال یہ تھا کہ فوج کی کمان کس کے ہاتھ میں دی جائے بالآخر نظر کلائیو پر پڑی۔ یہ طے ہوا کہ بڑی فوج کی کمان کلائیو کو دی جائے۔ اس کے ساتھ یہ بھی طے ہوا کہ وہ امیر البحر واٹسن کی نیابت میں کام کرے گا جس کے پاس اس وقت بحری بیڑے کی کمان تھی۔ آٹھ سو یورپی اور تیرہ سو دیسی سپاہی کلائیو کی سربراہی میں بنگال کی طرف روانہ ہوئے۔

کلائیو بہادر بھی تھا اور لومڑی کی طرح چالاک بھی۔ اس نے صرف اپنی تلوار پر بھروسا نہیں کیا بلکہ سازش کا جال بھی تیار کیا۔ اس جال کا پہلا شکار کلکتے کا حاکم اعلیٰ راجا مانک چند ہوا۔ اس نے کلائیو سے ساز باز کر لی اور معمولی سے مقابلے کے بعد بھاگ کھڑا ہوا۔

کلائیو کے ہاتھوں کلکتہ فتح ہو گیا۔

وہ جب فاتحانہ شان سے فورٹ ولیم میں داخل ہوا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ قلعے میں تجارتی مال و اسباب اسی طرح رکھا ہوا تھا جس طرح انگریز چھوڑ کر گئے تھے۔

سراج کے حکم سے مفرور باغیوں کے املاک و اسباب کی حفاظت ہو رہی تھی۔ دوسری طرف یہ عالم کہ کلائیو اور اس کے ساتھیوں نے ہگلی پر حملہ کر کے لوگوں کے مال و متاع پر قبضہ کر لیا۔ سراج الدولہ کی نیکیوں کا صلہ کلائیو نے اس صورت میں ادا کیا۔

"11 جنوری 1757ء کا دن قلعہ کے ارد گرد کے مکانات لوٹنے میں صرف ہوا۔ سات دن تک انگریز... فوجیں دیسی آبادی میں لوٹ مار مچاتی رہیں بعض سپاہی اس بہانے سے ولندیزی علاقے میں داخل ہو گئے کہ نواب کی رعایا اس علاقے میں پناہ گزین ہو رہی تھی۔"

کمپنی کی ان حرکات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اگر سراج الدولہ ہر انگریز... تاجر کی جائداد ضبط کر لیتا تو عسکری اخلاقیات کی ہرگز خلاف ورزی نہ ہوتی لیکن اس نے اب بھی صلح اور اخلاق کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ اس نے کوئی قدم اٹھانے سے پہلے امیر البحر واٹسن کو خط ارسال کیا۔

"آپ نے ہگلی پر قبضہ کر کے میری رعایا کے مال و اسباب کو لوٹا۔ یہ حرکات سوداگروں کے لیے ٹھیک نہیں۔ میں مرشد آباد سے روانہ ہو کر ہگلی کے قریب پہنچ چکا ہوں۔ میں اپنی فوج سمیت دریا عبور کر رہا ہوں۔ اس کے باوجود اگر آپ صلح کے لیے بات چیت کے طلب گار ہیں تو ابھی ایک نمائندہ میرے پاس بھیج دیں۔ میں کمپنی کو ساتھ مراعات دینے کے لیے تیار ہوں۔ میرے مقبوضات میں بسنے والے انگریز اگر میرے احکام کی اطاعت کریں اور مجھے تنگ کرنے کی حکمت عملی چھوڑ دیں تو آپ یقین کریں کہ میں ان کے نقصان کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ان کی تسلی کروں گا۔"

اس کے جواب میں واٹسن نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ اپنے دو نمائندے بظاہر صلح کے لیے بھیجے لیکن ان کا مقصد نواب کے خیمے کی فوجی قوت کا اندازہ لگانا تھا۔ ابتدائی گفتگو کے بعد رات کے وقت یہ نمائندے اپنے خیمے میں چلے گئے اور جاتے ہی چراغ گل کر دیے۔

پہرے دار یہ سمجھ رہے تھے کہ نمائندے محوِ خواب ہیں تاریکیٔ شب کا فائدہ اٹھا کر یہ نمائندے باہر نکلے اور کلائیو کے پاس پہنچ گئے۔ انہوں نے نہ صرف نواب کے خیمے کی نشاندہی کی بلکہ اس کی فوجی قوت کا نقشہ بھی کلائیو کے سامنے کھینچ دیا۔ کلائیو تو تیار بیٹھا ہی تھا۔ اسی فوج نے کلائیو کے زیرِ قیادت ٹھیک اسی خیمے پر حملہ کیا جہاں کمپنی کے دو

نمائندوں نے سراج کو دیکھا تھا لیکن اتفاق سے وہ اس خیمے میں موجود نہیں تھا۔ سراج کے سپاہیوں نے مقابلہ کیا مگر سراج خوف زدہ ہو کر بھاگ کھڑا ہوا۔ روشنی نمودار ہوتے ہی کلائیو واپس چلا گیا۔

دربار سراج الدولہ میں غدار پیدا کیے جا چکے تھے۔ میر جعفر ان میں پیش پیش تھا۔ میر جعفر کے دل میں تاج و تخت کی خواہش پیدا کی گئی۔ اس نے وعدہ کیا کہ اگر اسے نواب بنا دیا گیا تو وہ انگریزوں کو جنگی اخراجات کے علاوہ ایک کروڑ پچیس لاکھ روپے دے گا۔ انگریزوں نے اسے اقرار نامہ بھی لکھ کر دے دیا۔

سراج الدولہ کے دربار کے سب سازشیوں نے اسے انگریزوں سے لڑنے کا مشورہ دیا۔ سراج الدولہ کو اپنے اور فوجی سرداروں کی سازش کا علم ہو چکا تھا لیکن اسے ان پر اعتماد نہیں تھا۔ اس نے فرانسیسی جنرل کو مدد کے لیے پکارا لیکن اس نے جواب تک دینا گوارا نہیں کیا۔ مرہٹوں کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ وہ بھی انگریزوں سے ساز باز کر چکے تھے۔ دلی کو صورت حال سے آگاہ کیا لیکن وہاں کیا دھرا تھا اور وہ نے بھی اس کی درخواست ٹھکرا دی۔

اس نے مایوس ہو کر اپنے سرداروں کو غیرت دلائی۔ سب وفاداری دکھانے لگے۔ میر جعفر سمیت تمام سازشی سرداروں نے وفاداری کی قسم کھائی۔ یہ نوجوان نواب اپنی فوج لے کر پلاسی کے میدان میں پہنچ گیا۔ ادھر کلائیو بھی اپنی فوج کے ہمراہ پلاسی پہنچا۔

23 جون 1757ء کی صبح کو سراج الدولہ اپنی فوج کو خندقوں سے نکال کر کلائیو کے پڑاؤ کی طرف بڑھا۔ کلائیو اپنی فوج کے ساتھ جس باغ میں چھپا ہوا تھا سراج الدولہ نے اس باغ کے قریب توپیں نصب کر دیں اور گولہ باری شروع کر دی۔ انگریزی فوجیں چونکہ درختوں کی آڑ میں تھیں اس لیے ان کا بہت کم نقصان ہو رہا تھا۔ اس کے باوجود وہ سراسیمہ تھے۔ کلائیو۔۔۔ اپنے سپاہیوں کو سمجھا رہا تھا کہ بس دن کا وقت یہاں گزار لو رات ہوتے ہی نواب کے پڑاؤ پر چھاپا مارا جائے گا۔

دن کا کچھ حصہ گزرا تھا کہ موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ بس یہیں سے سازشیوں کو موقع مل گیا۔ بارود کو کھلا چھوڑ دیا گیا۔ آدھا گھنٹہ بارش ہوتی رہی۔ جب بارش تھمی اور توپیں چلائی گئیں تو وہ خاموش رہیں خیال یہ تھا کہ بارش نے انگریزوں کی بارود کو بھی ناکارہ کر دیا ہوگا لیکن ان کا تخت سے

متوجہ ہو گیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ انہوں نے اپنی بارود کی حفاظت کر لی تھی۔ نواب کی فوج کو بڑی نقصان اٹھا کر پیچھے ہٹنا پڑا۔ جب سراج الدولہ نے میر جعفر کو بلایا اور اس سے مدد کے لیے کہا۔ میر جعفر نے دو بار وعدہ کیا لیکن اس نے مدد کرنے کی بجائے کلائیو کو تمام حالات سے آگاہ کر دیا اور سراج الدولہ کو آگے بڑھنے کو کہا۔

ایک اور غدار راجا درلب کا خیال یہ تھا کہ انگریز آگے بڑھ رہے تھے اور راجا کے سپاہی پیچھے ہٹ رہے تھے۔ سراج الدولہ بہت زیادہ پریشان تھا۔ اسی وقت راجا درلب گھوڑا دوڑاتا ہوا نواب کے پاس آیا۔ "آپ شکست ہو گئی ہے یہاں سے مرشد آباد چلے جائیے۔"

سراج الدولہ نے مصیبت کے وقت اپنی جان بچانے اور اپنے خاندان کا وجود برقرار رکھنے کی غرض سے یہ بات مان لی اور اپنی فوجوں کو خندقوں میں واپس ہونے کا حکم دے کر ایک تیز رفتار اونٹ پر سوار ہوا اور دو ہزار سواروں کی ہمراہی میں اپنے دارالحکومت روانہ ہو گیا۔

جس وقت نواب کی شکست خوردہ فوج مراجعت کر رہی تھی کلائیو کے پاس میر جعفر کے قاصد پہنچے میر جعفر اس سے ملاقات کا خواہاں تھا۔ کلائیو نے کہلوا دیا کہ کل صبح دادپور میں ملاقات ہوگی۔ یہ مقام مرشد آباد سے جنوب کی طرف تین میل کے فاصلے پر واقع تھا۔

24 جون 1758ء کو کلائیو اور میر جعفر میں ملاقات ہوئی۔ یہ ملاقات اس معاہدے کی تفصیلات طے کرنے کے لیے تھی جو پلاسی کی لڑائی سے پہلے کلائیو اور میر جعفر کے درمیان طے پایا تھا۔ میر جعفر اس رقم کے لیے پریشان تھا جو اس نے نواب بننے کی صورت میں کلائیو کو ادا کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ کلائیو نے اسے مشورہ دیا کہ وہ مرشد آباد کے خزانے پر قبضہ کر لے۔

وہ اسی شام مرشد آباد پہنچ گیا۔

سراج الدولہ نے مرشد آباد میں رہنا مناسب نہیں سمجھا اور بھاگ نکلا۔ وہ ایک ویران باغ میں رات گزارنا چاہتا تھا کہ چند لوگوں نے اسے پہچان لیا اور میر جعفر کے حوالے کر دیا۔ میر جعفر نے اسے قید کر دیا اور میر جعفر کے بیٹے میرن نے اسے قتل کر دیا۔

☆☆☆

جنگ پلاسی میں فتح کے بعد بنگال میں انگریزوں کے قدم جم گئے۔ میر جعفر کو صوبے دار بنا دیا گیا۔ ایسے انتظامات

بھی کر دیے گئے کہ وہ لکڑی کے جال میں پھنسا پھڑ پھڑاتا رہے۔ کلائیو کو اب بنگال کی طرف سے قدرے اطمینان تھا کہ اس نے اپنی قوم کو شہنشاہیت کے خواب دیکھنا سکھا دیا تھا۔ ایک ایسی بنیاد ڈال دی تھی جس پر مضبوط عمارت تعمیر کی جا سکتی تھی۔ اسے یقین تھا کہ وہ انگلستان پہنچے گا تو اس کا شاندار استقبال کیا جائے گا لیکن وہ انگلستان پہنچا تو اس کا استقبال اس کی توقعات سے گرا ہوا تھا۔ ان حالات میں اس نے بجا طور پر سوچا کہ اپنی ترقی کے لیے ہندوستان کی طرح یہاں بھی اسے سخت محنت کرنی پڑے گی۔

ان دنوں اس کی صحت ٹھیک نہیں تھی بچپن ہی سے اسے بیماری کے دورے پڑتے تھے۔ اس خراب صحت کے باوجود وہ اپنی قوم کے لیے بڑے بڑے کارنامے انجام دیتا چلا آرہا ہے۔ وہ ان تکلیفوں کو برداشت کرتا رہا اور ترقی کی جو تدبیریں اس نے سوچی تھیں ان پر عمل کرنے کے لیے راہیں ڈھونڈتا رہا۔

لارنس سلوین نے ہندوستان میں کمپنی کی ملازمت کی تھی۔ وہ کوئی خاص امتیاز حاصل نہ کر سکا تھا لیکن دولت خوب جمع کر لی تھی اور کمپنی کا ناظم بن گیا۔ وہ کلائیو کا حامی اور مداح تھا۔ انگلستان آنے کے بعد وہ اس کی تعریفیں کرتا رہا تھا اور اس کی سفارشوں پر وہ مجلس نظامت کا امیدوار ہوا اور کامیاب بھی ہو گیا لیکن جب اس نے سنا کہ کلائیو انگلستان آرہا ہے تو اس خوف سے کہ کلائیو کے آنے کے بعد اس کا چراغ نہیں جلے گا وہ اس کا سخت مخالف ہو گیا اور اس کے خلاف پروپیگنڈا شروع کر دیا پہلا اعتراض تو یہ کیا کہ میر جعفر نے جو جاگیر اس کو عطا کی ہے اس پر اس کو کیا حق حاصل ہے۔

کلائیو اپنی بے عزتی کو خاموشی سے برداشت کر رہا تھا لیکن وہ زیادہ دیر خاموش نہ رہ سکا۔ لارنس سلوین نے بہت سے ہم خیال پیدا کر لیے تھے جو کلائیو کی مخالفت میں ہم آواز ہو گئے تھے۔ کلائیو کو ان سب سے نبرد آزما ہونا تھا۔ یہ موقع اسے جلد ہی مل گیا۔ سلوین مالکان کمپنی کی مجلس کی رکنیت کے لیے دوبارہ امیدوار ہوا۔ اب اس نے کلائیو سے مخالفت مول لے لی تھی اور کلائیو پیچھا چھٹنے والا نہیں تھا۔ اس نے سلوین کو شکست دینے کے لیے سرمایہ ہند کے کافی حصص خرید کر اپنے احباب میں تقسیم کر دیے۔ رائے گنتے وقت جب ہاتھ اٹھائے گئے تو کثرت سلوین کے خلاف تھی لیکن

جب خلیف وونگ ہوئی تو پانسہ پلٹ گیا اور سلوین اور اس کے ساتھی پہ تعداد کثیر منتخب ہو گئے۔ یہ کلائیو کی مکمل شکست تھی۔ اس کے نتیجے میں اس کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ سلوین اس سے انتقام لینے کے لیے میدان میں اتر آیا۔ اس نے ہندوستان میں کلائیو کی جاگیر کا مسئلہ پھر اٹھایا اور مقدمہ مجلس کے اراکین کے سامنے رکھ دیا گیا۔ مجلس میں سلوین کے حمایتیوں کی اکثریت تھی لہٰذا فیصلہ یقینی طور پر کلائیو کے خلاف جاتا تھا۔

کلائیو کی قسمت ہر جگہ ساتھ دے رہی تھی مقدمے کی سماعت سے صرف ایک روز قبل ہندوستان سے ایک ایسی خبر آگئی کہ مجلس کے خیالات میں تغیر پیدا ہو گیا۔ کلکتہ سے اطلاع ملی کہ کلائیو نے جن سول عہدے داروں کو وہاں چھوڑا تھا ان کی بدعنوانیوں اور بدانتظامی نے طوفان برپا کر دیا ہے۔ بنا بنایا کھیل بگاڑ دیا ہے۔ ان تمام کامیابیوں پر پانی پھر گیا ہے جن کی کلائیو تکمیل کر کے آیا تھا۔ وہاں کوئی ایسا شخص نہیں جو ان حالات کو سنبھال سکے۔ کمپنی کے مقبوضات بنگال سخت خطرے میں ہیں۔ ان حالات میں قدرتی طور پر زبان پر کلائیو کا نام تھا۔ مالکان کمپنی کو بھی جب اپنا سرمایہ ڈوبتا نظر آیا تو انہوں نے بھی کلائیو کو دوبارہ ہندوستان بھیجنے کی تدبیریں شروع کر دیں۔

مالکان کمپنی کا اجلاس منعقد ہوا جس میں طے کیا گیا کہ اسے پورے اختیار... کے ساتھ گورنر جنرل بنا کر ہندوستان بھیجا جائے۔ ایک کانٹا اب بھی تھا جاگیر کا مقدمہ شروع ہونے والا تھا جو اس کے عہدہ قبول کرنے میں مانع ہو سکتا تھا لہٰذا اسی اجلاس میں یہ طے کر دیا گیا کہ جاگیر کے مقدمے کی کارروائی بند کر دی جائے اور کلائیو کے حق کو سرکاری طور پر تسلیم کر لیا جائے۔

4 جون 1764ء کو وہ عازم کلکتہ ہوا۔ کلائیو کی بیوی اس کے ہمراہ نہیں گئی کیونکہ بچوں کی تعلیم کی وجہ سے اس کا انگلستان میں قیام ضروری تھا۔

وہ جہاز میں تھا کہ اسے معلوم ہوا کہ میر قاسم اور میر جعفر کے درمیان جنگ ہو رہی ہے۔ جب وہ مدراس پہنچا تو یہ بات اس کے علم میں آئی کہ میر قاسم کو کامل شکست ہو گئی اس کے ساتھیوں نے ہتھیار ڈال دیے۔ میر جعفر کا انتقال ہو گیا اور نواب وزیر اودھ نے بھی خود کو انگریزوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔

کلکتہ پہنچ کر پہلے اس نے فوج کو از سر نو مرتب کیا۔ اسی طرح سرکاری ملازموں کا انتظام کیا۔ یہ اس کے لیے سب سے کٹھن مرحلہ تھا۔ رشوت ستانی کا بازار گرم تھا۔ بدعنوانیوں کے جتنے نقائص ہو سکتے ہیں سب پیدا ہو گئے تھے۔ وہ جس طرف ہاتھ ڈالتا تھا ایسے آدمیوں سے سابقہ پڑتا تھا جو رشوت لیتے لیتے ڈھیٹ ہو گئے تھے۔ اس نے جب ان پر الزام لگایا کہ انہوں نے ممانعت کے باوجود نذرانے وصول کیے تو خود اس کی مثال پیش کر دی گئی۔ کلائیو نے بھی جنگ پلاسی کے وقت میر جعفر سے معاہدہ کیا تھا۔ اس کی جاگیر کا معاملہ یہاں تک اس کا پیچھا کر رہا تھا۔ یہ طعنہ بھی دیا گیا کہ پٹنہ میں اس نے جاگیر کیوں قبول کی۔ کلائیو کے پاس اس کا جواب یہ تھا کہ اس وقت حالات سخت نازک تھے۔ انگریزوں کے لیے فتح و شکست کا مسئلہ تھا لیکن اب ایسا کوئی خطرہ نہیں۔ سرکاری عمال کے پاس ہر بات کا جواب تھا۔ وہ کوئی بات سننے کو تیار نہیں تھے تنگ آ کر کلائیو نے احکام جاری کر دیے۔

"نذرانے وصول کرنے کی اجازت پہلے تھی اب نہیں ہے۔ اب اگر کوئی ایسا کرے گا تو قابلِ سزا جرم کہلائے گا۔"

ایک اقرار نامہ تیار کیا گیا جس پر ان کے دستخط لیے گئے۔ انہوں نے دستخط کر تو دیے لیکن کلائیو کے اس برتاؤ نے انہیں سخت برہم کر دیا۔ وہ نذرانے لینے سے باز آگئے لیکن اپنے طرزِ عمل اور سرکاری کاموں میں تاخیری حربوں کے ذریعے کلائیو کی راہ میں مشکلات پیدا کرنے لگے۔ یہ تکرار اتنی بڑھی کہ کلائیو نے تمام اعلیٰ عہدے داروں کو ان کے عہدوں سے ہٹا دیا۔ یہ عہدے دار جب انگلستان پہنچے تو اس کے خلاف ان کے دلوں میں زہر بھرا ہوا تھا۔ یہ سب اس کے مخالفوں سے مل گئے اور اسے بدنام کرنے کی سازشوں میں مشغول ہو گئے اور ایک ایسی فضا بنا دی جو کسی وقت بھی اس کے خلاف کام آسکتی تھی۔

اس طرف سے مطمئن ہونے کے بعد وہ کمپنی کے ملازمین کی طرف متوجہ ہوا۔ اس نے سب سے پہلے کمپنی کے ملازموں کو نجی تجارت کرنے سے روک دیا۔

یہ ملازمین نجی تجارت اس لیے کرتے تھے کہ ان کی تنخواہیں بہت کم تھیں۔ اس نے مجلس نظامت کو یہ تجویز پیش کی کہ ان کی تنخواہیں اتنی ہونی چاہئیں کہ ان کو بددیانتی پیدا کرنے کی فکر ہی نہ ہو۔ کلائیو نے بہت کوشش کی مجلس اس تجویز کو منظور کر لے لیکن وہ اپنی کوشش میں کامیاب نہ ہوا۔

مجبور ہو کر اس نے ذاتی تجارت کی اجازت دے دی لیکن اس پر اس نے قدرے سخت قیدیں لگا دیں۔ عام اجازت سے جو خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں وہ بہت کم ہو گئیں اور ایک حد تک وہ حکومت کی نگرانی میں آ گئی۔

کلائیو کا دوسرا اقدام کمپنی کے اخراجات کو کم کرنا تھا۔ جنگ پلاسی کے بعد میر جعفر نے کمپنی کے فوجی افسروں کو جو الاؤنس دینا منظور کیا تھا وہ ڈبل بھتا کہلاتا تھا لیکن جب شاہ عالم بادشاہ نے بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی کمپنی کے حوالے کر دی تو ڈبل بھتا بھی کمپنی کو ادا کرتی تھی۔ اس لیے کلائیو نے اسے بند کر دیا۔ اس کے اس اقدام کے خلاف کمپنی کے فوجی افسروں نے بہت احتجاج کیا لیکن کلائیو نے اس شورش کو دبا دیا۔

اس تکمیل کے بعد کلائیو نے کلکتہ کی مجلس کی اصلاح کی طرف توجہ کی۔ مروجہ قواعد کے مطابق مجلس ایک صدر اور سولہ ارکان پر مشتمل تھی لیکن اس کے رکن کے لیے کمپنی کے کسی دوسرے علاقے میں کسی قسم کی ایجنسی کے لیے کوئی پابندی نہیں تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ وہ اپنے تعلقات استعمال کرتے تھے اور حد درجہ کی بدعنوانیاں ہوتی تھیں۔ قوانین کی پابندی ہونا مشکل تھی۔ اس خرابی کو کلائیو نے دور کرنے کے لیے ایک حکم جاری کیا جس کی رو سے رکن مجلس کوئی اور کام اپنے ذمے نہیں لے سکتا تھا۔ انتظامی مجلس میں کلائیو کو سخت مخالفت کا سامنا کرنا پڑا لیکن باوجود اس کے وہ اپنی تجویز میں کامیاب ہوا۔

بکسر کی لڑائی میں نواب وزیر اور شاہ عالم انگریزوں سے شکست کھا چکے تھے لیکن کلائیو کو اندیشہ تھا کہ نواب وزیر اور مرہٹے شاہ عالم کو ساتھ ملا کر بنگال پر حملہ کر دیں گے۔ وہ پیش بندی کے لیے ان سے کچھ معاہدے کر لینا چاہتا تھا تاکہ یہ امکانی اتحاد نہ ہونے پائے۔ اس نے اس مقصد کے حصول کے لیے نواب وزیر اور شاہ عالم سے ملاقات کی۔

نواب وزیر سے معاہدہ کیا گیا کہ اس کے مطابق نواب وزیر کو پچاس لاکھ تاوان جنگ دینا پڑا۔ اس کے بدلے میں کورہ اور الہ آباد کے اضلاع کے علاوہ اس کی ساری مملکت اسے واپس کر دی گئی۔ یہ معاہدہ بھی طے ہوا کہ اگر نواب وزیر کی مملکت پر کسی نے حملہ کیا تو انگریزی فوج اس کی مدد کرے گی۔ نواب وزیر اس کا معاوضہ ادا کرے گا۔

معاہدے کا رنگ ڈھنگ یہاں تک تو ٹھیک تھا لیکن

جب کلائیو نے اودھ میں انگریزی فیکٹریاں قائم کرنے کی اجازت چاہی تو نواب بھڑک اٹھا۔ اس نے صاف لفظوں میں کہہ دیا۔

”میں دیکھ رہا ہوں کہ جہاں کہیں انگریزوں نے اپنے قدم جمائے خواہ وہ تجارتی اغراض کے لیے ہی کیوں نہ ہوں وہ وہاں سے پھر کبھی نہیں ٹلے۔ وہ آخر کار اس علاقے پر قبضہ کر لیتے ہیں۔“

اس طرف سے مایوس ہونے کے بعد ایک اور بے بس کو ڈھونڈا۔ یہ تھا شاہ عالم وہ ہر چند کہ ہندوستان کا شہنشاہ تھا لیکن اس کی حیثیت بے ملک نواب کی طرح تھی۔ وہ ان دنوں الہ آباد میں مقیم تھا۔ کلائیو نے نہایت چالاکی سے اس برائے نام شہنشاہ کی شہنشاہیت کو تسلیم کر لیا۔ اس نے کورہ اور الہ آباد کے اضلاع اس کے حوالے کر دیے تاکہ وہ یہاں کی آمدنی سے اپنی شہنشاہیت کا رعب قائم رکھ سکے۔

ایک ملاقات میں کلائیو نے اپنی عیاری، ہمدردی کے لباس میں اس کے سامنے رکھ دی۔

”میں تو یہ چاہتا ہوں کہ آپ شہنشاہوں کے شایان شان زندگی گزاریں۔“

”ٹھاٹ باٹ کے لیے دولت کی ضرورت ہوتی ہے دولت اقتدار سے حاصل ہوتی ہے۔“

”میں تو خود بے تخت ہوا بیٹھا ہوں۔ میری بادشاہت پر مرہٹوں کا قبضہ ہے۔ میں تو جیسے تیسے دن گزار رہا ہوں الہ آباد کی آمدنی سے میرا گزارہ کہاں ہوتا ہے۔“

”میں اگر آپ کی آمدنی میں اضافے کی صورت بتاؤں؟“

”مجھے آپ کی نیک نیتی سے یہی اُمید ہے۔“

”آپ ایسا کریں کہ بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی کمپنی کے حوالے کر دیں۔ میں اس کے عوض چھبیس لاکھ روپے سالانہ آپ کے لیے کمپنی سے منظور کروا دوں گا۔“

شاہ عالم اس پیشکش کے بعد بہت کچھ سمجھ گیا ہوگا لیکن وہ لالچ میں آ گیا اور بنگال، بہار، اڑیسہ کی دیوانی کمپنی کے نام کر دی۔

اس اقدام سے کمپنی کی آئینی حیثیت مضبوط ہو گئی۔ دیوانی کے حصول نے کمپنی کو موقع دے دیا کہ وہ اپنے مقبوضات پھیلانے میں مصروف ہو جائے۔

پاؤں ایک مرتبہ پھیلتے تو پھر پھیلتے ہی چلے گئے۔ اب کلائیو نے ایک معاہدہ کر کے بنگال کی حفاظت کا کام کمپنی

کے سپرد کروا دیا۔ نواب کو شہری نظم و نسق چلانے کے لیے کلائیو نے ترپن لاکھ سالانہ منظور کیا۔

اب نواب وزیر اور شاہ عالم دونوں انگریزوں کے ہاتھوں میں کھیلنے پر مجبور تھے۔ شہری نظم و نسق کا کام نواب کے سپرد تھا اور مال گزاری کا وصول کرنا کمپنی کی ذمے داری تھی۔ اس نے بنگال کے عوام کو مفلسی کی دلدل میں دھکیل دیا۔ ان میں اتنا دم ہی نہ رہا کہ وہ کوئی احتجاج کرتے۔ کلائیو اور اس کے آقا یہی چاہتے تھے۔

کلائیو نے اب انگریزوں کے مقبوضات کے لیے ایک ایسی سرحد قائم کرنے کا تہیہ کر لیا تھا جس سے آئندہ بیرونی حملوں کا بآسانی تدارک ہو سکے۔

انگریزوں کے تحت جو تین ولایتیں (بنگال بہار اڑیسہ) تھیں وہ ہندوستان کے زرخیز ترین علاقے میں واقع تھیں وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ اگر ان ہمسایوں کے گرد و نواح کے اہم مقامات پر قبضہ کر لیا جائے اور ان سے معاہدے کر کے انہیں بے ضرر بنا دیا جائے تو یہ نہایت ہی مناسب مسلک ہوگا۔ اس نے یہی کیا شاہ عالم کو دوبارہ تخت نشین کرنے کا جھانسا دے کر اس سے معاہدہ کر لیا کہ انگریزوں کی ایک فوج الہ آباد میں رہے۔ دوسری چنار پر قابض رہے اور فوج کا ایک دستہ بنارس اور ایک لکھنؤ میں رکھ دیا جائے۔

کلائیو کو جتنا کام کرنا تھا وہ تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ یہ کام اتنے تھے اور اس قدر تھے کہ جنہیں نمٹاتے نمٹاتے اس کی صحت خراب ہو گئی لہٰذا اس نے خیال کیا کہ جو ملک وہ انگلستان کے لیے فتح کر چکا ہے اس ملک کو اب عزت کے ساتھ خیرباد کہہ دینا چاہیے۔

یہ کام اتنا اہم تھا کہ اگر کلائیو نہ ہوتا تو ہندوستان میں انگریزوں کے قدم اتنی سرعت سے آگے نہیں بڑھ سکتے تھے۔

اس نے ایک یادداشت مرتب کی۔ گزشتہ تین سال میں جو کام اس نے انجام دیے ان سے اصول اخذ کیے اور اپنے جانشین کی رہنمائی کے لیے اس میں درج کر دیے۔ دوست احباب کو خیرباد کہا اور 19 جنوری 1767ء کو جہاز میں سوار ہو کر عازم انگلستان ہو گیا۔

کلائیو اب ہندوستان میں دو دور گزار چکا تھا۔ اس کا پہلا دور اگر فتوحات کے اعتبار سے اہم تھا تو دوسرے دور کی اصلاحات قابل فراموش تھیں۔

اس نے سوداگروں کی ایک جماعت کو ہندوستان کی سیاست میں اہم بنا دیا۔ انگریزی راج کی بنیاد مضبوط کر دی۔ اس کی شخصیت کا ایک پہلو فریب، مکاری اور لالچ تھا۔ اس نے اپنی خدمات کے عوض ہندوستانی فرماں رواؤں سے لاکھوں روپے بٹورے اور ایسی بری مثال قائم کر دی جس پر عمل کر کے کمپنی کے ملازموں نے بنگال میں اسی قسم کی سیاسی تبدیلیاں پیدا کر کے لوٹ مار سے دولت حاصل کی۔

وہ جب انگلستان پہنچا تو ناموری اور بدنامی دونوں کو اپنے ساتھ لے کر گیا۔

انگلستان پہنچنے پر اس کا نہایت مناسب طریقے سے استقبال ہوا۔ بادشاہ اور ملکہ نے اسے شرف ملاقات بخشا۔ اس اہمیت کی وجہ سے دوسروں کو اس کی اہمیت کا ادراک ہونا لازمی تھا لہٰذا مجلس نظامت نے اپنے پورے اجلاس میں اس کا استقبال کیا اور جو نمایاں خدمات اس نے انجام دی تھیں ان کا شکریہ ادا کیا گیا۔ مجلس کا ایک عام جلسہ بھی منعقد ہوا جس میں تحریک پیش کی گئی کہ میر جعفر نے جو جاگیر کلائیو کو عطا کی تھی اس کی مدت میں دس سال کی توسیع دی جائے۔ یہ قرارداد باتفاق آرا منظور ہو گئی۔

اس پذیرائی کے موسم میں ایسے عمر رسیدہ بھی تھے جو اپنی برہمی کا ذمے دار کلائیو کو سمجھتے تھے اور دشمنی پر اترے ہوئے تھے۔ مخالفت میں اس قدر اندھے ہو گئے تھے کہ ان سے کسی قسم کی نازیبا حرکت کا سرزد ہونا بعید نہ تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جنہیں اس نے ان کے عہدوں سے علیحدہ کر دیا تھا۔ انہوں نے حکومت کے مشہور مدبروں کو جو اس وقت اعلیٰ عہدوں پر مامور تھے اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔ انہوں نے اس بیمار آدمی کا خیال بھی نہیں کیا اور اس کے خلاف پروپیگنڈے میں مصروف رہے۔

وہ اب بھی اپنے ملک کی خدمت کے لیے تیار تھا۔ اس نے اپنے اور اپنے چھ رشتے داروں کے لیے پارلیمنٹ میں جانے کا انتظام کر لیا۔ انتخاب ابھی دور تھے لہٰذا وہ اپنی صحت کی بحالی کے لیے بیوی بچوں اور چند دوستوں کے ہمراہ پیرس روانہ ہو گیا۔ اس نے یہاں پہنچ کر ڈاکٹروں سے اپنا معائنہ کروایا۔ ڈاکٹروں نے اسے بتایا کہ ہندوستان کے قیام نے جو اثر اس کی صحت پر مرتب کیا تھا اس کا اثر اب تک ہے۔ اس کا دماغ ابھی تک سوچنے اور فیصلہ کرنے کی قوت سے مالا مال ہے لیکن اس کی جسمانی صحت اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ ڈاکٹروں نے مشورہ دیا کہ اسے چند مہینے

تک فرانس میں رہ کر کامل آرام کرنا چاہیے لیکن پارلیمنٹ کے انتخاب سے قبل اس کا انگلستان پہنچنا لازمی تھا۔ ڈاکٹر اسے بہ مشکل آٹھ ماہ کے قیام کے لیے راضی کر سکے۔

آٹھ ماہ کے قیام کے بعد جب وہ پیرس سے انگلستان پہنچا تو اسے معلوم ہوا کہ وہ خود اور اس کے چھ رشتے دار پارلیمنٹ کے رکن بنائے جا چکے ہیں۔

اس کی واپسی کے بعد ہی اس کے دشمنوں نے اس کے خلاف جدوجہد شروع کر دی۔ اس کے مظالم بدعنوانیوں کے قصے بڑھا چڑھا کر بیان کرنا شروع کر دیا گیا۔ اس کے خلاف ایسا مواد بھی چھاپا گیا جس سے عوام میں اشتعال پیدا ہوا۔

وہ دشمنوں کے نشانے پر تھا اور اس کی حالت روز بہ روز غیر محفوظ ہوتی جا رہی تھی۔ مخالفت کی اس آگ کو ہندوستان کی اس وقت کی غیر تسلی بخش حالت نے مزید ہوا دی۔ ہندوستان کی موجودہ حالت کو اس کی غلط پالیسیوں کا نتیجہ بتایا جا رہا تھا۔

حیدر علی جو محض اپنی ذاتی قابلیت کے زور سے سلطنت میسور کے اعلیٰ ترین عہدے پر پہنچ گیا تھا۔ وہاں کے انگریزوں کو اپنے حملوں سے سخت نقصان پہنچا رہا تھا اور اس نے انہیں ایسے کثیر اخراجات میں الجھا دیا تھا کہ سرمایہ داروں کو آئندہ کچھ زمانے تک کسی قسم کے منافع کی توقع نہیں ہو سکتی تھی۔

کمپنی کو مالی مشکلات سے نجات دلانے کے لیے کمپنی کی مجلس نظامت نے ہندوستانی امور کی دیکھ بھال کے لیے تین نگرانوں کو ہندوستان بھیجا۔ ان تینوں نے کلائیو سے بھی ہدایات لیں اور جہاز پر سوار ہو گئے۔ یہ جہاز ان نمائندوں کو ہندوستان تک نہ لے جا سکا اور راستے میں ڈوب گیا۔ اس کے ساتھ وہ ہدایات بھی ڈوب گئیں جو کلائیو نے انہیں اپنے تجربات کی روشنی میں دی تھیں حکومت برطانیہ کی امیدیں بھی ڈوب گئیں۔

اس کے بعد کافی مدت گزر گئی اور کسی نے اس ضرورت کو محسوس نہیں کیا کہ ڈوبنے والے نگران کاروں کی جگہ کسی اور کو بھی بھیجنا ہے یا نہیں۔ وقت بڑا ظالم ہوتا ہے گزرتا چلا گیا۔

وقت سبق سکھاتا ہے اور فوری تدابیر کا اختیار کرنا لازمی ہوتا ہے۔ بنگال میں قحط پڑ گیا۔ سب سے زیادہ وہ علاقے متاثر ہوئے جو انگریزوں کے پاس تھے۔ ایسے قحط پہلے بھی پڑتے رہے تھے لیکن اس وقت مصیبت یہ بھی ہوئی کہ اس کا تدارک کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ بارش نہ ہوتے سے تالاب خشک ہو گئے چاول کے کھیت سوکھ گئے۔

اس قسم کے قحط سے انگریزوں کا پہلا سابقہ تھا۔ حیدر علی سے جنگ اور بنگال کے قحط کی وجہ سے پارلیمنٹ کی تقریروں میں ہندوستان اور اس کے معاملات کا خوب چرچا ہو رہا تھا اور ان تقریروں میں کلائیو کا نام بار بار آ رہا تھا اور اس پر تیز و تند حملے کیے جا رہے تھے۔ دوسرے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی کہ ان سب آفتوں کا ذمے دار وہی ہے۔

ان تقریروں کے پیچھے مخالفین کا ذاتی حسد کام کر رہا تھا۔ اس نے ہندوستان میں رہ کر اتنی دولت پیدا کر لی تھی اور اس فیاضی سے دولت خرچ کر رہا تھا کہ اس سے خوش ہونے والے کم اور جلنے والے زیادہ پیدا ہو گئے تھے۔ کچھ سرکاری بدعنوانیاں اس کی ذات سے ضرور منسوب تھیں۔ انہی کا سہارا لے کر دل کے پھپھولے پھوڑے جا رہے تھے۔ کہیں کہیں دبے دبے لفظوں میں اس کی خدمات کا ذکر بھی آ جاتا تھا۔

اس پر حملے کرنے والوں میں جنرل برگوئن پیش پیش تھا۔ اس نے ایوان میں تحریک ملامت پیش کرتے ہوئے کہا تھا۔

”فوجی اثر یا معاہدے کی رو سے جو کچھ بھی حاصل ہو وہ اصولی طور پر حکومت کی ملکیت ہے۔ سول یا فوجی عہدے داروں کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اس میں سے کسی چیز کو اپنے ذاتی تصرف میں لائیں کیونکہ ایسا کرنا خلاف قانون ہے۔ بہت سے لوگ ایسے ہیں جنہوں نے بنگال کے نوابوں اور دوسروں سے اپنے سول یا فوجی عہدوں کی بنا پر بہت کچھ وصول کیا اور اسے ذاتی تصرف میں لائے۔“

اس تحریک ملامت میں کسی کا نام نہیں لیا گیا تھا لیکن صاف ظاہر ہوتا تھا کہ اشارہ کلائیو کی طرف ہے۔

جب یہ تحریک منظور ہو گئی تو اس نے ایک اور تحریک پیش کرتے ہوئے کہا۔ ”اس ایوان کی رائے میں رائٹ آنریبل رابرٹ کلائیو بیرن آف پلاسی نے سراج الدولہ کی برطرفی اور میر جعفر کی سند نشینی کے موقع پر اپنے اختیارات کے اثر سے جو اسے انتظامی کونسل کے رکن اور انگریزی فوج کے کمانڈر ہونے کی حیثیت سے حاصل تھی وہ خود اپنے حاصل کیے اور کمانڈر ہوتے ہوئے اس رقم کو

تصرف میں لایا اور دو لاکھ اسی ہزار کی رقم انتظامی کونسل کے رکن ہونے کی حیثیت سے حاصل کی اور تقریباً سولہ لاکھ یا اس سے کچھ زیادہ ذاتی عطیہ کے نام پر حاصل کیا۔ یہ رقم دو لاکھ چونتیس ہزار پاؤنڈ کے برابر ہے۔ اس فعل سے کلائیو نے اس عہدے کی جس پر وہ مقرر تھا غیر مناسب استعمال کیا اور اس طرح دوسرے ملازموں کے لیے ایک بری مثال قائم کی اور حکومت کے نام اور اقتدار کو بٹا لگایا اور اس کے مفاد کو نقصان پہنچایا۔''

جنرل برگاؤنی کی تقریر کے بعد کلائیو نے اپنی تقریر میں کہا۔

''میں قوم کا ایک ناچیز خادم اور پلاسی کا بیرن ہوں لیکن ذیلی مجلس نے مجھے دارالعوام کا رکن نہ سمجھا بلکہ ایک بھیڑ چرانے والا سمجھ کر مجھ سے جرح کی۔ جناب والا! مجھے یقین ہے کہ اگر میرے کوئی زخم ہوتا تو وہ چھپا نہ رہتا۔ میرے خوب نشتر لگائے گئے ہیں کسی نے میرے خشخاش مرہم نہیں لگایا۔ جناب والا! میرے دل میں تو پھپھولے پڑے ہوئے ہیں جو ہسپانیہ کی تیز ڈنک والی مکھیوں اور دیگر اشتعال انگیز چیزوں سے ڈالے گئے ہیں۔''

اس نے اپنی تقریر ان الفاظ پر ختم کی۔

''کیا میں اسی کا مستحق ہوں کہ مجھے ملزم گردانا جائے اور میرے بہترین کام کو حکومت کے خلاف جرم قرار دیا جائے۔'' اس کی تقریر کا بس اتنا اثر ہوا کہ ایک طویل بحث کے بعد ایوان میں یہ قرارداد منظور ہوئی کہ ''رابرٹ کلائیو نے اس کے ساتھ ہی اپنے ملک کی اعلیٰ خدمات انجام دی ہیں۔''

ان متواتر حملوں کے باوجود اس نے صبر کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ وہ مغلوب ہو چکا تھا لیکن اپنی جگہ ڈٹا کھڑا تھا۔ اس کڑی دھوپ میں اس کا دوست ویڈر برن گھنے درخت کے سائے کی طرح اس کے ساتھ رہا۔ وہ ایک سرکاری وکیل تھا۔ اس نے کلائیو کو نہایت معقول مدد دی۔ خود کلائیو نے بھی بنگال میں اپنے دور کے ہر پہلو کو اس انداز سے واضح کیا کہ ہر ایک نے اسے پسند کیا۔

جنرل برگاؤنی نے اپنی تحریک منظور ہو جانے کے بعد یہ اعلان بھی کیا تھا کہ وہ چند اور تحریکیں پیش کرے گا کیونکہ اس کا خاص مقصد تو یہ ہے کہ جن اشخاص نے اس مذموم طریقے سے کثیر دولت حاصل کی ہے وہ ان سے واپس لی جائے۔

ویڈر برن، کلائیو کی طرف سے وکیل تھا۔ تھرلو، برگاؤنی کی طرف سے وکیل تھا۔ وزیراعظم لارڈ نارتھ نے اس کے موافق رائے دی۔

برگاؤنی کی پہلی تحریک منظور ہو گئی تھی۔ اب اسے اپنی فتح کو مکمل کرنے کے لیے ایک قدم اور آگے بڑھنا تھا اس نے دوسری تحریک پیش کر دی جو براہ راست کلائیو کا نام لے کر پیش کی گئی تھی اور اس پر ہندوستانی فرماں رواؤں سے رقم بٹورنے کا الزام عاید کیا گیا تھا۔

کلائیو نے حسب عادت نہایت استقلال سے مقابلہ کیا۔ اسے جہاں دکھ تھا کہ وہ بدنام ہو رہا ہے وہیں اس بات کا اطمینان تھا کہ تمام باتیں پارلیمنٹ کے سامنے آ چکی ہیں۔ معاملہ عدالت کے سامنے جائے گا اور وہاں فیصلہ یقیناً اس کے حق میں ہوگا۔ اب تک جو باتیں مبہم ہیں ان پر مکمل کر بحث ہو سکے گی اور وہ اپنا نقطہ نظر پیش کر سکے گا۔

پارلیمنٹ میں تحریک کی منظوری کے بعد جب معاملہ عدالت میں گیا تو کلائیو نے ایک مرتبہ پھر وہ باتیں دہرائیں جو وہ پارلیمنٹ میں کر چکا تھا۔

''میں سولہ سال سے جس قدر مال و دولت پر متصرف ہوں آج اسے ناجائز قرار دینا کس قدر ظلم ہے۔ میں تو نہیں سمجھتا کہ برطانیہ کی مجلس اعلیٰ میرے ساتھ اس قسم کا سلوک کرے گی اور اگر بالفرض محال ایسا ہوا بھی تو کچھ مضائقہ نہیں۔ مجھے اپنی بے گناہی کا پوری طرح علم ہے اور میرا دل گواہی دیتا ہے کہ میں ہرگز قابل ملامت نہیں۔ جو کچھ میرے پاس ہے میرے دشمن مجھ سے چھین لیں۔ مجھے مفلس بنا دیں لیکن میں خوش ہی رہوں گا۔''

عدالت نے بھی یہی فیصلہ دیا کہ تحریک سے جن الفاظ سے کلائیو کی عزت پر حرف آتا ہو ان کو نکال دیا جائے۔ اس کے بعد مقدمے کا خاتمہ ہو گیا اور کلائیو کو آئندہ پارلیمنٹ کے حملے کا قطعی خوف نہ رہا۔

یہ اس کی فتح ہی تو تھی۔ اس کے کارناموں کو سراہا گیا تھا لیکن اسے تو یہ دکھ تھا کہ اس کی بدعنوانیوں کو منظر عام پر کیوں لایا گیا۔ یہ دکھ اسے اندر ہی اندر کھائے جا رہا تھا۔ اس کی صحت پہلے ہی خراب تھی ان جھگڑوں نے اسے بالکل ہی نڈھال کر دیا۔ ہندوستان سے جو مرض وہ اپنے ساتھ لگا کر لایا تھا اس میں اضافہ ہو گیا۔

اتنی بدنامی کے بعد بھی اس کے دوستوں نے اسے نہیں چھوڑا تھا۔ وہ اس کے گرد جمع رہتے۔ اسے سیر و تفریح

میں مشغول رکھتے لیکن اس جیسے مزاج والے آدمی کے لیے یہ سب بے مزہ تفریحات تھیں کہ کسی نے اس پر شک بھی کیا۔ وہ دوستوں میں رہ کر بہل ضرور جاتا تھا لیکن تنہائی اسے کاٹنے لگتی تھی۔

مقدمے کی کارروائی کے بعد اس کے وہ مشاغل جاتے رہے تھے جن میں اس کا دماغ منہمک رہتا تھا لہٰذا یہ تنہائی اسے مارے ڈال رہی تھی۔ اس کے دوست اسے برابر اکساتے رہتے تھے کہ وہ خود کو کسی مشغلے میں گم کر لے۔ انہی دنوں شمالی امریکا کی نوآبادیات سے جنگ چھڑنے والی تھی۔ یہ جنگ اور اس میں شرکت اس کے ذہن میں گردش کر رہی تھی۔ اس نے اپنے دوستوں کو اپنے ارادے سے آگاہ کیا۔

"آپ لوگ اگر میری بھلائی چاہتے ہی ہیں تو مجھے کوئی اعلیٰ عہدہ دلا کر اس جنگ میں جھونک دیں۔ میدان جنگ میری سب سے اچھی علاج گاہ ہوگی۔"

"مسٹر کلائیو، آپ کی صحت اس کی اجازت نہیں دے گی۔"

"اگر صحت اچھی ہوتی تو میں یہ خواہش کرتا ہی کیوں۔ اپنی دولت اوڑھ کر سو نہیں جاتا۔ میں علاج ہی کے لیے تو اس جنگ میں شریک ہونا چاہتا ہوں۔ کیا میں جنگ پاسی کا فاتح نہیں ہوں؟ کیا میں موجودہ جنگ میں کوئی کارنامہ انجام نہیں دے سکتا؟"

"آپ یقیناً ٹھیک سوچتے ہوں گے لیکن آپ کی صحت کو مدِنظر رکھتے ہوئے ڈاکٹر آپ کو اجازت نہیں دیں گے۔"

"میرے عزیز دوستو! بات میری صحت کی نہیں ہے بلکہ جنرل برگائن جیسے لوگوں نے مجھے بے اعتبار کر دیا ہے۔ وہ یہ سمجھنے لگے ہیں کہ جنگوں سے دولت حاصل ہوتی ہے۔ اسی لیے وہ خود جانا چاہتے ہیں۔ مجھے کیوں لے جانے لگے تھے اور بالفرض اگر میری صحت ہی کا سوال ہے تو یہ امراض بھی تو مجھے وطن کی خدمت کرتے ہوئے لگے ہیں۔ اگر میں وطن کی خدمت کرتے ہوئے مر جاؤں تو کسی کو کیا اعتراض۔ یہ لوگ مجھے باعزت موت مرتے ہوئے بھی دیکھنا نہیں چاہتے۔"

اس کے دوستوں کو اس کی گفتگو سے یہ شک گزرنے لگا تھا کہ اس کی گرتی ہوئی صحت اب اس کے ذہن کو بھی متاثر کرنے لگی ہے۔ انہوں نے اس کے ڈاکٹروں سے اس کی ذہنی حالت کے بارے میں تبادلہ خیال کیا۔ اسے یہ کہہ کر ڈاکٹر کے پاس لے جایا گیا کہ محاذ پر جانے کے لیے اس کا میڈیکل چیک اپ کیا جانے گا۔

ڈاکٹروں نے اس سے معائنے کے بعد جو رپورٹ دی وہ بڑی سنسنی خیز تھی۔ اس رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ کلائیو کا ذہن پوری طرح مستعد ہے لیکن مستقبل کی طرف سے مایوس ہو جانے کے بعد اس کا ذہن صرف ماضی کے بارے میں سوچتا رہتا ہے۔ ہندوستان میں رہتے ہوئے اس کا بیشتر وقت جنگوں کے درمیان گزرا ہے اس لیے اب کلائیو جنگ میں شریک ہو کر اپنا ماضی زندہ کرنے کا خواہاں ہے۔ اسی لیے اسے وہ اپنی علاج گاہ کہہ رہا ہے۔ بے شک وہ محاذ پر جا کر کچھ دنوں کے لیے صحت مند ہو بھی جائے گا لیکن یہ امکان قوی ہے کہ اس کا ذہن ماضی کو سامنے دیکھ کر دوبارہ ذہنی ہونے کی صلاح دے گا اور ممکن ہے کلائیو جان بوجھ کر دشمن کی گولی کے سامنے آ جائے اور اپنے آپ کو ختم کر لے۔ اس لیے اسے جنگ پر نہ بھیجا جائے تو اچھا ہے۔"

کلائیو کے دوست نہایت بااثر تھے۔ وہ اگر چاہتے تو اسے کوئی اعلیٰ عہدہ دے کر جنگ پر بھیج سکتے تھے لیکن اس رپورٹ کے بعد وہ چوکنا ہو گئے بلکہ کلائیو سے صاف کہہ بھی دیا کہ اس کی صحت ٹھیک نہیں لہٰذا وہ جنگ پر جانے کے قابل نہیں۔

اس اطلاع کے بعد کلائیو کو سخت مایوسی ہوئی۔ ایسی مایوسی اس کے لیے مزید خطرناک ہو سکتی تھی۔

لیڈی کلائیو اس کا پوری طرح خیال رکھ رہی تھی۔ اسے ہر اس جگہ سیر و تفریح کے لیے لے جا رہی تھی جہاں اس کا دل بہل سکتا تھا لیکن وہ دیکھ رہی تھی کہ کلائیو ہر وقت ماضی میں جھانکتا رہتا ہے۔

"تم نے دیکھا وارن ہیسٹنگز کو بنگال کا گورنر بنا کر بھیجا گیا ہے۔"

"اس کی اطلاع مجھے بھی ہوئی ہے۔"

"جانتی ہو یہ شخص کون ہے۔ یہ میرا ماتحت تھا۔ اٹھارہ سال کی عمر میں کمپنی میں کلرک ہو کر کلکتہ پہنچا تھا لیکن جلد ہی قاسم بازار میں ریذیڈنٹ بنا کر بھیج دیا گیا۔ جب سراج الدولہ نے قاسم بازار پر قبضہ کیا تو اسے قید کر لیا گیا۔ یہ شخص قید سے بھاگ آیا اور میری ماتحتی میں کام کرنے لگا پھر ترقی کرتا رہا۔ میں تو انگلستان کی آنکھوں میں کھٹکتا رہا۔ میری خدمات فراموش کر دی گئیں۔ مجھ پر بدعنوانیوں کے

الزامات لگائے گئے اور اب مشتبہ کو مجرم بنا کر بھیجا گیا ہے۔ یہ لوگ یہ بھی نہیں سوچتے کہ ہندوستان میں میری کیا حیثیت رہی ہے۔ میں چاہتا ہوں تو وہ کتنا برا ہوتا۔"

"کس نے کہا ہے کہ آپ برے ہیں؟"

"کیا تم نے مجلس کی کارروائی نہیں دیکھی تھی؟"

"اسی مجلس میں آپ کی خدمات کی تعریف بھی کی گئی تھی۔"

"ہاں مگر یہ بھی تو کہا جاتا رہا کہ بنگال کی تباہی میری غلط پالیسیوں کی وجہ سے ہوئی ہے۔ وہاں قحط بھی شاید میری وجہ سے آیا ہو۔"

"آپ کی پالیسیاں خواہ غلط ہوں لیکن آپ کی نیت غلط نہیں تھی۔"

"نیت کون دیکھتا ہے۔ سب تو یہ دیکھ رہے ہیں کہ میں نے وہاں رہ کر دولت جمع کی ہے۔"

"اب جبکہ دولت جمع کر ہی لی ہے تو اس سے فائدہ بھی اٹھائیے۔" اس کی بیوی نے بات کو ٹالتے ہوئے کہا۔ "چند دن کے لیے یہاں سے نکل کر کسی پرفضا مقام پر چلتے ہیں۔ آپ کی صحت پر بھی اچھا اثر پڑے گا۔ بچے بھی گھوم پھر لیں گے۔"

اس نے بھی اسی میں بہتری سمجھی۔ وہ وسط یورپ کی سیر کو نکل گیا۔ تبدیلی آب و ہوا نے بھی اس کی صحت پر خوشگوار اثر نہیں ڈالا۔ اس کی سوچیں اس کی فکریں بڑھتی چلی گئیں۔ اس سفر کے دوران وہ ایک نئی مصیبت سے دوچار ہو گیا۔ اسے بے خوابی نے اپنی گرفت میں لے لیا۔ نیند اس کی روٹھ گئی۔ آنے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔ رات رات بھر جاگ کر ماضی کے دروازے کھٹکھٹاتا رہتا تھا۔ اسے پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ جس دولت کے حصول کے لیے صحیح اور غلط سب طریقے استعمال کیے تھے وہ اسے سکون کے دو لمحے فراہم نہیں کر سکتی۔ اس نے تنہائی میں جائزہ لیا تو اسے اپنی بہت سی ایسی غلطیاں نظر آئیں جن کا اب کوئی ازالہ نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ گھبرا کر انگلستان واپس چلا آیا۔ یہاں آنے کے بعد بھی پیچیدگیاں بڑھتی ہی چلی گئیں۔ ماضی کی یادیں اب بھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑ رہی تھیں۔

وہ اس روز گھر میں اکیلا تھا۔ ملازم اپنے اپنے کمروں میں تھے۔ بیوی بچے باہر گئے ہوئے تھے۔ وہ حسب معمول ماضی کی ورق گردانی کر رہا تھا کہ اسے ایک واقعہ یاد آ گیا۔ وہ ان دنوں مدراس میں کلرکی کے دن گزار رہا تھا۔ دل برداشتہ ہو کر اس نے خودکشی کرنی چاہی تھی۔ کنپٹی پر پستول رکھ کر دو مرتبہ چلایا لیکن گولی نہیں چلی پھر اس کا ایک ساتھی اندر آ گیا اور اس نے کھڑکی سے باہر رخ کر کے پستول چلایا تو گولی چل گئی۔

اسے یاد آیا کہ یہ منظر دیکھ کر وہ اچھل گیا تھا اور اس نے نعرہ لگایا تھا کہ قدرت مجھ سے کوئی بڑا کام لینا چاہتی ہے۔ اسی لیے گولی نہیں چلی اور میں زندہ رہا۔

میرا یہ اندازہ غلط نہیں تھا۔ میں نے کلرکی سے گورنر جنرل تک ترقی کی۔ بڑے بڑے کارنامے انجام دیے۔

یہ واقعہ یاد آتے ہی وہ ایک مرتبہ پھر اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ میز تک چلتا ہوا گیا اور دراز میں رکھا ہوا پستول نکال لیا۔ چند لمحے سوچتا رہا پھر پستول اپنی کنپٹی پر رکھ لیا۔

"قدرت اگر مجھ سے کوئی بڑا کام لینا چاہتی ہے تو مجھے ضرور زندہ رکھے گی اور اگر اب کوئی عظیم کارنامہ میری تقدیر میں نہیں تو پھر میرا زندہ رہنا بے کار ہے۔"

اس نے اپنے آپ سے کہا اور گولی چلا دی۔ اس مرتبہ پستول نے دھوکا نہیں دیا۔ گولی چلی اور کلائیو زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ گولی کی آواز سن کر ملازم دوڑتے ہوئے آئے۔ کلائیو خون میں لت پت زمین پر پڑا تھا۔ پستول ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔ ملازموں نے پولیس کو اطلاع دی۔ تھوڑی دیر میں اس کی بیوی بھی آ گئی۔ اخباری نمائندے بھی آ گئے۔

یہ معلوم کرنا مشکل تھا کہ ایک اچھے دماغ شخص کے ہوش و حواس اس موقع پر کیسے بکھر جاتے رہے کہ اس سے یہ حرکت سرزد ہوئی۔

پھر وہی ہوا جو مرنے والوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ زندگی کے آخری دنوں میں اس پر لعن طعن ہوتی رہی لیکن مرنے کے بعد اخبارات میں اس کے قصیدے شائع ہو رہے تھے۔

"قیصر نے اپنے ملک کے لیے گال فتح کیا۔ ہنی بال نے نصف صدی تک روما کا ناطقہ بند کیے رکھا۔ ولنگٹن نے فرانسیسیوں کو پرتگال، ہسپانیہ سے نکال باہر کیا۔ کلائیو کے کارنامے ان سے بڑھے ہوئے رہے۔"

ماخذات

لارڈ کلائیو ... مترجم ابن احسن

کمپنی کی حکومت ... باری علیگ

اگست کی شخصیات

سمیع الحق فاروقی

عیسوی سن کے اس آٹھویں مہینے میں ایسے بے شمار واقعات رونما ہوئے جو کئی معنوں میں اہم ہیں۔ ان میں سے چند اہم واقعات، اس ماہ سے جڑی چند اہم شخصیات کا مختصر تعارف تاکہ معلومات جمع کرنے والے باذوق قارئین کی تشنگی مٹ سکے۔

یوں تو 14 اگست کی تاریخ قیامِ پاکستان کے حوالے سے پہچانی جاتی ہے اور اس سلسلے میں ذرائع ابلاغ کے ہر شعبے سے آپ کو بہت سی معلومات ملتی رہتی ہیں۔ اس لیے اگر ہم نے بھی اس وقت صرف قیامِ پاکستان کے حوالے سے کچھ معلومات فراہم کریں تو شائد یہ کچھ زیادہ سودمند نہ ہو۔ لیکن ہم آپ کو 14 اگست اور پاکستان کے حوالے سے ایک بالکل نئے زاویے سے روشناس کروا رہے ہیں، جو یقیناً اپنی انفرادیت اور ندرت کے حوالے سے آپ کی دلچسپی کا باعث ہوگا۔

یہ زاویہ ہے پاکستان کی ان معروف شخصیات کا مختصر تذکرہ جنہوں نے پاکستان کے مختلف شعبہ ہائے زندگی میں اہم خدمات سرانجام دیں، اور اپنے اپنے شعبے میں نمایاں مقام حاصل کیا۔ ان تمام شخصیات میں ایک چیز مشترک ہے اور وہ یہ کہ یا تو ان کی تاریخ پیدائش یا تاریخ وفات 14 اگست ہے جو قیامِ پاکستان کی تاریخ ہے۔ آیئے پہلے تذکرہ کرتے ہیں ان شخصیات کا جن کی تاریخ پیدائش 14 اگست ہے، بعد میں ان شخصیات کا تذکرہ کریں گے جن کی تاریخ وفات 14 اگست ہے۔

صبا اکبرآبادی

جزو دل تن کے سوا ہے محبت دل میں
یہ وہ کانٹا ہے کہ اور کھٹکتا بھی نہیں

یہ خوبصورت شعر معروف شاعر جناب صبا اکبرآبادی کا ہے۔ ان کا اصل نام خواجہ محمد امیر تھا۔ وہ 14 اگست 1908ء کو آگرہ (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے صرف بارہ سال کی عمر میں شاعری شروع کردی تھی۔ بعد میں وہ شاہ محمد محسن ابوالعلائی رحمانپوری کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوئے اور تصوف کی دنیا میں قدم رکھا۔ محض تین سال کی عمر میں یعنی

1928ء میں ایک ادبی جریدہ ماہنامہ "آزاد" نکالا۔ کچھ ہی عرصے بعد رعنا اکبرآبادی کے ماہنامہ "مشورہ" کی ادارت بھی سنبھال لی۔

آپ نے قیام پاکستان کے بعد پہلے حیدرآباد پھر کراچی میں رہائش اختیار کی۔ آپ کچھ عرصہ محترمہ فاطمہ جناح کے پرائیویٹ سیکریٹری کے فرائض بھی سرانجام دیتے رہے۔ اس کے علاوہ بھی انہوں نے کئی دیگر ملازمتیں اختیار کیں۔ اسی دوران وہ کراچی کی ادبی فضا کے ایک اہم رکن بھی بن چکے تھے۔

وہ ایک اچھے شاعر ہونے کے علاوہ ایک اچھے ادیب اور ناول نگار بھی تھے۔ ان کے شعری مجموعوں میں اوراق گل، سخن ناشنیدہ، ذکر و فکر، چراغ بہار، خوں ناب، حرز جاں ثبات اور دست دعا شامل ہیں۔ آپ کو چونکہ مرثیہ نویسی سے بھی شغف تھا اسی لیے آپ کے مرثیوں کے تین مجموعات سربکف، شہادت اور قرطاس الم کے نام سے شائع ہوئے۔ اس کے علاوہ انہوں نے غالب، حافظ، عمر خیام اور امیر خسرو کے منتخب فارسی کلام کا اردو ترجمہ بھی کیا۔

ان کی ملی شاعری کا مجموعہ "زمزمۂ پاکستان" قیام پاکستان سے پہلے ہی شائع ہو چکا تھا۔ ان کا ایک ناول "زمرد اش" کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔ وہ 29 اکتوبر 1991ء کو اسلام آباد میں وفات پا گئے جہاں سے ان کا جسد خاکی کراچی لایا گیا اور علی حسن کے قبرستان میں تدفین کی گئی۔ ان کا ایک اور شعر ملاحظہ فرمایئے:

یہ ہمی ہیں کہ ترا درد چھپا کر دل میں
کام دنیا کے بدستور کیے جاتے ہیں

پرویز مہدی

معروف گلوکار پرویز مہدی 14 اگست 1947ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد بشیر حسین ... بھی ... پاکستان کے معروف گلوکار تھے۔ پرویز مہدی نے ابتداء میں جے اے فاروق سے موسیقی کی تربیت حاصل کی لیکن بعد میں ان کا غزل گائیکی کی طرف رجحان دیکھتے ہوئے ان کے والد نے

ان کو شہنشاہ غزل استاد مہدی حسن خان کی شاگردی میں دے دیا۔ پرویز مہدی نے غزل گائیکی میں وہ کمال حاصل کیا کہ بعض اوقات سننے والے یہ پہچان ہی نہ پاتے کہ یہ مہدی حسن گا رہے ہیں یا پرویز مہدی۔ انہوں نے اپنے استاد مہدی حسن خان کا نام اپنے نام میں شامل کرکے پرویز مہدی رکھا۔ وہ 29 اگست 2005ء کو انتقال کر گئے اور لاہور میں آسودۂ خاک ہیں۔

مہتاب اکبر راشدی

موجودہ معروف پاکستانی خواتین میں ایک بڑا نام مہتاب اکبر راشدی کا ہے۔ وہ 14 اگست 1947ء کو پیدا ہوئیں۔ وہ سندھ کے ایک نواحی قصبے "نوڈیرو" سے تعلق رکھتی ہیں۔ سندھ کے ایک قصبے سے تعلق رکھنے کے باوجود ان کے والد نے اپنی تمام بیٹیوں سمیت اپنی اولاد کی تعلیم کا خاص اہتمام کیا اور مہتاب اکبر راشدی نے بھی اپنی باقی تین بہنوں کی طرح تعلیمی میدان میں اچھے نتائج دیے۔ آپ پہلے سندھ یونیورسٹی میں تدریسی فرائض انجام دیتی رہیں، پھر فل برائٹ اسکالرشپ پر امریکا چلی گئیں۔ وہاں سے واپسی پر دوبارہ تدریسی شعبے سے وابستہ ہو گئیں۔ انہوں نے پی ٹی وی پر چائلڈ اسٹار کی حیثیت سے اپنے ٹی وی کیریئر کا آغاز کیا۔ بڑے ہونے کے بعد ٹی وی کے مختلف پروگراموں میں میزبانی کے فرائض بھی سرانجام دیتی رہیں۔

جنرل ضیاء الحق کے دور میں سرکاری احکامات سے اصولی اختلاف کے باعث پی ٹی وی سے علیحدگی اختیار کرلی اور مکمل توجہ درس و تدریس کی جانب دی۔ ضیاء دور کے خاتمے کے بعد واپس ٹی وی کے پروگراموں میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ انہوں نے سندھ یونیورسٹی میں شعبۂ سندھیالوجی کے قیام میں اہم کردار ادا کیا۔ بعد میں بے نظیر بھٹو کی ذاتی دلچسپی کی باعث بیوروکریسی کی جانب آ گئیں اور مختلف اہم سرکاری عہدوں پر فائز رہیں۔

بلقیس ایدھی

پاکستان ہی نہیں اگر دنیا بھر میں بے لوث انسانی

خدمت سرانجام دینے والوں کی فہرست مرتب ہو تو یقیناً مولانا عبدالستار ایدھی اور بلقیس ایدھی کا نام سرِفہرست ہوگا۔ ابتداء میں بلقیس ایدھی کی شناخت صرف مولانا ایدھی کی اہلیہ کی تھی لیکن اب وہ "مادرِ پاکستان" کے نام سے پہچانی جاتی ہیں۔ وہ 14 اگست 1947ء کو پیدا ہوئیں، وہ پیشے کے اعتبار سے نرس ہیں اور اسی حیثیت میں مولانا ایدھی کی ڈسپنسری میں کام شروع کیا۔ آپ کی محنت اور جانفشانی مولانا ایدھی کو اتنی بھائی کہ 1966ء میں آپ کی مولانا ایدھی سے شادی ہوگئی۔ اور وہ دن اور آج کا دن دونوں میاں بیوی اور ان کی اولاد آج تک بلا امتیاز خدمتِ انسانیت میں مگن ہیں۔ آج پاکستان ہو کیا دنیا کے کسی بھی حصے میں کوئی بھی آفت آجائے سب سے پہلے امداد لے کر پہنچنے والوں میں مولانا ایدھی یا ان کے خاندان کا ہی کوئی فرد ہوگا۔

انصار برنی

پاکستان کے سماجی خدمت کے شعبے میں ایک بڑا نام انصار برنی کا بھی ہے۔ وہ 14 اگست 1956ء کو کراچی میں پیدا ہوئے۔ جامعہ کراچی سے ایم اے، ایل ایل بی اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ وہ زمانہ طالبعلمی سے ہی سیاست میں متحرک ہونے کی باعث جنرل ضیاء کے مارشل لاء دور میں متعدد بار قید و بند کی صعوبتیں جھیلتے رہے۔ ان ہی قید و بند کی صعوبتوں نے انہیں جیلوں میں بند قیدیوں کی

حالت زار کو قریب سے مشاہدہ کرنے کا موقع فراہم کیا۔ جس کے نتیجے میں 1980ء میں انہوں نے انصار برنی ویلفیئر ٹرسٹ قائم کیا۔ جس کے تحت قیدیوں کی قانونی امداد،

گمشدہ اور اغواشدہ افراد کی بازیابی کی کوششوں کا اپنا مشن بنالیا۔ آپ 2007ء کی نگران حکومت کے دور میں محدود مدت کے لیے وزیر بھی بنے۔ ان کی خدمات کے اعتراف میں ان کو حکومتِ پاکستان نے ستارۂ امتیاز بھی عطا کیا۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی

اردو ادب کے معروف نقاد اور ادیب ڈاکٹر عبادت بریلوی 14 اگست 1920ء کو بریلی (یوپی) بھارت میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم کے بعد 1942ء میں لکھنؤ یونیورسٹی سے ایم اے [illegible] سے 1946ء میں پی ایچ ڈی کیا۔ لکھنؤ اور دہلی یونیورسٹی میں تدریسی فرائض انجام دینے کے بعد پاکستان آکر اورینٹل کالج لاہور میں تدریسی ذمہ داریاں سنبھالیں۔ آپ نے اردو ادب، غالب اور اقبال کے حوالے سے متعدد تحقیقی کام کیے۔ آپ 19 دسمبر 1998ء کو لاہور میں انتقال کر گئے اور وہیں آسودۂ خاک ہیں۔

محمد طفیل

پاکستان کے معروف ادیب، خاکہ نگار اور مدیر ماہنامہ "نقوش" 14 اگست 1923ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ ابتداء میں خوشنویسی سیکھنے کے بعد 1944ء میں ایک طباعتی ادارہ قائم کیا۔ 1948ء میں ماہنامہ نقوش کا اجراء کیا۔ 18 شماروں کے بعد اس کی ادارت خود سنبھال لی۔ اس کے بعد اس جریدے کے تحت انہوں نے مختلف نمبر بھی نکالے مثلاً افسانہ نمبر، شخصیات نمبر، آپ بیتی نمبر، طنز و مزاح نمبر اور ادبی معرکے نمبر وغیرہ کے علاوہ مختلف

شخصیات مثلاً میر، غالب، انیس، پطرس اور منٹو وغیرہ پر بھی نمبر نکالے۔ جنہوں نے ادبی دنیا میں دھوم مچائے رکھی۔ ان کی خاکوں پر مبنی متعدد کتب بھی شائع ہوئیں۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق نے ان کو "محمد نقوش" کا خطاب دیا۔ وہ 5 جولائی 1986ء کو اسلام آباد میں انتقال کر گئے اور ان کی تدفین لاہور کے میانی صاحب قبرستان میں ہوئی۔ آپ کی اعلیٰ ادبی خدمات کے اعتراف میں آپ کو ستارۂ امتیاز بھی عطا کیا گیا۔

غلام مصطفیٰ جتوئی

پاکستان کے معروف سیاستدان اور سابق نگران وزیر اعظم جناب غلام مصطفیٰ جتوئی 14 اگست 1931ء کو پیدا ہوئے۔ وہ سندھ کے معروف زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ 1956ء میں مغربی پاکستان اسمبلی کی رکنیت سے اپنے سیاسی کیریئر کا آغاز کیا۔ ذوالفقار علی بھٹو کی پاکستان پیپلز پارٹی سے ابتداء سے ہی وابستہ رہے۔ وہ مرکزی حکومت کے وزیر کے علاوہ صوبہ سندھ کے وزیر اعلیٰ بھی رہے۔ جنرل ضیاء الحق کے خلاف چلنے والی ایم آر ڈی کی تحریک میں بھی متحرک کردار ادا کرتے رہے۔ جب بے نظیر بھٹو نے پیپلز پارٹی کی قیادت سنبھالی تو ان کے اقدامات کی وجہ سے جتوئی صاحب ناراض ہو کر پیپلز پارٹی کے خلاف صف آراء ہو گئے۔ 1990ء میں بے نظیر بھٹو کی حکومت کے خاتمے کے بعد مختصر دور کے لیے نگران وزیر اعظم بھی بنے۔ انہوں نے 1993ء میں آخری بار عام انتخابات میں حصہ لیا اور پھر رفتہ رفتہ سیاست سے کنارہ کش ہوتے چلے گئے۔ وہ 20 نومبر 2009ء کو لندن میں انتقال کر گئے اور اپنے آبائی علاقے نیو جتوئی میں مدفون ہیں۔

قاری خوشی محمد الازہری

پاکستان کے معروف قاری خوشی محمد الازہری 14 اگست 1943ء کو ضلع اوکاڑہ کے ایک نواحی قصبے میں پیدا

ہوئے۔ انہوں نے ابتداء سے ہی فن قرأت کے رموز سیکھنے شروع کر دیے تھے۔ انہوں نے 1972ء اور 1975ء میں ملائیشیا میں منعقد ہونے والے عالمی مقابلۂ قرأت میں اول انعام حاصل کیے۔ 1976ء میں پہلی بار ان کی قرأت پر مبنی مکمل قرآن پاک [illegible].... 30 کیسٹوں پر جاری ہوا۔ 1977ء میں حکومت پاکستان نے ان کو فن قرأت میں مزید تعلیم کے لیے جامعہ الازہر، مصر بھیجا۔ وہاں پہلے ہی سال زیر تربیت 90 ممالک کے قراء کرام میں پہلی پوزیشن حاصل کی۔ وہ 11 اگست 1998ء کو انتقال کر گئے۔

14 اگست کو وفات پا جانے والے

بشیر ساربان

20 مئی 1961ء کو امریکی صدر جانسن پاکستان کے دورے پر آئے تو ان کا بڑا پر جوش استقبال ہوا۔ ان کا قافلہ کراچی کی سڑک سے گزر رہا تھا تو ان کو عوام کی استقبالیہ قطار میں ایک اونٹ گاڑی اور اس کا بشیر نامی ساربان (اونٹ گاڑی چلانے والے کو ساربان کہا جاتا ہے) بھی تماشا دیکھنے کی منتظر کھڑا تھا۔ اونٹ گاڑی غالباً صدر جانسن کے لیے ایک نئی چیز تھی۔ انہوں نے اپنا قافلہ [illegible] سے ملاقات کی اور اس کو ذاتی

دوستی کی پیشکش کے علاوہ امریکا کے ریاستی مہمان کی حیثیت سے امریکا آنے کی دعوت بھی دی۔ 14 اکتوبر 1961ء کو بشیر ساربان امریکا کے ریاستی مہمان کی حیثیت سے امریکا روانہ ہو گیا۔ راستے میں لندن میں رکا تو وہاں بھی اس کو سرکاری مہمان کا

پروٹوکول دیا گیا۔ ڈپلومیسی کی دنیا میں اس قسم کے واقعات دو ممالک کے عوام کو قریب لانے میں معاون ہوتے ہیں، اور صدر جانسن کے اس ایک قدم نے امریکی اور پاکستانی عوام کو قریب لانے میں اہم کردار ادا کیا۔ انہوں نے بشیر ساربان کو سرکاری خرچ پر امریکا کی سیر کروا کر اور واپسی پر ایک ٹرک تحفے میں دے کر وہ کامیابی حاصل کی جو عام حالات میں لاکھوں ڈالر کے خرچ سے بھی ممکن نہ تھی۔ بشیر ساربان 14 اگست 1992ء کو کراچی میں انتقال کر گئے اور یہیں مدفون ہیں۔

ڈاکٹر محمد عبداللہ

معروف ادیب، محقق اور ماہر تعلیم ڈاکٹر محمد عبداللہ 14 اگست 1986ء کو لاہور میں انتقال کر گئے۔ آپ 5 اپریل 1904ء کو ضلع مانسہرہ میں پیدا ہوئے تھے۔

آپ نے جامعہ پنجاب میں بطور لائبریرین اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا اور پھر اپنا تعلیمی سلسلہ جاری رکھتے ہوئے وہیں سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ آپ پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج کے پرنسپل کے عہدے تک پہنچے۔ آپ نے اردو ادب کے سلسلے میں کافی تحقیقی کام کیا جن میں ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ، شعرائے اردو کے تذکرے اور تذکرہ نگاری کا فن، اردو کا سنہ وجہی سے عبدالحق تک اور دیگر کئی اہم تصنیفات شامل ہیں۔

اب ہم چلتے ہیں اگست سے جڑی شخصیات کی طرف

بابائے اردو مولوی عبدالحق

زبان دنیا کی کوئی بھی ہو اس میں ارتقاء کا عمل مسلسل جاری رہتا ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ اس میں جغرافیائی اور سیاسی عوامل کی باعث تبدیلی بھی آتی رہتی ہے۔ دنیا کی تمام زبانوں کی طرح اردو زبان کو لشکری سے موجودہ اردو تک پہنچنے میں کئی مراحل سے گذرنا پڑا ہے۔ موجودہ اردو کی ترویج و ترقی میں جتنا کردار بابائے اردو مولوی عبدالحق کا ہے اتنا شاید ہی کسی فرد واحد کا ہو۔ آپ نے اپنی زندگی کا واحد مقصد ہی اردو کی ترویج و ترقی کو بنا رکھا تھا۔ آپ کی تاریخ پیدائش میں تو اختلاف پایا جاتا ہے لیکن سن پیدائش میں عمومی طور پر اتفاق ہی پایا جاتا ہے۔ معتبر محققین آپ کی تاریخ پیدائش 20 اگست 1870ء مانتے ہیں اس لیے ہم بھی اسی کو صحیح مانتے ہوئے ان کا تذکرہ ماہ اگست کی شخصیات میں ہی کر رہے ہیں۔ آپ کی جائے پیدائش صوبہ اتر پردیش (بھارت) کے ضلع میرٹھ کا قصبہ ہاپوڑ ہے جہاں 1857ء کو مسلمانوں نے سب سے پہلے انگریزی تسلط کے خلاف عسکری جدوجہد کا آغاز کیا

جو ہماری تاریخ میں جنگ آزادی کے نام سے جانی جاتی ہے جب کہ انگریزوں نے اسے غدر کہا۔

آپ نے ادبی سرگرمیوں کا آغاز 1887ء میں کیا اور اسی زمانے میں ایک بہترین مضمون لکھنے پر لارڈ لینس ڈاون سے ایوارڈ بھی حاصل کیا۔ ابتدائی کامیابیوں کے بعد آپ سرسید احمد خان کی نظروں میں آ گئے جنہوں نے ان کی ادبی صلاحیتوں کے جلاء میں اہم کردار ادا کیا اور ان کو اپنے رسالے "تہذیب الاخلاق" میں مصروف کر لیا۔ 1895ء میں حیدرآباد دکن پہنچ کر آپ نے درس و تدریس کا فریضہ انجام دینا شروع کر دیا اور بالآخر حیدرآباد دکن کی جامعہ عثمانیہ میں صدر شعبۂ اردو مقرر ہوئے۔ آپ کو اسی جامعہ عثمانیہ کے ایک طالب علم نے 1935ء میں "بابائے اردو" کا خطاب دیا جو ان کے نام کا حصہ بن گیا۔ قبل ازیں آپ 1928ء میں وطن منتقل ہو گئے تھے۔

انہوں نے تمام عمر اردو زبان کی تحقیق و ترقی میں صرف کی۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ اردو لغت کی تدوین ہے، جس کو آج بھی اردو لغت کی مکمل، جامع اور مستند ترین لغت ہونے کا درجہ حاصل ہے۔ اس کے علاوہ وہ تمام عمر اس میں بھی کوشاں رہے کہ ایک اردو یونیورسٹی قائم کی جائے۔ ان کی زندگی میں یونیورسٹی تو قائم نہ ہو سکی لیکن اردو آرٹس، اردو سائنس اور اردو کامرس کالج قائم ہو گئے۔ اور یہ کالج بالآخر ان کی وفات کے بعد یونیورسٹی بن گئے، جو ان کے خواب کی ہی تعبیر ہے۔

ان کا ایک اور بڑا کارنامہ ان کے ذاتی وسائل سے

"انجمن ترقی اردو" کا قیام ہے۔ اس ادارے کے قیام کے لیے انہوں نے اپنے تمام ذاتی اثاثے وقف کر دیے، بالخصوص اپنی کتب اسی ادارے کے نام وقف کر دیں۔ لیکن ان کی عمر کے آخری حصے میں جب انجمن ترقی اردو ایک کامیاب اور معروف ادارہ بن چکا تھا، بعض مقتدر افراد کی سیاستوں کی نذر ہو گیا۔ ان حالات نے بابائے اردو کو اس قدر پریشان کر دیا کہ وہ اس ادارے کے مستقبل سے تقریباً مایوس ہی ہو گئے تھے۔ اسی ادارے کے تحت لسانیات، لغت اور جدید علوم پر تقریباً 20 کتب شائع ہوئیں۔

آپ نے 16 اگست 1961ء کو کراچی میں وفات پائی اور وہیں وفاقی اردو یونیورسٹی کے عبدالحق کیمپس میں آسودۂ خاک ہیں۔

پائلٹ آفیسر راشد منہاس شہید

قوموں پر جب کڑا وقت آتا ہے تو اس کے جوانوں کا بھی امتحان ہوتا ہے۔ اس آزمائش سے سرخرو ہو کر نکلنے کی بجائے آزمائش اس کو مزید کسی نقصان کی طرف دھکیل دے گی۔ پاکستان کے جوانوں اور خصوصاً فوجی جوانوں نے ہر آزمائش میں یہ ثابت کیا ہے کہ وہ ہر قسم کی آزمائش میں سرخرو ہو کر نکلنا جانتے ہیں۔ ایسے ہی ایک عسکری جوان پاک فضائیہ کے پائلٹ آفیسر راشد منہاس بھی تھے۔ جنہوں نے اپنے خون کا نذرانہ دے کر یہ ثابت کیا کہ عظیم مقصد کے حصول کے لیے خون کا نذرانہ کوئی بہت بڑی قیمت نہیں ہے۔ وہ 17 فروری 1951ء کو کراچی میں پیدا ہوئے اور انہوں نے وہیں سینٹ پیٹرکس کالج سے او لیول پاس کرنے کے بعد پاک فضائیہ میں شمولیت اختیار کی۔

1971ء میں جب مشرقی پاکستان میں شورش اپنے عروج پر تھی اور دشمن مغربی پاکستان میں بھی نقب لگانے کی کوشش کر رہا تھا ایسے ماحول میں 20 اگست 1971ء کو کراچی کے پی اے ایف بیس مسرور سے پائلٹ آفیسر راشد منہاس شہید اپنی دوسری سولو فلائٹ کے لیے طیارہ لے کر رن وے کی جانب روانہ ہوئے ہی تھے کہ ان کے انسٹرکٹر مطیع الرحمان نے ان کو خطرے کا سگنل دے کر روک دیا۔ جونہی راشد منہاس نے طیارہ روکا مطیع الرحمان جمپ کر جہاز میں سوار ہو گیا، اور طیارے کا کنٹرول خود سنبھال لیا۔ جب راشد منہاس کو حالات کی سنگینی کا احساس ہوا تو انہوں نے کنٹرول ٹاور کو جہاز کے اغواء کا سگنل بھیج دیا۔ اسی دوران مطیع الرحمان نے راشد منہاس کو کلوروفام میں بھیگے ہوئے رومال سے بے ہوش کرنے کی کوشش کی لیکن وہ اس میں پوری طرح کامیاب تو نہ ہو سکا لیکن جہاز پر کنٹرول حاصل کرتے ہوئے نچلی پرواز کرتے ہوئے جہاز کو بھارت لے جانے لگا۔

اب جہاز بھارت کی طرف رواں دواں تھا اور نچلی پرواز کی باعث نہ تو ریڈار پر نظر آرہا تھا اور نہ ہی پاک فضائیہ کے ان طیاروں کو نظر آرہا تھا جو اس کی تلاش میں فضاؤں کو چھان رہے تھے۔ مطیع الرحمان کے پاس اس وقت پاکستان کی دفاعی تنصیبات کے کچھ اہم اور خفیہ دستاویزات بھی موجود تھیں جو وہ بھارت لے کر جانا چاہتا تھا۔ دوران پرواز جب راشد منہاس کو کچھ ہوش آیا تو اس وقت طیارہ ٹھٹھہ کے قریب پرواز کر رہا تھا۔ راشد منہاس نے بالآخر ایک دلیرانہ فیصلہ کیا اور طیارے کا ایک لیور کھینچ دیا جس سے طیارہ بڑی تیزی سے زمین کی طرف گرنے لگا۔ مطیع الرحمان نے راشد منہاس کو اس لیور سے ہٹانے کی کوشش کی مگر وہ اس میں ناکام رہا اور طیارہ پاکستان کی اپنی فضائی حدود میں ہی گر کر تباہ ہو گیا۔

یوں راشد منہاس شہید نے اپنی زندگی کی قربانی دے کر طیارہ اور خفیہ دستاویزات بھارت لے جانے کی کوشش ناکام بنا دی۔ 29 اگست 1971ء کو صدر پاکستان نے ان کی اس دلیری کے اعتراف میں جرأت و بہادری کا اعلیٰ ترین فوجی اعزاز "نشان حیدر" عطا کرنے کا اعلان کیا۔ وہ کراچی میں ہی مدفون ہیں۔

میجر راجا عزیز بھٹی شہید

پاک فوج کے بہادر سپوتوں نے ہمیشہ یہ ثابت کیا ہے کہ جب بھی آزمائش آئی ہے انہوں نے اپنی جان کو ثانوی حیثیت دیتے ہوئے اپنے ملک کا بھرپور دفاع کیا ہے۔ ایسے ہی ایک بہادر سپوت میجر راجا عزیز بھٹی شہید

ہیں۔

میجر عزیز بھٹی شہید 16 اگست 1923ء کو ہانگ کانگ میں اس وقت پیدا ہوئے جب ان کے والد اپنے علاقے کی فوجی روایت کے مطابق عسکری خدمات سرانجام دے رہے تھے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد ... آبائی قصبے لادیاں، ضلع گجرات آگئے۔ یہاں میجر عزیز بھٹی نے قیام پاکستان کے بعد جنوری 1948ء پاکستان ملٹری اکیڈمی کے پہلے کورس میں شمولیت اختیار کی اور 1950ء میں پاس آؤٹ ہونے والے پہلے کورس میں شامل تھے۔ پاسنگ آؤٹ کے موقع پر آپ کو وزیر اعظم ... لیاقت علی خان نے اعزازی شمشیر بھی عطا کی، اس کے علاوہ انہوں نے نارمن گولڈ میڈل بھی حاصل کیا، اور پھر پنجاب رجمنٹ میں بطور سیکنڈ لیفٹیننٹ شامل ہوئے، اور پھر ترقی کرتے کرتے میجر کے عہدے تک پہنچے۔

6 ستمبر 1965ء کو جب بھارت نے لاہور سیکٹر پر حملہ کیا تو میجر عزیز بھٹی وہیں برکی کے علاقے میں اپنی کمپنی کے ہمراہ موجود تھے اور بی آر بی نہر کی حفاظت پر مامور تھے۔ اس جنگ میں میجر عزیز بھٹی کے دستے اور دشمن کے درمیان مسلسل آنکھ مچولی چلتی رہی۔ بالآخر 8 اور 9 ستمبر کی رات دشمن نے پوری ایک بٹالین کے ہمراہ ٹینکوں اور توپوں کی مدد سے اس علاقے پر بھرپور حملہ کیا۔ اس دوران عزیز بھٹی شہید نہر پار کرکے دشمن کے علاقے میں داخل ہوچکے تھے۔ حالات کی سنگینی کی باعث ان کو واپس اپنی پوسٹ پر آنے کی ہدایات ملیں لیکن اس دوران دشمن ان کی پوسٹ پر قابض ہوچکا تھا۔ پھر بھی انہوں نے اپنی صفوں کو دوبارہ منظم کرکے دشمن پر بھرپور حملہ کیا اور دشمن کی طرف سے آتش وآہن کی بھرپور بارش کے باوجود اپنی جگہ پر ڈٹے رہے حتیٰ کہ اپنے پورے دستے کو اس خطرناک ماحول سے باہر نکالنے میں کامیاب رہے۔

یہ معرکہ تین دن تک جاری رہا۔ 12 ستمبر 1965ء کو دشمن کے ٹینک کا ایک گولہ سیدھا آکر ان کے سینے میں لگا اور انہوں نے وہیں جام شہادت نوش کرلیا۔ 26 ستمبر 1965ء کو صدر مملکت نے ان کو بہادری اور شجاعت کا اعلیٰ ترین عسکری ایوارڈ ''نشان حیدر'' عطا کرنے کا اعلان کیا۔

نواب اکبر بگٹی

زندگی میں بعض کردار اتنے متلون مزاج اور سیماب صفت ہوتے ہیں کہ ان کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا انتہائی دشوار ہوجاتا ہے کہ ان کی سوچ کا محور کیا ہے۔ پاکستانی سیاست میں ایسا ہی ایک کردار نواب اکبر بگٹی کا ہے۔ وہ بھی تو پاکستان کی قومی سیاست میں اتنے متحرک نظر آتے ہیں کہ قومی اور صوبائی اسمبلیوں کی رکنیت حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ صوبہ بلوچستان کے گورنر اور وزیر اعلیٰ بننے کے ساتھ ساتھ وفاقی وزیر بھی بنتے ہیں۔ اور کبھی وفاق سے اتنی بغاوت کرتے ہیں کہ ریاست کے خلاف اسلحہ اٹھا کر پہاڑوں کی جانب نکل جاتے ہیں اور بالآخر اپنی جان بھی اسی مقصد میں دے دیتے ہیں۔

نواب اکبر بگٹی 12 جولائی 1927ء کو پیدا ہوئے۔ ان کی عمر ابھی صرف بارہ سال ہی تھی کہ اپنے والد نواب محراب بگٹی کی وفات کے بعد ان کے جانشین مقرر ہوئے۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم ایچی سن کالج لاہور اور اعلیٰ تعلیم برطانیہ سے حاصل کی۔ قیام پاکستان کے فوراً بعد 1949ء میں پاکستان سول سروس میں شمولیت اختیار کی لیکن جلد ہی سیاست کی طرف چلے آئے اور 1958ء میں رکن قومی اسمبلی منتخب ہوکر چند دن کے لیے مرکزی کابینہ میں وزیر بھی رہے۔

اس کے بعد ایوب خان کا دور ایسا تھا جس میں اکثر بلوچ رہنما پس دیوار زنداں رہے، ان ہی میں نواب اکبر بگٹی بھی تھے۔ 1970ء کے عام انتخابات میں بلوچستان میں نیشنل عوامی پارٹی کی کامیابی میں اہم کردار ادا کیا۔ جس کے بعد 1973ء سے 1974ء کے درمیان ایک سال کے لیے صوبہ بلوچستان کے گورنر بھی رہے۔ بعد ازاں وہ قومی سیاست میں بالواسطہ یا بلاواسطہ متحرک کردار رہے۔

1988ء کے عام انتخابات میں بلوچستان نیشنل الائنس کے نام سے سیاسی جماعت تشکیل دی اور 1989ء - 1990ء کے دوران ایک سال کے لیے بلوچستان کے وزیر اعلیٰ بھی رہے۔ پھر 1990ء میں جمہوری وطن پارٹی کے نام سے ایک جماعت تشکیل دے کر صوبائی اسمبلی کے بلا مقابلہ رکن منتخب ہوئے۔ 1993ء اور 1997ء کے عام انتخابات میں رکن قومی اسمبلی منتخب ہوئے۔

اسی دوران ان کے وفاقی حکومت سے اختلافات بھی رہے لیکن 2003ء میں جب پرویز مشرف نے سوئی میں چھاؤنی بنانے کا اعلان کیا تو ان کے اختلافات کی کشتی پر گویا آخری تنکا ثابت ہوا۔ اور پھر انہوں نے وفاقی حکومت کے خلاف مسلح جدوجہد کا آغاز کرتے ہوئے پہاڑوں کی جانب نکل جانے کا اعلان کیا۔ 2005ء میں ایک ناخوشگوار واقعے کی وجہ سے بگٹی قبیلے کے حامیوں اور سرکاری فورسز میں باقاعدہ جھڑپیں زور پکڑ گئیں۔ بالآخر 26 اگست 2006ء کو جب کچھ اہلکار ان سے مذاکرات کی غرض سے ان کے پاس ایک غار میں پہنچے اسی وقت پورا غار ایک زوردار دھماکے سے تباہ ہو گیا اور نواب اکبر بگٹی ان اہلکاروں سمیت اسی غار میں زندہ دفن ہو گئے۔ چند دن بعد حکومت نے اسی ملبے سے اکبر بگٹی کی نعش برآمد کرنے کے بعد ایک تابوت میں بند کر کے ڈیرہ بگٹی میں دفن کر دی۔

جنرل محمد ضیاء الحق

یوں تو پاکستانی حکمرانوں میں ایک سے ایک منفرد شخصیت نظر آتی ہے لیکن سابق صدر جنرل محمد ضیاء الحق وہ شخصیت ہیں جنہوں نے پاکستانی سیاست اور ریاستی امور میں اتنے گہرے اثرات چھوڑے ہیں کہ آج تک کٹر مخالفین اور پکے حامیوں کی ایک واضح تعداد موجود ہے۔

جنرل ضیاء الحق 12 اگست 1924ء کو جالندھر کے ایک غریب کسان گھرانے میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے جالندھر اور دہلی سے حصول علم کے بعد 1945ء میں فوج میں کمیشن حاصل کیا۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران وہ برما، ملایا اور انڈونیشیا میں فوجی خدمات سرانجام دیتے رہے۔ قیام پاکستان کے بعد انہوں نے پاک فوج میں شمولیت اختیار کی۔ وہ 1964ء میں لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے تک ترقی پا چکے تھے۔ انہوں نے 1960ء میں کیولری رجمنٹ کی قیادت سنبھالی اس کے علاوہ اردن کی شاہی فوج میں بھی خدمات انجام دیتے رہے۔ 1969ء میں آرمرڈ ڈویژن کے کرنل اسٹاف اور پھر بریگیڈیئر بنے۔ 1973ء میں میجر

جنرل اور 1975ء میں لیفٹیننٹ جنرل اور کور کمانڈر بنے۔ 1976ء میں فل جنرل کے عہدے پر ترقی پا کر چیف آف آرمی اسٹاف بنے۔

1977ء کے عام انتخابات کے بعد انتخابی دھاندلیوں کی باعث ملک بھر میں سیاسی انتشار برپا ہو گیا۔ حکومت اور حزب اختلاف میں تحت محاذ آرائی خونریز ہنگاموں میں بدل گئی۔ چار ماہ کی اس شدید بدنظمی اور ہنگامہ آرائی کے دوران حکومت اور حزب اختلاف کے درمیان مذاکرات کا سلسلہ چلتا اور ٹوٹتا رہا۔ حتیٰ کہ 5 جولائی 1977ء کو جنرل ضیاء الحق نے حکومت کو رخصت کر کے ملک میں مارشل لاء نافذ کر دیا۔ اور قوم سے 90 روز میں منصفانہ اور آزادانہ انتخابات کروا کے فوجوں کو واپس بیرکوں میں لے جانے کا وعدہ کیا۔ لیکن اس کے بعد حالات نے کچھ ایسا رخ اختیار کیا کہ 90 روز کا یہ وعدہ وفا نہ ہوا اور بات گیارہ سال تک چلی گئی۔

اسی دوران معزول وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کو گرفتار کر کے ایک مقدمہ قتل میں ہائیکورٹ کے ذریعے ان کو سزائے موت سنائی گئی، پھر سپریم کورٹ نے اس سزا کی توثیق کر دی۔ یوں 4 اپریل 1979ء کو بھٹو کو تختہ دار پر لٹکا دیا گیا۔ اس کے بعد جنرل ضیاء کے اقتدار کو کوئی چیلنج درپیش نہ رہا اور وہ پورے سکون سے حکومت کرتے رہے۔

اپنے اقتدار کو قانونی جواز دینے کے لیے انہوں نے دسمبر 1984ء میں اپنے حق میں ریفرنڈم بھی کروایا اور اس میں بھاری اکثریت سے کامیابی حاصل کی۔ بعد میں 1985ء میں غیر جماعتی بنیاد پر عام انتخابات منعقد کروائے جن کا پاکستان پیپلز پارٹی نے بائیکاٹ کیا اور اس کے نتیجے میں محمد خان جونیجو وزیر اعظم بنے۔ وزیر اعظم جونیجو نے جنرل ضیاء کی رضامندی سے 30 دسمبر 1985ء کو اس شرط پر ملک سے مارشل لاء اٹھانے کا اعلان کر دیا کہ جنرل ضیاء بدستور

آرمی چیف اور صدر مملکت کے عہدے پر فائز رہیں گے۔

اسی دوران افغانستان میں روسی فوجیں گھس چکی تھیں، جس کا مقابلہ کرنے کے لیے جنرل ضیاء نے امریکا سمیت دیگر بین الاقوامی قوتوں کو ساتھ ملا کر افغان جہاد کا آغاز کردیا۔ اس افغان جہاد نے جہاں ایک طرف جنرل ضیاء کے اقتدار کو طول بخشا وہیں اسی مسئلے پر ان کے اور وزیر اعظم جونیجو کے درمیان اختلافات بھی شروع کردیے اور نتیجہ یہ نکلا کہ 29 مئی 1988ء کو صدر ضیاء نے اپنے آئینی اختیارات کا استعمال کرتے ہوئے جونیجو حکومت کا خاتمہ کیا اور اسمبلیوں کو بھی تحلیل کردیا۔ اس کے بعد جنرل ضیاء نے متبادل سیاسی قیادت کے لیے بھی سرگرمیاں شروع کردیں۔

ایک طرف یہ حالات چل رہے تھے اور دوسری طرف 17 اگست 1988ء کو جنرل ضیاء بہاولپور میں امریکی ٹینکوں کا ایک مظاہرہ دیکھ کر واپس اسلام آباد کے لیے روانہ ہوئے ہی تھے کہ 3 بج کر 48 منٹ پر ان کا طیارہ بہاولپور کے قریبی قصبے بستی لال کمال کے قریب نامعلوم وجوہات کی بناء پر گر کر تباہ ہوگیا۔ اس وقت جہاز میں ان کے ہمراہ چیئرمین جوائنٹ چیفس آف اسٹاف کمیٹی جنرل اختر عبدالرحمان، لیفٹیننٹ جنرل افضال کے علاوہ امریکی سفیر آرنلڈ رافیل اور امریکی بریگیڈیئر جنرل واسم سمیت 31 اعلیٰ فوجی عہدیدار اور عملے کے دیگر افراد سوار تھے جو سب کے سب اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ یوں پاکستانی حکمرانوں کا یہ منفرد کردار تاریخ کے صفحات میں گم ہوگیا۔

جہاز کے اس حادثے کے فوراً بعد اس وقت کے چیئرمین سینیٹ غلام اسحٰق خان نے آئین کے مطابق عہدۂ صدارت سنبھالا اور وائس چیف آف آرمی اسٹاف جنرل مرزا اسلم بیگ کو افواج پاکستان کا سربراہ مقرر کیا۔ حادثے کے تین روز بعد 20 اگست 1988ء کو جنرل ضیاء کی باقیات کو شاہ فیصل مسجد اسلام آباد سے متصل چمن کے احاطے میں سپرد خاک کردیا گیا۔ ان کے جنازے میں لاکھوں کی تعداد میں افراد نے شرکت کی۔

اگرچہ بعد میں پاک فضائیہ نے ایک تحقیقاتی رپورٹ شائع کی جس کا لب لباب یہ تھا کہ "امکان یہ ہے کہ یہ تخریب کاری کا ایک گھناؤنا واقعہ تھا، جو طیارے کے اندر ہی رونما ہوا جس کی باعث طیارہ تباہ ہوا" لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس حادثے کی وجوہات اور ذمہ داران پر آج تک پردہ پڑا ہوا ہے اور بظاہر ایسا نظر بھی نہیں آتا ہے کہ کبھی اس راز سے پردہ اٹھ پائے گا۔

احمد فراز

ہم خلد سے نکل تو گئے ہیں پر اے خدا
اتنے سے واقعے کا فسانہ بہت ہوا

یا

رنجش ہی سہی دل ہی دکھانے کے لیے آ
آ پھر سے مجھے چھوڑ کے جانے کے لیے آ

یا

شکوۂ ظلمت شب سے تو کہیں بہتر تھا
اپنے حصے کی کوئی شمع جلاتے جاتے

حسن وعشق کے نازک جذبات اور انقلاب کے درس سے مزین یہ خوبصورت اشعار نازک جذبات اور قومی احساسات کے حسین امتزاج سے بھرپور شاعر احمد فراز کے علاوہ اور کس کے ہوسکتے ہیں۔ فراز کا اصل نام تو سید احمد شاہ تھا لیکن وہ نازک اور قومی دلوں میں یکساں طور پر احمد فراز کے نام سے دھڑکتے رہے۔ وہ 12 جنوری 1931ء کو نوشہرہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سید شاہ محمد برق کوہاٹی بھی فارسی زبان کے معروف شاعر تھے۔

فراز نے اردو، فارسی اور انگریزی ادب میں ایم اے کرنے کے بعد ریڈیو پاکستان سے اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا اور بعد میں پشاور یونیورسٹی سے بطور لیکچرر منسلک ہوگئے۔ آگے چل کر متعدد سرکاری اداروں میں اہم عہدوں پر بھی فائز رہے جن میں پاکستان نیشنل سینٹر میں بطور ریذیڈنٹ ڈائریکٹر پشاور، اکادمی ادبیات پاکستان کے پہلے مینیجنگ ڈائریکٹر اور نیشنل بک فاؤنڈیشن میں بطور مینیجنگ ڈائریکٹر شامل ہیں۔

یوں تو احمد فراز کی شاعری رومان پرور شاعری میں شمار ہوتی ہے لیکن ان کی ایک واضح شناخت معاشرے کی ناانصافیوں کے خلاف ایک مزاحمتی شاعری بھی یکساں ہے۔ اسی پاداش میں ان کو جلاوطنی سمیت مختلف سزائیں بھی جھیلنی

بڑے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ادب میں ان کا مقام اتنا بڑا ہے کہ حکومت کی جانب سے ان کو ستارۂ امتیاز اور ہلال امتیاز سے بھی نوازا گیا۔ اس کے علاوہ ان کو آدم جی ادبی ایوارڈ اور کمال فن ایوارڈ بھی ملا۔ ہلال امتیاز انہوں نے صدر مشرف کی پالیسیوں سے اختلاف کی باعث حکومت کو واپس کر دیا۔ ان کو جامعہ کراچی کی جانب سے پی ایچ ڈی کی اعزازی ڈگری بھی عطا کی گئی۔

ان کے مجموعہ کلام میں تنہا تنہا، درد آشوب، نایافت، شب خون، میرے خواب ریزہ ریزہ، جاناں جاناں، بے آواز گلی کوچوں میں، نابینا شہر میں آئینہ، پس انداز، غزل بہانہ کروں وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ وہ 25 اگست 2008ء کو اسلام آباد میں انتقال کر گئے اور وہیں مرکزی قبرستان میں آسودۂ خاک ہیں۔ ان کے یہ اشعار بھی کتنے مقبول ہیں اس کا آپ کو یقیناً اندازہ ہوگا۔

تم تکلف کو بھی اخلاص سمجھتے ہو فراز
دوست ہوتا نہیں ہر ہاتھ ملانے والا

ابھی ابھی وہ ملا تھا ہزار باتیں کیں
ابھی ابھی وہ گیا ہے مگر زمانہ ہوا

طاہرہ نقوی

اگر کبھی ایسے فنکاروں کی فہرست تیار ہوئی جنہوں نے جواں عمری میں اپنے کیریئر کا آغاز کیا اور مختصر وقت میں کامیابی کے جھنڈے بھی گاڑے، فن کی سلطنت پر راج بھی کیا اور پھر جوانمرگی میں ہی اپنی یادوں کے بجھتے چراغ چھوڑ کر اپنی زندگی کی شمع بھی بجھا گئے۔ ایسے فنکاروں کی فہرست میں طاہرہ نقوی کا نام موجود نہ ہو یہ ممکن ہی نہیں ہے۔

طاہرہ نقوی 20 اگست 1956ء کو سیالکوٹ کی تحصیل ڈسکہ کے ایک نواحی گاؤں میں پیدا ہوئیں۔ انہوں نے ریڈیو میں صداکاری سے اپنے فنی سفر کا آغاز کیا، جلد ہی ٹی وی کے ڈراموں میں اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھانے لگیں۔ یوں تو ان کے تقریباً تمام ہی ڈرامے پسند کیے گئے لیکن طویل دورانیے کا کھیل "زندگی بندگی" ان کے یادگار ڈراموں میں سے ہے۔ ان کو سب سے زیادہ پذیرائی پی ٹی وی کی مشہور ٹی وی سیریز "وارث" کے کردار میں ملی۔ اس میں انہوں نے اپنا کردار اتنا ڈوب کر کیا کہ حقیقت کا گمان ہونے لگا۔ 1981ء میں ان کو بہترین اداکارہ کے لیے پی ٹی وی کا ایوارڈ بھی دیا گیا۔

انہوں نے دو فلموں بدلتے موسم اور میاں بیوی راضی میں بھی کام کیا لیکن ان کا مزاج فلمی دنیا سے ہم آہنگ نہ ہونے کی وجہ سے انہوں نے آیندہ کسی بھی فلم میں کام کرنے سے معذرت کر لی۔ ان کو بہترین اداکارہ کا ایوارڈ تو 1981ء میں ملا لیکن 1982ء میں شدید بیمار ہو گئیں۔ اسی بیماری کے علاج کی خاطر وہ سی ایم ایچ راولپنڈی میں داخل ہو گئیں جہاں انہیں کینسر کا مرض تشخیص ہوا۔ بالآخر اسی موذی مرض نے 2 جون 1982ء کو ان کی جان لے لی اور وہ لاہور میں میاں میر کے مزار کے احاطے میں آسودۂ خاک ہوئیں۔

نازیہ حسن

1980ء کی دہائی میں اردو موسیقی سے شغف رکھنے والے تقریباً ہر فرد کے لبوں پر بھارتی فلم "قربانی" کا یہ نغمہ گنگنا رہا تھا "آپ جیسا کوئی میری زندگی میں آئے"۔ اسی نغمے نے گلوکارہ نازیہ حسن کو ہفتوں اور دنوں میں نہیں بلکہ گھنٹوں میں شہرت کی ان بلندیوں پر پہنچا دیا جن کا اتنی کم عمری میں کوئی شاید ہی تصور کر پائے۔ 3 اپریل 1965ء کو کراچی میں پیدا ہونے والی اس کم سن گلوکارہ نے ٹی وی کے پروگرام "سنگ سنگ چلیں" سے اپنے فنی کیریئر کا آغاز کیا، اس پروگرام میں اس کے بھائی زوہیب حسن بھی اس کے ہمراہ اپنے فن کا مظاہرہ کرتے تھے۔

ان کا گایا ہوا فلم قربانی کا گانا دراصل ان کی فنی زندگی میں سائونڈ بیریئر کراس کرنے کی اہمیت رکھتا ہے، اس کی کامیابی کے بعد انہوں نے اپنے بھائی زوہیب حسن کے ہمراہ اپنی البم "ڈسکو دیوانے" ریلیز کیا۔ اس البم نے پاکستان کی پوپ موسیقی میں نئی راہیں متعین کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس کی باعث پاکستان کی پوپ موسیقی میں جو نکھار آیا وہ شاید ہی کسی البم سے آیا ہو۔ اس کے بعد ان دونوں بہن بھائیوں نے "بوم بوم" اور "ینگ ترنگ" ریلیز کیے جس نے ان کی شہرت کو چار چاند لگا دیے۔ اگرچہ ان

دونوں بہن بھائیوں کی پرفارمنس پر بعض حلقوں کی جانب سے اعتراض بھی ہوا لیکن حقیقت یہی ہے کہ ان اعتراضات کے باوجود انہوں نے فن کا میابیوں کے سفر کو جاری رکھا۔

فنی میدان میں کامیابیوں کے جھنڈے گاڑنے والی اس معروف گلوکارہ کی ازدواجی زندگی کوئی اچھی مثال پیش نہ کر سکی۔ 1995ء میں معروف کاروباری شخصیت مرزا اشتیاق بیگ سے شادی کے کچھ ہی عرصے بعد ان کی شوہر سے اختلافات کی خبریں سامنے آنا شروع ہو گئیں لیکن بعد میں ان کی سرطان میں مبتلا ہونے کی زیادہ اندوہناک خبر نے ازدواجی اختلافات کی خبروں کو پس پردہ کر دیا۔ بالآخر 13 اگست 2000ء کو پاکستانی پوپ موسیقی کا یہ درخشندہ ستارہ لندن میں غروب ہوا اور وہیں نارتھ لندن کے مسلم قبرستان میں سپرد خاک ہوا۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

اردو ادب میں جب بھی ہمہ جہت شخصیات کی فہرست مرتب ہوگی اس میں یقیناً ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا نام سرفہرست ہوگا۔ وہ ایک معتبر محقق، بہترین نقاد، عمدہ ادیب اور ایک اچھے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے استاد بھی تھے۔ اردو ادب کے تحقیقی میدان میں انہوں نے درجنوں کتب تحریر کیں۔ ان کی زیر نگرانی متعدد افراد نے اپنی پی ایچ ڈی کے مقالے بھی تحریر کیے۔

ان کا اصل نام سید دلدار علی تھا، لیکن فرمان فتح پوری کا قلمی نام اختیار کیا اور اسی نام سے معروف ہوئے۔ وہ بھارت کے صوبہ اترپردیش کے شہر فتح پور ہسوہ میں 26 جنوری 1926ء کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم میں ناظرہ قرآن مجید اور فارسی کی ابتدائی کتب مثلاً گلستان و بوستان وغیرہ اپنے والد سید عاشق علی سے پڑھیں۔ 1946ء میں والد کے انتقال کے بعد سرکاری مدرسے میں عصری علوم کے حصول کے لیے داخلہ لیا۔ عصری علوم میں اچھی عمدہ کارکردگی کا مظاہرہ کیا کہ مدرسہ اسلامیہ فتح پور سے میٹرک کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کرتے ہوئے بورڈ میں ساتویں پوزیشن حاصل کی۔ اس کے بعد الٰہ آباد بورڈ سے انٹرمیڈیٹ اور آگرہ یونیورسٹی سے گریجویشن مکمل کی۔

وہ قیام پاکستان کے بعد کراچی چلے آئے اور یہاں اپنی تعلیمی سرگرمیاں جاری رکھتے ہوئے 1958ء میں جامعہ کراچی سے ایم اے اردو کے علاوہ ایل ایل بی بھی امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔ اس کے بعد جامعہ کراچی سے ہی اردو میں منظوم داستانوں پر پی ایچ ڈی مکمل کیا۔ بعد میں 1974ء میں جامعہ کراچی سے اردو ادب میں ڈی لٹ کی ڈگری حاصل کی۔ وہ صرف جامعہ کراچی ہی نہیں بلکہ پورے پاکستان میں اردو ادب میں ڈی لٹ کرنے والی پہلی شخصیت تھے۔

علمی میدان میں سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ وہ جامعہ کراچی میں تدریسی فرائض بھی انجام دیتے رہے۔ اس کے ساتھ ہی متعدد علمی و ادبی تنظیموں اور اداروں کے رکن بھی رہے۔ علامہ نیاز فتح پوری نے جو ادبی جریدہ ”نگار“ 1922ء میں آگرہ سے جاری کیا تھا اور بعد میں یہ جریدہ لکھنؤ اور بھوپال سے شائع ہوتا رہا۔ آپ علامہ نیاز فتح پوری کے بہت ہی مقرب شاگرد بھی تھے۔ اسی لیے آپ نے علامہ نیاز فتح پوری کی اجازت سے یہ جریدہ کراچی سے 1962ء میں جاری کیا اور یہ ڈاکٹر صاحب کی وفات تک مسلسل جاری رہا۔ اس دوران متعدد دیگر ادبی جرائد بھی جاری ہوئے لیکن جو اہمیت ”نگار“ کی رہی وہ مقام دوسرا کوئی جریدہ حاصل نہ کر پایا۔

ان کی معروف کتب میں اردو کی منظوم داستانیں، مرزا شوق کی مثنویاں، قمر زمانی بیگم اور اردو زبان، اردو املاء اور اردو رسم الخط کی نعتیہ شاعری، اقبال سب کے لیے، اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری وغیرہ شامل ہیں۔ ان سے حکومت پاکستان نے علامہ اقبال اور قائداعظم کی صد سالہ تقریبات کے موقع پر ”اردو ہندی تنازعہ“ اور ”اقبال

"سب کے لیے" بھی خصوصی طور پر تحریر کروائیں۔ وہ اردو ڈکشنری بورڈ کے صدر اور چیف ایڈیٹر بھی رہے۔

ان کی علمی ادبی خدمات کے صلے میں حکومت پاکستان نے ان کو ستارۂ امتیاز سے بھی نوازا۔ ان کا 3 اگست 2013ء کو کراچی میں انتقال ہوا اور وہ وہیں آسودۂ خاک ہیں۔

علامہ عارف حسین الحسینی

یوں تو پاکستان میں مختلف فقہ کے کئی علماء اور صاحبانِ علم نے پاکستان کے ساتھ ساتھ دنیا بھر میں اپنے علم کی وجہ سے بہت نام کمایا لیکن فقہ جعفریہ میں پاکستانی علماء میں جو مقام علامہ عارف حسین الحسینی کا ہے وہ شاید ہی کسی دوسرے اہلِ تشیع عالم کا ہو۔ اگر یہ کہا جائے کہ پاکستان میں اہل تشیع کو ایک متحدہ پلیٹ فارم پر جمع [illegible] معاملات میں اپنے فقہ کی بنیاد پر جداگانہ شناخت قائم کرنے میں ان کا بہت بڑا کردار ہے تو یہ دعویٰ ہرگز غلط نہ ہوگا۔

وہ پاکستان کے قبائلی علاقے کرم ایجنسی کے ہیڈ کوارٹر پارہ چنار کے قریب پاک افغان بارڈر سے متصل ایک گاؤں پیواڑ میں 25 نومبر 1946ء کو پیدا ہوئے۔ [illegible] تعلیم علاقائی رواج کے مطابق اپنے والد سے حاصل کرنے کے دوران ہی پیواڑ کے پرائمری اسکول میں داخل ہو گئے۔ اس کے بعد پارہ چنار کے ہائی اسکول میں میٹرک تک تعلیم حاصل کی۔ میٹرک کے بعد گھر والے ان کو کالج میں داخل کروانا چاہتے تھے، لیکن انہوں نے اپنے دینی رجحان کی باعث 1962ء میں پارہ چنار میں ہی مدرسۂ جعفریہ میں داخلہ لیا۔ یہاں سے تعلیم کی تکمیل کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے پہلے لاہور کی جامعہ المنتظر میں داخلہ لیا، اس کے بعد نجف چلے گئے۔

اس زمانے میں ایرانی مذہبی رہنما آیت اللہ خمینی نجف میں جلاوطنی کی زندگی گزار رہے تھے اور یہ علامہ عارف الحسینی کے لیے بہترین موقع ثابت ہوا جب انہوں نے براہ راست آیت اللہ خمینی سے اکتسابِ فیض کرنا شروع کیا۔ حصولِ علم کے ساتھ ساتھ وہ آیت اللہ خمینی کی سیاسی جدوجہد میں شامل ہو کر سیاسی تعلیم بھی حاصل کرتے رہے۔ اسی زمانے میں عراق کے حکمرانوں نے آیت اللہ خمینی کے خلاف کارروائی کا آغاز کیا تو علامہ عارف الحسینی نے عراقی حکومت کے خلاف جدوجہد میں عملی حصہ بھی لیا اور وہاں گرفتار بھی ہوئے۔ اس کے بعد 1973ء میں پاکستان واپس آئے، اور جب 1974ء میں واپس نجف جانا چاہا تو عراقی حکومت نے ان کے داخلے پر پابندی عائد کر دی، لہٰذا وہ کچھ عرصے بعد ایران کے علمی مرکز قم چلے گئے۔ انہوں نے قم میں بھی سیاسی جدوجہد میں حصہ لینا نہ چھوڑا بالآخر ایرانی شہنشاہ کی خفیہ پولیس ساواک کے ہاتھوں گرفتار ہوئے۔ آخر کار 1977ء میں مستقل قیام کی خاطر پاکستان چلے آئے۔

پاکستان آ کر تحریک نفاذ فقہ جعفریہ کے پرچم تلے انہوں نے اپنی علمی و سیاسی جدوجہد کا آغاز کیا۔ 1984ء میں مفتی جعفر حسین کے انتقال کے بعد تحریک نفاذ فقہ جعفریہ کی باگ ڈور سنبھالی اور پاکستان کے متحرک ترین مذہبی و سیاسی قائدین میں شمار ہونے لگے۔ اس زمانے میں پاکستان کے صدر ضیاء الحق کے خلاف سیاسی تحریک اپنی پوری رفتار سے جاری تھی اور علامہ عارف الحسینی نے اس تحریک میں بھی بھرپور کردار ادا کرتے ہوئے پاکستان میں فقہ جعفریہ کی جداگانہ سیاسی شناخت کو مہمیز کیا۔ بالآخر 5 اگست 1988ء کو انہیں فائرنگ کر کے سفرِ آخرت پر روانہ کر دیا گیا۔

رئیس فروغ

حسن کو حسن بنانے میں مرا ہاتھ بھی ہے
آپ مجھ کو نظر انداز نہیں کر سکتے

یہ شعر ہے منفرد سوچ کے حامل معروف شاعر جناب رئیس فروغ کا۔ جناب رئیس فروغ کا شمار ان شعراء کرام میں ہوتا ہے جنہوں نے ساری عمر شاعری میں صرف الفاظ کی ریاضت ہی نہیں کی بلکہ اپنی ایک جداگانہ حیثیت بھی بنائی۔ وہ دورِ جدید کی اشیاء کو بھی اپنے اظہار کے لیے بخوبی استعمال کیا کرتے تھے۔ ایک جگہ کہتے ہیں:

تیزی سے دوڑتے ہیں ٹرک بھی لدے ہوئے
میں بھی بھرا ہوا ہوں انتقام سے

پھر ایک جگہ کہتے ہیں:

کیا جانیے جبر ہے یا اختیار ہے
دفتر میں تھوڑی دیر جو کرسی نشین ہوں

فروغ صاحب کا اصل نام سید محمد یونس حسن تھا لیکن انہوں نے انہوں نے رئیس فروغ کا قلمی نام اختیار کیا اور یہی ان کی شناخت بنا۔ آپ بھارت کے صوبہ اترپردیش کے شہر مراد آباد میں 15 فروری 1926ء کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے حصول کے بعد علاقہ کے ماحول جو کہ جگر مراد آبادی کی باعث خاصہ ادبی تھا انہوں نے بھی علمی و ادبی مجالس میں شرکت کرنی شروع کر دی۔ اور یہیں سے آپ کے شعر و ادب کے ذوق کو جلا ملنی شروع ہوگئی۔

آپ قیام پاکستان کے بعد پہلے تو ٹھٹھہ میں کچھ عرصہ قیام کیا لیکن بعد میں وہاں کچھ اچھا مستقبل نہ پاتے ہوئے کراچی چلے آئے۔ کراچی آکر انہوں نے کراچی پورٹ ٹرسٹ میں ملازمت اختیار کی۔ اسی زمانے میں کے پی ٹی میں ہی اسد محمد خان بھی موجود تھے۔ ان دو بڑی ادبی شخصیات کی موجودگی نے کے پی ٹی میں بھی ایک اچھا ادبی ماحول پیدا کر دیا، اور یہاں وقتاً فوقتاً مختلف قسم کی ادبی تقریبات کے علاوہ محافل مشاعرہ منعقد ہونے لگیں۔ ادبی تقریبات کے علاوہ کے پی ٹی کے مجلے کی ادارت کی ذمہ داریاں بھی نبھاتے رہے۔ کے پی ٹی میں چندرہ سال ملازمت کے بعد ان کو اسد محمد خان کے ہمراہ ہی ریڈیو پاکستان میں ملازمت کا موقع مل گیا۔ ریڈیو پاکستان کی ملازمت ان کے لیے ایسی ہی ثابت ہوئی جیسے کسی تالاب کی مچھلی کو دریا کا ٹھنڈا ٹھنڈا اور وافر پانی میسر آجائے۔ یہاں سلیم احمد، قمر جمیل اور رضی اختر شوق وغیرہ کا ساتھ ان کے ادبی ذوق کی تسکین میں بہت معاون ثابت ہوا۔ اور اس کے بعد وہ آخر وقت تک ریڈیو پاکستان سے وابستہ رہے۔

وہ اپنے ریڈیو پاکستان کے قیام کے زمانے میں ہی اپنا مجموعہ کلام "رات بہت ہوا چلی" مرتب کر رہے کہ اسی دوران 5 اگست 1982ء ان کی زندگی کی آخری ہوا ثابت ہوئی اور دست اجل ان کو اپنے ہمراہ لے گیا۔ بعد میں ان کا یہ مجموعہ کلام شمیم نوید نے شائع کروایا۔ فروغ صاحب صرف بڑوں کے ہی نہیں بچوں کے بھی ایک عمدہ شاعر تھے۔ وہ بچوں کی نظمیں ان ہی کے انداز اور الفاظ میں کہنے پر مہارت رکھتے تھے۔ انہوں نے بچوں کے لیے نظموں کی ایک کتاب "ہم سورج، چاند، ستارے" بھی شائع کی، جس میں بچوں کے لیے دلچسپ نظمیں شامل ہیں۔ ان کی بچوں کے لیے ایک نظم کا ایک منتخب حصہ ملاحظہ کیجیے اور دیکھیے کس خوبصورتی سے وہ بچوں کو خود انہی کے الفاظ میں کتنا اچھا پیغام دیتے ہیں:

ابو کے ابو دادا میاں
اتنے بڑے؟
جی ہاں، جی ہاں......
دادا میاں کے چشمے سے
حرف بڑے ہو جاتے ہیں
ان سے مل کر لوگ بہت
لکھے پڑھے ہو جاتے ہیں
اور ہے ایسا کون سا؟

سجاد باقر رضوی

اس رقص میں شعلے کے کوئی تو سحر ہوگا
پروانے بڑی آن سے قربان گئے ہیں

اس خوبصورت شعر کے خالق سجاد باقر رضوی ایک معروف ترقی پسند شاعر تھے۔ وہ صرف ایک اچھے شاعر، مترجم اور عمدہ نقاد ہی نہیں بلکہ ترقی پسند تحریک کے نمایاں دانشوروں میں بھی شمار ہوتے تھے۔ وہ بھارتی صوبہ اترپردیش کے قصبہ پھول پور، ضلع اعظم گڑھ میں 4 اکتوبر 1928ء کو پیدا ہوئے۔ قیام پاکستان کے بعد کراچی چلے آئے اور جامعہ کراچی سے بی اے آنرز کے بعد ایم اے کیا اور پھر وہیں سے اردو میں پی ایچ ڈی کیا۔ تکمیل تعلیم کے بعد انہوں نے کراچی کو خیرآباد کہا اور لاہور چلے گئے اور اسی کو اپنا مستقل مسکن بنایا۔ آپ اسلامیہ

کالج سول لائنز اور اورینٹل کالج جامعہ پنجاب میں تدریس کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔ آپ چونکہ اردو ادب کے نمایاں نقادوں میں شمار ہوتے تھے اور آپ کی تنقید سند کا درجہ رکھتی تھی اسی لیے آپ کی تنقیدی کتب "مغرب کے تنقیدی اصول" اور "تہذیب و تخلیق" اپنے شعبے میں نمایاں مقام رکھتی ہیں۔ ان کا پی ایچ ڈی کا مقالہ "طنز و مزاح کے نظریاتی مباحث" بھی کتابی صورت میں شائع ہو چکا ہے۔

ان کے شعری مجموعوں میں تیسرا لفظ اور جوئے معانی شامل ہیں۔ اس کے علاوہ تراجم میں "داستانِ مغنیہ الشادگان" بھی کافی مشہور کتاب ہے۔ سجاد باقر رضوی کا 13 اگست 1992ء کو لاہور میں انتقال ہوا اور وہ وہیں آسودۂ خاک ہیں۔ ان کا ایک شعر ملاحظہ کیجیے:

میں سرگراں تھا ہجر کی راتوں کے قرض سے
مایوس ہو کے لوٹ گئے دن وصال کے

ڈاکٹر بی بی قریشی

انسان کیا کیا سوچتا ہے، کیسے کیسے خواب دیکھتا ہے۔ اپنے مستقبل کو سنہرا بنانے کے لیے بہترین ہدف مقرر کرتا ہے، اس ہدف کے حصول کے لیے کتنی تگ و دو اور محنت کرتا ہے، اور پھر پوری زندگی اسی میں صرف کر دیتا ہے۔ لیکن آخر میں کیا ہوگا یہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتا ہے۔ ایسا ہی ایک کردار ہماری تاریخ میں بھی موجود ہے جس کے حالات دیکھ کر سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ ہم کسی کی انفرادی بدقسمتی پر افسوس کریں، معاشرتی اقدار کی زوال پذیری پر روئیں یا اجتماعی بے حسی کا ماتم کریں۔

اکتوبر 2011ء ذرائع ابلاغ میں اس چھپی چھپائی اڑتی ہوئی خبر نے سب کی توجہ اپنی طرف مبذول کروائی کہ تقریباً 86 سالہ ایک بزرگ خاتون کو کوئی یہ کہہ کر کراچی کے ایدھی سینٹر میں چھوڑ گیا کہ اب ان سے اس بزرگ خاتون کی مزید خدمت نہیں ہو سکتی ہے۔ اور یہ بزرگ خاتون بھی کوئی عام پاکستانی عورت نہیں تھی بلکہ تحریکِ پاکستان کی ایک متحرک کارکن ڈاکٹر بی بی قریشی تھیں۔

بھارت کے شہر مراد آباد سے تعلق رکھنے والی بی بی قریشی تحریکِ پاکستان کی ایک عام سیاسی کارکن ہی نہیں تھیں بلکہ یہ پاکستان کی معاشیات میں پہلی خاتون پی ایچ ڈی اسکالر بھی تھیں۔ انہوں نے لندن اسکول آف اکنامکس سے پی ایچ ڈی کرنے کے علاوہ ڈبلن یونیورسٹی سے بھی ڈگری حاصل کی تھی۔ اس کے بعد تعلیم کو اپنا مشن بنا لیا۔ پہلے گورنمنٹ کالج راولپنڈی میں تدریس کے فرائض انجام دیتی رہیں، اس کے بعد کینیا، گھانا اور زیمبیا سمیت دنیا بھر کی کئی جامعات میں معاشیات پڑھاتی رہیں۔ گھانا میں تدریس کے دوران انہوں نے اقوامِ متحدہ کے سابق سیکریٹری جنرل کوفی عنان کو بھی معاشیات پڑھائی۔ اپنے اسی تعلیمی مشن سے لگاؤ کے باعث انہوں نے ساری عمر شادی نہیں کی۔ اتنی کامیابیوں کے بعد آخری عمر میں حالات کے باعث ان کو ایدھی ہوم میں پناہ لینی پڑی۔ اس خبر کا منظرِ عام پر آنا تھا کہ پورے ملک میں ایک ہنگامہ سا مچ گیا۔ گورنر سندھ ڈاکٹر عشرت العباد خان نے ان سے ملاقات کر کے ان سے مستقلاً گورنر ہاؤس میں منتقل ہو جانے کی درخواست کی لیکن وہ نہ مانیں۔ خدا جانے اس خبر کا اثر تھا یا معاشرتی دباؤ کہ بی بی قریشی کی رشتے دار ان کو دوبارہ اپنے ساتھ لے گئیں مگر محض تین دن بعد ہی بی بی قریشی دوبارہ ایدھی سینٹر میں یہ کہہ کر خود سے آ کر داخل ہو گئیں کہ انہیں یہاں زیادہ سکون ملتا ہے۔ 15 اگست 2012ء کو ڈاکٹر بی بی قریشی نے ایدھی سینٹر میں ہی اپنی آخری سانسیں لیں اور ان کی آخری رسومات بھی ایدھی فاؤنڈیشن نے ہی ادا کیں اور وہ ان ہی کے قبرستان میں آسودۂ خاک ہیں۔

نصرت فتح علی خان

کس کو پتا تھا کہ جالندھر سے تعلق رکھنے والے معروف قوال فتح علی خان کے گھر فیصل آباد میں 13 اکتوبر 1948ء کو پیدا ہونے والا پرویز فتح علی خان جب

کسی بزرگ کے مشورے پر اپنا نام تبدیل کر کے نصرت فتح علی خان رکھے گا تو فتح و نصرت اس کے اتنے قدم چومے گی کہ پوری دنیا کے ہر کونے میں اور ہر زبان بولنے والوں کے دلوں کی دھڑکن بن جائے گا۔

ابتداء میں تو نصرت فتح علی خان اپنے خاندان کی روایات کے مطابق روایتی انداز میں قوالیاں ہی گاتے رہے۔ اسی زمانے میں ان کی قوالی ''علی مولا علی مولا'' قوالی سے رغبت رکھنے والے ہر دل کی دھڑکن تھی۔ بعد میں انہوں نے موسیقی کے جدید رجحانات اور قوالی کے رنگ کو آپس میں ملا کر ایک جدید انداز متعارف کروایا۔ اور پھر اسی انداز میں لوک گیتوں کو گا کر موسیقی کے متوالوں کو اپنا دیوانہ بنا دیا۔

1980ء میں وہ وقت بھی آیا جب مارٹن اسکورسس کی ہدایت کاری میں بننے والی انگریزی فلم ''دی لاسٹ ٹیمپٹیشن آف دی کرائسٹ'' کا ساؤنڈ ٹریک تیار کیا اور یہ کامیابی انہیں عالمگیر شہرت پر لے گئی۔ اس کے بعد موسیقی کی دنیا میں ان کا نام کامیابی کی ضمانت سمجھا جانے لگا۔ انہوں نے متعدد بھارتی فلموں کی موسیقی ترتیب دینے کے علاوہ ان میں گلوکاری کا مظاہرہ بھی کیا۔

ان کے معروف نغمات میں دم مست قلندر مست، آفریں آفریں، اکھیاں اڈیکدیاں، سانوں اک پل چین نہ آوے اور غم ہے یا خوشی نے اپنی مقبولیت کے ریکارڈ تو قائم کیے ہی لیکن مظفر وارثی کی مشہور زمانہ حمد ''کوئی تو ہے جو نظام ہستی چلا رہا ہے'' تو آج بھی مقبول ترین حمد ہے۔ ان کو حکومت پاکستان کی طرف سے صدارتی تمغہ حسن کارکردگی کے علاوہ دنیا بھر کے متعدد ممالک کی جانب سے کئی ایوارڈ اور اعزازات سے نوازا گیا۔ وہ 16 اگست 1997ء کو لندن کے ایک اسپتال میں دماغ کی شریان پھٹ جانے کی باعث انتقال کر گئے بعدازاں ان کا جسد خاکی پاکستان لا کر ان کی جنم بھومی فیصل آباد میں سپرد خاک کیا گیا۔

انشائیہ ادب میں تخلیقی مضمون کی ایک قسم ہے جس میں کسی موضوع پر شخصی تاثرات اور خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے۔ ان شخصی تاثرات و خیالات کے مطابق انشائیے میں شگفتگی بھی آسکتی ہے اور افسردگی کو بھی موضوع بنایا جاسکتا ہے۔ اردو میں انشائیے کا باقاعدہ آغاز اردو رسالہ نویسی، فارسی انشاء پردازی اور انگریزی ایسے (essay) کے زیر اثر انیسویں صدی عیسوی کے دوسرے نصف میں ہوا اور اپنے آغاز سے موجودہ دور تک اس کے تسلسل میں کبھی کوئی وقفہ نہیں پڑا۔ قیام پاکستان سے پہلے تک کی انشائیہ نگاری کی روایت میں سرسید احمد خاں، میر ناصر علی دہلوی، مولانا محمد حسین آزاد، عبدالحلیم شرر، خلیق دہلوی، سجاد حیدر یلدرم، سر عبدالقادر، خواجہ حسن نظامی، رشید احمد صدیقی، فلک پیما، پطرس بخاری اور کرشن چندر کے نام زیادہ اہم ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد بھی انشائیہ نگاری کا سلسلہ جاری ہے۔ پاکستان کے پہلے دور میں جن انشائیہ نگاروں نے اردو انشائیے کا ایک معیار بنایا ان میں ڈاکٹر وزیر آغا، ممتاز مفتی، احمد حسین، مشتاق احمد یوسفی، داؤد رہبر، مشکور حسین یاد اور نظیر صدیقی کے نام قابل ذکر ہیں۔

دوسرے دور میں انشائیہ لکھنے والے متعدد نئے ادیب سامنے آئے۔ اسی دور میں انشائیے کی فنی و فکری شناخت پر مباحث کا زور بڑھ گیا اور یہ مباحث تا حال جاری ہیں اس دور کے انشائیہ نگاروں میں مشتاق قمر، جمیل آذر، توصیف افضل، اقبال ساغر صدیقی، انور سدید، صلاح الدین حیدر، بشیر سیفی، محمد یونس بٹ اور سلمان بٹ کے نام قابل ذکر ہیں۔

مرسلہ: نوزیہ پروین۔ جہلم

علامہ غلام حسن شاہ کاظمی — خواجہ عبدالرحیم — چوہدری رحمت علی

لفظِ پاکستان کا

خالق کون؟

عقیل عباس جعفری

مشہور یہی ہے کہ ہمارے وطن کا یہ پیارا نام چودھری رحمت علی نے رکھا ہے مگر اس معروف محقق کی یہ تحقیق کچھ اور ثابت کرتی ہے۔ اس تحقیق کے لیے محقق نے برسوں محنت کی، گویا بھوسے کے ڈھیر سے سوئی تلاش کی ہے۔ اس تحقیق نے ہر ایک کو چونکا دیا ہے۔ یقیناً آپ بھی حیران رہ جائیں گے۔

لفظ پاکستان کا خالق کون؟ چوہدری رحمت علی، خواجہ عبدالرحیم یا علامہ سید غلام حسن شاہ کاظمی۔

جب بھی لفظ پاکستان کی تخلیق کا ذکر چھڑتا ہے تان اسی بات پر آکر ٹوٹتی ہے کہ اس مملکت خداداد کا یہ خوب صورت نام چوہدری رحمت علی نے وضع کیا تھا۔ اور یہ کہ یہ نام پنجاب کا پ، شمالی مغربی سرحدی (افغانیہ) کا الف، کشمیر کا ک، سندھ کا س اور بلوچستان کے تان کا مرکب ہے۔ چوہدری رحمت علی نے یہ نام اپنے مشہور کتابچے ناؤ آر نیور (اب یا کبھی نہیں) میں تجویز کیا تھا جو 28 جنوری 1933ء کو 3 ہمبر اسٹون روڈ، کیمبرج سے شائع ہوا تھا۔ اس کتابچے پر چوہدری رحمت علی کے علاوہ محمد اسلم خان خٹک (صدر، خیبر یونین)، شیخ محمد صادق (صاحبزادہ) اور عنایت علی خان (آف چارسدہ) (سیکریٹری، خیبر یونین) نے دستخط کیے تھے۔

قیام پاکستان کے بعد بھی ایک طویل عرصے تک یہی

سمجھا جاتا رہا کہ لفظ پاکستان چوہدری رحمت علی کی تخلیق ہے۔ خود کیمبرج میں چوہدری رحمت علی کی لوح مزار پر بھی یہی تحریر ہے:

"بانی تحریک پاکستان، خالق لفظ 'پاکستان'"

مشہور صحافی اور ماہر لسانیات خالد احمد نے اپنی کتاب "دی بریج آف ورڈز" میں بھی لفظ پاکستان کی شروعات کے حوالے سے دو ابواب تحریر کیے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ پاکستان کا لفظ سب سے پہلے خواجہ عبدالرحیم نے اختراع کیا تھا جو سابق گورنر پنجاب، خواجہ طارق رحیم کے والد تھے۔ خالد احمد کا کہنا ہے انہیں یہ بات سید افضل حسین کے صاحبزادے عظیم حسین نے بتائی تھی۔ خالد احمد کے مطابق عظیم حسین کا کہنا تھا جب خواجہ عبدالرحیم لندن میں مقیم تھے تو ایک دن سر اولف کیروکی کتاب "سوویت سلطنت" کا مطالعہ کرتے ہوئے ان کی نظریں ایک نقشے پر ٹک گئیں جس میں وسطی ایشیا کی ایک ریاست کا نام قرا قل پاک ستان تحریر تھا۔ یہیں سے انہوں نے لفظ پاکستان اخذ کیا۔

خالد احمد نے اس بات کی تصدیق کے لیے سر اولف کیروکی محولہ بالا کتاب تلاش کی۔ انہیں اس کتاب کا 1950ء کا ایڈیشن دستیاب ہوا۔ خالد احمد کہتے ہیں کہ اس کتاب میں وہ نقشہ بھی موجود تھا اور اس نقشے میں وہ نام بھی موجود تھا۔

اشفاق بخاری نے اپنی کتاب چناب کلب۔ فیصل آباد میں خواجہ عبدالرحیم کے حوالے سے جو 13 نومبر 1942ء سے 7 جولائی 1945ء تک لائل پور (موجودہ فیصل آباد) کے ڈپٹی کمشنر رہے تحریر کیا ہے:

"خواجہ عبدالرحیم آئی سی ایس جب شہر میں وارد ہوئے تو اپنے ہمراہ ایک تاریخی حوالے کی پوشیدہ تاریخ بھی لائے۔ ان دنوں انڈین سول سروس کے حکام کی سول سروس اکیڈمی میں تربیت کا کچھ عرصہ انگلستان میں قیام بھی ہوا کرتا تھا۔ خواجہ صاحب کی خوش قسمتی کہ کیمبرج یونیورسٹی انگلستان میں انہیں چوہدری رحمت علی کی رفاقت میسر ہوئی۔ یہ بھی روایت ہے وہ اور ایک اور صاحب تینوں ہی ایک کمرا میں فروکش تھے۔ چوہدری صاحب ان دنوں ہندوستان میں سرگرم مسلمانوں کے لیے الگ وطن کے نام کی جستجو میں رہتے تھے۔ ایک اتفاق یہ رونما ہوا کہ خواجہ عبدالرحیم کے زیر مطالعہ وسط ایشیا کی ریاستوں کے بارے میں مشہور انگریز مستشرق سر اولف کیرو کی کتاب قرا قل پاک ستان آئی چونکہ مطالعہ کے دوران دونوں نام آپس میں جڑے ہوئے تھے اس وجہ سے ان کا دھیان اس طرف نہ گیا مگر جونہی انہوں نے کتاب کی جلد کی پشت کا بغور مطالعہ کیا تو لفظ پاک ستان کی صورت میں نئے ملک کا نام ان کے سامنے تھا۔ خواجہ صاحب نے اس انکشاف کا اظہار چوہدری رحمت علی کے سامنے کیا۔ چوہدری صاحب کو تحریک ملی انہوں نے "ناؤ اور نیور" کے عنوان سے پمفلٹ شائع کر دیا اور پاک ستان کے نام سے الگ وطن قائم کیے جانے کا مطالبہ کیا اس میں "I" (آئی) کا اضافہ بعد میں کیا گیا۔"

اشفاق بخاری کو کتاب کے نام میں تسامح ہوا ہے۔ اس کتاب کا درست نام "سوویت سلطنت" ہی تھا۔ دوسری طرف خالد احمد نے لکھا ہے کہ عظیم حسین سے یہ واقعہ سن کر انہیں قرا قل پاک قوم کے بارے میں تجسس ہوا۔ انہوں نے لکھا ہے کہ یہ ایک ترک النسل قومیت تھی جو ازبکستان کے آمو دریا کے ڈیلٹا پر رہتی تھی۔ اس خطے کو قرا قل پاک کی خود مختار ریاست کہا جاتا ہے۔ ان کی اپنی زبان اور رسم الخط ہے جس کی پہلی کتاب سوویت یونین کے دور میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں بھی اس خطے کا نام قرا قل پاک ستان لکھا ہے۔ خالد احمد مزید بتاتے ہیں کہ مشہور سائنسدان، سیاح اور مؤرخ البیرونی کا تعلق بھی اسی قوم سے تھا۔ قرا قل پاک کے معنی ہیں سیاہ ٹوپی۔ اردو میں قراقلی ٹوپی کا لفظ بھی اسے خطے سے آیا ہے۔ قرا قل پاک قوم کو یہ ریاست 1925ء میں ملی۔ آج ان کی تعداد دس لاکھ سے زائد ہے۔ خالد احمد نے خیال ظاہر کیا ہے کہ اگر خواجہ عبدالرحیم نے کسی نقشے پر قرا قل پاک ستان کا نام دیکھا ہے تو وہ ممکن ہے اولف کیرو کی کتاب نہیں بلکہ رائل سینٹرل ایشین سوسائٹی کا جاری کردہ کوئی دوسرا نقشہ ہو۔

قرا قل پاک ستان کی موجودہ جغرافیائی صورت حال کے حوالے سے انٹرنیٹ پر موجود انسائیکلو پیڈیا کی پیڈیا سے بھی مدد لی گئی۔ اس انسائیکلو پیڈیا کے مطابق یہ خطہ آج بھی موجود ہے اور ازبکستان کا حصہ ہے۔ اس کا رقبہ 160000 مربع کلو میٹر (61776 مربع میل) اور آبادی تقریباً ڈیڑھ لاکھ نفوس پر مشتمل ہے۔ یہاں جو زبان بولی جاتی ہے اس کا نام بھی قرا قل پاک ہے اور یہ زبان قازق اور ازبک زبانوں سے بھی ملتی جلتی ہے۔ یہ خطہ ارال کے کنارے واقع ہے۔

خالد احمد نے اپنے مضمون میں مشہور کرکٹر جہانگیر خان کے دو انٹرویوز کا ذکر بھی کیا ہے جس میں انہوں نے یہ بات کہی تھی کہ لفظ پاکستان چوہدری رحمت علی کی اختراع نہیں تھا۔ (ڈاکٹر محمد منیر سلیچ کی کتاب وفیات، ناموران پاکستان کے

مطابق ان میں سے ایک انٹرویو ماہنامہ سیارہ ڈائجسٹ کے مارچ 1978ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا) خالد احمد نے کے کے عزیز کی کتاب میں جہانگیر خان کے انٹرویو کا حوالہ دیا ہے۔ اس انٹرویو میں جہانگیر خان نے بتایا تھا کہ لفظ پاکستان دراصل خواجہ عبدالرحیم کا سوچا ہوا نام تھا۔ 1964ء میں میاں عبدالحق نے بھی ایک

مولانا غلام حسین کاکی اور قیام پاکستان سے اڑھائی برس قبل شائع ہونے والا ان کا اخبار

اردو روزنامے کو انٹرویو دیتے ہوئے بتایا کہ 1932ء میں کیمبرج کی نہر کے کنارے خواجہ عبدالرحیم اور میں احسن الدین چہل قدمی کر رہے تھے۔ خواجہ صاحب نے تجویز کیا کہ برصغیر کے مسلمانوں کو ایک علیحدہ ریاست کا مطالبہ کرنا چاہیے جو پنجاب، سندھ، سرحد، بلوچستان اور کشمیر پر مشتمل ہو۔ یہ خیال سبھی کو پسند آیا۔ جب علامہ اقبال سے مشورہ کیا گیا تو انہوں نے خیال سے اتفاق کرنے کے باوجود اسے گول میز کانفرنس میں پیش کرنے سے انکار کردیا۔ پھر ایک دن لندن کے گولڈرز گرین کے علاقے میں بس پر سفر کے دوران خواجہ عبدالرحیم نے چوہدری رحمت علی سے کہا کہ اس ریاست کا نام "پاکستان" ہونا چاہیے۔ چوہدری رحمت علی اس پر رضا مند ہوگئے اور بعدازاں علامہ اقبال نے بھی اس کی تائید کردی۔ جون 1970ء میں میاں عبدالحق نے روزنامہ مشرق لاہور میں بھی یہی تحریر کیا کہ لفظ پاکستان خواجہ عبدالرحیم کی تخلیق تھا اور بعدازاں اس نام کے سلسلے میں علامہ اقبال کی تائید حاصل تھی۔ میاں عبدالحق بہاولپور کے جاگیردار تھے اور ایوب خان کے دور میں قومی اسمبلی کے رکن بھی منتخب ہوئے تھے۔

خواجہ عبدالرحیم کا انتقال 5 نومبر 1974ء کو ہوا۔ وہ میانی صاحب لاہور کے قبرستان میں آسودہ خاک ہیں۔ خود انہوں نے بھی اپنی زندگی میں ایوان نوائے وقت راولپنڈی میں ایک اجلاس میں بتایا تھا کہ لفظ پاکستان کے خالق وہ ہیں اور انہوں نے یہ لفظ پہلی مرتبہ کیمبرج یونین آف اسٹوڈنٹس کے ایک اجلاس میں استعمال کیا تھا، جس کی صدارت بھی خود انہوں نے کی تھی۔

اس حوالے سے مشہور مؤرخ اور چوہدری رحمت علی کے سوانح نگار خورشید کمال (کے کے) عزیز کا موقف تھا کہ "ناؤ اور نیور" کا پورا مسودہ چوہدری رحمت علی نے تن تنہا تحریر کیا تھا۔ ان کے اس مسودے پر کوئی شخص دستخط کرنے کو تیار نہیں تھا بالآخر انہوں نے لندن میں تین ایسے طالب علم ڈھونڈ نکالے جنہوں نے ان کے ساتھ اس مسودے پر دستخط

کیے۔ انہوں نے اپنی کتاب میں کرنل (ر) جہانگیر خان کے مذکورہ بالا انٹرویوز کا حوالہ تو دیا مگر اس بحث پر کوئی حتمی رائے نہیں دی کہ لفظ پاکستان کا اصل خالق کون تھا، چوہدری رحمت علی یا خواجہ عبدالرحیم۔

یہ تو سارا تذکرہ اس بحث کا تھا جس کے مطابق لفظ پاکستان چوہدری رحمت علی یا خواجہ عبدالرحیم کا تجویز کردہ تھا۔ لفظ پاکستان کے حوالے سے ہماری تاریخ کی تمام بحثیں اسی قضیے پر آکر ختم ہوجاتی ہیں اور اس بات پر بے شمار تحقیق کی جاتی ہے کہ لفظ پاکستان پہلی مرتبہ 28 جنوری 1933ء کو جاری کیے جانے والے چوہدری رحمت علی کے کتابچے "ناؤ اور نیور" میں شائع ہوا اور یہ کہ یہ لفظ چوہدری رحمت علی یا زیادہ سے زیادہ ان کے دوست خواجہ عبدالرحیم کا وضع کردہ ہے۔ مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ حقیقت یہ نہیں ہے۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

والسلام

سید [illegible] شاہ

[illegible]

حقیقت یہ ہے کہ لفظ پاکستان 1933ء سے کوئی پانچ سال پہلے استعمال میں آچکا تھا۔ یہ لفظ کس نے اور کہاں استعمال کیا اس کے لیے ہمیں ماضی کا سفر کرنا پڑے گا اور 24 ستمبر 1905ء کو طوری شریف ضلع ایبٹ آباد میں پیدا ہونے والے علامہ سید غلام حسن شاہ کاظمی کے حالات سے آگاہی حاصل کرنی ہوگی۔

علامہ سید غلام حسن کاظمی کا تعلق کشمیر کی سرزمین سے تھا۔ انہوں نے تعلیم و تربیت کے مراحل اترچھی پورہ میں طے کیے۔ یہ مقام آج ضلع کپواڑہ کی تحصیل ہندواڑہ کہلاتی ہے، جو مقبوضہ جموں و کشمیر کی ضلع بارہ مولا میں واقع ہے۔ ابتدائی تعلیم کے حصول کے بعد علامہ سید غلام حسن شاہ کاظمی لاہور چلے گئے جہاں انہوں نے مزید تعلیم حاصل کی۔

علامہ سید غلام حسن شاہ کاظمی کے اساتذہ میں میاں جان محمد قادری، مولانا میاں عبدالرحمن نقش بندی اور مولانا اصغر علی شامل تھے۔ علامہ غلام حسن شاہ کاظمی لاہور میں اپنے ماموں سید لعل حسین کاظمی کے پاس قیام پذیر ہوئے۔ سید لعل حسین کاظمی ابتدا میں سرکاری ملازم تھے مگر اپنی سیاسی [illegible] کی وجہ سے [illegible] ہزارہ بدر کر دیے گئے تھے۔ ہزارہ بدری کی بعد سید لعل حسین کاظمی لاہور آگئے اور مولانا ظفر علی خان کے مشہور اخبار زمیندار سے وابستہ ہوگئے۔ مولانا ظفر علی خان، زمیندار کے مالک و مختار تھے، مگر اپنی صحافتی سرگرمیاں آزادانہ طور پر برقرار رکھنے کے لیے زمیندار پر بطور مدیر، کسی اور بے ضرر شخص کا نام درج کرتے تھے۔ تاکہ اگر کسی مرحلے پر ان کی کسی تحریر پر اعتراض ہو تو گرفت اس ڈمی ایڈیٹر کی ہو اور مولانا ظفر علی خان اپنا مجاہدانہ کام آزادی سے جاری رکھ سکیں۔ ڈمی ایڈیٹر کو سال دو سال کی سزا ہوجاتی جسے وہ بھی خوشی قبول کرلیتے اور زمیندار کی آزادانہ اشاعت کا سلسلہ جاری رہتا۔

چنانچہ ایسے ہی ایک موقع پر جب سید غلام حسین شاہ کاظمی، سید لعل حسین کاظمی کے پاس اقامت پذیر تھے، سید لعل حسین کاظمی جیل چلے گئے۔ ان کے جیل جانے کے بعد مولانا ظفر علی خان نے سید غلام حسن شاہ کاظمی کو زمیندار کی مجلس ادارت میں شامل کرلیا۔ اسی ادارت کے دوران انہوں نے زمیندار میں افغانستان میں انگریزوں کی پالیسیوں کے حوالے سے ایک اداریہ تحریر کیا اور حکومت وقت پر سخت تنقید کی۔ حکومت نے سید غلام حسن شاہ کاظمی کو گرفتار کرلیا اور ان کو دو سال قید بامشقت کی سزا سنائی۔ غلام حسن شاہ کاظمی نے یہ ایام اسیری لاہور، کیمبل پور (اٹک) اور ملتان کی جیلوں میں بسر کیے۔ رہائی کے بعد غلام حسن شاہ کاظمی سری نگر آگئے اور ایک اخبار حقیقت سے وابستہ ہوگئے۔ پھر وہ بمبئی چلے گئے اور ایک ناشر سلطانی اینڈ کمپنی، تاجران کتب، بھنڈی بازار کے پاس ملازم ہوگئے۔

جن دنوں مولانا غلام حسن شاہ کاظمی بمبئی میں مقیم تھے، انہی دنوں انہوں نے یکم جولائی 1928ء کو ایبٹ آباد سے ایک ہفت روزہ اخبار کے اجرا کے لیے ڈیکلریشن کی درخواست دی۔ یہ پہلا موقع تھا جب برصغیر پاک و ہند کے کسی شخص نے لفظ پاکستان استعمال کیا تھا۔

مولانا غلام حسن شاہ کاظمی صاحب نے یہ درخواست ایس اے عزیز چشتی کے توسط سے ڈپٹی کمشنر ایبٹ آباد کی خدمت میں روانہ کی تھی۔ ایس اے عزیز چشتی ضلعی مجلس اتحاد ملت ایبٹ آباد کے صدر، ضلعی مسلم لیگ ایبٹ آباد کے پروپیگنڈا سیکریٹری اور سٹی مسلم لیگ ایبٹ آباد کے سیکریٹری تھے۔ ایس اے عزیز چشتی نے اس درخواست کے ساتھ ڈپٹی کمشنر ایبٹ آباد کے نام ایک خط بھی تحریر کیا جس میں تحریر تھا:

"میں آپ کا انتہائی شکر گزار ہوں گا اگر آپ مجھے سید غلام حسن شاہ کاظمی، کی اس درخواست کے حوالے سے، جو انہوں نے ہفت روزہ اخبار پاکستان کے ڈیکلریشن کے لیے جمع کی ہے، گفتگو کے لیے چند منٹ کی ملاقات کا وقت عطا فرمادیں"۔

یہ درخواست ڈپٹی کمشنر ہزارہ کے دفتر میں یکم جولائی 1928ء کو موصول ہوئی مگر اسی روز اس جوابی خط کے ساتھ واپس لوٹا دی گئی۔

"درخواست گزار کو مطلع کیا جاتا ہے کہ یہ مسئلہ ابھی مزید تفتیش اور تحقیق کا متقاضی ہے۔ جونہی اس درخواست پر کوئی فیصلہ ہوا، درخواست گزار کو مطلع کر دیا جائے گا۔"

اس خط پر ڈپٹی کمشنر ہزارہ کے سپرنٹنڈنٹ کے دستخط موجود ہیں، مگر لگتا یہ ہے کہ سید غلام حسن شاہ کاظمی کا مجاہدانہ ماضی، درخواست کی منظوری میں رکاوٹ بن گیا اور ڈپٹی کمشنر ہزارہ نے ہفت روزہ پاکستان کے ڈیکلریشن کی درخواست مسترد کر دی۔

21 مئی 1929ء کو سید غلام حسن شاہ کاظمی کے بھائی سید میرن شاہ نے انہیں مطلع کیا کہ پاکستان اخبار کے اجرا کی درخواست مسترد کر دی گئی ہے۔ (سید میرن شاہ کا یہ خط اور اس کا لفافہ دونوں آج بھی محفوظ ہیں اور ان کا عکس اس فیچر کے ساتھ شائع کیا جا رہا ہے۔) سید میرن شاہ نے اپنے مکتوب میں تحریر کیا تھا:

"برادر مکرم! السلام علیکم و رحمتہ اللہ علیہ! شجرہ شریف چھپ گئی ہے، میں ایبٹ آباد گیا تھا، حسب الحکم پتا کیا ہے پاکستان اخبار کی درخواست کو منظوری نہیں مل سکی ہے۔ آپ کی اہلیہ کی صحت ٹھیک نہیں ہے، آغا جی نے بتایا ہے کہ وہ کافی پریشان ہیں، عزیزی نذیر حسین دوائیوں کے لیے جا رہا ہے،

یہ خط اسے سد ہا ہوں ملاحظہ سے بھیج دے گا۔ پیسے بھی دے دیئے ہیں، آپ جلدی آنے کی کوشش کریں، بہتر یہی ہے کہ چھٹی ختے ہی آجائیں۔"

"21 مئی 1929ء بابعدار سید میرن شاہ"۔

سید غلام حسن شاہ کاظمی نے جب ہفت روزہ پاکستان کے اجرا کی درخواست روانہ کی تو اس زمانے میں چوہدری رحمت علی، ہندوستان ہی میں مقیم تھے۔ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ انہوں نے کسی خبر یا کسی اور ذریعہ سے غلام حسن شاہ کاظمی کی اس درخواست یا لفظ پاکستان کے حوالے سے کچھ سنا ہو اور یہ لفظ ان کے حافظے کا حصہ بن گیا ہو۔ جنوری 1933ء میں چوہدری رحمت علی نے اپنے مشہور کتابچے ناؤ اور نیور میں یہ لفظ پہلی بار استعمال کیا اور یوں دنیا انہی کو اس لفظ کا خالق سمجھ بیٹھی۔

سید غلام حسن شاہ کاظمی اپنی پہلی درخواست کے استرداد سے مایوس نہیں ہوئے اور انہوں نے 1935ء میں انڈیا ایکٹ کے نفاذ کے بعد ایک مرتبہ پھر ہفت روزہ پاکستان کے اجرا کی درخواست داخل کردی۔ اس مرتبہ وہ کامیاب رہے اور یوں یکم مئی 1936ء کو ایبٹ آباد سے ہفت روزہ پاکستان کی اشاعت کا آغاز ہوگیا۔ (اس پہلے شمارے کی لوح کا عکس اس فیچر کے ساتھ شائع کیا جارہا ہے)۔

سید غلام حسن شاہ کاظمی نے ہفت روزہ پاکستان کے دوسرے شمارے (مورخہ 8 مئی 1936ء) میں ہفت روزہ کا نام پاکستان رکھنے کا سبب ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

"اخبار کا نام ہم نے پاکستان کیوں پسند کیا؟ یہ نام اس لیے اختیار کیا گیا کہ غیر مسلم اس سے بہت گھبراتے ہیں... انہیں بتایا جائے یہ کوئی خطرہ نہیں۔ تم نہیں۔ انہیں بھی فکر کی دعوت دینا مقصود ہے تاکہ جو نامانوسی انہیں پاکستان سے ہے مانوسیت سے بدل سکے"۔

اس کے پہلے شمارے میں پاکستان اخبار جاری کرنے کے حسب ذیل اغراض و مقاصد بیان کیے گئے۔

"ہفت روزہ پاکستان کا عقیدہ ہے کہ اسلامی تہذیب، تمدن، سیاست و معاشرت اور اخلاق و روحانیت مقدس مذہب کے اجزا ہیں۔ عصر حاضر کے دریا طن جہد نے جو نیا عقیدہ وضع کیا ہے کہ مذہب جدا ہے اور سیاست جدا۔ ہمارے نزدیک یہ عقیدہ مردود ہے کیونکہ اگر مذہب اسلام سے مذکورہ فرق اجزا سے الگ کر دیے جائیں تو پھر معلوم نہیں کہ اسلام کے لیے کونسی خوبی باقی رہ جاتی ہے"۔

اخبار ہفت روزہ پاکستان کے اجرا کی مزید وضاحت ان الفاظ میں کی گئی:

"سب سے بڑا مقصد اسلام کی خدمت، مسلمانوں کا اتحاد اور ان کی سرخروئی ہے۔ اگر یہ کام ہو جاتا ہے تو زہے قسمت!"

اخبار کے پہلے ہی اداریہ میں اپنی پالیسیوں کی مزید وضاحت کرتے ہیں کہ

"کانگریس کو ہم ایک فعال اور ہندوستان کی سب سے بڑی سرمایہ دار جماعت سمجھتے ہیں اور یہ بھی جانتے ہیں کہ اس کے اجزائے ترکیبی میں ہندو پن کی ذہنیت کی بہت زیادہ کار فرمائی ہے..."

کانگریس کا ساتھ ہی یہ بھی عزم ہے کہ ہندوستان کی کمزور اور چھوٹی چھوٹی اقوام کو اکثریت والی قوم کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے۔

مسلمان، ایک قوم کی غلامی کو ترجیح نہیں دے سکتے۔ ملکی اور غیر ملکی حکومت کا سوال بے معنی ہے۔ غلامی بہرحال غلامی ہے، خواہ وہ ہندو کی ہو یا کسی اور کی... نجات و حریت اور تعمیر و فلاح کے دروازے ہم پر نہیں کھل سکتے جب تک وہ اپنی تنظیم نہ کریں"۔

ہفت روزہ پاکستان نے بہت کم زندگی پائی۔ 1937ء میں ہندوستان بھر میں انتخابات کا انعقاد ہوا۔ جس کے نتیجے میں صوبہ سرحد میں کانگریس کی حکومت قائم ہوگئی اور ڈاکٹر خان صاحب صوبہ سرحد کے وزیراعلیٰ منتخب ہوگئے۔ انہوں نے اپنی وزارت کے قائم ہوتے ہی 1938ء میں ہفت روزہ پاکستان کی ضمانت ضبط کرلی اور یوں یہ جریدہ بند ہوگیا۔

علامہ غلام حسن شاہ کاظمی نے 1939ء میں سری نگر سے شائع ہونے والے ہفت روزہ حقیقت سری نگر کی ادارت سنبھال لی۔ بعد ازاں وہ مظفرآباد کے ایک موضوع ٹھنگر شریف میں جا بسے۔ یہاں بھی انہوں نے اپنی علمی و ادبی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ علامہ غلام حسن شاہ کاظمی کو انگریزی، عربی، فارسی، اردو، ہندی، گورمکھی، پنجابی، پشتو اور ہندکو زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ انہوں نے مختلف مذہبی موضوعات اور انساب کے موضوع پر 127 کتابیں تحریر کیں، جن میں متعدد کتابیں ہنوز تشنہ طباعت ہیں۔ 14 ستمبر 1984ء کو اس مرد قلندر کا انتقال ہوگیا۔ وہ مظفرآباد کے مضافاتی گاؤں ٹھنگر شریف میں آسودہ خاک ہیں۔

صوفی

ابن کبیر

اس نے وقت سے پہلے محسوس کرلیا تھا کہ یہ حاکم وقت یہ قوت جبر سے کام لینے والے غریبوں کا استحصال کرنے والے، اونچے محلوں میں رہنے والے، غریب کسانوں کا خون چوسنے والے، اس وقت تک زمین کا سینہ چیر کر فصل اگانے والوں کا حق نہیں دیں گے جب تک اتحاد کی قوت سے جاگیرداروں پر ضرب نہ لگائی جائے۔ اس نے مساوات اسلامی کا عملی مظاہرہ کیا اور ایک بلند نعرہ لگا "زمین اس کی جو کاشت کرے"۔ یورپ و امریکا میں یہ نعرہ بہت بعد میں لگایا ... کارل مارکس اور لینن نے یہ نعرہ اسی صدی میں لگایا جبکہ اس سے ایک صدی قبل سندھ کی اس دھرتی پر یہ نعرہ گونج چکا تھا اور عملی شکل اختیار کر گیا تھا۔ اسی نعرے نے جاگیرداروں کی نیندیں چھین لیں اور سندھ کی سرزمین پر ایک خونی تاریخ رقم ہو گئی۔

سوشلزم سے بہت پہلے مساوات کا نعرہ [illegible]

ٹھنڈی ہوا درختوں کی ٹہنیوں پر جھولتی ہوئی نیچے اتری اور ندی کا بوسہ لیا۔

پرندوں میں لافانی گیت انگڑائی لینے لگے۔ انہوں نے آسمان کی سمت دیکھا۔ پر پھڑپھڑائے اور خود کو ٹھنڈی ہوا کے سپرد کر دیا۔

یہ حیدرآباد دکن پر اترنے والی ایک روشن صبح کا تذکرہ ہے۔ ابھی سلطنت آصفیہ کا قیام عمل میں نہیں آیا تھا۔ نظام الملک کے اقتدار سنبھالنے میں تھوڑا وقت تھا۔ مغلیہ سلطنت
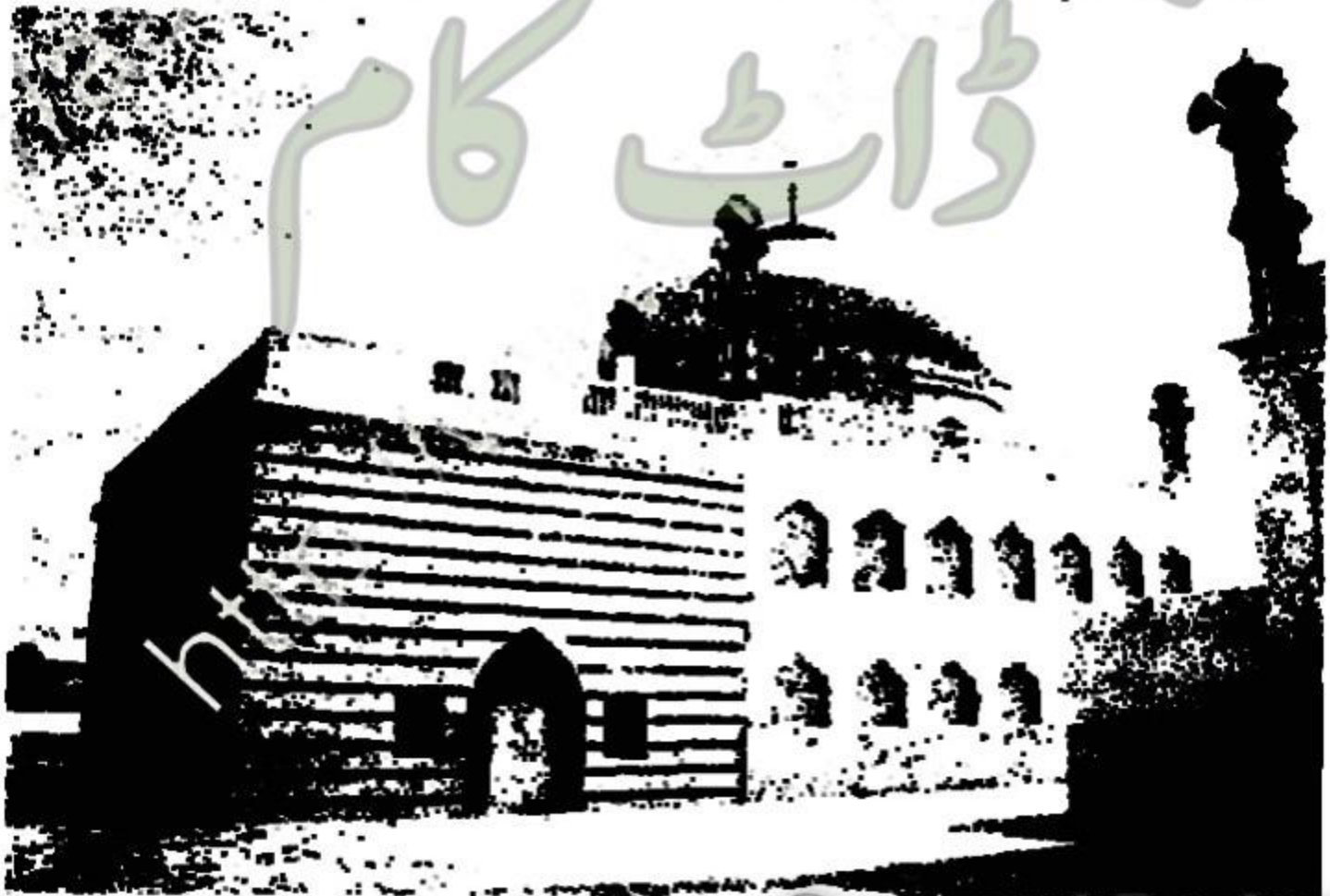
میں انتشار کی سرگوشیاں تو سنائی دیتی تھیں مگر سلطنت اتنی کمزور نہیں ہوئی تھی کہ دہلی سے حیدرآباد دست کش ہو جائے۔

تو یہ سترہویں صدی سے حیدرآباد دکن کا تذکرہ ہے جہاں بیجاپور نامی ایک سرسبز علاقے میں شاہ عبدالملک نامی عالم رہا کرتا تھا۔ جس کی عقیدت اور پرہیزگاری کی گونج سینکڑوں میل دور سندھ کی دھرتی سے ایک دیوانے کو کھینچ لائی تھی۔ یہ شاید یہ قسمت کا کرشمہ تھا، جس نے میرٹھ پور نامی گاؤں کے اُس وجیہہ نوجوان کو اُس کے سپرد کر دیا۔

اُس میں کچھ خاص تھا۔ کوئی ایسی بات جو اسے اوروں سے ممتاز کرتی۔ جس دوپہر وہ شاگرد ہونے کی درخواست لیے شاہ عبدالملک کے حجرے میں داخل ہوا تھا، آفتاب یہ ساتھ سورج کی روشنی سے بادلوں کی اوٹ میں چلا گیا، سبک ہوائیں چلنے لگیں اور شاہ کے دل میں سرگوشی ہوئی۔ "وہ شاگرد آ گیا، جو تیرا نام زندہ رکھے گا۔"

وہ کم گو شاگرد جیسے حافظ، رومی اور سعدی حفظ تھے، جس نے حیدرآباد آنے سے قبل اپنے عالم باعمل والد سے اکتساب علم کیا تھا اور پھر ملتان کے شیخ شمس الدین ملتانی کے سامنے سر جھکایا... بلا کا ذہین تھا۔

فقط دینی علوم اُس کا مطمح نظر نہیں تھے، وہ فقط روحانی بصیرت کا خواہش مند نہیں تھا۔ سیاسی امور میں بھی اُسے خاصی دلچسپی تھی۔ فلسفہ اُس کا من پسند مضمون تھا اور ہندوستان کی تاریخ کے بارے میں اس کی معلومات حیران کن تھی۔

شاہ عبدالملک صاحب علم ہونے کے ساتھ ایک سیاسی مدبر بھی تھا۔ حاکم وقت اس سے مشورے کیا کرتے۔ اُسے اپنے پہلو میں جگہ دیتے۔ تو اس دانا نے سندھ کی دھرتی سے آئے طالب علم کو صرف روحانی اور دینی علوم سے لیس نہیں کیا بلکہ دنیاوی امور کا بھی فہم عطا کیا۔

گندمی رنگت والے اس شاگرد کو ریاستی امور اور سماج کے بارے میں جاننے اور سیکھنے کا خوب موقع ملا اور وہیں حاکموں کی قربت اور فیصلہ سازوں کی جھرمٹ میں، محل آنے جانے والے راستوں سے گزرتے ہوئے اس کی آنکھوں کے سامنے اس تقسیم کی تصویر ابھری جو آنے والے برسوں میں اس کا جیون رتھ سنبھالنے والی تھی۔

تو یہ مملکت آصفیہ سے پہلے کا حیدرآباد دکن تھا جہاں ٹھنڈی ہوائیں درختوں کی ٹہنیوں پر جھولتی ہوئی اترتیں اور بہتی ندی کا بوسہ لیتیں۔

شاہ عبدالملک کے زیر سایہ علم کی منازل طے کرنے کے بعد جب وہ اگلی منزل کی سمت روانہ ہونے والا تھا، جب وہ حیدرآباد کے پنچھیوں کو الوداع کہنے والا تھا، ایک واقعہ ہوا۔

وہ شب نا موسم تھی... پھر استاد کا بلاوا آ پہنچا۔ وہ سر جھکائے حجرے میں داخل ہوا۔ سامنے اٹھ کر اپنے شاگرد کو گلے لگایا۔ دوسروں کی موجودگی میں سب کو شان کی شاہ دعوت کرتی تھی۔

"تم سا شاگرد تو پہلے کوئی نظر سے نہیں گزرا، نہ ہی پھر آئے گا۔" استاد کے ان الفاظ نے اُس عاجز کی گردن مزید جھکا دی۔

"جو ہم سکھا سکتے تھے، تم نے قلیل مدت میں سیکھ لیا۔ اب رخصتی کا وقت ہے۔ ہم تمہیں اپنا تحفہ عطا کرتے ہیں۔"

حجرے کے باہر سرسبز درختوں پر پرندے دم سادھے بیٹھے تھے۔ وہ اس منظر کو آنکھوں میں قید کرنا چاہتے تھے۔

شاگرد کی گردن اٹھی تھی۔ اس کی آنکھوں میں وہ عزم تھا جو آج سے پہلے کسی کی آنکھوں میں نظر نہیں آیا تھا۔ اس کی اگلی آواز حجرے میں گونجی۔ وہ ایک تقاضا تھا جیسے... استاد کے دل کو بیک وقت حیرت اور مسرت سے بھر دیا۔ بادل گہرے ہونے لگے۔

شاگرد نے تحفے کے بدلے استاد سے اُس کی بیش بہا جڑاؤ تلوار عطا کرنے کی درخواست کی تھی۔

"کوئی شے ایک قابل شاگرد سے زیادہ قیمتی نہیں۔" شاہ نے کہا۔ "مگر کل کسی نے تم سے یہ تلوار طلب کیا، تو اس کا بدلہ کیا ہوگا؟"

وہ ایک تاریخی لمحہ تھا۔ پرندے دم سادھے بیٹھے تھے۔ بادل گرجنے کو تھے۔ شاگرد کے لب وا ہوئے۔ "اس کی قیمت تو فقیر کی گردن ہے۔"

ہندوستان کی زمین پہ انقلاب کا پہلا بیج گر چکا تھا۔

☆☆☆☆

اس کہانی کا آغاز اُس دریا سے ہوا جس کے بارے میں ہندوؤں کی مقدس کتاب رگ وید میں درج ہے "اے سندھو! تو اپنی روانی میں آگے ہی آگے چلا جاتا ہے، خوش حالی کے دیوتا نے دھرتی پر تیری گزرگاہ متعین کر دی۔"

تو اس کا آغاز سندھ سے ہوا جو کبھی گھوڑوں اور رتھوں سے مالا مال تھا۔ جس کی شان میں قصیدے لکھے جاتے تھے۔ ٹھٹھہ سے تیس کلومیٹر دور میراں مہدی سید محمد سے موسوم ایک زرخیز گاؤں تھا۔ وہیں اُس بچے کی پہلی قلقاری گونجی تھی جس کی جد امجد نے اس علاقے کو ٹھٹھو کا نیا نام دیا، جس کے نعرۂ حق سے جاگیریں لرز گئیں، جس کے احترام میں شاہ لطیف جیسا صوفی سر جھکائے اُس بستی میں داخل ہوا۔ جیسے پہلے شاہ

نے اپنے بازوؤں گیتوں میں پرو دیا۔

چند محققین کے نزدیک اس بچے کا تعلق لانگہ قبیلے سے تھا۔ بلوچوں کے اس طاقتور قبیلے کی وجہ شہرت وہ لمبے ہوئے تجارتی قافلے تھے جو ہندوستان کے ایک سے دوسرے کونے تک سفر کرتے۔ کتنے ہی عالم اور صوفی اس قبیلے میں گزرے تھے۔ اس سلسلے کے جد امجد کو اوچ شریف کی خوشبو بردار گاہ کا معتقد تصور کیا جاتا ہے۔ شاید اسی عقیدت کے باعث ہی سے ملتان تک کے علاقے میں اثر و رسوخ رکھنے والا یہ خاندان دھیرے دھیرے سندھ منتقل ہو گیا اور میراں پور آن بسا۔

مخدوم فضل اللہ اسی خاندان کا ہونہار سپوت تھا۔ ایک جری انسان۔ ایک حقیقی عالم۔ جس کے گرد شاگردوں کی بھیڑ رہتی، اکتساب فیض کرنے والے دھول آلود راستوں پر اس کا تعاقب کرتے، اس کے سامنے سر جھکاتے۔

اورنگ زیب کے زمانے میں، کوئی 1655 کے آس پاس مخدوم فضل اللہ کے گھر بیٹے کی پیدائش ہوئی۔ جس کا ماتھا کشادہ اور آنکھیں روشن تھیں۔ جس کی صورت دل موہ لیتی تھی اور جس کے سانسوں میں تبدیلی مہکا کرتی۔

بچے کا نام عنایت رکھا گیا۔ پوت کے پاؤں پالنے ہی میں نظر آ جاتے ہیں۔ صوم و صلوٰۃ کا پابند مخدوم فضل اللہ جانتا تھا کہ جو تعلیم وہ اپنے شاگردوں کو دیتا آیا ہے، وہ اس کے بیٹے کا کشادہ سینہ بھرنے کے لیے ناکافی ہے۔ اس منزل تک پہنچنے کے لیے، جس کی گزرگاہ کا تعین قدرت نے کیا ہے، اسے یہ سرسبز و شاداب علاقہ چھوڑ کر نئی دنیاؤں کا رخ کرنا ہوگا۔ کئی دشوار گزار راستوں سے گزرنا ہوگا۔

لوکل عمری ہی میں اذان کی آواز سن کر سر جھکا دینے والے اس بچے نے سب سے پہلے قرآن پاک کی تعلیم حاصل کی۔ اور یہ مرحلے اس نے اوروں سے جلدی طے کر لیے۔ اس کے روبرو فقط مقدس اوراق نہیں تھے، ان پر درج الفاظ نہیں تھے، ان میں پنہاں روح تھی۔

لہلہاتے کھیتوں کے پاس ایک ٹیلے پر بیٹھ کر اس کے باپ نے سعدی اور رومی کی حکایات سنائیں، حافظ کے اشعار کی دانش تک رسائی بخشی۔ سرما کی ٹھٹھرتی راتوں میں وہ ان مفکروں کے قصے بیان کرتا، جنہوں نے معاشرے پر ان مٹ نقوش چھوڑے۔

پھر وہ صبح آئی، جب مخدوم فضل اللہ نے اپنے نوجوان بیٹے کو سینے سے لگایا۔ "سفر کی تیاری کرو۔"

بیٹے نے کوئی سوال نہیں کیا۔ وہ جانتا تھا کہ جلد یا بدیر وہ لمحہ آئے گا، جب اسے اپنا آبائی وطن چھوڑنا پڑے گا۔ وہ اس کی تیاری کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ وہ تو پہلے ہی تیار تھا۔

☆☆☆

وہ ہزاروں برس پرانا شہر تھا۔ کتنے ہی ہولناک سانحے ہوئے، کتنے ہی یورش گروں نے اسے نیست و نابود کرنے کی کوشش کی مگر نابودی ان کا مقدر نہ تھی۔ وہ مٹ گئے، یہ شہر قائم رہا۔

اس شہر پر صوفیوں کا سایہ تھا۔ اسی باعث جب دریائے چناب اس کے پہلو سے گزرتا تو احتراماً دھیما پڑ جاتا، خاموش ہو جاتا۔

ملتان علمیت کا مرکز تھا۔ اس کی خوش نصیب مٹی پر روز ہی عالموں کے قدم پڑتے جن کے گرد شاگردوں کا ہجوم ہوتا، جو موسم کی شدت سے بے پرواہ بھوک اور پیاس سے ماورا ان داناؤں کے ساتھ ساتھ چلتے تھے۔

ہاں، وہ بستی گرم تھی، بے حد گرم، مگر گرد آلود جھکڑ نوجوان عنایت کے پاؤں اکھاڑنے کی قوت نہیں رکھتے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ اسے کون سا در کھٹکھٹانا ہے۔ کس درویش کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرنے ہیں۔

یوں تو شیخ شمس الدین ملتانی کے سیکڑوں شاگرد تھے مگر جب شیخ نے عنایت کا ہاتھ تھاما تو اس روشنی کو فوراً ہی پہچان لیا جو شاگرد کے وجود میں خون بن کر دوڑ رہی تھی۔ جو اس کے ماتھے کا جھومر تھی۔

شیخ شمس الدین ملتانی نے وہی کیفیت محسوس کی جو کچھ برس بعد حیدرآباد میں شاہ عبداللطیف نامی درویش محسوس کرنے والا تھا۔

استاد کو روحانی باپ کہا گیا ہے۔ اس کے اور شاگرد کے درمیان غیر مرئی ہونے کے باوجود ایک اٹوٹ بندھن ہوتا ہے۔ ایسا بندھن جو درس و تدریس کے بغیر، بنا کسی لفظ کی ادائیگی کے ایک انسان سے دوسرے انسان میں علم منتقل کر دیتا ہے۔

شیخ اور عنایت میں یہی رشتہ تھا۔

ملتان کی تپتی دوپہر میں جب گرمی اوطاق کی دیواروں میں چھید کر دیتی، سائے میں بیٹھنے والوں کی سانسوں کو دہکا دیتی، دیگر شاگردوں کو پانی کی طلب بے چین کر دیتی... تب بھی یہ نوجوان سر جھکائے استاد کے سامنے بیٹھا رہتا۔ اس کے وجود میں جنبش بھی نہیں ہوتی۔ اس کا سانس بھی احترام کا دامن

کما سکے فقط۔

اُس زمانے میں استاد، نصاب کا محتاج نہیں ہوتا تھا۔ اس کی ذات ہی علم کا ماخذ ہوتی۔ اور یہ علم، زندگی کے کسی خاص شعبے تک محدود نہیں ہوا کرتا تھا، اس کا مقصد شعور کی گرہیں کھولنا، فرد کو انسان بنانا ہوتا تھا۔ انسان جو اشرف المخلوقات ہے۔

عنایت کئی برس شیخ کی شاگردی میں رہا۔ عرفان کی منازل طے کیں۔ اور جب شیخ نے محسوس کیا کہ عرفان اپنا نظر نوجوان کے سینے میں منتقل کر چکا ہے، تو اس حقائق کو مغرب کی سمت روانہ کر دیا گیا، تاکہ وہ نئے موسموں سے روشناس ہو سکے، نئے حالات سے نبھا کرنا سیکھ سکے۔

تو روانگی کا حکم ہوا مگر منزل کی وضاحت مطلع کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ نقشے میں کوئی نشان نہیں لگایا گیا۔ کسی استاد کا پتا نہیں بتایا گیا۔

وہ گٹھری اٹھائے خانقاہ سے نکلا۔ اسے رخصت کرتے وقت ساتھیوں کی آنکھوں میں جہاں محبت تھی، وہیں کچھ اندیشے بھی تھے۔

وہ آپس میں باتیں کرتے "یہ اب کہاں جائے گا؟ کس کا دامن تھامے گا؟ کہیں بھٹک نہ جائے؟"

عنایت کے کان میں جب یہ جملے پڑے، تو وہ مسکرا دیا۔ اور یہ مسکراہٹ برسوں قائم رہنے والی تھی۔ کیوں کہ وہ ان باتوں کا علم رکھتا تھا جو دوسرے نہیں جانتے تھے۔

☆☆☆☆

اس نے پہاڑ عبور کیے، دریا پار کیے، موسموں کا قہر برداشت کیا، مگر چلتا رہا۔ چلتا رہا، کیونکہ منزل دور تھی۔

کبھی وہ سیلن زدہ سرائے میں ٹھہرا، طوفانی بارشیں بچی جھونپڑی میں گزاریں، بے انت صحرا عبور کیے، فاقوں کا تلخ ذائقہ چکھا، مگر رکا نہیں۔ علم اسے پکار رہا تھا۔

یہ سفر نہیں تھا، یہ تو ایسا عمل تھا جو انسان کو حق تک رسائی عطا کرتا ہے۔ صوفی پہلے مشاہدہ کرتا ہے، پھر مجاہدہ اور آخر میں حقیقت کا تجربہ اس کا نصیب ہوتا ہے۔

تو عنایت ایک ایک کر کے ہر مرحلے سے گزرا۔ بغیر شکایت زبان پر لائے، بغیر کوئی شکوہ کیے وہ چلتا رہا، یہاں تک کہ ایک صبح اس نے خود کو حیدر آباد دکن میں پایا۔

اس نے گہرا سانس لیا۔ بوئے دوست نتھنوں میں اتر گئی۔ یہاں اس کا استاد تھا جس کی محبت میں وہ کھنچا چلا آیا تھا۔ سستانے کی خواہش تھی، کئی دنوں سے کچھ کھایا نہیں تھا مگر جب مؤذن کی پکار سنی تو فوراً مسجد کی سمت ہو لیا۔ جوں جوں قدم مسجد کی سمت اٹھتے گئے، دوست کی خوشبو بڑھتی گئی۔ وضو خانے میں داخل ہوتے ہی یوں لگا جیسے روح معطر ہو گئی ہو۔

گھٹتی روشنی میں اس نے اپنے شیخ کو دیکھا جس کے بالوں سے وضو کا پانی ٹپک رہا تھا اور جس کی انگلی آسمان کی سمت اٹھی ہوئی تھی۔

بوئے دوست اس کے نتھنوں میں اتر گئی تھی۔ وہ اپنی منزل پر پہنچ چکا تھا۔

شاہ عبدالملک نے اسے دیکھا تو فوراً پہچان لیا۔ یوں جیسے برسوں سے جانتا ہو۔ اس روز مغرب کی نماز عنایت نے شاہ عبدالملک کی امامت میں ادا کی۔

سندھ کے اس سپوت نے کتنے ہی برس اس جید استاد کی صحبت کی۔ دین بھی سمجھا، دنیا داری بھی سیکھی۔ عبادات اس کا تکیہ، مطالعہ اس کا بستر تھا۔ رخصتی کے وقت جب چوغہ عطا ہوا تو اس نے قیمتی تلوار مانگ لی۔

جب شاہ عبدالملک نے تلوار اسے سونپی تو دونوں کی انگلیاں مس ہوئیں۔ اور تب استاد نے وہ آسمان دیکھا جو خون سے سرخ تھا اور وہ سر دیکھا، جو سورج کے مانند دمک رہا تھا۔

وہ شاہ عنایت کا سر تھا۔ اس کے شاگرد کا سر۔

استاد نے آگے بڑھ کر اس کے ماتھے پر بوسہ دیا۔ "شاہ جہاں آباد جاؤ۔ شاہ غلام محمد تمہارا منتظر ہے۔"

وہ چلا گیا۔ حیدر آباد میں خزاں کے موسم نے ڈیرا ڈال لیا تھا۔ بہار رخصت ہو چکی تھی۔

شاہ غلام محمد کا شمار قابل احترام اساتذہ میں ہوتا تھا۔ عنایت لگ بھگ ایک برس اس صاحب علم کے زیر سایہ رہا۔

مورخین کے مطابق اس زمانے میں شاہ عنایت کی بے چینی عروج پر تھی۔ اس نے ایک زرخیز علاقے میں آنکھ کھولی تھی جہاں دھرتی سونا اگلا کرتی، اس کے باوجود زمین کا سینہ چیر کر اس میں سنہری بیج بونے والا کسان بدحالی کا شکار تھا۔ گندم اگانے والوں کی اولاد فاقے کرتی، دوسروں کا پیٹ بھرنے والوں کی نسل بھوکی رہتی۔

کچھ یہی حال پنجاب اور بلوچستان کے زرعی علاقوں کا تھا، جہاں زندگی کے تل میں پتے ہاری ناامیدی کی کھائی میں گرتے جا رہے تھے۔ مایوسی کے دبیز بادل ان کی زندگی کے آسمان پر چھائے تھے۔ اور اس وحشت کی وجہ تھے مقامی حکمران اور جاگیردار، جنہیں مغل حکومت نے کھلی چھوٹ دے

رکھی تھی۔ وسیع و عریض ہندوستان پر اقتدار قائم رکھنے کے لیے بادشاہ اپنے وفاداروں کو جاگیریں عطا کیا کرتے تھے۔ جب تک وہ شخص حکومت کی خدمت کرتا رہتا، اُسے محصول وصول کرنے کی مکمل آزادی ہوتی۔ جب لگتا کہ وہ حکومت کے تقاضے پورے کرنے میں ناکام ثابت ہو گیا ہے یا اس کی وفاداری پر شک ہوتا تو اسے معزول کر کے کسی اور کو وہ جاگیر سونپ دی جاتی۔

نہری پانی پر کاشت کاری شروع ہوئی تو سرکار نے لگان بڑھا دیا۔ ہر کسان اپنی محنت سے اگائی فصل کا ایک حصہ بطور لگان حاکم وقت کو دینے کا پابند تھا۔ جو ایسا نہیں کرتا، اس پر ظلم کے پہاڑ توڑے جاتے۔ اور استحصال یہیں تمام نہیں ہوتا۔ مقامی جاگیردار اور مذہبی طبقات بھی اس سے اپنا حصہ وصول کرتے اور یوں مجبور کسان اپنا محنت کو کافور ہوتے دیکھتا رہتا۔

شاہ عنایت نے عالموں کی صحبت میں وقت گزارا تھا، صوفیوں کی درگاہوں پر مراقبے کیے تھے۔ مسکینوں کی زندگی کا مطالعہ کیا تھا۔ اسے ادراک تھا کہ ان صاحب بصیرت انسانوں نے اپنی زندگی کو فقط یادِ الٰہی تک محدود نہیں رکھا، صرف آستانوں میں نہیں بیٹھے، بلکہ اپنے حجروں سے نکل کر سماج کی خدمت کی۔ انسان کی زندگی بہتر بنانے کی جدوجہد کی۔ اور شاہ عنایت بھی یہی چاہتا تھا۔ سب کائنات کی حمد و ثنا کرنے والا اس کا دل اپنے جیسے انسانوں کی بدحالی پر خون کے آنسو روتا۔ وہ جانتا تھا، اس کا سبب تقدیر نہیں، قدرت نہیں، بلکہ وہ جابر حکمران ہیں جو اپنے مفادات کے لیے کسان کا استحصال کرتے ہیں، غریبوں کا خون چوستے ہیں۔

• شاہ عنایت کی بے چینی عروج پر پہنچ چکی تھی، جو دھیرے دھیرے اسے اس نظریے کی سمت لے جا رہی تھی جو سندھ کا چہرہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بدلنے والا تھا۔

☆☆☆☆

• جن دنوں شاہ جہاں آباد طوفانی بارشوں کی لپیٹ میں تھا اور عنایت ایک درخت کی کھوہ میں بیٹھ کر جبر سے نجات کی راہ تلاش کر رہا تھا۔ اورنگ زیب کی حکومت آخری دور میں داخل ہو گئی۔

• سندھ میں میاں دین محمد کلہوڑا کی حکومت تھی، جس کی بڑھتی قوت کو مغل گورنر اپنے لیے خطرہ محسوس کرنے لگے۔ یوں جنگوں کا ایک بے انت سلسلہ شروع ہوا جس کا اختتام دین محمد کلہوڑا کے قتل پر ہوا۔ اس کے بھائی میاں یار محمد کلہوڑا نے قلات میں پناہ لی۔

کچھ برس بعد مغل بادشاہ کی گرفت کمزور پڑنے لگی تو میاں یار محمد نے بلوچ قبائل کی مدد سے مقبوضہ علاقے دوبارہ حاصل کر لیے۔ مغل گورنروں کے لیے اس کا مقابلہ کرنا مشکل ہوتا جا رہا تھا، سو مفاہمت کی راہ اختیار کی گئی۔ اسے خدا یار خان کا لقب دے کر سندھ کی عملداری سونپ دی گئی۔

سندھ میں روحانیت کی گدی پہلے ہی کلہوڑوں کے پاس تھی، اب اقتدار بھی ان کے ہاتھ آ گیا۔ مذہبی طبقے اور جاگیردار ان کے دست راست بن گئے، کسانوں کے استحصال میں مزید شدت آ گئی۔

ہندو صوفی

موئرخین جھوک میں لڑی جانے والی جنگ کو اس خطے میں برپا ہونے والے پہلا منظم طبقاتی معرکہ قرار دیتے ہیں جس کا مقصد فرقہ بندی سے پاک مدنی پہلی معاشرے کا قیام تھا۔

اس کے کئی دلچسپ پہلو تھے۔ تحقیق کے مطابق بہت سے ہندو محنت کشوں نے بھی شاہ عنایت کے شانہ بہ شانہ اس جنگ میں حصہ لیا اور مساوات پر مبنی نظریے کے لیے اپنی جانیں پیش کیں۔ شاہ عنایت کے مدفن کے احاطے میں ایسی کئی قبریں ہیں جو سرخ اور سبز رنگ کی چادر سے ڈھکی ہیں اور بہ ظاہر کسی مسلمان کی قبر معلوم ہوتی ہیں مگر ان کے کتبے الگ کہانی سناتے ہیں۔ نام پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں شاہ عنایت کے وہ عقیدت مند دفن ہیں، جنھوں نے وصیت کی تھی کہ انھیں جلایا نہ جائے، بلکہ مرشد کے قدموں میں تھوڑی سی جگہ عطا کر دی جائے۔ ان کی اولادیں بھی سندھ بھر میں پھیلی ہوئی ہیں جو بظاہر ہندو ہیں مگر ان کے مردے جلائے نہیں جاتے دفن کیے جاتے ہیں۔ اپنے نام کے ساتھ یہ لوگ "دیودیہ" لقب لگاتے ہیں اور صوفیانہ زندگی گزارتے ہیں۔

تعصب سے آزاد، مساوات پر مبنی نظام کے لیے جدوجہد کرنے والے شاہ عنایت کے مدفن کے احاطہ میں ان قبروں کی موجودگی اشارہ ہے کہ اس صوفی کی تعلیمات نے کس طرح زندگی سے تعلق رکھنے والے ہر طبقے کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔

دشمنوں کا موسم تمام ہوا۔ بادل چھٹ گئے۔ سورج نکل آیا اور تب... طویل مراقبے کے بعد شاہ عنایت نے، سندھ کے سپوت نے وہ نظام تشکیل دیا جو اس استحصال پر کاری ضرب لگانے والا تھا۔ محنت کش کو اس کا حق دلانے کی جدوجہد شروع ہونے کو تھی۔

ایک روایت ہے کہ جب شاہ عنایت نے اپنا تجربۂ زندگی استاد کے سامنے پیش کیا تو اس کی پختگی اور ہمہ جہتی نے شاہ غلام محمد کا سر جھکا دیا۔ شاگرد استاد کے قالب میں ڈھل گیا۔ مرید، مرشد ہو گیا۔ غلام محمد نے شاہ عنایت کا دامن تھام لیا۔ اس کے شاگردوں نے بھی اس جواں سال درویش کے سامنے سر تسلیم خم کیا۔ اور یوں مصلحین کی ایک چھوٹی سی جماعت وجود میں آئی جو پیغمبر رسول ﷺ کے اس قول پر کامل یقین رکھتی تھی کہ کسی عربی کو عجمی، کسی گورے کو کالے پر فوقیت حاصل نہیں۔ فوقیت فقط تقویٰ کی بنیاد پر، ورنہ ہر انسان مساوی۔ ہر انسان برابر۔

تو وہ برابری کے خواہش مند تھے۔ ایسے صوفی تھے جو سماج میں بہتری کے لیے ہمہ گیر منصوبہ پیش کرنے والے تھے مگر اس سے قبل انھیں سفر کرنا تھا... ایک طویل سفر۔ انھیں نگری نگری گھومنا تھا۔ مختلف سماجوں اور نظام حکومت کو دیکھنا تھا۔

پہلے شاہ عنایت نے بلوچستان کا رخ کیا۔ وہاں قبائلی نظام میں قید سرداروں کے مظالم کے شکار کسانوں کے ساتھ وقت گزارا۔ پھر پڑوسی ملک افغانستان کا سفر کیا۔ کچھ وقت ایران میں بھی گزارا۔ ایک روایت کے مطابق وہ عراق بھی گیا تھا۔

مورخین اس بات پر روشنی ڈالنے سے قاصر ہیں کہ اس سفر کے دوران شاہ عنایت کن تجربوں کے روبرو ہوا؟ اس کے مقاصد کیا تھے۔ البتہ عام خیال یہی ہے کہ اس کارواں نے اپنے مشاہدے اور تجربے کو وسعت دینے کے لیے، مختلف خطوں میں رائج سماجی نظام کا ادراک حاصل کرنے کے لیے یہ دشوار گزار سفر کیے۔ اور جب مصلحین کے اس گروہ نے خود کو انقلاب کے لیے تیار پایا تو وہ پلٹا۔ اس کی منزل سندھ تھی۔

بارہ برس بعد جب اُس نے اپنی دھرتی پر قدم رکھا تو سبک ہواؤں نے اُس کا استقبال کیا۔ مٹی کی طلسماتی مہک نتھنوں میں داخل ہوئی۔ دریا کا جادوئی بہاؤ گیت بکھیر رہا تھا۔ سرسبز فصل اس سے بغل گیر ہوئی تھی۔ مگر اس لمحے کا سحر جلد ہی دم توڑ گیا کہ اسی منظر میں وہ کسان بھی تھا، جو اس فصل کی تیاری میں اپنا خون پسینا شامل کرتا۔ اپنی روح پھونک دیتا، مگر جب فصل تیار ہو جاتی، اس پر درانتی چل رہی ہوتی تو ظالم جاگیردار اس غریب کی محنت کا پھل لے اڑتا۔

مگر یہ صورت حال ہمیشہ نہیں رہنے والی تھی۔ تبدیلی کی ہوائیں چل پڑی تھیں۔ شاہ عنایت صوفی لوٹ آیا تھا۔

☆☆☆☆

مغل کے دروازوں کو دیمک لگ گئی۔ تخت خون سے سن گئے اور بازاروں میں سناٹا چھا گیا۔

اورنگ زیب کی موت کے بعد تخت کے لیے ایک خون ریز جنگ شروع ہوئی۔ بھائی بھائی کا دشمن بن گیا۔ سگے رشتے داروں کے سر قلم کیے گئے۔ ہر گلی مقتل بن گئی تھی۔

طویل جنگ کے بعد جہاں دار شاہ بادشاہ بنا مگر اپنے بھائیوں کا خون اس کا تعاقب کر رہا تھا۔ آسیب اس پر جھپٹے۔ آخر وہ اپنے بھتیجے فرخ سیر کے ہاتھوں قتل ہوا۔

مغلیہ سلطنت لرز رہی تھی۔ بغاوت کی آگ بھڑک اٹھی۔ جنگیں چھڑ گئیں۔ تخت قائم رکھنے کے لیے مزید سرمائے کی ضرورت تھی۔ اس کا بوجھ براہ راست محصولات پر پڑا۔ لگان بڑھا دیا گیا۔ ہر شے پر ٹیکس لگ گیا۔ غریبوں پر بوجھ بڑھنے لگا۔ ابتری کے اس زمانے میں شاہ عنایت ٹھٹھہ میں ظاہر ہوا۔ یہ شہر سندھ کا مرکز تھا۔ وہاں کے اوطاقوں میں فلسفے زیرِ بحث رہتے۔ یہاں سے تجارتی قافلے گزرا کرتے۔ وہاں کی زمینیں زرخیز تھیں اور اناج سونے کی مانند تھا۔ ایک معنوں میں وہ اشرافیہ کا مرکز تھا۔ وہاں رونما ہونے والی تبدیلیاں پورے سندھ پر اثرات مرتب کرتیں۔ اسی اہمیت کے پیشِ نظر صوفی نے ٹھٹھہ کا انتخاب کیا۔

اس کے پیروکاروں نے شہر کے نزدیک ایک وسیع اراضی پر ڈیرا ڈالا۔ اس اراضی پر کاشت کاری نہیں ہوتی تھی۔ بنجر ہونے کی وجہ سے حکمرانوں کو اس میں دلچسپی نہیں تھی۔

ایک صبح شہر نے عجیب منظر دیکھا۔ ہل چلا کر زمین کو نرم کیا جا رہا تھا۔ بیج بکھیرے جا رہے تھے۔ پانی کا چھڑکاؤ ہو رہا تھا۔

شاہ عنایت کے ساتھیوں نے اس زمین پر کاشت کاری شروع کر دی تھی۔ محنتی لوگ تھے۔ خدا کی ذات پر انھیں کامل یقین تھا، اس لیے جلد ہی سخت زمین کا سینہ چیر دیا۔ کچھ ہی عرصے میں وہاں فصلیں لہلہا رہی تھیں۔

سرگوشیاں ہونے لگیں۔ قہوہ خانوں میں لوگ سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ وہ اس نئی سرگرمی پر تبصرے کرتے۔

منشی حیرت کا اظہار کرتا۔ ''اُن کا نظام عجیب ہے۔ جو شخص کاشت کاری میں حصہ لیتا ہے، وہ پیداوار میں شریک بن

ہوتا ہے۔"

دوسرا شخص تائید کرتا۔ "ہاں، جو جتنا بوتا ہے، اتنی فصل پر اس کا حق ہوتا ہے۔ اجتماعی محنت کے ثمر میں تمام محنت کشوں کا برابر حصہ طے کیا جاتا ہے۔"

قہوے خانے کا مالک بھی مکالمے میں شریک ہو گیا۔ "سنیے جناب، کل اُس کے کچھ ساتھی ادھر آئے تھے۔ وہ مساوات کی بات کرتے ہیں۔ شاہ عنایت نے اس نظام کا نام دائرہ رکھا ہے۔ وہ کہتے ہیں، یہ ایک پاکیزہ چکر ہے، جدوجہد کرنے والے کو آخر میں محنت کا پھل ملتا ہے۔ اور یوں دائرہ مکمل ہو جاتا ہے۔"

ہاں وہ حیرت زدہ تھے۔ سر جوڑے بیٹھے تھے۔ ایسی باتیں انہوں نے کبھی پہلے نہیں سنی تھیں۔

جلد یہ نظام لوگوں کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ بہت سے چھوٹے کسان شاہ عنایت کے پاس آئے اور اپنی زمین اجتماعی کاشت کاری کے لیے سونپ دی۔ ایسا کرتے ہوئے انہیں کوئی خوف نہیں تھا، کوئی خدشہ نہیں تھا۔ اور ہو بھی کیوں۔ وہ شاہ عنایت تھا، نیکی کا پیکر۔ جو اس کا درشن کرتا، اس کا ایمان تازہ ہو جاتا۔

عوام اس تحریک سے جڑتے جا رہے تھے۔ بیداری کی ہوائیں چلنے لگیں۔ مساوات پر مبنی نظام کی پہلی شکل ابھرنے لگی۔

وقت کروٹ لے رہا تھا۔ کسان مضبوط ہوئے تو جاگیرداروں میں خوف کے اندیشے نے جنبش کی۔ ان پر گھبراہٹ طاری ہو گئی۔ وہ مشرق سے ابھرتے سورج کو دیکھ سکتے تھے جس کی روشنی آنکھوں کو خیرہ کیے دیتی تھی۔

نجی ملکیت کے زور پر، استحصال کے ستون پر کھڑے نظام کو خطرہ لاحق ہوا تو مقامی حکمراں حواس باختہ ہو گئے۔ روایتی پیر فقیر، جن کا کام فقط حکومت کی حمایت کرنا تھا، حرکت میں آ گئے۔ فتوے جاری کیے گئے۔ بادشاہ کو خدا کے درجے پر فائز کرنے والے مفاد پرست پیشواؤں نے شاہ عنایت پر غداری کے الزامات لگائے۔

سازشیں شروع ہو گئی تھیں۔ مخالفین اکٹھے ہونے لگے۔ ہتھیاروں کو صاف کیا جانے لگا۔

شاہ عنایت فقط ایک انقلابی نہیں تھا، اس کا جنون رتھ جذبات نے نہیں، دانش نے سنبھال رکھا تھا۔ اس نے اپنے حامیوں کو مخاطب کیا۔ "جمود پرست اکٹھے ہو رہے ہیں۔ استحصالی نظام کسی بھی وقت حملہ کر سکتا ہے۔ انقلابیوں کو نئی حکمت عملی اختیار کرنی ہوگی۔"

ایک رات، جب آسمان میں پورا چاند تھا اور ستاروں سے محفل سجائی ہوئی تھی، اس نے اپنے چہیتے شاگرد شاہ غلام محمد کو بلوا بھیجا۔ "ہندوستان کا محاذ آپ کو پکار رہا ہے۔ وہاں فکری انقلاب کے لیے زمین تیار کریں۔ وہاں آپ کے ہتھیار اور بیج آپ کی دعائیں ہے۔"

شاگرد، جو تابع استاد تھا، فوراً ہی روانہ ہو گیا۔ اس نے یہ بھی نہیں پوچھا کہ اس سے فائدہ کا ارادہ کیا ہے۔ اس نے کسی اندیشے، کسی خدشے کا اظہار نہیں کیا۔ اسے شاہ عنایت کے تدبر پر یقین تھا۔

وہ ٹھٹھہ میں اجتماعی کاشت کاری کا کامیاب تجربہ کر چکا ہے۔ ثابت ہو گیا تھا کہ یہ نظام نہ صرف قابلِ اطلاق، بلکہ انتہائی سودمند ہے۔ اب وہ اُسے وسعت دینے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اور اس کے لیے اس کی اپنی دھرتی سے بہتر... میران پور سے زیادہ سازگار دوسرا علاقہ ہو سکتا تھا۔

اس نے ٹھٹھہ کا محاذ اپنے چند ساتھیوں کو سونپا۔ انہیں ہدایت کی۔ "چاہے کتنی ہی تاریکی ہو، تم چراغ کی مانند روشن رہنا۔"

خود پیروکاروں کے ساتھ اپنی جنم بھومی کی سمت چل پڑا، جہاں تبدیلی انگڑائی لے رہی تھی۔ جہاں نیا دائرہ قائم ہونے کو تھا۔

☆☆☆☆

"آج میں تمہیں محمد جونپوری کی کہانی سناتا ہوں جو پندرہویں صدی کے وسط میں پیدا ہوئے۔"

وہ تاروں بھری رات تھی۔ درخت غنودگی میں جھومنے لگے تھے اور میران پور میں ایک باپ اپنے بچوں کو بیتے دنوں کا ایک قصہ سنا رہا تھا۔

"وہ ہمہ وقت سفر میں رہتے تھے۔ مہدوی تحریک کی بنیاد انہوں نے ہی رکھی۔ گو ان کے کئی دعوے متنازع ٹھہرے، مگر علما ان کی فہم و فراست اور دانش کو سراہتے ہیں۔"

بچوں کی آنکھوں میں نیند اتر رہی تھی۔ باپ نے دیوار سے ٹیک لگا لی۔ "جانتے ہو میں تمہیں یہ قصہ کیوں سنا رہا ہوں، کیوں کہ ایک بار وہ اس علاقے سے بھی گزرے تھے۔ ہاں انہوں نے دو برس ٹھٹھہ میں قیام کیا تھا۔ شاید وہ جام نندو کا زمانہ تھا۔"

بچوں کی آنکھوں پر نیند کا پردہ گر چکا تھا۔ ان کے خراٹے سنائی دینے لگے۔ البتہ ایک لڑکا ابھی جاگ رہا تھا۔ وہ ہمہ تن

گوش تھا۔ "ابا، ان کی تعلیمات کیا تھیں؟"

"تعلیمات!" باپ تھوڑا متذبذب تھا۔ وہ اپنے ننھے بیٹے کو کسی مذہبی مسئلے میں نہیں الجھانا چاہتا تھا۔ البتہ محمد جونپوری کی سماجی تعلیمات بیان کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں تھا۔ "میرے بیٹے، وہ مشترکہ زمین اور مشترکہ زراعت کے قائل تھے۔"

اس بار تذبذب بچے کے چہرے پر ظاہر ہوا۔ آدمی نے وضاحت کی۔ "سب کسان پیداواری عمل میں حصہ لیتے۔ پھر ہر شخص اپنی ضرورت کے مطابق اناج لے لیتا۔ یعنی وہ برابری کے قائل تھے، جس کا حکم دنیا کا ہر مذہب دیتا ہے۔ چلو، کہانی ختم، اب سو جاؤ۔"

باپ چلا گیا کہ اسے کل کھیت پہنچنا تھا مگر بیٹا نہیں سویا کہ اس کے ذہن میں چلنے والی ہواؤں میں ایک نئی مہک تھی۔

مخدوم فضل اللہ نے اپنے بیٹے کو یہ کہانی سناتے ہوئے قطعی نہیں سوچا تھا کہ اس کا ہونہار بیٹا ایک روز میراں پور میں یہی نظام قائم کرے گا۔ سو دلت کا بیٹا اس بستی کی پہچان بن جائے گا۔

اس بات پر تو محققین میں اختلاف نہیں کہ شاہ عنایت، محمد جونپوری کی سماجی تعلیمات سے متاثر تھا، مگر وہ اس بات کی بھی نشان دہی کرتے ہیں کہ وسیع مطالعے اور تجربے کے حامل اس شخص نے اوروں کی تقلید کرنے کی بجائے اپنی راہ خود بنائی۔

جب اس نے میراں پور لوٹ کر دائرہ قائم کیا اور اپنی خاندانی زمین پر اجتماعی کاشت کاری شروع کی، تو جس کے سابق ہم جماعت جو کبھی اس کے باپ کے شاگرد رہے تھے، اس سے ملنے آئے اور سرشار ہو کر لوٹے۔

گندم کے کھیتوں سے گزرتے ہوئے ایک نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "کمال یہ نہیں کہ مخدوم فضل اللہ کے بیٹے نے رائج نظام سے بغاوت کی، کمال یہ ہے کہ اس نے ایک متبادل نظام پیش کیا۔"

دوسرے نے تائید کی۔ "زمین تو خدا کی ہے۔ بے شک ذاتی ملکیت مصائب کی جڑ ہے۔ اور سنا ہے وحدت الوجود بھی قائم ... کا ار ... ہو رہا ہے۔"

... نے ... زمین سے مٹی اٹھا کر سونگھی۔ اس کی مہک جدا تھی۔ ... کی محنت اور کے قدم پڑے تھے۔ آدمی نے مہک کو اپنے اندر اتار لیا۔ "شاہ عنایت کے نظریے کا سب سے متاثر کن پہلو یہ ہے کہ وہ اناج کی تقسیم کے دوران مساوات کی بات نہیں کرتا کہ اس طرح کے نظریات تو پہلے بھی آتے رہے ہیں۔ وہ پیداواری عمل میں مساوات کی بات کرتا ہے۔ آپ کا تعلق زندگی کے کسی طبقے سے ہو، آپ شاہ ہوں، فقیر ہوں، سپہ سالار ہوں، آپ کو پیداواری عمل میں حصہ لینا پڑے گا، ٹھیک اس ہاری کی طرح، جو زمین میں اپنے پسینے کا بیج بوتا ہے۔"

"محنت ہی میں عظمت ہے۔ رسول کریم ﷺ اپنے ہاتھ سے اپنے کام کیا کرتے تھے۔" اگلے نے کہا۔ "یہ نظام شان دار ہے۔ ایسا نہیں کہ سب اپنے مال مویشی اور بیج لے آئیں اور مشترکہ زمین پر محنت کرنے لگیں۔ اصل بات تو یہ ہے کہ جب اناج میں حصہ لینے کی باری آئے، تو ہر شخص اپنے ضرورت کے مطابق حصہ لے۔ نہ زیادہ نہ کم۔ اور جو بچے، وہ دائرہ کی ملکیت ہو۔ اس سے دیگر ضرورت مندوں کا خیال رکھا جائے۔"

گندم کے کھیتوں سے گزرنے والے وہ سب سرشار تھے۔ انہیں روشنی دکھائی دے رہی تھی...

اس لوح کے مکالمے فقط شاہ عنایت کے سابق ہم جماعتوں کے درمیان نہیں، بستی کے ہر دوسرے شخص کے مابین جاری تھے۔ ایک نئے، اچھے نظام کی لہلہاتی فصل نے ان کے دلوں کو شاد کر دیا تھا۔ ان میں امید پیدا کر دی تھی۔

میراں پور کے گرد و نواح میں بھی دائرہ کا ذکر ہونے لگا۔ یہاں تک کہ گھروں میں عورتیں بھی اس کا تذکرہ کرتیں۔ وہ آپس میں کہتیں۔ "شاہ عنایت کوئی فقیر تھوڑی ہے۔ وہ ترک دنیا کی تعلیم نہیں دیتا۔ خود شادی شدہ ہے۔ بال بچے ہیں۔ بڑے لڑکے شاہ خلیل اللہ کو تو دیکھو، بالکل اپنے باپ کا عکس معلوم ہوتا ہے۔ برداشت اور صبر کی نصیحت تو کرتا ہے شاہ عنایت۔ مگر یہ بھی کہتا ہے کہ انسان کو نیک کاموں کے لیے متحرک رہنا چاہیے، محنت کرنی چاہیے، تب ہی دعائیں قبول ہوتی ہیں۔"

تو میراں پور میں مخدوم فضل اللہ کے بیٹے کا ڈنکا بج رہا تھا۔ اسے سرداری کی حیثیت حاصل ہوگئی تھی۔ مگر ایسا سردار، جو خود محنت کرتا۔ ہل چلاتا۔ بیج بوتا۔ ایسا سردار جو برابری کا قائل تھا۔ جو علی الاعلان کہتا "جیکو کھیڑے، سو کھائے!" (جو بوئے وہ کھائے)

اس نعرے نے حکمراں طبقے کی نیند چرالی تھی۔ ان کی راتوں کو ڈراؤنے خواب میں بدل دیا۔ ان کے جسموں پر آسائش نے سستی طاری کردی تھی۔ وہ ہل چلانے، اپنی روٹی

...روکانے کے قابل نہیں تھے۔ اور اگر شاہ عنایت کی تحریک
پھیل جاتی، اس کا نعرہ حقیقت کا روپ اختیار کر لیتا، اصول بن
جاتا تو ان کی طاقت کا پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جاتا، ان کی سلطنت
...ے جاتی اور وہ بھوکے مر جاتے۔

میراں پور کے ندی نالے، بیل بوٹے جاگ اٹھے
تھے۔ وہ آزادی کے گیت گا رہے تھے، جو استحصالی نظام کی
...ائندگی کرنے والوں کی ساعتوں کے لیے برچھی کے مانند
تھے۔ اس گروہ کی سربراہی عبدالواسع اور نور محمد نامی جاگیردار کر
رہے تھے۔

انہوں نے گرد و نواح کے چھوٹے بڑے جاگیرداروں
اور وڈیروں کو اکٹھا کیا۔ ایک وفد بنایا گیا، جس کی منزل ٹھٹھہ
تھی۔ ان چرب زبانوں نے مغل گورنر میر لطف علی خان کے
سامنے شاہ عنایت کی ایک مکروہ تصویر پیش کی، مصلح کی بجائے
باغی قرار دیا۔ ایسا شخص جو کل حکومت کے خلاف اٹھ کھڑا ہوگا۔

گورنر نے شاہ عنایت کے بارے میں سن رکھا تھا۔
ٹھٹھہ ہی میں تو صوفی نے اپنے انوکھے نظام کا پہلا تجربہ کیا تھا۔
وہ جانتا تھا کہ یہ شخص عوام میں مقبول ہے۔ اس کے خلاف
کارروائی سہل نہیں۔

”کارروائی کے لیے کوئی قانونی جواز نہیں ہے۔“ اس
نے کہا۔ ”شاہ عنایت اپنی آبائی زمین پر کاشت کر رہا تھا۔ جو
لوگ اس سے آن ملے ہیں، ان کی زمین بھی ذاتی ہے۔ سرکار
انہیں قانونی پیچیدگیوں میں نہیں الجھا سکتی۔“

تاہم جاگیرداروں کو مایوس نہیں لوٹایا گیا۔ وہی تو وہ
ستون تھے، جن پر حکومتی نظام قائم تھا۔ ”آپ لوگ اُسے
راستے سے ہٹانے کے لیے جو چاہیں کریں، ہم اپنی آنکھیں
بند رکھیں گے۔“

اس وعدہ نے عبدالواسع اور اس کے ساتھیوں کو تکبر
سے بھر دیا۔ ان کے اندر کے ظالم نے انگڑائی لی۔ عفریت
جاگ اٹھا۔

محنت کشوں پر حملے کا منصوبہ ذہن میں سر کنے لگا تھا۔

☆☆☆☆

وہ ایک تاریک رات تھی۔ یخ بستہ ہواؤں نے زندگی
کی چہل پہل کو وقت سے پہلے خاموش کر دیا۔ عورتوں نے
چولہے بجھا دیے۔ بچوں کو نیند نے آن لیا۔ کسان بھی اپنے
بستروں میں چلے گئے تھے۔

جب تاریکی مزید گہری ہوئی اور نیند کی وادی میں اتر
چکے انسانوں نے اپنے سر لحاف میں چھپا لیے، چند سائے

نظریاتی ساتھیوں کا قتل عام

شاہ عنایت کا نظریہ فلسفیانہ پیچیدگیوں سے آزاد
تھا۔ وہ انتہائی عملی تھا۔ ہر شخص اپنی اہلیت کے مطابق کام
کرے اور اپنی ضرورت کے مطابق معاوضہ پائے۔
برسوں بعد یہی نظریہ کارل مارکس نے پیش کیا، جس سے
متاثر ہو کر لینن اور اس کے ساتھیوں نے سوویت یونین
کی بنیاد رکھی۔

شاہ کی تحریک پورے سندھ میں پھیل گئی تھی۔
اس کے نظریاتی ساتھی جگہ جگہ موجود تھے۔ جنگ
شروع ہونے کے بعد یہ لوگ جھوک آنا چاہتے تھے،
اپنے مرشد کے ساتھ لڑنا چاہتے تھے مگر انہیں حکم تھا کہ
جھوک نہ آئیں بلکہ نظریاتی محاذ سنبھالیں۔ ہر گاؤں،
ہر شہر میں مساوات پر مبنی اس نظام کا پرچار کریں۔ شاہ
عنایت کو شہید اور جھوک کو نیست و نابود کرنے کے بعد
سلطنت نے ان انقلابیوں کی جانب توجہ مرکوز کی۔
مقامی ہرکاروں اور جاسوسوں کے ذریعے انہیں تلاش
کیا گیا۔ سروں کی قیمت مقرر کی گئی۔ دانشوروں کو چن
چن کر قتل کیا گیا۔ انصاف کے تقاضے پورے کرنے
کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔ بس جو شخص اپنی وضع قطع
سے صوفی لگتا، شاہ عنایت کے نظریات کا حامی معلوم
ہوتا، اسے قتل کر دیا جاتا۔ کتابوں میں درج ہوا کہ جس
شخص کی آنکھیں سرخ ہوتیں، اُسے سپاہی چوٹ
مارتے، اگر وہ اللہ کہتا تو اسے صوفی قرار دے کر سر قلم
کر دیا جاتا۔ قتل و غارت گری کی کہانی برسوں جاری
رہی۔ جب دہلی کا تخت محمد شاہ نے سنبھالا تب ظلم کا یہ
سلسلہ تھما۔

کھیتوں کے مشرقی کنارے سے ظاہر ہوئے۔ وہ دھیرے دھیرے
گاؤں کی سمت بڑھ رہے تھے۔ ان کا رخ کسانوں کی
جھونپڑیوں کی سمت نہ تھا۔ وہ اس اراضی پر دھاوا بولنے کے
ارادے سے آئے تھے، جہاں اگنے والی فصل کا سبزہ ان کے
اندرون کو خوف سے بھر گیا تھا۔

ان کی قیادت نور محمد کلہوڑا کر رہا تھا۔ حملہ آوروں کے
ہاتھوں میں لاٹھیاں اور کلہاڑیاں تھیں۔ دلوں میں مشترکہ
اراضی کو پھونک ڈالنے کی قبیح خواہش انگڑائی لیتی تھی۔

سیکڑوں بزدل رات کی تاریکی میں نیک دل کسانوں

پڑ پڑے۔ چیخیں بلند ہوتے ہی تاریکی مزید گہری ہوگئی۔ قتل و غارت گیری کے مکروہ کھیل میں معصوموں کے گلے کاٹے گئے۔

جونہی حملے کی خبر ملی، شاہ عنایت اور اس کے ساتھیوں نے نیند کی دبیز چادر اتار پھینکی اور یخ بستہ ہواؤں کے سمندر میں اتر گئے۔ گروہ تعداد میں کم تھے، ہتھیاروں کی قلت تھی، مگر انھوں نے جواں مردی سے مقابلہ کیا۔

دشمنوں نے مشترکہ فصل کو آگ لگانے کی کوشش کی، مگر یہ سہل نہیں تھا۔ اُس کی حفاظت پر مامور جوان جان دینے کو تیار تھے۔ انھوں نے انقلابی فصل پر آنچ نہیں آنے دی۔ مزاحمت بڑھتی گئی۔ محنت کشوں نے بھرپور مقابلہ کیا۔ آخرکار یزید کے پاؤں اکھڑ گئے۔ وہ بھاگ نکلا۔

اگلی صبح جو سورج طلوع ہوا، اس کے سامنے بربادی کے نشانات بکھرے تھے۔ پرندے ہیبت سے گھونسلوں میں دبکے رہے اور پیڑوں نے چپ سادھ لی۔

ہر طرف لاشیں۔ ہر طرف خون۔ ایک اندازے کے مطابق 36 معصوم اس حملے میں اپنی جان سے گئے۔

میراں پور میں قیامت کا منظر تھا۔ ایک کہرام بپا تھا۔ پہلے غم کے سیاہ بادل چھائے۔ پھر انتقام کی بجلی چمکی۔

جس کا باپ قتل ہوا، اس نے کلہاڑی اٹھا لی۔ جس کا بیٹا مارا گیا، اس نے خنجر تھاما۔ عورتیں بھی چھریاں اور لاٹھیاں لیے گھر سے نکل آئی تھیں۔ بدلے کے شعلے اٹھنے لگے۔

اور تب... وحشت کے ان لمحے میں مردِ حق منظر میں ظاہر ہوا۔ وہ ٹیلے پر کھڑا تھا۔ اس کے کشادہ ماتھے پر کرب کی لکیر تو تھی، مگر روشن آنکھوں میں انتقام کی آگ نہیں تھی۔

ہیبت ناک سناٹے میں اس کی پُرسکون آواز گونجی۔ اس کے الفاظ زخموں پر مرہم تھے۔ بے چین دلوں کو قرار آنے لگا۔ جذبات سے سلگتے بدن ٹھنڈے ہونے لگے۔

"یہ جوش سے نہیں، ہوش سے کام لینے کا وقت ہے۔" اس نے کہا۔ "پہلے ہم بادشاہ کے انصاف کو آزمائیں گے۔"

شاہ عنایت نے، اس بے بدل عالم نے مغل بادشاہ فرخ سیر کے نام ایک خط لکھا۔ فارسی میں لکھے اس مختصر خط کو ادبی شہ پارے کا درجہ حاصل ہے۔ اس نے حاکمِ وقت کو خبردار کیا۔ "بیدار ہو جاؤ، ہوشیار ہو جاؤ۔ میں یہ نہیں کہتا کہ دنیا سے الگ تھلگ رہو، مگر جس حال میں بھی رہو، خدا کے ساتھ رہو۔"

اس نے یہ خط شہدا کے اہلِ خانہ کے حوالے کیا، جو وفد کی صورت دہلی روانہ ہوئے۔ جب کچھ ہفتے بعد دربار میں یہ خط پڑھا گیا، تو وہاں سناٹا چھا گیا۔ آج سے قبل کسی فقیر نے یوں بادشاہ کو مخاطب نہیں کیا تھا۔

وفد نے جاگیرداروں کے مظالم اور بزدلانہ حملے کی تفصیلات بتانے کے بعد کہا۔ "شاہِ وقت، ہم تیرا انصاف آزمانے آئے ہیں۔"

وزراء سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ وفد حق پر تھا۔ میراں پور میں موت کا کھیل کھیلا گیا تھا۔ اور اس کی خبر پورے ملک میں پھیل چکی تھی۔ سلطنت کسی نئی بغاوت کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی، سو فیصلہ مظلوموں کے حق میں ہوا۔

عبدالواسع، نور محمد اور دیگر جاگیرداروں کی زمین قصاص میں شہدا کے اہلِ خانہ کے حوالے کر دی گئیں۔

میراں پور میں ایک بار پھر زندگی نے سانس لیا۔ پھر زمین کا سینہ چیر کر امید کا بیج بویا گیا۔ پھر حوصلے کی روشنی میں توانا فصل لہرائی۔

قصاص میں ملنے والی زمین نے شاہ عنایت کے دائرے کو مزید وسیع کر دیا۔ اس اخلاقی فتح کے بعد اردگرد کے چھوٹے زمین داروں نے بھی ہمت پکڑی۔ انھوں نے بھی اپنی اراضی اجتماعی کاشت کاری کے لیے وقف کر دی۔

اور یوں خطے سے چند میل دور اُس فلاحی ریاست کے امکانات ابھرنے لگے، سندھ کے باسی جس کا برسوں سے سپنا دیکھ رہے تھے۔

سندھ، جو گھونڈوں سے مالا مال تھا، جس کے دریاؤں کا راستہ قدرت کا متعین کردہ تھا، ایک نئے روپ میں ڈھل رہا تھا۔

☆☆☆☆

اس وسیع و عریض حویلی کے ایک گوشے میں کچھ لوگ سر جوڑے بیٹھے تھے۔

انھوں نے عمدہ پوشاکیں زیبِ تن کر رکھی تھیں۔ ان کی تلواروں پر ہیرے جڑے تھے، مگر ان کے چہرے اندیشوں نے سیاہ کر دیے تھے۔ ان پر فقیر کی ہیبت بیٹھ چکی تھی۔

یہ مقامی جاگیرداروں کا گروہ تھا۔ زمین قصاص میں دیے جانے کے واقعے نے ان کا اعتماد ادھیڑ ڈالا اور یہ خوف پنپنے لگا کہ کہیں یہ انقلابی نظام ان کی پُرآسائش زندگی نہ نگل لے۔

وہ سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ ایک نے کہا۔ "ہمارا دبدبہ کم ہو رہا ہے۔ کسانوں سے خوف نکل گیا۔ اب تو

مزار سے بھی نہیں ملتے۔"

دوسرے کا کرب بھی کم نہ تھا۔ "ہاں۔ ان کم ظرفوں نے آنکھوں میں خواب سجا لیے ہیں۔ کہتے ہیں کہ شاہ عنایت کے دائرے میں نہ تو اضافی محنت کرنی پڑتی ہے، نہ ہی محصول دینا پڑتا ہے۔ ہر جگہ اسی کا چرچا ہو رہا ہے۔"

تیسرے نے سرد آہ بھری۔ "صاحبو، حالات توقع سے زیادہ خراب ہیں۔ آپ کا ہمارا تو اب بھی کچھ رعب ہے، کچھ اثر ہے۔ چھوٹے زمین دار تو عذاب میں مبتلا ہیں۔ کئی علاقے میں کسانوں نے شاہ عنایت کے دائرے کی طرز پر کاشت کاری کا مطالبہ کر دیا ہے۔ مغربی کنارے کے کچھ دیہات میں تو یہ نظام رائج بھی ہو گیا ہے۔ سرحدی علاقے میں بھی کسانوں نے اپنے طور پر خانقاہیں قائم کر لی ہیں۔"

پہلے نے اپنی تلوار پر ہاتھ پھیرا۔ "اب وہ ایک فرد نہیں رہا، ایک سوچ بن چکا ہے۔"

یہ سچ تھا۔ شاہ عنایت کی فکر ایک گھنے درخت کے مانند پھیلتی جا رہی تھی۔ نئے نئے انسان اس کی چھاؤں میں آتے جا رہے تھے۔ استحصالی قوتوں کی بوکھلاہٹ قابل فہم تھی۔

بادشاہ فرخ سیر کو اندازہ تھا کہ یہ تحریک اپنے اندر ایک عظیم بغاوت کے بیج رکھتی ہے۔ اگر ملک کے دیگر حصوں میں بھی ایسا نظام قائم ہو گیا، تو جاگیریں ڈھے جائیں گی، جس کا براہ راست اثر سلطنت پر پڑے گا۔

بہت سوچ بچار کے بعد دلی سے حکم جاری ہوا کہ شاہ عنایت سے پیداوار پر لگان لیا جائے۔

اس سے قبل کہ ہرکارے حکم نامہ لے کر میراں پور پہنچتے، مقامی جاگیرداروں کو اس کی خبر کر دی گئی ہے۔ انہوں نے کمر کس لی۔ سب کو اندازہ تھا کہ شاہ عنایت یہ حکم ماننے سے انکار کر دے گا۔ اور اس انکار کے نتیجے میں ایک جنگ چھڑ جائے گی۔

شاہ عنایت کی جانب سے مدلل جواب دیا گیا۔ فقیر کا موقف تھا کہ جس زمین پر وہ اور اس کے حواری کاشت کر رہے ہیں، وہ قصاص میں انہیں ملی ہے۔ اسی مانند میراں پور کی جس اراضی پر ابتدائی کاشت کاری شروع کی گئی تھی، وہ سابق حکمرانوں کی جانب سے شاہ عنایت کے بزرگوں کو ملی تھی، جس پر لگان دینے کا رواج نہیں۔ یعنی زمینیں ہر قسم کے محصولات سے مستثنیٰ ہیں۔

دلیل مضبوط تھی، مگر جب طاقت کا نشہ سر چڑھا ہو، خوشامدیوں نے آپ کو گھیر رکھا ہو، تو انصاف کے تقاضے پورے کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ فرخ سیر کے کان بھرے جا رہے تھے۔ مقامی جاگیرداروں نے وزراء سے گٹھ جوڑ کر لیا تھا۔

شاہ عنایت کے مدلل جواب کے بعد گورنر میر لطف علی خان نے مزید کسی کارروائی سے اجتناب برتا۔ اسے اس کی کمزوری پر محمول کیا گیا۔ سزا کے طور پر معزول کر کے نواب اعظم خان کو ذمے داری سونپ دی گئی۔

نئے گورنر کو بخوبی احساس تھا کہ اس کے پیش رو کو کون سی غلطی لے ڈوبی۔ وہ جانتا تھا کہ آج نہیں تو کل، اسے شاہ عنایت کے خلاف کارروائی کرنی ہو گی۔ مقامی زمین دار بھی تیار بیٹھے تھے۔ وہ وفد کی صورت نئے گورنر سے ملے، اسے ہر طرح کی حمایت کا یقین دلاتے ہوئے بھرپور حملے کا مشورہ دیا۔

"قتل کا مشورہ دینا تو آسان ہے، مگر اس پر عمل کرنا دشوار۔" نواب مسکرایا۔ "ٹھہرو، پہلے مجھے اس صوفی سے مل لینے دو۔ کیا پتا کسو وہ لگان دینے کو تیار ہو جائے۔"

جب نواب اعظم خان اپنے سپاہیوں کے ساتھ میراں پور پہنچا، مغرب کا وقت ہو چلا تھا۔ شاہ عنایت کا سر رب کائنات کے سامنے جھکا ہوا تھا۔ وہ عبادت میں مشغول تھا۔ دربان نے اسے حجرے میں جانے سے روک دیا۔

نواب کے چہرے پر ناگواری تھی۔ انتظار کرنا اس کی شان کے خلاف تھا۔ ایک شاطر زمین دار نے موقع سے فائدہ اٹھانے کے لیے چوٹ کی۔ "خدارا ہمیں یہ وقت بھی دیکھنا تھا کہ آپ جیسا نواب اس فقیر کی کٹیا کے باہر انتظار کرے۔ کاش زمین کا کلیجہ پھٹ جائے۔ اور میں اس میں سما جاؤں۔"

وہ شعبدہ باز سینہ کوبی کرنے لگا۔ کچھ چاپلوس کارندے بھی اسے دیکھا دیکھی اس کام میں شامل ہو گئے۔

"یہ سراسر گستاخی ہے حضور۔ جہاں پناہ خود اس سے ملنے آئے اور وہ اتنا مغرور ہے کہ انہیں انتظار کی اذیت دیتا ہے۔ ایسا تو کبھی دیکھا نہ سنا۔"

نواب پہلے ہی غصے میں تھا۔ ان باتوں نے اس کا پارہ اور چڑھا دیا۔ جب شاہ حجرے سے باہر آیا، تو وہ اس کی پُرجلال شخصیت کی رعب میں آ گیا۔ زیادہ تو نہیں کہہ سکا، مگر اتنا ضرور کہا۔ "فقیر کے دروازے پر دربان کچھ بھلے نہیں لگتے۔"

وہ مسکرایا۔ "یہ یوں کھڑے ہیں کہ سگ دنیا اندر داخل نہ ہو سکے۔"

نواب کے دل پر گھونسا لگا۔ وہ اتنے سخت جواب کی توقع نہیں کر رہا تھا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور بغیر کوئی لفظ کہے وہاں سے چل دیا۔

شاہ اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ افق پر چھائی تاریکی میں سرخی کی آخری لکیر تھی۔ فضا میں بے نام سناٹا تھا۔

وہ واپس حجرے میں آ گیا۔ بستر کے سرہانے ایک تلوار رکھی تھی۔ جڑاؤ تلوار۔ اس کے استاد کی کو بی، جس کے عوض وہ اپنا سر کٹانے کو تیار تھا۔

☆☆☆☆

متوازی حکومت!

یہ وہ ترکیب تھی، جسے گورنر نے اپنے مذموم مقاصد کے لیے استعمال کیا۔ اور یہ کارگر ثابت ہوئی کہ تخت کے لیے اپنوں کا خون بہانے والے بادشاہ کو سب کچھ گوارا تھا، مگر یہ قبول نہیں تھا کہ کوئی اس کی قوت کو للکارے۔

نواب اعظم خان نے جو خط روانہ کیا، اس میں میراں پور میں جاری اجتماعی کاشت کاری کو ایک باغی تحریک کے طور پر پیش کیا۔ لگان نہ دینے کے معاملے کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا۔ تذلیل کے احساس نے اس کے مغرور دل کو چھید ڈالا تھا۔

دلی نے فیصلہ کرنے میں وقت ضائع نہیں کیا۔ کسانوں کے اس اتحاد اور مساوات پر مبنی نظام نے انھیں خوف زدہ کر دیا تھا۔ سلطنت ایک نہتے فقیر سے ڈرنے لگی تھی۔

جنگ کا بگل بج گیا۔

تاریخ کی کتب میں اس کی تیاری کا عجیب احوال ملتا ہے۔ ٹھٹھہ میں شاہی فوج منظم ہوئی۔ ان کے پاس تیز دھار ہتھیار تھے اور ان کے بدن زرہ بکتر میں محفوظ تھے۔ قرب و جوار کے زمین داروں نے اپنے ذاتی رکھوالے اس فوج میں شامل کر دیے۔ یار محمد کلہوڑا اس جنگ میں پیش پیش تھا۔ نہ صرف اس کے کارندے، بلکہ وہ خود بھی اپنے بھائی اور بیٹے کے ساتھ اس جنگ میں شریک ہوا۔

قصاص میں اپنی زمین کھونے والا عبدالواسع بھی اسی لمحے کا منتظر تھا۔ وہ اپنے پیروکاروں کے ساتھ میدان میں اتر آیا۔ سبی اور گندھاوا میں تعینات دستے بھی دھول اڑاتے میراں پور کی سمت آتے تھے۔ شاہی حکم نامہ ملا تو ملتان کے صوبیدار نے اپنے بیٹے کی سرپرستی میں ایک دستہ روانہ کر دیا۔ ایک دستہ لاڑکانہ سے آیا۔ ان کے پاس بندوقیں بھی تھیں اور توپیں بھی۔ آتش گیر اسلحہ ان کا حوصلہ بڑھا رہا تھا۔

ڈاکٹر محمد علی شیخ بھی اس واقعے کا تذکرہ کرتے ہوئے مقالات الشعراء کا ایک اقتباس نقل کرتے ہیں:

"اعظم خان نے یہاں یار محمد کلہوڑا، تمام زمین داروں اور اس ضلعے کے ان تمام لوگوں کے نام معاونت کے احکام حاصل کر لیے تھے۔ یوں ایک ایسی فوج تیار کی، جو شمار نہیں کی جا سکتی۔ وہ چیونٹیوں اور ٹڈیوں سے بھی زیادہ تھی اور سبی سے لے کر سمندر کے کنارے تک کے علاقوں سے جمع کی گئی تھی۔"

اور اس بھاری بھرکم اور خونخوار فوج کا مقابلہ کس سے تھا۔ کسانوں سے۔ نہتے کسانوں سے۔

ان چوبیس ہزار کسانوں کے پاس فقط بھالے اور لاٹھیاں تھیں۔ کوئی اسلحہ نہیں تھا۔ مگر انھیں پروا نہیں تھی۔ انقلابی تعلیمات ان کی ڈھال تھیں۔ شاہ کے الفاظ تلوار کا کام دیتے تھے۔

جب دشمنوں کی فوج صفیں درست کر رہی تھیں، میراں پور کے ایک گم نام سپاہی نے، ایک کسان نے اپنی بیوی سے کہا۔ "یہ فقط شاہ عنایت کی جنگ نہیں۔ یہ تمام ہاریوں کی جنگ ہے۔ ہم جاگیرداروں کی غلامی سے نکل آئے ہیں۔ زنجیریں توڑ چکے ہیں۔ وہ جان تو دے دیں گے، مگر دوبارہ یہ زنجیریں نہیں پہنیں گے۔"

جب شاہی فوج میراں پور کی سمت بڑھ رہی تھیں، کسان کھلے میدانوں میں اکٹھے ہوئے۔ محنت کشوں کی کمان سنبھالنے والے سالار کی بارعب آواز گونجی۔ "ہم عدم مساوات کی دوزخ سے نکل آئے ہیں، اور اس میں دوبارہ جانے سے انکار کرتے ہیں۔ ہم آزاد ہیں۔ زمین اللہ کی ہے۔ جو زمین کا سینہ چیر کر بیج بوئے گا، وہی فصل کا حق دار۔ اگر کوئی اس نظام کے خلاف ہے، تو ہم اس سے لڑنے کے لیے تیار ہیں۔"

قرب و جوار سے بھی کسانوں کی ٹولیاں اس عظیم جنگ میں حصہ لینے کے لیے میراں پور کی سمت روانہ ہو چکی تھیں۔ ان کے لبوں پر گیت تھے اور انھوں نے درختوں کی ٹہنیاں اٹھا رکھی تھیں۔ خوف انھیں چھو کر بھی نہیں گزرا تھا۔

شاہ عنایت کی سپاہ پوری طرح تیار تھی۔

وہ قلعہ بند ہو گئے۔ کئی مہینوں کا راشن اور پانی جمع کر لیا گیا۔ پھر ہزاروں افراد کدال لے کر نکلے۔ ان میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے۔ میراں پور کے گرد خندق کھود کر اس میں پانی بھر دیا گیا۔

دوسرے طرف چھاپا مار جتھے تیار کیے گئے۔ انھیں

رات میں محاصرہ کرنے والے پر حملوں کی ذمے داری سونپی گئی تھی۔ شب خون مارنے والے بے جگر دلاور ان راستوں کا علم رکھتے تھے جن سے خندق عبور کی جا سکتی تھی۔

اکتوبر 1717ء میں جب مغرور سالار اپنے بدترین جنون کے ساتھ میراں پور پہنچا تو ایک صدمہ اُس کا منتظر تھا۔ انہیں خبر ملی تو تھی کہ انقلابی خندق کھودنے میں جتے ہیں مگر یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ اتنی گہری ہو گی کہ اسے عبور کرنا ناممکن ہو جائے گا۔

وہ خندق شاہی فوج کے لیے ڈراؤنا خواب ثابت ہوئی۔ محاصرہ تو کر لیا مگر زنگ زدہ ذہنوں کو نقب لگانے کی کوئی راہ نہیں مل رہی تھی۔ انہوں نے توپوں سے گولے داغے مگر آبادی اتنے فاصلے پر تھی کہ یہ کوشش رائیگاں گئی۔

جلد ہی محاصرے میں دراڑیں ظاہر ہونے لگیں۔ کچھ سائے رات گئے آسیب کے مانند حملہ کرتے۔ بچھیوں اور درانتی سے سپاہیوں کو چیر دیتے اور اس سے قبل کہ مشعل روشن ہوں، جوابی کارروائی کی جائے، وہ نہ جانے کیسے اپنی پناہ گاہ میں واپس جا چھپتے۔

دن گزرتے گئے۔ مایوسی اتنی بڑھی کہ بالآخر کلہوڑا نے اپنے بیٹے کو خط لکھا "انہوں نے بستی کے گرد خندق کھود رکھی ہے۔ اسے پار کرنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ ہمیں میراں پور سے کئی کوس دور ڈیرا ڈالنا پڑا۔"

جنگ طول پکڑتی جا رہی تھی۔ کسانوں کی سپاہ محفوظ تھی۔ سلطنت کے زور پر کھڑی فوج میں وحشت بڑھنے لگی۔ محاصرے کو ایک ہفتہ گزرا، پھر دوسرا ہفتہ اور پھر تیسرا ہفتہ بھی گزر گیا۔

کچھ روز شدید بارشیں ہوئیں۔ خندق کیچڑ سے بھر گئی۔ پھر گرد کا طوفان آیا۔ حد نگاہ اتنی گھٹ گئی کہ جو جہاں تھا، وہیں کھڑا رہ گیا۔ یہ ہوا کہ بیماریاں ساتھ لائی۔ سپاہیوں کی کمر بستر سے لگ گئی۔ کئی ہلاکتیں ہوئیں۔ فوج میں سراسیمگی پھیل گئی۔ مختلف علاقوں کے دستوں نے واپسی کا مطالبہ کر دیا۔

گورنر تک یہ خبر پہنچی، تو وہ بہت آگ بگولا ہوا۔ تازہ دستے روانہ کیے۔ ساتھ ہی حکم نامہ بھی تھا۔ "محاصرہ ختم کرنے کا مطالبہ بغاوت تصور کیا جائے گا اور بغاوت کی سزا موت ہے۔ میں خود وہاں پہنچ رہا ہوں۔"

اُس فوج میں ملتان کا دستہ بھی شامل تھا، جس کی کمان ملتان کے صوبیدار کے بیٹے نے سنبھالی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے باپ کو خط لکھا، تو صورت حال کی کچھ یوں تصویر کشی کی۔

"فوج دو ماہ سے جاں فشانی سے جنگ کر رہی ہے مگر قلعے کے چاروں طرف کا علاقہ پانی میں ڈوبا ہوا ہے۔ چاروں طرف سے دس کوس تک خشکی کا نام و نشان نہیں۔ ابھی ایک تھوڑی بمشکل خندق عبور کر کے شاہ عنایت کے قلعے کے پاس مورچہ زن ہوئی ہے۔ ان پر شب خون مارا گیا۔ گھمسان کا رن پڑا۔"

تو جنگ جاری تھی۔ ایک جانب آزادی کی فطری خواہش تھی اور دوسری طرف زنجیر پرست تھے۔

انقلابیوں نے نعرے نہیں لگائے۔ ڈھول نہیں پیٹے۔ شور نہیں مچایا۔ بس سر جھکائے اپنے قائد کی ہدایت پر عمل کرتے رہے۔ گو وسائل کم تھے۔ راشن ختم ہو رہا تھا۔ پانی کا ذخیرہ بھی تھوڑا رہ گیا۔ سردی بلا کی تھی مگر ہاریوں کے جسم جہد و جہد کے عادی تھے۔ موسم کے تھپیڑوں نے انہیں سخت جان بنا دیا تھا۔

محاصرہ خاصا طویل ہو گیا۔ ادھر چھاپا مار کارروائی کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ وسائل ختم ہونے لگے، تو گورنر نے جاگیرداروں پر مزید ٹیکس عائد کر دیے۔ بھاری لگان وصول کیا گیا، تاکہ مزید اسلحہ خریدا جا سکے۔ ہزاروں سپاہیوں کی غذائی ضروریات پوری ہو سکیں مگر کچھ حاصل نہیں ہوا۔ کچھ بھی نہیں۔

نیا سال شروع ہو گیا۔ محاصرہ چار ماہ تک مکمل کرنا کا داغ بن چکا تھا۔ ہتھیاروں کو زنگ لگ گیا۔ گھوڑے بیمار پڑ گئے اور سپاہیوں کی ہمت جواب دے گئی۔

وقت نے طاقت کے گھمنڈ میں مبتلا فوج کو توڑ ڈالا۔ نہتے کمزور کسان جیت رہے تھے۔ طاقتور ترین سپاہ ڈھے گئی۔ ان کی جنگی حکمت عملی ناکام گئی۔ شکست عیاں تھی... مگر تب دشمن نے ایک چال چلی۔

ایک کارگر چال۔

☆☆☆☆

وہ شاہ عنایت تھا۔ ایک انقلابی، ایک صوفی، ایک سچا مسلمان۔

اُس کا روشن سر فقط خدا کے سامنے جھکتا تھا۔ اس کا منور دل ہر وقت رب کی حمد و ثنا کرتا۔ اس کے عقیدت مندوں میں بھی جذبۂ ایمانی کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ دین سے اُن کی محبت اٹل اور خالص تھی۔

اور دشمن اِسی محبت کو اپنا ہتھیار بنانے والا تھا۔

خندقوں کے اُدھر سے، شکستہ خیموں اور بیمار سپاہ کے درمیان سے ایک آواز اٹھی۔ "ہم صلح چاہتے ہیں۔"

ایک قوی الجثہ ہاتھی پر سوار شخص منادی کر رہا تھا۔ "آؤ،

سمجھوتا کرلیں۔ ہم اور تم ایک اللہ ایک رسول ﷺ کے ماننے والے ہیں۔ بہت خون خرابا ہوا۔ آؤ سمجھوتا کرلو۔"

سپاہی اپنے کمانڈر کے گرد جمع ہوگئے۔ صوفی سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اس کے وجود پر اطمینان کا سایہ تھا۔

کئی ساعتوں تک خاموشی چھائی رہی۔ پھر حجرے میں "اللہ اکبر!" کی صدا گونجی۔

اُس نے سر اٹھا کر افق کو دیکھا۔ وہاں لالی چھائی ہوئی تھی۔

"بہار کی چال ہے۔" ایک ساتھی نے کہا۔

وہ مسکرلیا۔ اُس کے تبسم میں عزم لہلہاتا تھا۔ وہ حجرے سے باہر آگیا۔ خندق کی اس سمت صبح کے خواہش مند کھڑے تھے۔ اُنہوں نے قرآن اٹھا رکھا تھا۔

ہاں، ان کے ہاتھ میں کلام خدا تھا۔ ان کی زبانوں پر آیات تھیں۔ وہ خیر کی بات کررہے تھے۔ وہ بھائیوں کا بھیس بدلے آگے بڑھ رہے تھے۔

"وہ قرآن پاک اٹھائے آرہے ہیں۔ انہیں راستہ دو۔ پھاٹک کھول دو۔" اس کی آواز میں کامل سکون تھا۔

نجی ملکیت کے خلاف برسرپیکار، مساوات پر یقین رکھنے والے وہ انقلابی پکے سچے مسلمان تھے۔ قرآن کے احترام میں ان کے سر جھک گئے۔ کل تک جوان کے خون کے پیاسے تھے، جنہوں نے انہیں قتل کرنے کی قسم کھا رکھی تھی، آج وہ ظالم اُن کے سامنے تھے، مگر انہوں نے اپنے دشمنوں کو ہاتھ بھی نہیں لگایا کہ اُن کے ہاتھ میں قرآن جو تھا۔

وہ قرآن تھامے شاہ عنایت کے حجرے تک گئے۔

"ایک اللہ ایک رسول کے نام پر، قرآن کے نام پر... آؤ ہم مذاکرات کریں۔"

"جنگ ہمارا انتخاب نہیں تھا۔" صوفی نے کہا۔ "یہ ہم پر مسلط کی گئی۔ ہم مذاکرات کے لیے تیار ہیں۔"

چال بازوں کے چہرے کھل گئے۔ "سبحان اللہ شاہ عنایت رحم دل اور سخی ہے۔ گورنر صاحب اپنے خیمے میں آپ کے منتظر ہیں۔"

وفاداروں میں شک کا سانپ پھنکارا۔ وہ کچھ کہنا چاہتے تھے، مگر شاہ عنایت کے اشارے نے خاموش کروادیا۔

صوفی کے سامنے قرآن پاک تھا جو اس کا راہبر تھا، جس کی سربلندی اس کا مقصد زیست تھا۔ اس کے لیے ہر شے قربان۔

اس نے تلوار اٹھائی۔ وہی تلوار جو اسے شاہ عبدالملک نے عطا کی تھی۔ اس جراؤ تلوار کو دیکھ کر مذاکرات کے لیے آنے والوں پر ہیبت طاری ہوگئی۔

"گھبراؤ نہیں۔" وہ مسکرایا۔ "یہ بیش قیمت تحفہ جنگ کے لیے نہیں۔ یہ تو فقیر کے نیے ہے۔"

وہ چند ساتھیوں کے ہمراہ قلعے سے باہر آیا۔ اس نے پلٹ کر اس زمین پر نظر ڈالی جہاں سرسبز فصل میں لہریں اٹھتی تھیں۔

"وہاں چلنے کا وقت آگیا ہے۔" اس نے دھیرے سے کہا۔

پھاٹک کھولے گئے۔ اس نے خندق عبور کی۔ اس کے ساتھی اسے جاتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں اندیشے تھے، دل میں خدشات تھے۔ مگر وہ چپ تھے۔

وہ دھیرے دھیرے دور ہوتا جارہا تھا۔ اُس کا سر بلند تھا اور بیروں تک آنے والے مٹی سوتاتن کر چھٹ رہی تھی۔

وہ اپنے ساتھیوں سے دور ہوتا گیا، ایک دھبے جتنا رہ گیا۔ یہاں تک کہ تحلیل ہوگیا۔ وہ شخص، جس نے مساوات پر مبنی تقسیم کا نظام متعارف کروایا تھا۔ سندھ کا نقشہ بدل دیا تھا، ایک ناممکن جنگ لڑی تھی... قرآن پاک کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔

گورنر کے خیمے میں پہنچتے ہی چال بازوں کا نقاب اتر گیا۔ ان کی مصنوعی انکساری کی جگہ درشتی نے لے لی۔ دانتوں سے خون ٹپکنے لگا۔ وہ پھنکارنے لگے تھے۔

اُس راست باز انسان کو اُس خدا ترس شخص کو گرفتار کر لیا گیا۔

اسے زنجیروں میں جکڑ دیا گیا۔ انہوں نے کمر سے بندھی اس کی تلوار بھی نکال لی۔ مگر وہ اس کی مسکراہٹ نہیں چھین سکے۔ وہ ہنوز قائم تھی۔ اس میں ٹھہراؤ تھا۔

انہوں نے شاہ عنایت کو دھوکا نہیں دیا تھا، بلکہ اپنے ضمیر کو دھوکا دیا تھا۔ وہ یہ سمجھے کہ انہوں نے صوفی کو اپنی چال میں پھانس لیا ہے، مگر حقیقت میں وہ اپنے فریب کے جال میں خود پھنس چکے تھے۔

قربانی تو انقلاب کا جزو ہے اور اصل قربانی وہ جو قائد دے، رہنما دے۔ اصل قربانی وہ، جو شاہ عنایت دے... یہی قربانی تو اسے تاریخ کے اوراق میں زندہ رکھنے والی تھی۔

☆☆☆☆

اس کے قدم پڑتے ہی بنجر زمین کے سینے میں خوابیدہ بیج جاگ اٹھے۔ بادل آوارہ ہوائیں چلیں اور کونپلیں پھوٹ پڑیں۔

جب اس عہد ساز ہستی کو ٹھٹھہ لایا گیا تو درختوں نے

معروف اور مقبول قلم کار

طاہر جاوید مغل

کی نئی سلسلے وار کہانی

انگارے

جاسوسی ڈائجسٹ

میں پیش کی جارہی ہے

زندگی کی رعنائیاں اور ہولناک سچائیاں

اپنے دامن میں سمیٹے

ایسی طویل، سنسنی خیز اور تحیر انگیز کہانی

جسے قارئین ایک ہی نشست میں پڑھنے پر

خود کو مجبور پائیں گے

اُس کا استقبال کیا۔ پھول کھل اٹھے۔ مگر ظالم کا دل چنگاریوں سے بھرا ہوا تھا۔ وہاں آتش نمرود کی لپٹیں تھیں۔

ظالم انصاف سے نالاں ہوتا ہے، مگر انصاف پسند بننے کا ڈھونگ ضرور کرتا ہے۔ تو انہوں نے ڈھونگ رچایا۔ یہ ثابت کرنے کے لیے کہ مجرم کو اپنے دفاع کا، بات کہنے کا پورا موقع دیا جائے گا، عدالت سجائی گئی۔ شاہ عنایت کو کٹہرے میں کھڑا کردیا گیا۔ میر علی شیر نے اُس مقدمے کی روداد کو قلم بند کیا ہے۔ جسے ڈاکٹر شاہ محمد مری نے اپنی کتاب ”شاہ عنایت شہید“ میں پیش کرتے ہوئے ادبی شاہکار ٹھہرایا کہ حاکم وقت کے متکبرانہ سوالات کا جواب شاہ عنایت نے قرآن و حدیث، سعدی و رومی کی حکایات اور حافظ کے اشعار کی صورت دیا۔ اور ثابت کردیا کہ ایک سمت علم تھا اور دوسری طرف بے علمی۔

کوتوال نے پوچھا۔ ”تم نے شورش کیوں برپا کی؟“

جواب رباعی کی شکل میں ملا:

جس روز فلک کے گھوڑے پر زین رکھی گئی
پروین سے مشتری کی آرائش کی گئی
قضا کے دفتر سے یہ ہمارا نصیب ہوگیا
ہمارا کیا گناہ، ہماری قسمت یونہی لکھی گئی تھی

جب ایک درباری نے کہا۔ ”جاگ جاؤ، یہاں حساب کا موقع ہے۔“

تو وہ مسکرایا۔ ”نیک کاروں کے کوچے میں ہمارا گزر لکھا ہی نہیں، تمہیں اعتراض ہے تو ہماری تقدیر بدل ڈالو۔“

جب خوشامدی لاجواب ہوگیا تو گورنر دھاڑا۔ ”اب سزا کے لیے تیار ہو جاؤ۔“

جواب میں شاہ عنایت نے کہا۔ ”دوست کے لیے آزمائش ایسے ہی ہے، جیسے سونے کے لیے آگ، جو سونے کو حرے چمکا دے۔“

کوئی جواب نہیں بن پڑا تو حاکم جھنجھلا اٹھا۔ ”جب قتل ہونا ہے تو تب بھی ضد نہیں چھوڑو گے؟“

شاہ نے کہا۔ ”وہ شخص کبھی نہیں مر سکتا، جس کا دل عشق سے زندہ ہے۔“

پھر پوچھا گیا۔ ”آخری خواہش کیا ہے؟“

اس نے شعر پڑھا:

میں نے جس وقت عشق کے چشمے سے وضو کیا
اس وقت ہر موجود شے پر چار تکبیریں پڑھ ڈالی تھیں

وزراء اور جاگیردار گورنر کے گرد جمع ہوگئے۔ دلائل نے انھیں زچ کردیا تھا۔ وہ فقط اسے سزا دینے کے متمنی نہیں تھے بلکہ عبرت کا نشان بنانے کے آرزومند تھے۔ اذیت پسندوں کے درمیان طویل مکالمے کے بعد اعلان ہوا۔

”اے باغی، تیرا قتل تو طے ہے مگر اس سے پہلے تیرے بھائی اور بھانجے کو، جو بغاوت میں شریک تھے، تیرے سامنے قتل کیا جائے گا۔“

یہ روح کو جھنجھوڑ دینے والا اعلان بھی اسے نہ توڑ سکا۔ اس نے آسمان کی سمت دیکھ کر کہا۔ ”عشاق کی قتل گاہ میں سوئی اور فربہ بھیڑ ہی ذبح کی جاتی ہے۔“

میدان سجا۔ خونیں مناظر سے اپنی پیاس بجھانے والے اکٹھے ہوئے۔ شاہ کے بھائی میاں رحمت اللہ اور بھانجے محمد یوسف کو لایا گیا۔

صوفی کے دل میں رومی کا ... گیت تھا۔ ”سریلے پرندے ہی قید کیے جاتے ہیں، کیا تم نے الوؤں کو کبھی پنجرے میں دیکھا ہے۔“

اس نے اپنے پیاروں پر شاہ کی جو موت سے فقط ایک قدم پرے کھڑے تھے۔ ان کے ہونٹوں پر وہ مسکراہٹ تھی، جو تاریخ نے فقط لازوال انسانوں کے ہونٹوں پر ہی دیکھی تھی۔

”سر قلم ہونے کا وقت ہے۔“ شاہ نے باآواز بلند کہا۔

”اس سے اچھا سجدہ کے لیے بھلا کون سا لمحہ ہوگا۔“

دونوں نے تکبیر پڑھی، ہاتھ باندھے اور خالق کائنات کی یاد میں محو ہوگئے۔ جلاد آگے بڑھا۔ اس نے تلوار بلند کی۔ وہ نیک دل انسانوں کے سرتن سے جدا ہوگئے۔

خونیں مناظر سے اپنی پیاس بجھانے والے حیران تھے کہ شاہ عنایت کو تڑپتا دیکھ کر بھی مسکرا رہا ہے۔ اس کے ہونٹوں سے اُن سوں الفاظ جھڑے۔ ”ساری دنیا توبہ کرسکتی ہے مگر عاشق توبہ نہیں کرسکتا۔“

☆☆☆☆

پہلے طوفانی ہوائیں چلیں۔ ان میں سرخ ریت اور آتش گیر مادے کی بو تھی۔ پھر کنوؤں کا پانی کڑوا ہوگیا۔ برتن بجنے لگے اور ان میں رکھا دودھ پھٹ گیا۔

وہ 7 جنوری 1718 کی ٹھٹھرتی ہوئی صبح تھی۔

ایک بار پھر عدالت لگی۔ ایک بار پھر الزامات کی بارش ہوئی اور ایک بار پھر فتوؤں کا انبار لگا۔

اس پرشور سرگرمی کا نتیجہ اس اعلان کی صورت سامنے آیا۔ ”باغی شاہ عنایت کو موت کی سزا سنائی جاتی ہے۔“

وہ 63 سالہ شخص شان سے مقتل میں گیا۔ جس آنکھ نے

اسے دیکھا، وہ ٹھٹکا، جھک گیا۔ زباں دراز چپ ہو گئے اور مخالفین کے کاندھوں پر شرمندگی کا بوجھ بڑھنے لگا۔

عاشق، معشوق کی سمت بڑھ رہا تھا۔ دوست، دوست سے ملنے والا تھا۔ مٹی اس کے قدموں کے بوسے لے رہی تھی۔

مقتل میں جب شاہ عنایت کی نظر جلاد پر پڑی، تو ذہن کے پردے پر وہ منظر گھوم گیا، جب ٹھنڈی ہوا سے درختوں کی ٹہنیاں جھول رہی تھیں، پرندوں میں لافانی گیت نے انگڑائی لی تھی، استاد نے اسے اپنا چوغہ عطا کیا تھا، اور اس نے چوغہ کی بجائے اس کی تلوار مانگ لی تھی۔ اور کہا تھا۔ "اس تلوار کی قیمت فقیر کی گردن ہے۔"

ہاں وہ لمحہ آن پہنچا تھا۔ جلاد کے ہاتھ میں وہی تلوار تھی، جو برسوں تک شاہ عنایت کے جسم کا جزو رہی۔ وہی تلوار، جو اس کے استاد نے عطا کی تھی۔ وہی تلوار، جس سے اس کا سر قلم ہونا لکھا گیا تھا۔

عشق کا اس سے بہتر انجام بھلا کیا ہو سکتا تھا۔

اس سے قبل کہ جلاد اس کی گردن پر وہ مقدس تلوار چلاتا، اس نے جیب سے چند اشرفیاں نکال کر اچھالیں۔ "یہ تیری محنت کا معاوضہ۔" پھر اس نے حافظ کا شعر پڑھا:

تو نے مجھے زندگی کی قید سے رہا کر دیا
اللہ تجھے دونوں جہانوں میں جزا دے

تو وہ 7 جنوری 1718 کی ٹھٹھرتی ہوئی صبح تھی، جب طوفانی ہواؤں میں سرخ ریت اور آتش گیر مادے کی بو تھی... جب شاہ عنایت کا سر تن سے جدا ہوا۔

شاہ عنایت کی شہادت کی خبر نے جھوک کو آگ بگولا کر دیا۔ وہاں انتقام کی لپٹیں اٹھنے لگیں۔ اب ہر کسان شاہ عنایت تھا۔ محنت کشوں نے لاٹھی، کدال اور کلہاڑیاں اٹھا لیں۔ وہ مرنے کو تیار تھے مگر سر جھکانا انہیں گوارا نہیں تھا۔

شاہی فوج نے جھوک پر چڑھائی کر دی۔ پوری قوت سے حملہ کیا۔ عزم و ہمت کے ہتھیار سے لیس کسانوں نے جواں مردی سے مقابلہ کیا، مگر ظالم غالب آ گیا۔ فوجیں بستی میں داخل ہو گئیں۔ مکانات مسمار کر دیے گئے۔ فصلوں کو آگ لگا دی گئی اور فقیروں کا قتل عام شروع ہو گیا۔

ایک روایت کے مطابق اس حملے میں اتنے لوگ قتل ہوئے کہ گلیوں میں چلنے کی جگہ نہ رہی۔ شاہی فوج لاشیں دفناتے دفناتے تھک گئی۔ سات بڑے کنویں لاشوں سے بھر گئے۔ ان اجتماعی قبروں کو گنج شہیداں کہہ کر پکارا جاتا ہے۔

شاہ عنایت کو شہید کرنے کے بعد بھی ظلم کا آتش کدہ ٹھنڈا نہیں ہوا۔ عوام میں وحشت پھیلانے کے لیے اس کا سر نیزے پر بلند کر کے ٹھٹھہ کی گلیوں میں گھمایا گیا اور پھر اس نیزے کو دہلی بھیج دیا گیا۔ یہ ڈیڑھ ماہ کا سفر تھا۔ شاہ کا سر وادیوں اور صحراؤں سے گزرا۔ اس نے دریا اور سنگلاخ پہاڑ عبور کیے۔

روایت ہے کہ کبھی نہ جھکنے والا یہ مقدس سر پورا راستے مرکز نگاہ بنا رہا، دلوں کو منور کرتا رہا۔ اہل دل شعر کہتے رہے۔ اس شاعری کو "بے سرنامہ" کہا جاتا ہے۔ کچھ محققین کے مطابق ان اشعار کی تعداد لگ بھگ سات سو کے قریب تھی، مگر وہ محفوظ نہیں کیے جا سکے۔ ہاں، معروف شاعر بیدل نے "مثنوی دلکشا" میں شاہ عنایت کی شاعری کا تذکرہ کیا ہے۔ بعد کے برسوں میں انہیں انتخاب کی بھی شکل دی گئی۔ ڈاکٹر محمد علی ہاشمی اور محبوب علی چنا نے اپنی کتب میں اس بے بدل شاعری کے کچھ بیش قیمت ٹکڑے اکٹھے کیے۔

صوفی کا مبارک سر تھال میں سجا کر شاہ کو پیش کیا گیا۔ اس سے قبل کہ اس کی مزید بے حرمتی کی جاتی، حضرت معین الدین چشتی کے خلفاء حرکت میں آئے۔ انہوں نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کرتے ہوئے یہ سر حاصل کر لیا اور پوری شان و شوکت کے ساتھ شاہ عنایت کے عقیدت مندوں کے حوالے کر دیا۔ آج جھوک میں شاہ کے روضے کے باہر ایک چبوترا ہے۔ کہتے ہیں، تدفین سے قبل وہ سر دیدار کے لیے وہیں رکھا گیا تھا۔

میراں پور، جو آج جھوک کے نام سے معروف ہے، کی اس جنگ کو صدیاں گزر چکی ہیں۔ وقت نے عجیب کھیل کھیلا۔ ظلم کا ساتھ دینے والے حاکم، جاگیردار بے نام و نشاں ہو گئے، کتابوں میں ان کا سرسری تذکرہ ملتا ہے، مگر مظلوم کے ساتھ کھڑا ہونے والا صوفی ایک استعارہ بن گیا۔ سندھ کا سپوت کہلایا۔ اس خطے میں جنم لینے والے کتنے ہی روحانی سلسلوں کی جڑیں جھوک میں ملتی ہیں۔ کتنے ہی عالموں، دانشوروں اور ولیوں نے اس کے سامنے سر جھکایا اور یہ سچ ہے۔ وہ دنیا ترک کرنے والا فقیر نہیں تھا، زمانہ بدل دینے والا فاتح تھا۔

ماخذات

شاہ عنایت شہید از شاہ محمد مری

وکی پیڈیا، اخبارات و رسائل

تاریخ عالم

منظر امام

یہ عالم رنگ و بو لفظ کُن سے خلق ہوا۔ سائنسدانوں نے کہا یہ تو بگ بینگ سے وجود میں آیا۔ اس کرۂ ارض کے وجود میں آتے ہی زندگی نے انگڑائی لی۔ آدمی کا وجود سامنے آیا۔ آدمی نے ہی اس کرۂ ارض کی رنگینی میں اضافہ کیا۔ اس میں ترقی کا اسپ تیز رفتار دوڑایا۔ یہ دنیا ترقی یافتہ دنیا، رنگینیوں، آسائشوں سے بھری دنیا کوئی ایک دن کی کہانی نہیں۔ ہزاروں سال پر محیط کہانی ہے جسے نہایت مختصر مگر جامع انداز میں احاطہ تحریر میں لایا گیا۔

آپ نے زمین پر انسانی تاریخ کا جائزہ تو لے لیا ہوگا۔

مجھے اُمید ہے کہ یہ معلوماتی سلسلہ آپ کو ضرور پسند آیا ہوگا۔ آپ کو یہ اندازہ ہو گیا ہوگا کہ انسان کہاں کہاں سے سفر کرتا ہوا کہاں تک آیا ہے۔

کیسے اس کی ابتدا ہوئی۔ وہ کیسے انسانی شکل میں آیا۔

پھر اس نے اپنی بقا کے راستے کیسے تلاش کیے، وغیرہ۔
ہم جائزہ لیتے ہوئے بہت آگے تک آگئے ہیں۔
اب انسانی تاریخ کی مجموعی صورت حال کی بجائے یہ دیکھا جائے گا کہ مختلف ادوار میں مختلف ملکوں میں کیا ہوتا رہا۔
یہ ایک متوازن تاریخ ہے۔ جس کی کمی میں نے محسوس کی تھی۔ کیوں کہ جب ہم کسی خاص ملک کی تاریخ دیکھتے ہیں تو ہمیں صرف اس ملک کی تاریخ ملتی ہے اور یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ اس دور میں دنیا کے دوسرے ملکوں یا خطوں میں کیا ہو رہا ہوگا۔
آئیں ہندوستان سے شروع کرتے ہیں۔ کیوں کہ ہمارا تعلق اس سرزمین ہندوستان اور پاکستان سے ہے۔
20 ہزار سال سے دس ہزار سال بی سی۔
قدیم تاریخ قدیم ترین زمین۔
وسطی ہندوستان کے نرمدا وادی سے ملنے والے آثار بتاتے ہیں کہ یہ علاقہ پچیس لاکھ سال پہلے سے آباد تھا۔
اب اس مدت کا تصور کریں۔ یہ پروٹو ہومو سپین کا دور ہے۔ اس کے بعد ہوموکی موجودگی ظاہر ہوئی (یعنی انسان ابھی مکمل حالت میں نہیں تھا)۔
پھر جب مکمل صورت میں آیا تو اس نے ایک ساتھ رہنے کا سلسلہ قائم کیا۔ اپنی آبادیاں بنائیں (دنیا کے دیگر علاقوں کی طرح)۔
آرکیالوجیکل سروے کے مطابق ہندوستان کی یہ آبادیاں دریائے سون کے کنارے تھیں۔ وہ علاقہ جو موجودہ ہندوستان، پاکستان اور نیپال میں ہے۔
ایک لاکھ سال پہلے ہوموا ریکٹس کے آثار پائے گئے ہیں۔
نرمدا وادی موجودہ مدھیہ پردیش ہوشنگ آباد اور جبل پور وغیرہ کے درمیان ہے۔
نرمدا وادی دریائے نرمدا کے نام پر ہے۔ یہ دریا ہندوستان کا تیسرا بڑا دریا ہے۔ گجرات میں واقع ہے۔
ہومونائڈ (عظیم قد آور گوریلے) کے آثار ان علاقوں میں پائے گئے ہیں تو پتا چلا کہ ہندوستان کا قدیم ترین کلچر سون کلچر تھا۔
اس کلچر کو سون کا نام 1936ء میں ہلمٹ ڈی ٹیرا نے دیا تھا۔ وہ ایک ماہر آرکیالوجسٹ تھا۔
ان علاقوں میں دریائی گھوڑوں اور مگرمچھوں کے فوسلز ملے ہیں جن سے ان کی قدامت کا اندازہ لگایا گیا ہے۔
ان میں سے چند فوسلز پاکستان میوزیم آف نیچرل سائنسز اسلام آباد میں محفوظ ہیں۔ سوانی برصغیر پاک و ہند کے سوانک پہاڑوں کی ایک آثاری ثقافت ہے۔ اس ثقافت کے آثار بھارت، نیپال اور موجودہ پاکستان میں ملتے ہیں۔
9000 بی سی۔ ابتدائی نیولیتھک کلچر۔
مدھیہ پردیش میں پتھروں کے چند مجسمے بھی ملے ہیں۔ جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اب کس حد تک آبادیاں ہو چکی ہیں۔
پاکستان کے بہت سے علاقوں سے پانچ ہزار سال قبل از مسیح کے ملنے والے آثار سے پتا چلتا ہے کہ اس دور میں یہاں کے لوگوں نے برتن سازی میں کمال حاصل کر لیا تھا۔
بعض ماہرین کا خیال ہے کہ برتن سازی کے کام کا آغاز عورتوں نے کیا تھا۔ اس دور کے لوگوں کے زیر استعمال جو برتن ملے ہیں وہ ٹوکری یا مٹکے کی شکل کے ہیں۔ جن پر خوب صورت ڈیزائن بھی بنے ہوئے ہیں۔
ان مٹکوں کو پانی بھرنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ جو آج بھی چلا آرہا ہے۔ صوبہ سرحد کے شہر ڈیرہ اسماعیل خان سے تقریباً 25 کلو میٹر شمال کی طرف ایک قدیم شہر کھدائی کے دوران دریافت ہوا ہے۔ اس شہر کے بارے میں ماہرین کا خیال ہے کہ یہ شہر تقریباً چار ہزار سال قبل از مسیح موجود تھا۔
اس شہر سے ملنے والے آثار قدیمہ، ہڈیوں، پتھروں پر کھدے ہوئے نقش و نگار، مٹی کے برتنوں پر کندہ ابھرے ہوئے نشانات اور رنگین اشاروں سے اس بات کا پتا چلتا ہے کہ یہاں کے رہنے والوں کا صوبہ سندھ کے لوگوں سے بھی بہت پہلے ایسا کوئی رسم الخط موجود تھا۔
7500 بی سی۔
ہندوستان کے ہریانہ اور دوسرے اضلاع میں نیو لیتھک (New Lithic) کلچر کا سراغ ملتا ہے۔
ہندوستان کے جنوبی علاقوں میں حسن سنگم کا عہد۔
سنگم۔ تاریخ کا وہ عہد جب ہندوستان کے جنوب میں اس کلچر کو فروغ ہوا۔ سنگم فلسفیوں اور شاعروں کا ایک مکتبہ فکر تھا۔ مدورائی شہر میں اس کے آثار ملتے ہیں۔ قدیم روایت کے مطابق سنگم عہد کے تین ادوار ہیں۔

1۔ ابتدائی سنگی دور۔ 2۔ وسطی سنگی دور اور 3۔ آخری سنگی دور۔

ہم نے 7500 بی سی تک کے ہندوستان کا ایک جائزہ دیا ہے۔ اب دیکھتے ہیں کہ ان ہی ادوار میں دنیا کے دوسرے خطوں میں کیا ہو رہا تھا۔

چین

انیس ہزار سال سے سات ہزار سال بی سی۔

اندازہ ہوتا ہے کہ چین میں اس دور میں انسانوں نے زراعت اور برتن وغیرہ بنانے کا ہنر سیکھ لیا تھا۔

ڈیان رین کے غاروں سے اس عہد کے آثار برتنوں اور اناج جمع کرنے کی کوٹھریوں کی صورت میں ملے ہیں۔

ڈیان رین کے آثار جانگسی صوبے میں ہیں۔ یہ غار سات میٹر طویل اور گیارہ میٹر بلند ہیں۔ اس سے اس دور کے انسانوں کی جفاکشی کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

7600 بی سی۔ زن یان کلچر۔

یہ وہ دور تھا جب انسان نے جانوروں کو اپنے فائدے کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ کسی حد تک مویشی پالنے لگا تھا۔

ماہرین کے مطابق خنزیر کی نسلیں بھی تھیں۔ یعنی انسان اس جانور کو پالنے لگا تھا۔

7500 بی سی۔ تان شوانگ کلچر۔

یلو ریور (دریائے زرد) کے کنارے جنوبی پہاڑی میں اس تہذیب کی باقیات برتنوں اور اوزاروں کی صورت میں ملی ہیں۔

(اس قسم کے نام ظاہر ہے کہ اس زمانے میں تو نہیں ہوتے ہوں گے۔ بعد میں ماہرین نے ایک کلچر کو دوسرے کلچر سے علیحدہ کرنے کے لیے مختلف نام دے دیے ہیں)۔

اس تہذیب میں کاریگری بہت عمدہ تھی۔ زراعت شروع ہو چکی تھی اور مویشیاں پالنے کا رجحان ہو گیا تھا۔

7500 بی سی میں دریائے یانگ کے آس پاس پنگ تو شان کلچر کے آثار بہت بڑی تعداد میں ملے ہیں۔ شمال مغربی یونان میں یانگ کے کنارے۔

اس آثار کی دریافت 1988ء میں ہوئی تھی۔

یہ آثار بتاتے ہیں کہ انسان نے ترقی کے کئی اور مراحل طے کر لیے تھے۔

یورپ

(اب دیکھیں کہ ان ادوار میں یورپ کی کیا صورت حال تھی)

24 ہزار بی سی۔

یورپ میں زراعت شروع ہو گئی تھی۔ یہاں ہجرت کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ آنے والے مشرق وسطی، اناطولیہ اور بلقان وغیرہ سے آ رہے تھے (یاد رہے کہ یہ سارے نام اب دیے گئے ہیں۔ جب کہ چوبیس ہزار سال پہلے ان ناموں کا وجود بھی نہیں ہوگا)۔

سولہ ہزار بی سی میں یورپ میں ایک نئی تہذیب کا آغاز۔

اس تہذیب کو میگڈالانین Magdalanian کا نام دیا گیا ہے۔ اس تہذیب نے بہت جلد فرانس، اسپین، جرمنی، اٹلی، پولینڈ، پرتگال اور یوکرائن وغیرہ پر غلبہ حاصل کر لیا تھا۔

بارہ ہزار بی سی۔ یورپ میں غاروں میں سنگ تراشی کا فن عروج پر تھا۔ اسپین اور فرانس میں اس دور کے غار دریافت ہوئے ہیں۔

فرانس میں لاس کاکس کے غار اس سلسلے میں بہت مشہور ہیں۔

دس ہزار بی سی میں دو قابل ذکر تہذیبیں سامنے آئیں۔

ایک کو Azilian کا نام دیا گیا اور دوسری تہذیب Saurotarrian تھی۔

ازیلیان اسپین اور فرانس کے جنوبی علاقوں میں ہوا کرتے تھے۔ جب کہ ساؤتاریان شمالی فرانس اور یورپ کے وسط میں تھے۔ ان کے آثار پرتگال اور بلغاریہ وغیرہ میں بھی ملے ہیں۔

یہ آثار ہارپون (شکار میں استعمال ہونے والا ہتھیار اور ہڈیوں سے بنائی ہوئی دیگر چیزیں ہیں)۔

7000 بی سی۔ یہ ایک اہم یورپی تہذیب کا دور ہے۔

یہ تہذیب سربیا میں واقع تھی۔ یہ لوگ ایک ساتھ آبادیوں کی صورت میں رہا کرتے۔

اب آپ کی دلچسپی کے لیے یہ بتا دوں کہ یورپ کا نام یورپ کیسے پڑا۔

قدیم روایت کے مطابق یہ نام زیوس دیوتا اور یوروپیا دیوی کے نام پر ہے۔

یہ کہانی کچھ یوں بیان کی جاتی ہے کہ ایک بار یوروپیا

دیوی دریا کنارے کھیل رہی تھی کہ زیوس دیوتا نے اسے دیکھ لیا اور سو جان سے اس پر عاشق ہو گیا۔

اس کا قرب حاصل کرنے کے لیے زیوس نے ایک بہت خوب صورت بیل کا روپ اختیار کر لیا اور یوروپا کے پاس پہنچ کر اپنی گردن جھکا دی۔

یوروپا کو وہ بیل پسند آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک ہار تھا۔ اس نے وہی ہار بیل کی گردن میں ڈال دیا اور اس کی پیٹھ پر بیٹھ گئی۔

زیوس اسے لے کر اپنے علاقے میں آ گیا۔ پھر دونوں نے شادی کر لی۔

بابائے تاریخ ہیرو ڈوٹس نے بھی اس کہانی کو بے سروپا لکھا ہے بلکہ اس نے وضاحت کی ہے کہ یورپ کا نام یونانی زبان سے لیا گیا ہے۔

(ہیرو ڈوٹس کا زمانہ 425 سے 484 بی سی ہے)۔

یہ تھا 7000 بی سی تک یورپ کا ایک مختصر جائزہ۔

میں کوشش یہ کر رہا ہوں کہ اپنے پڑھنے والوں کو ایک ساتھ الجھانے کی بجائے عہد بہ عہد چلتا رہوں تاکہ اندازہ ہو سکے کہ اس ایک خاص عہد میں دنیا کے مختلف علاقوں کی کیا صورت حال تھی۔

اب ہم آتے ہیں افریقا کی طرف۔

قدیم ترین براعظم۔ خیال کیا جاتا ہے کہ انسان کی ابتدا اسی براعظم سے ہوئی ہے۔

ایک لاکھ سال پہلے سے یہاں کے لوگوں نے خوراک اور شکار کی تلاش میں دوسرے علاقوں کی طرف ہجرت شروع کر دی تھی۔

پچاس ہزار بی سی۔ مصر میں زراعت کا سراغ لگا ہے۔ یعنی یہاں کے لوگ اس زمانے سے زراعت کرتے آ رہے ہیں۔

پھر بیس ہزار بی سی۔ 8 ہزار بی سی تک آ جائیں۔

Homolans ایک ساتھ خلط ملط ہو گئے۔

آگ کی دریافت اس زمانے میں ہوئی تھی۔

اب ایک جائزہ لے لیتے ہیں مشرق وسطی، سعودی عرب اور ترکی وغیرہ کا کہ اس عہد میں یہاں کیا ہو رہا تھا۔

عرب اور ترکی وغیرہ۔

چودہ ہزار بی سی۔ برفانی عہد کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ اس کے بعد زندگی نمو پانے لگی۔ لوگ ایک جگہ سے دوسری جگہ ہجرت کرنے لگے۔

بارہ ہزار سال بی سی۔ ملاحہ (یمن) میں چھوٹے چھوٹے آبادیاں شروع ہو گئیں اور شام میں سری ہیت کے مقام پر لوگوں نے غاروں میں گھر بنائے تھے۔

یہ آبادیاں گرچہ زیادہ وسیع و عریض نہیں تھیں لیکن اتنا ضرور تھا کہ انسان نے کسی ایک جگہ رہائش اختیار کر لی تھی۔

9500 بی سی۔ یمن کی وادیوں میں کچھ دیواریں تعمیر کی گئیں اور انسان اب غاروں سے نکل کر زمین پر گھر بنانے لگا تھا۔

8000 بی سی میں جانوروں کی افزائش شروع ہوئی۔

اسی دوران ترکی میں گندم کی کاشت شروع ہوئی اور ایران میں پہاڑی بکرے بکریاں پالی جانے لگیں۔

اس جائزے میں مڈل ایسٹ کے ساتھ ساتھ موجودہ سعودی عرب بھی شامل ہے۔

8500 بی سی میں "نے والی کوری" نے ترکی میں رہائش اختیار کی (یہ ایک نسل تھی)۔ 7500 بی سی میں اناطولیہ میں Cata holyuk نسل نے رہائش اختیار کی۔

اب ہم جس مقام کا ذکر کر رہے ہیں وہ ہے آسٹریلیا۔

زمین تو مکمل طور پر وجود میں آ چکی تھی۔ بس ہجرت کرنے والوں کو یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ جہاں ہجرت کر کے جا رہے ہیں کئی ہزار برسوں کے بعد اسے آسٹریلیا کہا جائے گا۔

اندازہ لگایا گیا ہے کہ ستر ہزار سال پہلے سے آسٹریلیا کی طرف ہجرت کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔

یہ سلسلہ تیس ہزار سال تک جاری رہا۔

آسٹریلیا جانے کے لیے انسان نے دریائے تیمور کا راستہ استعمال کیا تھا۔ اس وقت زمین کے وہ علاقے جنھیں آج نیوگنی اور تسمانیہ کہا جاتا ہے آسٹریلیا میں شامل تھے۔

سوائے انٹارکٹیکا کے انسان ہر جگہ رہنے لگا تھا۔

امریکا

دس ہزار بی سی۔ بہت وسیع و عریض زمین تھی۔ شکار خوب ملتا تھا۔ اس زمانے کے انسانوں کے لیے اس سے بڑی دلچسپی کی بات اور کیا ہو سکتی تھی کہ فلاں جگہ خوب شکار ملتا ہے۔ لہٰذا امریکا کی طرف ہجرت ہونے لگی تھی۔

یہ ہجرت یورپ اور ایشیا سے ہو رہی تھی۔

9000 بی سی میں شکار کا عام رجحان۔ یہ شکار عام طور پر کوئی ایک شخص اپنی انفرادی حیثیت میں کیا کرتا۔

8500 بی سی میں کرلوراڈو میں گروپ شکار کے آثار ملے ہیں۔ یعنی بہت سے لوگ مل کر شکار کرتے تھے۔

8000 بی سی میں Archaic عہد کا آغاز۔

7000 بی سی میں۔ میکسیکو میں اناج کی کاشت شروع ہوئی۔

یہ تو تھا انسانی تاریخ کا وہ جائزہ جو سات ہزار یا سات ہزار پانچ بی سی تک ہی گیا ہے۔ انسانی تاریخ کی اصل کامیابیاں اور ترقیاں اور بڑے بڑے واقعات اس کے بعد شروع ہوئے۔

اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ اس وقت تک انسان اچھا خاصا باشعور ہو چکا تھا۔ اس نے گھر بنا لیے تھے۔ آبادی کی صورت میں رہنے لگا تھا۔

اس نے زراعت سیکھ لی تھی۔ کئی اجناس پیدا کرنے لگا تھا۔ اوزار بنانے لگا تھا۔ ہتھیاروں کا استعمال کرنا شروع کر دیا تھا۔

اس کے بعد پھر مختلف باقاعدہ تہذیب کی ابتداء ہوئی۔

اب جو ہم جائزہ لے رہے ہیں وہ اصل میں معلوم تاریخ شروع ہوتی ہے۔ اس جائزے کے دو حصے ہیں۔

ایک 7500 بی سی سے حضرت عیسیٰ کی پیدائش یا ایک بی سی تک۔

اس کے بعد سے اب تک یعنی 2015 تک۔

یہ ایک بہت وسیع موضوع ہے لیکن میری کوشش ہے کہ آپ کو زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم کر دی جائیں تاکہ پوری انسانی تاریخ پر آپ کی معلومات ہو جائے۔

آئیں ہندوستان سے شروع کرتے ہیں جہاں سے ہم نے ابتدا کی تھی۔ ہم نے 7500 بی سی تک کا جائزہ لے لیا تھا۔

اب اس سے آگے کا سفر کرتے ہیں۔

ہندوستان

7500 بی سی کے بعد کا عہد وحشی خانہ بدوشی کا ہے۔ کوئی باضابطہ کلچر سامنے نہیں آیا ہے۔ باقاعدہ کلچر کی ابتداء 3500 سال پہلے دریائے سندھ کی وادی سے شروع ہوتی ہے۔

دریائے سندھ کی وادی میں ساڑھے تین ہزار سال قبل مسیح کے لگ بھگ زراعت پیشہ لوگ آباد ہونا شروع ہو گئے تھے۔

سندھ کے علاقے موہنجوداڑو اور پنجاب کے علاقے ہڑپہ کی کھدائی سے زراعت پیشہ لوگوں کے ایک تمدن کے آثار ملے ہیں۔

یہ لوگ شہر اور قصبے آباد کر کے رہتے تھے۔ جن کے گرد فصیلیں ہوا کرتیں۔ ان کھدائیوں سے جو برتن دستیاب ہوئے ہیں وہ اڑھائی تین ہزار سال قبل مسیح تک طوفان نوح سے قبل کی وادی دجلہ و فرات کے برتنوں سے ملتے جلتے ہیں۔

خیال ہے کہ وادی سندھ میں آ کر آباد ہونے والے خلیج فارس کی ساحلی اقوام ہی کی ایک شاخ ہوں گے (واضح ہو کہ اس وقت تک کئی معاشرے کی تشکیل ہو چکی ہے۔ انسان بہت کچھ بنانے لگا ہے۔ ان میں کشتیاں بھی شامل ہیں)

تو وہ لوگ سمندر کی راہ سے کشتیوں پر دریائے سندھ کے دہانے پر پہنچے اور اسے دجلہ و فرات کے دہانے کی سرزمین کی طرح زرخیز دیکھ کر وہاں آباد ہونے لگے۔ اور دریا کے کناروں کے ساتھ ساتھ اوپر کی طرف پھیلتے ہوئے پنجاب کے دریاؤں کی وادیوں تک جا پہنچے۔ ہڑپہ ضلع ساہیوال میں دریائے راوی کی وادی میں واقع ہے۔

ایک اور بات جس سے میسر یہ اور وادی سندھ کے آبادکاروں کا گہرا تعلق معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ میسر یہ میں بیلوں کی جو تصویریں یا مورتیاں کھدائی کے دوران دریافت ہوئی ہیں وہ ہندوستانی نسل کے بیلوں سے بہت ملتی جلتی ہیں۔

بہرحال یہ ایک مضبوط تہذیب تھی۔ شہر باقاعدہ پلاننگ سے بنائے گئے تھے۔ جس کا اندازہ موہنجوداڑو کو دیکھ کر ہو سکتا ہے۔

یہاں غلاموں کی تجارت بھی ہوا کرتی۔ اس دور میں بہت سی حکومتیں دنیا کے مختلف علاقوں میں وجود میں آ گئی تھیں۔

لیکن انڈس ویلی کی یہ تہذیب کئی حکومتوں سے زیادہ مضبوط تھی اور اس کا مرتبہ بھی زیادہ تھا۔

کھدائی کے دوران جو آثار ملے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ تہذیب آرٹ اور صناعی میں بھی اپنے دور کی

دوسری تہذیبوں سے بہت آگے تھی۔

رقاصہ کی مشہور مورتی اس کے مختلف اقسام کے زیورات جو یہ ظاہر کرتے تھے کہ عورتوں کو زیورات کا شوق تھا۔

2000 بی سی۔ انڈس ویلی کی یہ تہذیب اچانک ختم ہوگئی۔

کس طرح ختم ہوئی یہ ابھی تک پتا نہیں چل سکا۔ یہ تو کوئی وبا پھوٹ پڑی یا سیلاب آگیا یا وہاں سے لوگ اچانک کہیں اور ہجرت کر گئے، کیوں؟ یہ ایک سوالیہ نشان ہے۔

وادی سندھ کا تمدن، آریاؤں کی آمد سے قبل دریائے سندھ کی وادی کا تمدن دجلہ و فرات اور نیل کے تمدن کی طرح ترقی یافتہ تمدن تھا۔ تاہم جو آثار ملے ہیں ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ دریائے سندھ کی وادی کے زراعت کار بستیاں بنا کر رہتے تھے۔ پختہ اینٹوں کے گھر بناتے تھے۔ حمام اور نالیاں تعمیر کرتے تھے۔

سنگ، تانبہ، سکے، چاندی، سونا، قیمتی پتھر، گیرو مٹی اور سلیٹ وغیرہ استعمال کرتے تھے۔

کانسی اور مٹی کے برتن اور اوزار بناتے تھے۔

گندم، کھجور، جو، دالوں اور تلوں کی کاشت کرتے تھے۔

جانور پالتے تھے۔ گوشت کھاتے تھے۔ شکار کھیلتے تھے۔

ان کے ہتھیار، تیر کمان، نیزہ، کلہاڑی، خنجر اور گرز پر مشتمل تھے۔

اوزاروں میں کلہاڑیاں، درانتیاں، آرے، تیشے، استرے اور چاقو قابل ذکر ہیں۔ جو کانسی، تانبے، مٹی اور پتھر سے بنائے جاتے تھے۔

آٹا پیسنے کے لیے چکی کی بجائے اور اوکھلیاں استعمال کرتے تھے۔ چاک پر مٹی کے برتن بناتے اور ان پر نقش و نگار کرتے تھے۔

تحریر کے فن سے آشنا تھے۔ مردوں کو دفن بھی کرتے تھے اور جلاتے بھی تھے۔ بعض برتنوں میں انسانی جسم کے اعضا الگ الگ دفن کیے ہوئے ملے ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بعض لوگ مردوں کو جانوروں کے سامنے ڈال دیتے تھے اور بچے کھچے اعضا کو مٹی کے برتنوں میں بند کر کے دفن کر دیتے تھے۔

2000 سال بی سی، انڈس ویلی تہذیب کا اچانک خاتمہ۔

یہ ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا ہے کہ اتنی مضبوط اور پھیلی تہذیب اچانک کیسے ختم ہوگئی۔ ماہرین نے کئی اندازے لگائے ہیں۔

سیلاب آیا کوئی وبا پھوٹ پڑی یا یہاں کے رہنے والے کسی نامعلوم سبب سے ہجرت کر گئے۔ بہر حال وجہ ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا ہے۔

1500 بی سی۔ برصغیر میں آریاؤں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا۔

مورخین کا کہنا ہے کہ آریہ قبائل وسطی ایشیا کے رہنے والے تھے اور کابل اور جلند کی وادیوں سے ہوتے ہوئے کوہستان سلیمان کے دروں کے راستے سے پنجاب کی سرزمین میں داخل ہوئے۔ پنجاب میں ان کی آمد کے زمانے کا اندازہ پندرہ سو سال قبل مسیح سے بارہ سو سال قبل مسیح تک لگایا جاتا ہے۔

(آریاؤں کا ذکر میں تفصیل سے اس لیے کرنا چاہتا ہوں کہ ان کی آمد کے بعد ہندوستان کی تہذیب وتمدن کے انداز بدل گئے تھے۔ یہ آریہ اپنے ساتھ اپنا کلچر اور اپنا مذہب لے کر آئے اور پورے ہندوستان پر چھا گئے)

یہاں آنے کے بعد انہوں نے اپنی آبادیاں قائم کیں اور اس خطے کو متبرک سمجھنے لگے۔

اس خطے کا نام انہوں نے آریاورت رکھا۔

مہابھارت میں لکھا ہے کہ آریہ قبائل جب پہلے پہل پنجاب میں داخل ہوئے تو خانہ بدوش قبائل کی صورت میں آئے تھے۔ وہ مویشی پالتے اور شکار کھیلتے تھے۔ دریاؤں کے کنارے اپنی چراگاہیں قائم کیں اور یہاں کے پرانے باشندوں کی دیکھا دیکھی زراعت کرنے لگے۔

عام آریہ پرامن آباد کار تھے۔ جو اپنے دیوتاؤں سے مویشی چرانے اور مویشی بھگانے والے ڈاکوؤں سے پناہ میں رکھنے کی دعائیں کیا کرتے۔

اس دور میں شمالی ہند کے وسطی اور مشرقی حصوں کے حاصل خیز خطوں میں قدیم باشندوں کی بستیاں اور ریاستیں آباد تھیں یا جنگلات تھے۔ جن میں وحشی قبیلے شکاری دور کے انسانوں کی سی زندگی بسر کر رہے تھے (ہندوستان میں آج بھی ایسے قبائل پائے جاتے ہیں)

اس زمانے میں مبارزت یعنی دو دو پہلوانوں کے درمیان لڑائی کا طریقہ رائج تھا۔ ایران کی قدیم تاریخ میں بھی ایسی مبارزت کا ذکر ہے۔

فردوسی کے شاہنامہ میں قدیم تاریخ کے حوالے سے جو کہانی بیان کی گئی ہے اس کی تفصیلات کچھ ایسی ہی ہیں۔

ہتھیار بھی رستم و سہراب کی داستان کے ہتھیاروں سے ملتے جلتے ہیں۔ رتھ پر سوار ہو کر لڑتے تھے۔

تیر کمان، گرز، خنجر اور چکر سے مسلح ہوتے تھے۔ زرہ بکتر پہنتے تھے۔ راجاؤں کے بیٹوں اور کھشتری سورماؤں کو جنگی تربیت دینے کے لیے فوجی اسکول قائم تھے۔ جنگ طے شدہ اصولوں اور قاعدوں کے مطابق لڑی جاتی تھی۔

راجے دربار منعقد کر کے اہم فیصلے سرداروں کی مشاورت سے طے کیا کرتے تھے۔ راجے اور کھشتری گوشت کھاتے تھے۔ دیوتاؤں کے لیے جانوروں کی قربانیاں دیتے تھے۔

ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے یا چار پانچ بھائیوں کی ایک ہی بیوی کے خاوند بننے کو معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔

دشمن یا حریف کو شکست دے کر زور بازو سے عورت کو جیت لینا بھی جائز سمجھا جاتا تھا۔ راجاؤں کی بیٹیاں سوئمبر کے ذریعے شادیاں کرتی تھیں۔

سوئمبر کی رسم یہ تھی کہ شہزادی کا باپ راجاؤں اور شہزادوں کو دعوت دے کر اکٹھا کرتا تھا اور فن سپہ گری کے کسی مشکل کرتب کو شادی کا امیدوار بننے کی پہلی شرط قرار دیا جاتا تھا جو شہزادہ وہ کرتب کر دکھاتا شہزادی اسے ہی منتخب کر لیتی۔

واضح ہو کہ یہ ساری رسومات آریاؤں کی آمد کے ساتھ ہی نہیں شروع ہوئی ہوں گی بلکہ آہستہ آہستہ ان کی ایک تہذیب بنتی چلی گئی تھی۔

ہم نے ہندوستان کو 1500 بی سی تک لیا ہے۔ یعنی جب آریاؤں کی آمد اس علاقے میں شروع ہوئی اور انھوں نے قدیم باشندوں یعنی دراوڑوں پر فتح حاصل کر لی۔

ہم جیسے جیسے آگے بڑھتے جائیں گے ویسے ویسے ہمیں پتا چلتا جائے گا کہ اس دور میں دنیا کے دوسرے خطوں کی کیا صورت حال تھی۔

ورنہ یہ ذکر صرف ہندوستان کا ذکر ہو کر رہ جائے گا۔

جب کہ ہم نے متوازی تاریخ کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔

اب دیکھتے ہیں کہ ان ادوار میں چین کی کیا صورت حال تھی۔

چین

7000 بی سی میں چین میں جو تہذیب موجود تھی ماہرین نے اسے پالی گانگ Paligang کلچر کا نام دیا ہے۔

6600 بی سی۔ جیا ہیو رسم الخط کے آثار ملے ہیں۔ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ تحریر کی ابتدائی شکل تھی (جب کہ باقاعدہ تحریر کا آغاز سمیریوں نے کیا تھا)۔

5000 بی سی۔ کی شان کلچر۔ اس دور میں انسانوں نے اپنی حفاظت اور مویشیوں کی دیکھ بھال کے لیے کتے پالنا شروع کر دیے تھے۔ اس کے ساتھ ہی وہ مرغیاں بھی پالنے لگے تھے۔

5000 بی سی میں ہائی جیا کلچر۔ اب لوگ بھیڑیں اور بیل بھی پالنے لگے تھے۔

4500 بی سی۔ سی موڈو کلچر کا خاتمہ۔ یہ کلچر 5000 بی سی سے 4500 بی سی تک رہا تھا۔

1973 میں ہانگ ژو کے علاقے میں اس تہذیب کی دریافت ہوئی۔ یہ علاقہ آج Yoyau کہلاتے ہیں۔

اس تہذیب کے آثار ژاؤ شان کے جزیرے میں بھی ملے ہیں۔ یہ لوگ لکڑیوں سے کام لینا جانتے تھے۔

ان کے مکانات ستونوں پر بنے ہوئے ہیں۔ نیچے کے حصے کو مویشی رکھنے اور اناج اسٹور کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔

(یعنی 4500 بی سی میں تہذیب اس حد تک آگے آچکی تھی)

4000 بی سی۔ Banpo اسکرپٹ۔ رسم الخط یا تحریر۔

ماہرین اب کے بارے میں ابھی تک یہ فیصلہ نہیں کر پائے ہیں کہ یہ واقعی کوئی رسم الخط ہے یا محض نقش و نگار بنا دیے گئے تھے۔

3630 بی سی۔ یانگ شو کا عہد، موجودہ ہنان صوبے میں ایک جگہ سے ریشم کا سراغ ملا۔

اس لحاظ سے یہ ایک اہم تاریخ ہے۔ جب دنیا ریشم سے متعارف ہوئی ہوگی۔

3000 بی سی۔ یلانگ شان کلچر کا عہد ہے۔

اس عہد میں پہلی بار چین میں بیل متعارف ہوئے اور شاید اس زمانے سے ان بیلوں سے ہل جوتنے کا کام لیا جانے لگا۔

2570 بی سی۔ چین کے دوسرے علاقوں میں بھی ریشم کی دریافت۔

2852 بی سی۔ Fuxi کی حکومت۔
2737۔ ینن کی حکومت۔
2698 بی سی۔ زرد حکمرانوں کا دور۔
اس عہد کے تین حصے ہیں اور پانچ بادشاہ ہوئے تھے۔

روایت بتاتی ہے کہ یہ لوگ 2698 سے 2598 تک حکومت کرتے رہے۔ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اصل چینی تہذیب کی بنیاد رکھنے والے یہی لوگ تھے۔

اس دور کا ایک اہم واقعہ Banuan کی جنگ ہے۔

یہ چین کی تاریخ کی پہلی جنگ ہے جو زرد بادشاہوں نے لڑی تھی۔

2650 بی سی۔ یہ عہد چینی تاریخ اور زبان کے لحاظ سے اس لیے اہم ہے کہ کانگ میں نے چینی حروف تہجی ایجاد کیے۔

2594 بادشاہ ستات پاؤ کی حکومت۔
2514 بادشاہ ژوانگ سو کی حکومت۔
2371 بادشاہ ڈی کی حکومت۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اس کے زمانے میں چین کا تعارف پہلی بار ویت نام سے ہوا تھا۔

2358۔ یاؤ کی حکومت۔ اس زمانے میں سیلابوں نے بہت تباہی پھیلا رکھی تھی۔ اس نے اپنے ایک وزیر گن کو حکم دیا کہ وہ سیلابوں پر قابو پانے کی تدبیر سوچے۔

بے چارہ گن ناکام رہا۔ اس نے اسے موت کی سزا سنادی۔

2255-2205 بادشاہ شن۔ اس نے اور اس کے وزیروں نے کسی حد تک سیلاب پر قابو پالیا تھا۔

2194 بی سی۔ کنگ یو کا عہد۔ اس دور میں چین میں کانسی کا عہد شروع ہوا۔

اس کے بعد 1747 بی سی تک مختلف بادشاہوں کی حکومتیں رہیں۔

ایک خاص واقعہ 1747 بی سی میں پیش آیا۔ جو تائی پہاڑی سلسلے میں آنے والا زلزلہ تھا۔ یہ زلزلہ پہلا زلزلہ ہے جس کا ریکارڈ موجود ہے۔

اس کے بعد 1747 سے 1503 تک جن بادشاہوں کی حکومتیں رہیں ان کے نام کچھ یوں ہیں۔

1728۔ جی۔ 1675۔ تانگ۔ 1646 تائی ڈنگ۔ 1646 ہی میں جیا۔ 1634 یونگ۔ 1632 تائی جنگ۔ 1607 جیاز جیا۔ 1590 تائی ڈو۔ 1515 ڈنگ جی۔ 1503 ڈانگ ڈنگ۔

ہم ہندوستان کی طرح چین کی تاریخ کا بھی 1500 بی سی تک کا جائزہ لیتے ہوئے آگئے ہیں۔ اب دیکھتے ہیں کہ ان ہی ادوار میں دنیا نے دوسرے علاقوں میں کیا ہو رہا تھا۔

ویسے تو دنیا میں سیکڑوں ممالک ہیں۔ ان کی تہذیبیں ہیں لیکن ہم نے ان ہی تہذیبوں کو لیا ہے جنہوں نے دوسری تہذیبوں اور دوسرے ملکوں میں اپنے اثرات قائم کیے اور جو تہذیبیں دنیا اور تاریخ کی جانی پہچانی تہذیبیں ہیں۔

ان خاص خاص ممالک ہی کے تذکروں اور ان کی تاریخ سے دنیا کے بہت سے ممالک کی تاریخ کا اندازہ ہو جائے گا۔

ہم ایشیا کے دو اہم ممالک بھارت اور چین کی تاریخ کا جائزہ لے چکے ہیں۔ اب ایشیا کی ایک اور قدیم ترین تہذیب کا ذکر کرتے ہیں اور وہ ہے ایران۔

ایران (پرشیا)

یہ جائزہ بھی 7000 بی سی سے 1500 بی سی تک کیا جائے گا۔ اس کے بعد دوسرے خطے میں اس سلسلے کو آگے بڑھائیں گے۔

ایرانی قدیم دور میں علم و ادب کا مرکز رہا ہے۔ ایسے بے شمار شعبے ہیں جن میں اس خطے کے رہنے والوں نے گراں قدر خدمات انجام دیں۔ جیسے ستارہ شناسی، ادویات سازی، علم طب، ریاضی اور فلسفہ وغیرہ۔

ایران وہ ملک ہے جو قدیم زمانے سے پریشانیوں اور جنگوں میں گھرا رہا ہے۔ اس لیے سختیوں نے اس ملک کے باسیوں کو سخت جان کرنے کے ساتھ ساتھ اس بات پر بھی مائل کیا کہ وہ دنیا میں اپنی شناخت قائم کریں۔

اس خطے نے بہترین اسکالر پیدا کیے۔ ابن سینا جیسا دانش ور اس خطے میں پیدا ہوا۔ اس کی کتاب قانون طب صدیوں تک یورپ میں پڑھائی جاتی رہی۔ اسے بابائے طب بھی کہتے ہیں۔

اب آئیں ایران کا جائزہ لیتے ہیں۔

سات ہزار سال قبل از مسیح۔ 7000 بی سی۔

ایک شاندار زرعی انقلاب برپا ہوا جس کی وجہ سے

لوگ دور دور سے کھنچ کر آئے اور آباد ہونے لگے۔

مقامی لوگوں کے ساتھ مل کر انہوں نے ایک مخلوط النسل آبادیوں کی بنیادیں رکھیں۔ تاریخ کی قدیم ترین معاشرت میں سے ایک تھی۔

اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ایران میں ہزاروں قدیم یادگاریں ہیں جو اس کے ماضی کا فسانہ سنا رہی ہیں۔

6000 بی سی۔ شوش تہذیب۔

اسے آپ دنیا کی پہلی باقاعدہ تہذیب کہہ سکتے ہیں۔ باقاعدہ تہذیب سے مراد وہ تہذیبیں ہیں جو اپنے شہر تعمیر کرتی ہیں۔ حکومتیں قائم کرتی ہیں۔ قانون کا نظام نافذ کرتی ہیں۔

ایران میں یہ تہذیبیں آریاؤں کی آمد سے پہلے سے قائم تھیں۔ شوش تہذیب اور سمیر یوتامیہ کی تہذیبوں کا ایک دوسرے سے گہرا تعلق تھا۔

اس کی ایک وجہ جغرافیائی نزدیکی اور زمانے کی نزدیکی ہے۔ اس لیے ان کے اثرات ایک دوسرے پر مرتب ہوئے اور یادگاریں ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں۔

یہ آثار 1897 میں کھدائیوں کے دوران دریافت ہوئے تھے۔

5500 بی سی۔ شراب کی تاریخ۔

تاریخ داں بتاتے ہیں کہ دنیا میں پہلی بار شراب ایران میں کشید کی گئی۔

یہ علاقہ شمالی ایران میں موجودہ حاجی فیروز گاؤں کے آس پاس تھا۔ یہ شراب امفورا نام کے ایک ایسے برتن میں بنائی جاتی تھی جس کی گردن بہت لمبی صراحی دار ہوا کرتی۔

یہاں سے یہ شراب دنیا کے دوسرے ملکوں (مصر، عراق اور ہندوستان) میں بھیجی جاتی تھی۔

4200 بی سی میں سوسا کا شاندار شہر تعمیر ہوا۔

یہ شہر کاشان کے پاس تھا۔ جنوب مغربی ایران کی طرف۔ اس شہر کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگائیں کہ Old-tastmant میں بھی اس کا ذکر ہے۔

خیال کیا جاتا ہے کہ حضرت دانیال کی رہائش اسی شہر میں تھی۔

اس زمانے میں اس شہر کا گورنر بابی سون حکومت کے ماتحت تھا۔ پھر آزاد ہو کر خود مختار حکومت قائم کرلی۔

اس زمانے میں مختلف صوبوں میں خود مختار گورنر ہو:

کرتے تھے۔

3200 بی سی۔ دنیا کی پہلی متحدہ مملکت۔

اب تک یہ ہوتا آیا تھا کہ جہاں جس کو موقع ملا اس نے وہیں اپنی آبادی قائم کرلی اور شاید سرداری نظام کے تحت زندگی گزارنے لگے لیکن 3200 میں ایران میں بہت ساری ریاستیں مل کر ایک ہو گئی تھیں اور ایک مضبوط تہذیب کی بنیاد پڑ گئی تھی۔

ایلام تہذیب۔ ان لوگوں نے حفاظت کے لیے اپنے شہروں کے اردگرد فصیلیں تعمیر کی تھیں۔

ایلام قدیم ترین تہذیب ہے جس کے آثار جنوبی مغربی ایران میں دریافت ہوئے ہیں۔

یہ وہ لوگ تھے جو مختلف علاقوں سے ہجرت کر کے ایران آئے اور اپنی تہذیب کی بنیاد رکھی۔ ان کی اپنی زبان تھی اور ایلامی زبان آس پاس کی کسی زبان سے نہیں ملتی تھی۔

2500 بی سی میں آریاؤں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا۔

اگرچہ ان علاقوں میں بہت پہلے ہی آریاؤں کی آمد ہوئی تھی لیکن یہ دوسری بار تھی جس میں زیادہ بڑی تعداد میں آریا آئے تھے۔ انہوں نے یہاں آکر اس علاقے کو آریانہ کا نام دیا جو بعد میں ایران بن گیا۔

انہوں نے یہاں منظم ہو کر اپنے علاقے بنائے اور یہاں کی تہذیب پر اپنے اثرات مرتب کرتے چلے گئے۔

2300 بی سی۔ سوسا کا شہر میسوپوٹامیہ کے حکمران عکار کے ہاتھوں برباد ہو گیا۔ بعد میں ایلام تہذیب والوں نے چڑھائی کردی اور بدلے میں "ار" شہر کو برباد کردیا۔ اس کے بعد وہ قوت حاصل کرتے چلے گئے۔

1737 بی سی۔ زرتشت کی پیدائش۔

زرتشت کی تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات پر اختلافات ہیں۔ انسائیکلو پیڈیا کے مطابق اس کی تاریخ پیدائش 1737 بی سی ہے۔ جب کہ مائیکل پارٹی نے تاریخ پیدائش 628 بی سی لکھی ہے اور وفات 551 قبل مسیح ہے۔

بہرحال ایرانیوں کے یہ پیغمبر حضرت عیسیٰ سے کئی صدی پہلے ایران کے شمالی حصے میں کہیں پیدا ہوئے۔ انہوں نے گاتھا تحریر کیے جو زرتشت کے قدیم مذہبی صحائف اوستا ہی کا ایک حصہ ہیں۔

زرتشت مت کی الٰہیات اور یت (Mono thriam) اور ثنویت پسندی (Durlism) کا ایک امتزاج ہے۔

زرتشت کے مطابق سچا خدا ایک ہی ہے۔ جسے وہ آہورہ مزدہ کہتے ہیں۔ آہورہ مزدہ سچائی اور راست روی کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔

زرتشت مت کے پیروکار ایک بدروح انگرو مینو پر بھی یقین رکھتے ہیں جسے جدید فارسی میں اہرمن کہا جاتا ہے۔ یہ شر اور جھوٹ کا نمائندہ خدا ہے۔

دونوں کے درمیان کشمکش جاری ہے لیکن آخری فتح سچائی یعنی آہورہ مزدہ کی ہی ہوگی۔ اس مذہب میں حیات بعد الموت پر بھی ایمان موجود ہے۔

ساسانی دور حکومت میں زرتشت مت نے ایران میں سرکاری مذہب کی حیثیت اختیار کرلی تھی۔ ہندوستان میں پارسی اسی سے تعلق کی بنا پر پارسی کہلائے گئے۔

1600 بی سی۔ ایران میں یلدا کا جشن منانے کا سلسلہ کرسمس اس کو دیکھ کر منایا جانے لگا۔

یہ جشن 22 دسمبر سے 25 دسمبر تک منایا جاتا ہے۔ ساری رات جاگ کر رسومات ادا کرتے اور ایک دوسرے کو تحائف دیتے ہیں۔ اپنے اپنے دروازے پر گھاس کے گچھے لٹکاتے ہیں۔

25 دسمبر کو متھرا دیوی کی پیدائش کا جشن منایا جاتا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس قسم کی رسومات پورے یورپ میں پھیل گئیں۔

1500 بی سی سے جشن نوروز شروع ہوا۔

اس جشن کو موسم بہار کا جشن کہا جاتا ہے۔ ہر سال مارچ کی بیس تاریخ سے شروع ہوتا ہے۔ اس دن گھر سجایا جاتا ہے۔ نئے کپڑے پہنے جاتے ہیں۔

یہ تھی 7000 بی سی سے لے کر 1300 بی سی تک ایران کی تہذیب اور تاریخ۔ ہم اس دورانیے میں اب تک بھارت، چین اور ایران کا ذکر کر چکے ہیں۔

اس دورانیے کے پہلے حصے میں یہی ممالک ہیں۔

دوسرے حصے میں ہم 7000 بی سی 1500 بی سی کے مشرقی وسطی، جاپان، انڈونیشیا، سعودی عرب، یورپ کے کچھ ممالک، افریقہ، امریکا وغیرہ کا جائزہ لیں گے۔

یہاں ایک بار پھر واضح کردینا مناسب ہوگا کہ ہم نے صرف ان ہی تہذیبوں کو لیا ہے جنہوں نے اپنے دور پر اثرات مرتب کیے۔

(جاری ہے)

لباس

انجم فاروق ساحلی

لباس ہماری ضرورت ہے اور اس میں جدت پیدا کرنا فیشن لیکن یہ پیرہن کن حالات میں وجود میں ائے۔ کس وجہ سے انسانی زندگی کا حصہ بنے کن کن مراحل سے گزرے۔

معلومات کا خزانہ
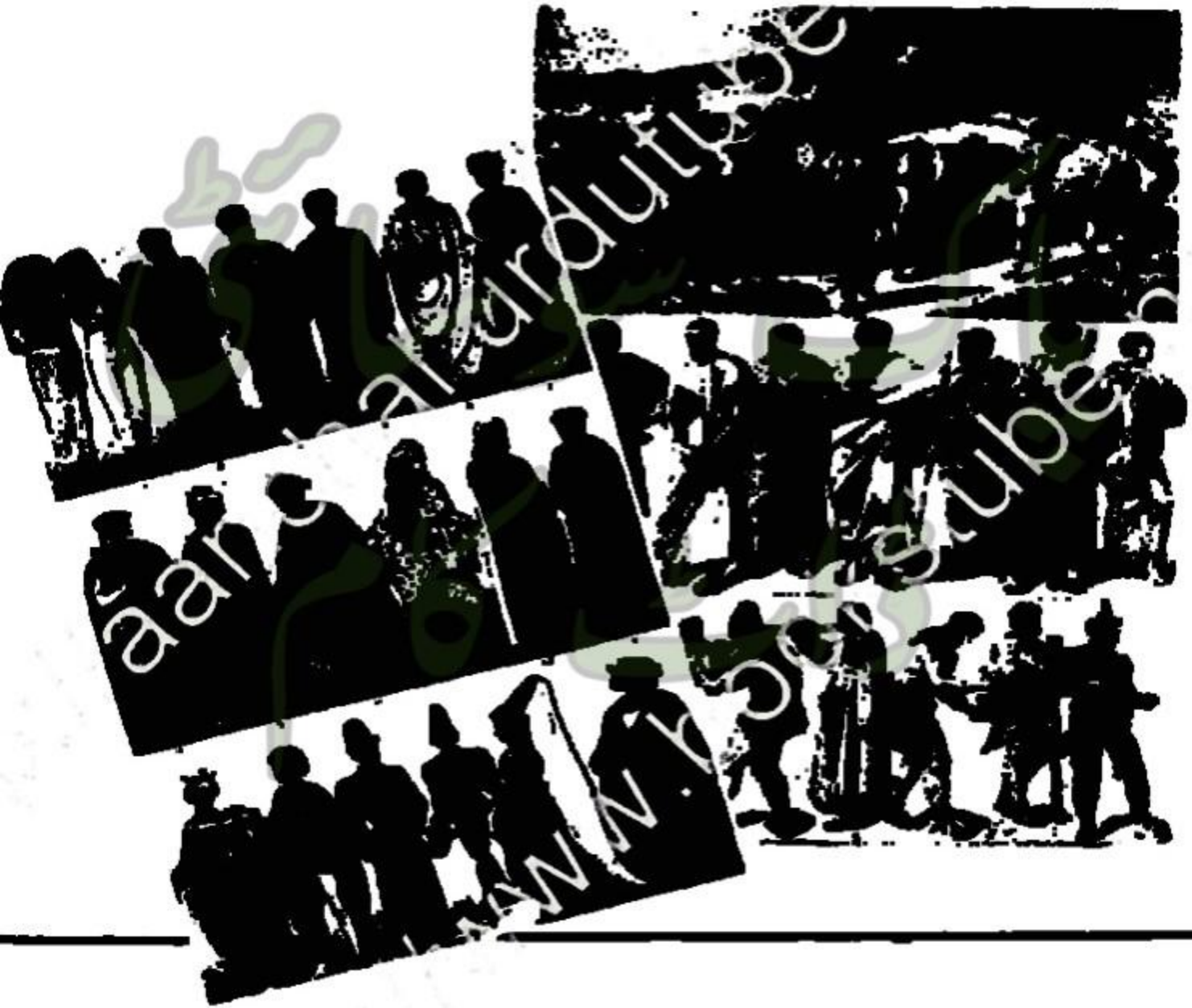
غاروں کا انسان سرد موسم سے بچاؤ کے لیے جانوروں کی کھالیں اوڑھ لیتا تھا جنہیں ہڈی کی سوئی اور تانے سے سی لیتا۔ ایران، کشمیر اور افغانستان میں آج بھی لوگ سرما میں پوستین پہنتے ہیں جو کھالوں کے لباس کی یادگار ہے۔ کافرستان کے باشندے بکری کی کھال اس طرح پہنتے ہیں کہ بالوں والا حصہ باہر ہوتا ہے۔ اسی لیے انہیں سیاہ پوش کہا جاتا ہے۔ مغرب کی امیر عورتیں قطبی لومڑی کی کھالوں سے تیار کیا ہوا فرغل پہنتی ہیں جو گراں بہا سمجھا

جاتا ہے۔ یہ بھی کھالوں کے لباس کی ایک صورت ہے۔ تمدن کی ترقی کے ساتھ بھیڑوں کی پشم کو کات کر بنا سینتا گیا اور اونی پوشش کا رواج ہوا۔

امراء کا لباس نفیس پشم سے تیار کیا جاتا تھا اور غریب کھردرا لباس پہنا کرتے تھے۔ عیسائی راہب اور مسلمان صوفی بھی اونی لباس پہنتے تھے تاکہ یہ بدن میں چبھتا رہے اور عبادت کے وقت ان پر نیند کا غلبہ نہ ہونے پائے۔ (صوفی کے معنی صوف کا لباس پہننے والا)۔

کپاس کا پودا سب سے پہلے وادی سندھ میں کاشت کیا گیا۔ موہن جو دڑو اور ہڑپا کپاس بیلنے، سوت کاتنے اور کپڑا بننے کے مرکز تھے۔ ان کا بنا ہوا سوتی کپڑا عراق کے شہروں کو برآمد کیا جاتا تھا۔ سوتی کپڑا بننے کی صنعت وادی سندھ ہی سے عراق پہنچی تھی۔ شہتوت کے پتوں پر ریشم کے کیڑے پالنے اور ان کے تاروں سے ریشم بننے کا فن چین میں دریافت کیا گیا اور تاجر ریشمیں کپڑا شاہ راہ قراقرم سے شام، کنعان اور روم تک لے گئے۔ جنہوں نے ریشمی کپڑے کو ارغوانی اور قرمزی رنگ دے کر دور دراز کے ملکوں کے شاہی درباروں اور محلوں تک پہنچا دیا۔ ہیلن اور قلوپطرا قرمزی رنگ کا ریشمی لباس پہنا کرتی تھیں اور روم کے قیصر ارغوانی رنگ کے چغے اوڑھا کرتے تھے۔

انسان صدیوں سے اونی، سوتی اور ریشمیں لباس پہنتا رہا ہے۔ آج کل مصنوعی دھاگوں سے بنے ہوئے کپڑے رواج پا رہے ہیں۔ مصنوعی ریشے امریکی سائنس دانوں نے تارکول سے نکالنے کا راز معلوم کیا اور ملبوسات کی دنیا میں انقلاب برپا کر دیا۔

سر کو پگڑی یا ٹوپی سے ڈھانپنے کا رواج سرد اور ریگستانی علاقوں سے شروع ہوا۔ گرم مرطوب علاقوں کے باشندوں نے کبھی اس کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ ایران، افغانستان، ازبکستان اور قازقستان میں کلاہ یا پاخ اوڑھی جاتی ہے۔ قراقلی بھیڑ کی کھال سے بنی ہوئی کلاہ سب سے قیمتی سمجھی جاتی ہے۔ ہمارے ہاں کی جناح کیپ اسی کلاہ یا پاخ کی بدلی ہوئی صورت ہے۔ ترکی ٹوپی یونان میں اوڑھی جاتی تھی، بعد میں ترکی میں رواج پا گئی۔ فارسی میں اسے سرپوش اور عربی میں طربوش کہتے ہیں۔ شاہان صفوی کے فدائی ترکمان قزلباش (سرخ سر) کہلاتے تھے کیوں کہ وہ سر پر سرخ رنگ کی بارہ گوشہ ٹوپی پہنتے تھے۔

انگریزوں نے تیز دھوپ سے بچنے کے لیے سولا ٹوپی ایجاد کی جسے عام طور پر ٹوپ کہتے ہیں۔ اسکیمو اور سائبیریا کے باشندے سمور کی ٹوپی اوڑھتے ہیں۔ رام پور کی ہلکی پھلکی کشتی نما ٹوپی کانگریسیوں کی قومی ٹوپی بن گئی۔ عرب تیز دھوپ سے بچنے کے لیے سر پر رومال اوڑھتے ہیں جسے عقال کا ڈورے سے باندھ دیا جاتا ہے۔ بنو عباس کے دور میں اسے کوفیہ کہنے لگے اور یہ نام آج بھی باقی ہے۔ پہلے پہل کوفے کے شہر میں اسے موجودہ صورت دی گئی تھی۔ علما شروع سے تہبند پہنتے آئے ہیں جو چودہ میں گز تک کے کپڑے کا ہوتا ہے۔ ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ میں جامع قاہرہ میں نماز پڑھنے گیا تو منبر پر جو خطیب بیٹھا تھا اس کے مقعد (عمامہ) سے ساری محراب بھر گئی تھی۔ قدیم مصری سر منڈوا کر اس پر سر سے چپکی ہوئی ٹوپی پہنتے تھے جس کے ساتھ گردن ڈھانکنے کے لیے رومال سی دیا جاتا تھا۔ بھاری دستار کا رواج بلیوں سے ہوا۔ ہندوستان میں مسلمان نسبتاً ہلکی پگڑی پہننا یا صافہ پہنتے تھے۔ راجپوت پیچ دار پگڑی پہنتے تھے۔ شکار پور اور پشاور کی لنگیاں شمال مغربی ہند میں بڑی مقبول تھیں۔ پٹھان کے دار ایرانی کلاہ پر لنگی پہنتے ہیں۔ جس کا طرہ سامنے کی طرف نکالتے ہیں۔

پنجاب میں تو اونچا پگڑی کو عزت و وقار کا نشان سمجھا جاتا ہے۔ اس کا طرہ غیر معمولی طور پر بلند رکھا جاتا ہے۔ مغلوں کے دور حکومت میں شاہی ملازم سرخ پگڑی سے پہچانے جاتے تھے۔ سکھ جوڑے کو چھپانے کے لیے پگڑی پہنتے ہیں۔

ہندوؤں کے علاوہ تمام اقوام عالم میں چمڑے کے جوتوں کا رواج تھا۔ ہندو لکڑی کی کھڑاؤں پہنتے تھے یا ننگے پاؤں پھرتے تھے کیوں کہ وہ گائے کے چمڑے کے جوتے ہونے کو معیوب سمجھتے تھے اور اچھے جوتے گائے یا بچھڑے کے چمڑے سے ہی بنتے ہیں۔ غریب لوگ رسیوں کے جوتے پہنتے رہے ہیں جیسا کہ آج کل بھی کشمیر میں دیکھا جا سکتا ہے۔ پٹھانوں کی چپلوں سے لے کر سلیم شاہی تک فن جفت سازی میں کئی جدتیں کی گئیں اور ان پر مخمل یا چمڑے سے کڑھائی کا کام بھی ہونے لگا۔ میانوالی کی چپلی، چکوال اور تلہ گنگ کے کھسے اور ملتانی جوتے پر نہایت نفیس سچے تلے کے بیل بوٹے کاڑھے جاتے ہیں۔ عورتیں نوکیلے جوتے پسند کرتی رہی ہیں۔ یونانی اپنی تخت کے تسمے پنڈلی پر کس لیا کرتے تھے۔ ہارون الرشید کی ملکہ زبیدہ نے

جوتوں پر ہیرے جواہرات جڑوا کر ایک نئے فیشن کا آغاز کیا تھا۔ یورپ اور روس میں برف باری سے بچنے کے لیے چمڑے کے بھاری بوٹ پہنے جاتے ہیں۔ جو پنڈلیوں کو بھی ڈھک لیتے ہیں۔ برف باری کے دوران میں پاؤں کی انگلیوں کو سردی سے بچانے کے لیے جوتوں پر بالا پوش پہنتے ہیں۔ آج کل کی جرابیں پرانے وقت کے چمڑے کے موزوں کی یادگار ہیں۔

قدیم مصری ننگے پاؤں پھرا کرتے تھے۔ بدن ڈھانپنے کے لیے ایک چادر کمر سے لپیٹ کر اس کا سرا کندھوں پر ڈال لیتے تھے۔ بابلی اور اشوری لمبی اور بھاری لباس پہنتے تھے۔ سروں پر دستار، لباس کے اوپر چوغہ جو ٹخنوں تک جاتا تھا۔ بنو عباس کے دور حکومت میں درباری لباس کو ثیاب المواہب کہتے تھے جن میں قبا، تلوار اور سیاہ عمامہ بھی شامل تھا۔ بعد میں سر پر اونچی قلندری کلاہ (قلنسوہ) پر عمامہ لپیٹنے کا رواج ہوا۔ علماء سیاہ طیلسان سے پہچانے جاتے تھے جو لباس کے اوپر پہنی جاتی تھی۔ اعزازی لباس کو تشریف کہتے تھے۔ منقول سعد معین کی سالار کے غیر معمولی کارنامے سے خوش ہو کر اسے نو پارچے کا خلعت (لغوی معنی بدن سے الگ کیا ہوا یعنی بادشاہ کا اپنا لباس) بخشے تھے جسے نوتوذ (کندھے پر ڈالنے کی چادر) کہتے تھے۔ ایرانیوں کا خلعت ہفت پارچہ گراں قدر ہوتا تھا۔ اس میں دستار مرصع، جڑاؤ خنجر اور پرتلا، سر دیج اور جیغہ شامل ہوتا تھا۔ امرا کا لباس تھا کلاہ چغہ زربفت کا، کمربند مرصع، تلوار کا پرتلا جڑاؤ ہوتا تھا۔ شب خوابی کا لباس ہر روز بدل دیتے تھے۔ صلیبی جنگوں سے پہلے عیسائی سلاطین و امرا تک دھڑ ننگے سویا کرتے تھے۔ شب خوابی کا لباس عربوں کی دیکھا دیکھی اختیار کیا۔ عرب خلفا کا لباس ساسانی بادشاہوں سے مستعار تھا۔ طیلسان اور کلاہ عربی لباس کا حصہ نہیں تھا۔ امیر طبقے میں دیباج (ایک کڑھائی کا کپڑا جو دمشق میں بنا جاتا تھا) دمشقی، مصر کے قبطی، بنے تھے۔ ان کی دستار ریشمی جاتی تھی۔ ساٹن (عربی میں زیتونی جو چین کے شہر سین تنگ میں بنی جاتی تھی) زربفت جس میں سونے کے تار بنے جاتے تھے کے ملبوسات مقبول تھے۔ ریشمی کپڑے پر جو کڑھائی کی جاتی تھی اسے طراز کہتے تھے۔ یہ لفظ فارسی کے ترازیدن بہ معنی کاڑھنا سے معرب ہے۔ بدن پر پہلے قفطان یا چھوٹی قمیص پہنتے تھے۔ اس کے اوپر امیر لوگ قبا اور غریب عبا اوڑھ لیتے تھے۔

مسلمانوں کی آمد سے پہلے ہندو کمر سے لنگوٹی باندھتے تھے اور ننگے پاؤں، ننگے سر رہتے تھے۔ عورتیں ایک بے سلی چادر کمر سے باندھ کر اس کا پلو سر پر ڈال لیتی تھیں۔ اسے ساڑی کہتے ہیں۔ بابر کی تزک سے معلوم ہوتا ہے کہ ہند میں خیاطی کا ہنر نہیں تھا۔ خیاط مسلمان حملہ آوروں کے ساتھ ایران اور خراسان سے آئے تھے۔ مغل امرا ریشمی لباس پہنتے تھے۔ زربفت، علا دوز، کمخواب، کلابتوں، تاش، مقیشکار کے ملبوسات پہننے کا رواج تھا۔ گرمی کے موسم میں چوتارہ ململ، نین سکھ، گنگا جل، بھیروں، بہادر شاہی، محمودی چھینٹ (ملتان کی مشہور تھی) کے ملبوسات پہنے جاتے تھے۔ ململ اس قدر نفیس ہوتی تھی کہ اس کا تہ در تہ لباس بھی بدن کو ڈھانپ نہیں سکتا تھا۔ ایک دفعہ اورنگ زیب نے اپنی بیٹی زیب النسا کو ململ کے لباس میں دیکھ کر سرزنش کی تھی۔ شہزادیاں سروں پر تاج کلاہ پہنتی تھیں۔ ہمایوں کے زمانے میں شہزادیوں نے نئی وار دستار جس میں جواہرات اور موتی ٹکے ہوئے تھے، پہننا شروع کی۔ انگیا اور لہنگا راجپوت عورتیں پہنتی تھیں۔ مسلم خواتین عام طور سے پیش واز یا تنگ پائجامہ پہنتی تھیں۔ انگیا کرتی کا فیشن شہزادی زیب النسا نے شروع کیا۔

ایران، خراسان اور ترکستان میں عورتیں چہروں پر نقاب ڈال لیتی تھیں۔ لیکن آنکھیں کھلی رکھتی تھیں تاجیک عورتیں گھوڑے کی دم کے بالوں کا نقاب اوڑھتی تھیں جسے روبند کہا جاتا تھا۔ پرانے وقتوں میں نظر بد سے بچنے کے لیے عورتیں اور خوب صورت مرد بھی نقاب اوڑھا کرتے تھے۔ محمد بن عمرہ کندی شاعر نقاب پہن کر باہر نکلتا تھا۔ ابن الرشید نقاب کے بغیر دربار میں نہیں آتا تھا۔ نجد اور الجزیرہ کے ملثمین (لثام یا نقاب اوڑھنے والے) کھلے منہ باہر نہیں نکلتے تھے۔ حالانکہ ان کی عورتیں کھلے منہ باہر جاتی تھیں۔ ایک حملی مقنع (نقاب پوش) کا ذکر تاریخ میں محفوظ ہے۔

دلی میں چھوٹی قمیص کو پیراہن کہتے تھے۔ لکھنؤ میں انگرکھا مقبول ہوا چپکن اور انگرکھا کو ملا کر اچکن بنی جو حیدرآباد میں شیروانی کہلائی۔ کہنیوں تک کا شلوکا نیمہ جامہ کہلاتا تھا۔ سینے پر گھنڈیاں ہوتی تھیں۔ اس کے اوپر جامہ پہنتے تھے جو قبا سے ملتا جلتا تھا۔ عورتیں گھروں میں ازار یا

شلوار پہنتی تھیں۔ بعض اوقات حسب ضرورت پاجامے پر شلوار پہنی جاتی تھی۔

شلوار ایران سے آئی۔ عربوں نے اسے سروال بنا لیا۔ سکھ عورتوں نے اسے کچھا کہہ کر اپنا لیا۔ وہ سر پر پھلکاری اوڑھتی تھیں۔ جس پر ریشم کی کڑھائی کی جاتی تھی۔ پنجاب میں مسلمان عورتیں سالوں اوڑھتی تھیں۔ سر پر چنی یا بڑا دوپٹا۔ کمر میں چادر۔ کھاتے پیتے مرد پٹ کا لاچا باندھتے تھے جس کا حاشیہ سرخ ہوتا تھا۔ بھیرے اور چنیوٹ کے لاچے مشہور تھے۔ دیہات میں کرتہ پہننے کا رواج تھا جس میں سینے پر بٹن لگایا جاتا تھا۔ یہ کرتہ قدیم دراوڑوں کی یادگار ہے۔

سرخ، زرد اور سبز رنگ کو شادی بیاہ کے رنگ کہا جاتا ہے جو خوشی کی علامت بن گئے ہیں۔ زرد چینیوں کا قومی رنگ تھا۔ بودھ سوامی زعفرانی رنگ کی چادریں اوڑھتے تھے اس لیے انہیں گیرو (سرخ پوش) کہتے تھے۔ سادات سبز رنگ کا لباس پہنتے تھے۔ شریف (سیدانی) کا برقع سبز رنگ کا ہوتا تھا۔ خاکی رنگ کی فوجی وردی ایرانیوں کی اختراع ہے جو انگریزوں میں رواج پا گئی۔ مغرب میں مردوں کا لباس کم و بیش ایک سا رہا ہے۔ البتہ عورتوں کے لباس میں نئے نئے فیشن آتے رہتے ہیں انیسویں صدی میں مغربی عورتوں کا لباس ٹخنوں تک ہوتا تھا پھر جو گھٹنا شروع ہوا تو بیسویں صدی کے اوائل میں گھٹنوں کے اوپر تک رہ گیا اور اب جنوبی ممالک میں چڈی کی صورت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ نہانے کا لباس محض تکلف بن کر رہ گیا ہے۔ مردوں کو لبھانے کے لیے مغربی عورتیں بڑے اہتمام کرتی ہیں۔ عورتوں کی ٹوپیوں کے فیشن ہر سال بدلتے رہتے ہیں۔

استوائی علاقوں میں رہنے والے جنگلی قبائل مادرزاد ننگے پھرتے ہیں۔ ڈاروِن کہتا ہے کہ ایک دفعہ میں نے چند وحشی عورتوں کی برہنگی پر ترس کھا کر انہیں کپڑے کا ایک تھان دیا کہ اس سے لباس بنا لیں۔ دوسرے دن گیا دیکھتا ہوں کہ ستر پوشی کی بجائے عورتوں نے تھان کے ٹکڑے کاٹ کاٹ کر گردن اور بازوؤں میں سجا لیے ہیں اور بدستور ننگ دھڑنگ پھر رہی ہیں۔

ہندوستان میں شیو بھگت سادھو آزادانہ ننگے پھرتے ہیں اس لیے انہیں ناگے کہا جاتا ہے۔ مسلمانوں میں سعید اے سرمد جیسے فقیر اور قلندر ستر پوشی کا تکلف نہیں کرتے

جان بل

انگریزوں کا روایتی نام، اس کا اولین تحریری ذکر آربتھ ناٹ کی کتاب "تاریخ جان بل" میں ملتا ہے جو 1712ء میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد اس لفظ کو عام مقبولیت حاصل ہو گئی اور اس سے انگریز مراد لیے جانے لگے۔

مرسلہ: آصف محمد۔ اسکاٹ لینڈ

تھے۔ ننگ دلق یا گودڑی اوڑھتے ہیں جو رنگ برنگ کے چیتھڑے سی کر بنائی جاتی ہے۔ جاڑے میں باسوتی (واسکٹ جس میں روئی بھری ہو۔ مردوں کا جبہ) پہنتے ہیں۔ سردی سے بچاؤ کے لیے روئی دار جبہ پہنتے ہیں جسے دگلا کہتے ہیں۔

لباس کی تراش خراش پرانے وقتوں سے بدلتی رہی ہے۔ کئی بار ایسا بھی ہوا کہ کسی بڑے آدمی نے اپنے بدن کے کسی نقص کو ڈھانپا تو اس سے ایک نیا فیشن چل نکلا۔ اس کی ایک مثال ہارون الرشید کی بہن علیہ کی سوانح حیات میں ملتی ہے۔ علیہ کی پیشانی بہت چوڑی تھی اور اسے ناگوار گزرتی تھی۔ اس عیب کو چھپانے کے لیے علیہ نے حریر کی مطرز پٹی ماتھے پر باندھنا شروع کی۔ دیکھتے ہی دیکھتے حرم میں چاروں طرف اس کا رواج ہو گیا اور خواتین نے ماتھے پر پٹیاں سجا لیں۔ بعض چلبلی کنیزوں نے پٹیوں پر مختصر جملے اور مصرعے کاڑھنا شروع کیے مثلاً کان لنا کمالہ (جو ہمارا ہے ہم اس کے ہیں) اس پٹی کو عصابہ کہا جاتا تھا۔

یورپ کے ممالک میں عہد وسطیٰ میں یہودیوں اور کسبیوں کو اپنے لباس پر نمایاں طور پر زرد رنگ کا ٹکڑا سینا پڑتا تھا تاکہ وہ پہچانی جائیں۔ اسے شرم کا نشان کہتے تھے۔ انقلاب سے پہلے کے روس میں کسی یہودی لڑکی کو یونیورسٹی میں داخلہ اس شرط پر دیا جاتا تھا کہ وہ لباس پر زرد رنگ کا ٹکڑا پہنے گی۔ ایک دفعہ نواب حسین خان صوبیدار لاہور بازار سے گھوڑے پر سوار گزر رہا تھا کہ اس نے ایک نہایت پاکیزہ صورت سفید ریش مرد دیکھا۔ نواب بے اختیار اس کی تعظیم کے لیے گھوڑے سے نیچے اترا تو پتا چلا کہ وہ کوئی بوڑھا ہندو تھا۔ یہ معلوم کر کے نواب کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اس نے حکم دیا کہ لاہور کے تمام ہندو اپنے لباس پر زرد رنگ کا ٹکڑا پہنا کریں تاکہ دوبارہ یہ غلط فہمی نہ ہو۔ زندہ دلانِ لاہور نے اس کا نام حسین خان ٹکڑیا رکھ دیا۔ وہ تاریخ میں اسی نام سے جانا جاتا ہے۔

پراسرار کتب

کشمانہ حسن

انسان کی رہنما، سب سے اچھی دوست اور ذہنوں کو جلا بخشنے والی، ترقی کی شاہراہ کو کشادہ کرنے والی، تنہائی کی سب سے اچھی ساتھی کتابیں ہیں جو آسمان و زمین کو مسخر کرنے کا تجربہ ایک سے دوسرے تک منتقل کرتی ہیں مگر کچھ ایسی کتابیں بھی لکھی گئی ہیں جن کا بھید آج تک کوئی جان نہ پایا۔ اسرار سے بھری چند کتابوں کا مختصر مختصر سا تعارف۔

کتابیں تنہائی کی ساتھی اور انسان کی سب سے اچھی دوست ہوتی ہیں۔ کیوں کہ دنیا میں جتنی بھی ترقی نظر آ رہی ہے وہ کتابوں کی بدولت ہے۔ کتابیں ذہنوں کو روشن کر کے انسان کو اسکالر بناتی ہیں۔ سائنس داں بناتی ہیں۔ شاعر اور ادیب بناتی ہیں۔

ہمارے چاروں طرف کتابوں کی حکومت ہے۔ کیوں کہ ان کتابوں میں لکھنے والا عمر بھر کے تجربے کا نچوڑ، زندگی کے نشیب و فراز اور اس کے پاس موجود حاصل کردہ مکمل علم بھر دیتا ہے۔ اسی لیے اگر کتابیں نہ ہوتیں تو انسان پتھروں ہی کے دور میں رہتا۔ ترقی اس کے لیے خواب و خیال بن کر رہ جاتی۔

دنیا نے کروڑوں کی تعداد میں لکھنے والے پیدا کیے۔ دنیا کے مذاہب بھی کتابوں کے حوالے سے قائم ہیں۔ قرآن شریف، زبور، انجیل، یہ سب کتابیں ہی تو ہیں۔ الہامی کتابیں گیتا اور گرو گرنتھ صاحب بھی کتابیں ہیں۔

کتابیں روشن چراغ کی طرح ہوتی ہیں۔ ان کا کام اندھیروں کو روشن کرنا ہے۔

کتابیں اسی لیے عام فہم ہوتی ہیں کہ آسانی سے سمجھ میں آسکیں۔

لیکن دنیا میں ایسی کتابیں بھی ہیں جو پُراسرار کہی جا سکتی ہیں۔ ان کتابوں کے بھید ابھی تک ظاہر نہیں ہو سکے ہیں۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ ان کتابوں کو ترتیب دینے والے یہ نہیں چاہتے ہوں کہ یہ کتابیں ہر ایک کی سمجھ میں آ جائیں۔ بلکہ وہ کتابیں خاص گروہ یا عقیدے کے لیے ہوتی ہوں۔ ہم نے اس مضمون میں ایسی ہی چند کتابوں کا جائزہ لیا ہے۔

The voynich manuscript

یہ کتاب ولفریڈ وائے نچ کے پاس تھی۔ اسی لیے اس کتاب کو وائے نچ کی کتاب کہا جاتا ہے۔ یہ کتاب ولفریڈ کے خاندان کے پاس صدیوں سے چلی آ رہی تھی۔ اس خاندان کے افراد مہینے چودہ دنوں میں کسی رات کسی ایک جگہ جمع ہو جاتے اور اس کتاب پر غور کیا کرتے۔ یہ کتاب

ریاضی دان، ماہر طب، فلاسفر، ستارہ شناس اور نہ جانے کیا کیا تھا۔ جان ڈیوی ملکہ کے دربار سے بھی وابستہ تھا۔ وہ ہر وقت مطالعہ کرنے کا عادی تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے ذاتی کتب خانے میں تیس ہزار کتابیں تھیں۔ یہ پُراسرار کتاب جان ڈیوی کے پاس برسوں سے محفوظ چلی آرہی تھی۔ اس نے یہ کتاب اپنے تمام دوستوں کو دکھائی تھی۔

کسی کی سمجھ میں نہ آنے والی اس کتاب کے بارے میں جان کا یہ کہنا تھا کہ یہ جنتروں منتروں کی کتاب ہے اور اس میں حیرت انگیز ٹوٹکے لکھے ہیں۔ اس کتاب کے اشاروں اور اس کی زبان کو آج تک کوئی نہیں سمجھ پایا۔ جان ڈیوی کی موت کے بعد ہی اس کتاب کا اسرار سامنے آیا۔ ہوا یوں تھا کہ وہ کتاب اس کے کتب خانے سے کہیں غائب ہو گئی تھی۔ اس کتاب کو تلاش کرنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی لیکن ناکامی ہوتی رہی اور آخر کئی برسوں کے بعد وہ کتاب اسی طرح اس کے کتب خانے میں واپس آگئی جس طرح غائب ہوئی تھی۔

اس کو کون لے گیا تھا اور کیوں واپس لایا اور اس میں کیا لکھا ہوا ہے یہ سب کسی کو نہیں معلوم لیکن کتابوں کے اسرار میں یہ کتاب ایک بھید کی حیثیت رکھتی ہے۔

Popol vuh

یہ ایک بہت پرانی کہانی ہے۔ فرانسسکو نام کا ایک پادری 1701 میں گوئٹے مالا کے ایک دور افتادہ گاؤں میں تبلیغ کی غرض سے پہنچا تھا۔ گاؤں والوں نے اس کی بہت آؤ بھگت کی۔ اس کو رہنے کی جگہ دی۔ پھر ایک رات گاؤں والوں نے اسے یہ بتایا کہ ان کے پاس ایک بہت قدیم کتاب ہے۔ جس کے بارے میں وہ نہیں جانتے کہ اس میں

منظر عام پر اس وقت آئی جب الفریڈ نے 1912ء میں یہ کتاب ایک لائبریری کو تحفے میں دے دی۔

کتاب کے منظر عام پر آتے ہی پوری دنیا کے ماہرین اس کتاب کی طرف متوجہ ہو گئے۔ وہ اس معمے کے حل کرنے کی کوششیں کرنے لگے کہ آخر اس کتاب میں لکھا کیا ہے۔

اس کتاب کے ہر صفحے پر الجھی ہوئی تصویریں ہیں۔ پُراسرار قسم کے ایسے پھول اور درخت ہیں جو آج تک نہیں دیکھے گئے۔ درختوں کی نکلی ہوئی جڑیں ہیں۔ ان کے علاوہ عریاں عورتوں کی تصویریں ہیں اور سب سے بڑھ کر کسی نامعلوم حروف تہجی کی عبارتیں ہیں۔ اگر یہ کسی قسم کے اشارے ہیں تو کیا ہیں۔ یہ بھید آج تک کسی کو معلوم نہیں ہو سکا ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ یہ کیسے کوڈ ورڈز ہیں۔

اس کتاب کو آئے سو سال سے زائد کا عرصہ ہو چکا ہے لیکن ابھی تک اس کے حروف تہجی کا معما حل نہیں ہو سکا ہے۔ دنیا کی کسی بھی زبان سے اس کی مماثلت نہیں ہے۔

The book of soyga

یہ کتاب جان ڈیوی کے پاس تھی۔ پڑھا لکھا طبقہ جان ڈیوی سے اچھی طرح واقف ہے۔ وہ انگلینڈ کا مشہور

کیا لکھا ہے لیکن وہ اس کتاب کو بہت مقدس سمجھتے ہیں۔
فرانسسکو کی فرمائش پر اسے وہ کتاب دکھائی گئی۔
وہ ایک بہت الجھی ہوئی کتاب تھی۔ طرح طرح کے اشارے تھے، تصویریں تھیں اور کسی نامعلوم حروف تہجی میں عبارتیں تھیں۔
فرانسسکو مہینوں اس کتاب میں سر کھپاتا رہا اور آخر کار وہ کتاب اس پر واضح ہونے لگی۔
اس کتاب میں کائنات کی تخلیق کے راز بتائے گئے تھے۔ اس کے علاوہ بہت سی خطرناک قسم کے عملیات تھے جن کا اثر فوری ہو جاتا تھا۔ فرانسسکو نے کسی نہ کسی طرح اس کتاب کا ترجمہ کر ڈالا پھر اس نے گاؤں والوں سے اس کتاب کی اشاعت کی اجازت لی۔

اسے اجازت تو دے دی گئی لیکن اس شرط کے ساتھ کہ اس کتاب کو عام نہیں کیا جائے گا۔ یہ صرف اہل علم اور اہل ظرف کے مطالعے میں رہے گی۔ یہ کتاب شائع تو ہو گئی لیکن کچھ دنوں کے بعد اس کے نسخے پُراسرار طور پر غائب ہو گئے۔

کتابوں کے حوالے سے یہ کتاب اب تک ایک مسٹری رہی ہے۔

Riply ascroll

یہ کتاب جارج نامی ایک آدمی نے لکھی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اس کتاب میں اس نے آب حیات کا نسخہ لکھ دیا ہے۔
وہ آب حیات کی تلاش میں بیس برسوں تک پورے یورپ، افریقا میں بھٹکتا رہا تھا۔ پھر اس نے وہ کتاب لکھی جس کو ریپلائی اسکرول کہا جاتا ہے۔ اس کا دعویٰ تھا کہ اس نے آب حیات کا راز معلوم کر لیا ہے۔
جارج نے اس کتاب کو انتہائی پیچیدہ کر دیا تھا۔ خفیہ اشارے، خفیہ زبان، عجیب عجیب تصویریں۔ یہ سب اس کتاب میں موجود ہیں لیکن ان کو آج تک سمجھا نہیں جا سکا تھا۔ اب یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ خود جارج نے بھی آب حیات بنا کر استعمال کیا یا نہیں۔

The rohonc codex

یہ کتاب 1838 میں اس وقت سامنے آئی جب کاؤنٹ گستاؤ نے ہنگری کی ایک لائبریری کو یہ کتاب عطیے کے طور پر دی۔ کسی اجنبی زبان کی یہ ایک حیرت انگیز کتاب ہے۔ اس میں ایسی ایسی تصویریں ہیں جن کو دیکھ کر عقل گھوم کر رہ جاتی ہے۔ انسان نما جانور اور جانور نما انسان۔ ایسے

ایسے پھول کہ پریوں کے دیس کے لگتے ہیں۔ کاؤنٹ نے بھی اس کتاب کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ اس سے جب دریافت کیا جاتا تو وہ یہ کہتا کہ یہ ایک مسحور کتاب ہے اور اس میں بنی ہوئی تصویریں خیالی نہیں ہیں لیکن میں کچھ نہیں بتاؤں گا تم کوشش کرنا ہو تو حل کر لو۔

لہٰذا وہ کتاب ابھی تک حل نہیں ہو سکی ہے اور ایک معمے کے طور پر رکھی ہوئی ہے۔

اس میں بے شمار جانوروں کی تصاویر ہیں۔ کچھ جانور تو دنیا میں موجود ہیں اور کچھ ایسے ہیں جو آج تک نہیں دیکھے گئے۔ اس میں ایسی تصویریں ہیں جن میں دھڑ تو انسانوں کے ہیں لیکن گردن سے اوپر کسی ایسی مخلوق کا چہرہ ہے جو بہت حیرت انگیز اور پُراسرار ہے۔ یہ کتاب اس وقت شائع ہوئی تھی جب مشہور پیش گو ناسٹرے ڈیمس اپنی پیش گوئیاں لکھ رہا تھا۔

The dead sea scroll

یہ واقعہ فلسطین کے قریب ایک غار کا ہے۔ دو چرواہے اس غار میں گر گئے تھے۔ ان کو بہت مشکل سے نکالا

گیا۔ ان دونوں نے اس غار میں کچھ عجیب چیزیں دریافت کی تھیں۔ ان چیزوں میں کچھ برتن، چمڑے کی تھیلیاں، اوزار اس کے علاوہ ایک نایاب کتاب بھی تھی۔ اس کتاب کی دریافت نے ایک دھوم مچا دی تھی۔ یہ کتاب 167 اے ڈی کی بتائی جاتی ہے اور اس کا تعلق رومن عہد سے ہے لیکن یہ ہے کیا اور اس میں کیا لکھا ہوا ہے یہ کسی کو بھی نہیں معلوم۔ کیوں کہ اس کا رسم الخط بالکل اجنبی ہے۔ نہ جانے رومن عہد میں اس کتاب سے کیا کام لیا جاتا تھا۔

The red book

یہ مشہور ماہر نفسیات کارل یونگ کی کتاب ہے۔ یونگ بیسویں صدی کا مشہور ماہر نفسیات تھا۔ وہ analytical psychology کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ یونگ سگمنڈ فرائیڈ کا شاگرد رہ چکا ہے۔ بعد میں اس نے اپنی راہیں الگ کر لی تھیں۔ اسی زمانے میں اس نے اپنی کتاب پر کام شروع کیا۔ اس نے اپنی اس کتاب پر

Prodijio rum

یہ بھی ایک حیرت انگیز کتاب ہے۔ یہ دعاؤں اور جنتروں منتروں کی کتاب ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کتاب میں رومن عہد سے لے کر آج تک کی پیش گوئیاں ہیں اور کہا جاتا ہے کہ جب جاننے والوں نے اسے تھوڑا بہت سمجھا تو بہت سی پیش گوئیاں درست ثابت ہو چکی تھیں۔

1913 میں کام شروع کیا تھا اور یہ کتاب 2009 میں جا کر شائع ہوئی۔ پہلے اس کا نام Libar novestt تھا لیکن بیدیدیک کے نام سے شائع ہوئی ہے۔

انسانی ذہن کی نفسیاتی گرہ کھولنے والی یہ کتاب خود اتنی الجھی ہوئی ہے کہ اس کو سمجھنا کارے دارد ہے۔ اسی لیے اس کو دنیا کی پُراسرار کتابوں کی فہرست میں رکھا جاتا ہے۔

The codex seraphinianus

یہ بھی دنیا کی حیرت انگیز کتابوں میں سے ایک ہے۔ اس کتاب کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ یہ اس دنیا اور دوسری دنیا کے درمیان کا دروازہ ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ یہ دوسری دنیا کے بھید کا انسائیکلو پیڈیا ہے۔

یہ کتاب اٹلی کے مصور Leugi serafini کی تخلیق ہے۔ وہ چونکہ خود مصور تھا۔ اسی لیے اس نے اس کتاب کو طرح طرح کی تصاویر سے سجا دیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ جو کچھ بھی اس کتاب کی تصاویر میں ہے وہ سب بالکل درست ہے۔ دوسری دنیا میں ایسا ہی ہے۔ اس کتاب میں ایسی مچھلیاں ہیں جن کی آنکھیں انسانوں جیسی ہیں۔ ایسے شہر ہیں جن کے مکانات بالکل الگ طرز تعمیر کے ہیں۔ ایسے انوکھے اونٹ ہیں جن کے سروں پر سینگیں ہیں۔ اس کے علاوہ یہ کتاب جس رسم الخط میں ہے وہ بھی ایسی ہے جو آج تک سمجھ میں نہیں آسکی ہے۔

Rongorongo

اگر کسی کتاب کی تعریف یہ ہے کہ وہ کاغذ پر چھپی ہو اور کتابی شکل میں ہو تو یہ کتاب اس تعریف پر پوری نہیں اترتی۔ بلکہ یہ ایک مختلف کتاب ہے۔ یہ کتاب لکڑی کے بڑے بڑے ٹکڑوں پر لکھی ہوئی ہے۔ اس کو اگر ترتیب سے رکھ دیں جوڑ دیں تو کتاب بن جاتی ہے۔ یہ کتاب انیسویں صدی میں دریافت ہوئی تھی۔ یہ کتاب ایک المناک واقعے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کتاب کا تعلق تاہیتی سے ہے۔ اس شہر پر دشمنوں نے حملہ کرکے اسے برباد کر دیا۔ مزید بدقسمتی

یہ ہوئی کہ اس شہر میں چیچک کی وبا پھوٹ پڑی اور بچے کھچے لوگ بھی مر گئے۔ یہ کتاب وہیں سے ملی تھی۔ اس کی حفاظت کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس کتاب کی کوئی اہمیت ہوگی لیکن اس تحریر کو جاننے والا کوئی بچا ہی نہیں تھا۔ اسی لیے کسی کو نہیں معلوم کہ اس کتاب میں ہے

کیا۔

The codex mandoza

یہ کتاب اسپین کے وائسرائے منڈوزا کے پاس تھی۔ اسی لیے اس کے نام سے منسوب ہے۔ منڈوزا نے یہ کتاب ایک بحری جہاز کے ذریعے اسپین کے بادشاہ کے پاس روانہ

کی لیکن راستے میں فرانس کے قزاقوں نے اس جہاز کو لوٹ لیا اور دیگر قیمتی چیزوں کے ساتھ یہ کتاب بھی فرانس پہنچ گئی۔ اب یہ کتاب آکسفورڈ کے کتب خانے میں ہے۔ یہ کتاب ایک قدیم تہذیب کی دستاویز ہے۔ وہ تہذیب ازٹیک کی ہے۔ اس میں اس تہذیب کی دعاؤں کے ساتھ ان کی دیگر رسومات بھی ہیں جن کا پتا اس کتاب کی تصویروں سے ہوتا ہے لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ اس تحریر کو پڑھنے والا کوئی نہیں ہے۔ ورنہ اس تہذیب کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہو سکتا۔

ہم نے ان کتابوں کو پراسرار کا درجہ اس لیے دیا ہے کیوں کہ ان کتابوں کے بھید پوشیدہ ہیں۔ جانے کیا ان میں لکھا ہو۔ ہو سکتا ہے کہ ان کتابوں کے بھید ہمیشہ کے لیے دفن ہو جائیں۔

Badger

ندھری کی قسم کا ایک دودھ پلانے والا گوشت خور جانور جسے پاکستان میں بجو کہا جاتا ہے۔ بلوں میں رہتا ہے اور زمین کھود کر جڑیں اور کرم کھاتا ہے۔ بعض دفعہ چوہوں اور خرگوش تک کو چٹ کر جاتا ہے۔ پاکستان اور بھارت میں عام ہے۔ ہمیشہ رات کو باہر نکلتا ہے۔ اس کے بال بہت نرم ہوتے ہیں اور ان سے بنے ہوئے دانتوں کے برش بہت گراں ہوتے ہیں۔ ایشیا، یورپ اور امریکا میں اس کی کئی قسمیں پائی جاتی ہیں۔

مرسلہ: سحر نیاز زاہد۔ فیصل آباد

Minor`s Court

وہ عدالت جو کم عمر اور نابالغ مجرمان کے مقدمات سنتی اور فیصلے دیتی ہے۔ اکثر ممالک میں ایسی عدالتیں قائم ہیں جو 16 سال سے کم عمر کے مجرمان کے مقدموں کا فیصلہ کرتی ہیں مگر کہیں کہیں 11 سال کی عمر تک کے ملزم بھی ان عدالتوں میں پیش کیے جاتے ہیں۔ کیلے فورنیا میں اکیس سال تک کے ملزم اس عدالت کے روبرو پیش ہونے کا حق رکھتے ہیں لیکن عام طور پر بھاری جرائم کا ارتکاب کرنے والے نابالغ مجرم فوجداری عدالتوں میں ہی پیش ہوتے ہیں۔ بچوں کی عدالتوں کا طریق کار دوسری عدالتوں کے طریق کار سے بہت مختلف ہوتا ہے۔ ایسی عدالتوں میں پیش ہونے والے کم عمر ملزم کو قصوروار سے زیادہ مستحق امداد سمجھا جاتا ہے اور سزا کی بجائے اس کی تربیت کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ مقدمے کی اس طرح شنوائی نہیں ہوتی جس طرح عدالتوں میں رواج ہے بلکہ ذاتی نشستوں میں اس پر غور کیا جاتا ہے۔ البتہ بچے کے والدین یا کوئی دوسرا متعلقہ شخص مطالبہ کرے تو اسے باقاعدہ مقدمے کی صورت بھی دی جا سکتی ہے۔

مرسلہ: سونیا زاہد۔ فیصل آباد

فن سے بڑا فنکار

سید زین مہدی

فنِ موسیقی کے بے شمار باکمال ہنر مند نے برصغیر میں جنم لیا. اسی دھرتی پر برسوں پہلے تان سین کی تان سے بجھے چراغ جل اٹھتے تھے۔ راگ ملہار سے بادل برسنے لگتے تھے ماضی قریب کے اس فنکار کے گلے میں بھی جادو تھا مگر افسوس چند مفاد پرستوں کی وجہ سے پاکستان کی سرزمین اسے راس نہ آئی اور وہ ہند کی جانب کوچ کر گیا.

قصور کے علاقے میں بابا فاضل کا بڑا نام تھا۔ وہ دور دور تک خوش گلوی کے لیے مشہور تھے۔ بلاشبہ وہ اپنے دور کے بہت بڑے مغنی تھے۔ خوش گلو ہونے کی وجہ سے لوگ ان کی دوستی پر فخر کرتے تھے مگر وہ خود عام لوگوں سے دوری بنائے رکھتے۔ امیر امراء سے تو وہ کوسوں دور رہتے مگر انہیں ایک درویش سے خاص عقیدت تھی۔ ان کے کلام کو وہ راگ کی مالا میں پرو کر جب سامنے لاتے تو لوگ اس کلام کے دیوانے ہو جاتے۔ خود وہ درویش بھی

بابا فاضل کی خوش گلوئی کو پسند کرتے تھے اور فرمائش کر کے اس سے اپنا کلام سنتے تھے۔ اسے کلام دیتے ہی وہ کہہ دیتے تھے۔ یہ کلام اس کی زبان سے ہی بھلا لگے گا۔ وہ درویش کوئی اور نہیں بابا بلھے شاہ تھے۔ یہی وجہ تھی کہ بابا کا سب سے زیادہ کلام بابا فاضل کی بنائی دھن اور انہی کی زبان سے لوگوں تک پہنچ کر مقبول ہوا۔ بابا فاضل کی اولادوں میں سے ایک ارشاد خان نے قصور سے ہجرت کی ٹھانی اور لاہور کی جانب چل پڑے۔ اس دور میں لاہور عروس البلاد کہلاتا تھا۔ مشرقی و مغربی پنجاب کا سب سے بڑا شہر کہلاتا تھا۔ دار الحکومت بھی یہی شہر تھا۔ لاہور پہنچ کر ارشاد خان نے مہاراجا رنجیت سنگھ کے دربار تک رسائی حاصل کی۔ اس کی آواز میں ایسا لوچ تھا کہ مہاراجا رنجیت سنگھ نے اسے دربار کا گویّہ مقرر کر دیا۔ کافی عرصہ مہاراجا رنجیت سنگھ کے دربار سے وابستہ رہنے کے بعد وہ مہاراجا جموں و کشمیر کے دربار سے منسلک ہو گیا۔

ارشاد خان کے دو بیٹے تھے علی بخش اور کالے خان۔ یہ دونوں بھی راگ راگنی کے شوق سے سرشار تھے۔ باپ نے بیٹوں کے شوق کو دیکھتے ہوئے انہیں پٹیالہ دربار کے مغنی فتح علی خان کے پاس بھیج دیا۔ اس وقت فتح علی خان کا طوطی بولتا تھا۔ ان سے فن کی باریکیاں سیکھنے کے بعد دونوں بھائی فن میں کامل ہو گئے۔ جب وہ دونوں اپنا فن پیش کرتے تو سامعین پر وجد طاری ہو جاتا۔ اسی لیے ان کو سنگیت رتن اور تان سراٹھ کے خطاب سے نوازا گیا۔ ان دونوں نے موسیقی کے فن میں بہت سی جدتیں پیدا کیں۔ بڑی موشگافیاں کیں اور اس فن کو بہت سے بے جا عناصر سے جو کانوں کو ناگوار گزرتے تھے اور محض اساتذہ کی بخ تھے اس سے پاک کیا۔ اسی علی بخش کے گھر 1901ء میں ایک بچے نے جنم لیا۔ اس کا نام غلام علی رکھا گیا۔ علی بخش نے اپنے بیٹے غلام علی کو اپنے بھائی کالے خان کے پاس موسیقی کی تعلیم کے لیے بٹھا دیا۔ علی بخش کے دو بیٹے اور بھی تھے، برکت علی اور مبارک علی مگر علی بخش غلام علی کو زیادہ چاہتے تھے اسی لیے وہ اس کی تعلیم پر نظر بھی رکھتے تھے۔ گو کہ کالے خان بھی پوری کوشش کر رہے تھے کہ ان کا مکمل فن اس میں منتقل ہو جائے۔ وہ ایک ایک چھند، ایک ایک ماترا پر پوری توجہ دیتے۔ ریاض کراتے وقت وہ چچا کی شفقت بھول جاتے۔

اس دن بھی ہر روز کی طرح انہوں نے صبح تڑکے اسے نیند سے بیدار کر دیا اور اپنے ساتھ لے کر ندی کنارے پہنچ گئے۔ افق پر صبح کاذب کی روشنی پھیل رہی تھی۔ اس وقت ہر گھر کے بچے نیند کی وادیوں میں کھوئے ہوئے تھے مگر کالے خان کی بھاری بھرکم آواز نے غلام علی کو نہ صرف نیند سے بیدار کرا دیا تھا بلکہ وہ اپنے ساتھ اسے بھی ندی کے کنارے لے آئے تھے۔

موسم سرد تھا۔ جاڑا ہڈیوں میں اترتا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ سہما سکڑا سا یہاں تک آ گیا تھا۔ کالے خان نے اپنی بڑی بڑی مونچھوں کو اینٹھتے ہوئے بچے سے کہا۔ "اوئے تو جاگ رہا ہے یا سو گیا؟"

"نہیں چچا میں جاگ رہا ہوں۔" بچے نے جواب دیا۔

"یہ تیری آواز کو کیا ہوا۔ ممیا کیوں رہا ہے۔ یہ آواز ہی ہماری دولت ہے۔ یہی ہمیں عزت و شہرت دیتی ہے۔ اس پر قابو پانا سیکھ۔" کہتے ہوئے وہ ندی کی جانب بڑھے۔ ان کی تقلید میں غلام علی بھی بڑھا۔ اس سرد موسم میں جب سردی مزاج پوچھ رہی ہو۔ ندی کی ٹھنڈی ہوا میں کچھ دیر کھڑا ہونا ہی وبال جان تھا مگر وہ چچا کے خوف سے ان کی تقلید میں ندی کی طرف بڑھنے پر مجبور تھا۔ چچا نے دھوتی کو کچھ اوپر اٹھا کر باندھا اور ندی کے سرد پانی میں پیر رکھ دیا۔ وہ گھٹنوں گھٹنوں پانی میں اتر کر کھڑے تھے۔ انہوں نے ہاتھ میں ایک مٹکا اٹھا رکھا تھا۔ جھک کر اس مٹکے کو پانی سے بھرا پھر بھتیجے کی طرف دیکھا۔ چارو ناچار ندی کے یخ پانی میں غلام علی کو بھی اترنا پڑا۔ وہ سردی سے کانپ رہا تھا مگر کمر تک پانی میں کھڑا تھا۔

"اب گلا صاف کر۔" کالے خان نے حکم صادر کیا۔

غلام علی نے گلے سے سُر نکالنا شروع کیا۔ اس یخ بستہ پانی میں کھڑے ہو کر بھیم سر میں سرگم نکالنا آسان نہیں مگر تعلیم تو تعلیم ہے۔ دانہ خاک میں مل کر ہی گل گلزار ہوتا ہے۔ اس ننھی سی جان نے بھی ریاض میں جان لگا دی۔ موسم کی تیکھی آواز میں رخنہ ڈال رہی تھی۔ بار بار سُر گر رہے تھے مگر وہ گرتے سُر کو پھر سے سنبھال لیتا تھا۔ کچھ دیر تک وہ سرگم نکالتا رہا۔

اب مشرقی افق پر سفیدی میں سرخی گھلتی نظر آ رہی تھی۔ اس نے آواز کے زیر و بم پر گرفت مضبوط کر لی تھی کہ چچا نے مٹی کے گھڑے کو سر سے بلند کیا اور اس میں بھرے

پانی کو گرانا شروع کیا۔ اس وقت پانی گرنے، گھڑے سے پانی نکلنے کی آواز گونج رہی تھی۔ غلام علی نے چچا کا اشارہ سمجھتے ہی اس آواز سے اپنی آواز ملانا شروع کر دیا۔ یہ تجربہ بہت کامیاب رہا۔ کالے خان کے چہرے پر مسکراہٹ پھیلتی گئی۔

"تو اب کامیابی کی طرف قدم بہ قدم بڑھ رہا ہے۔ خاندان کا نام اونچا ہوتا محسوس ہو رہا ہے۔ اپنی آواز پر اسی طرح قابو کیے رکھنا، یہی تیری کامیابی کی نوید ہے۔" کالے خان نے خالی گھڑے کو سنبھال کر ندی سے باہر قدم رکھ دیا۔ غلام علی بھی پانی سے باہر آ گیا تھا۔ پانی سے نکلنے کے بعد سردی کی لہر نے اسے بے چین کر دیا تھا مگر اس نے ریاض بند نہیں کیا تھا۔ سرگم ہنوز جاری تھا۔ آواز کے زیر و بم میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

"چل اب گھر چلتے ہیں۔" روز کی طرح کالے خان نے اس کے ننھے سے سر پر شفقت بھرا ہاتھ پھیر کر کہا۔ "سورج نکل چکا ہے۔ تیری ماں تیرا انتظار کر رہی ہوگی۔"

"چچا جان سنا ہے آپ دلی جا رہے ہیں۔" غلام علی نے گھر کی جانب قدم اٹھاتے ہوئے سوال کیا۔

"ولایت کی سرکار کے بڑے سرکار پرنس آف ویلز آ رہے ہیں۔ ان کی آمد کی خوشی میں خصوصی دربار منعقد کیا جا رہا ہے۔ اس دربار میں موسیقی کی تین روزہ محافل منعقد ہو رہی ہے۔ اس میں ہند کے تمام نامی گرامی استاد آ رہے ہیں۔ پنجاب سے مجھے بلایا گیا ہے۔"

"چچا میں بھی جاؤں گا۔" غلام علی نے ضد باندھی۔

"اگر تیری ماں نے اجازت دے دی تو ضرور لے جاؤں گا۔" کالے خان نے تسلی دی مگر انہیں علم تھا کہ بچہ ابھی چھوٹا اور سفر طویل ہے۔ دلی کوئی پاس میں تو ہے نہیں۔ اتنی دور کا سفر، سفری صعوبتیں بچہ برداشت نہیں کر سکے گا۔

یہی ہوا۔ ماں نے بچے کو اتنی دور جانے کی اجازت نہیں دی۔ کالے خان اپنے سازندوں کے ساتھ اکیلے ہی عازم دہلی ہوئے۔

دلی میں ہند کے کونے کونے سے استاد فن آئے ہوئے تھے۔ ایسے ایسے ماہر فن کہ ان کا نام ہی کافی سمجھا جاتا تھا مگر کالے خان کا اپنا الگ مقام تھا۔ جب انہوں نے اپنا فن دکھانا شروع کیا تو محفل پر وجد طاری ہو گیا۔ تمام اساتذہ کالے خان کے فن کے معترف ہو گئے۔ یوں بھی کالے خان کی وجہ سے پٹیالہ گھرانا اب پہچانا جا رہا تھا۔ پنجاب ہی نہیں

انہوں نے بنگال تک اپنے فن کے کمال سے لوگوں کو گرویدہ بنا رکھا تھا۔ پٹیالہ گائیکی کو کلکتہ سے ڈھاکا تک متعارف کرا دیا تھا۔ بتعداد شاگردان کی تقلید میں پٹیالہ گھرانے کے انداز کو اپنا رہے تھے۔

کالے خان جیسا استاد ہو تو شاگرد میں نکھار آنا ضروری ہے۔ گزرتے وقت کے ساتھ غلام علی میں بھی فن کی باریکیاں در آئیں اور وہ بھی چچا کی طرح اپنے فن میں نام پیدا کرتا چلا گیا۔ جب وہ تیس سال کا تھا اس وقت ایک عجیب پریشانی نے آ گھیرا۔ اس کے والد علی بخش نے دوسری شادی کر لی۔ اس عمر میں آ کر نئی شادی بہت سی پریشانیوں کو جنم دیتی ہے۔ ان کے گھر میں بھی فساد کا ماحول پیدا ہو گیا۔ ہر روز لڑائی جھگڑے ہونے لگے۔ ماں نے بیٹے پر زور دینا شروع کر دیا کہ وہ اپنی راہ خود متعین کرے۔ باپ نے تو خرچ دینا ہی بند کر دیا ہے، گرہستی چلانے کے لیے اب اسے ہی کوئی راہ نکالنی ہوگی۔ مجبوراً غلام علی کو گلوکاری کی بجائے ساز کی جانب متوجہ ہونا پڑا کیوں کہ ابھی وہ گلے کی موسیقی میں اتنا کمال حاصل نہیں کر پایا تھا کہ اسے بڑے استادوں کے مقابل بٹھایا جا سکے۔ آمدنی کی خاطر اس نے سارنگی پر ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیا۔ سازوں میں سب سے مشکل ساز سارنگی ہے۔ کہتے ہیں اس ایک آلے سے سو سازوں کا کام لیا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ سارنگی نواز اپنے فن کا ماہر ہو۔ یہ ساز موسیقی کی جان ہے اور ہر ایک کی ضرورت۔ سارنگی پر ہاتھ صاف ہو جانے کی وجہ سے آمدنی کا ایک نیا ذریعہ نکل آیا۔ گھر کی بگڑی حالت سدھر گئی۔

اسی دوران میں والد نے اسے اپنے پاس بلایا اور کہا کہ میں بمبئی جا رہا ہوں اگر ساتھ چلنا ہے تو چلو۔ پنجاب کے مقابلے میں بمبئی میں مواقع زیادہ تھے۔ اس لیے اس نے اس دعوت کو قبول کر لیا اور باپ سے رنجش ہوتے ہوئے بھی ان کے ساتھ بمبئی کے لیے چل پڑا۔

بمبئی وہ شہر ہے جہاں ہر فن کے استاد بھرے پڑے ہیں ان کے درمیان جگہ بنانا بھی آسان نہیں پھر بھی اس نے کوششیں شروع کر دیں۔ وہیں اس کی ملاقات سندھی خان سے ہوئی۔ اس نے ان سے اکتساب فن شروع کر دیا لیکن وہ زیادہ عرصہ ان کے ساتھ گزار نہ سکا اور واپس علی بخش کے ساتھ لاہور آ گیا۔ لاہور پہنچنے کے کچھ عرصے بعد کیرانہ گھرانے کے مشہور استاد بہرے وحید خان لاہور آ گئے۔ ان کی شہرت ہر طرف تھی۔ ایسا استاد شہر میں آئے اور اس سے

فیض حاصل نہ کیا جائے تو اسے کم عقلی کہا جائے گا۔ غلام علی ان کی خدمت میں جا پہنچا اور شاگرد بنا لینے کی استدعا کی۔ وہ کالے خان جیسے جید استاد کا شاگرد تھا اس لیے استاد بھورے وحید خان نے بلا چوں چرا کیے اسے اپنی شاگردی میں لے لیا۔ بھورے خان کی گائیکی کی جھلک غلام علی میں اب صاف نظر آنے لگی۔ پنجاب سے ایک اور معروف استاد عاشق علی سے بھی غلام علی نے فیض حاصل کیا۔ اتنے بڑے بڑے اساتذہ سے فیض یاب ہونے کی وجہ سے غلام علی کی گائیکی میں وسعت پیدا ہوئی۔ فن کے اظہار کی راہیں کشادہ ہوتی گئیں۔ روایتی پٹیالہ گائیکی کی حدود سے وہ آزاد ہوتا چلا گیا اور اس کا ایک منفرد اسلوب اظہار وجود میں آتا چلا گیا۔

1940ء میں کلکتہ جو فن موسیقی کے لیے خاصہ مشہور شہر تھا وہاں ایک محفل موسیقی برپا ہوئی اس محفل میں غلام علی نے بھی شرکت کی۔ اس محفل میں اساتذہ کی کثیر تعداد شریک تھی۔ اتنے بڑے بڑے استادوں کے سامنے اپنا فن پیش کرنا آسان نہ تھا مگر جب غلام کو موقع دیا گیا تو وہ محفل پر چھا گیا۔ اس کے فن کے آگے تمام استادوں کا رنگ پھیکا پڑ گیا اور اسے ہند کا سب سے بڑا گائیک مان لیا گیا۔

اس کی شہرت اب ملک بھر میں پھیل چکی تھی۔ دور دور سے بلاوا آنے لگا تھا۔ صوبہ بہار کے شہر پٹنہ میں ایک محفل منعقد ہونا تھی۔ وہاں سے بھی 1943ء میں بلاوا آ گیا اور اسی سال کلکتہ سے بھی ایسی ہی محفل سے بلاوا آیا۔ غلام علی نے ان دونوں محفلوں میں حصہ لیا اور اپنے فن کا بھرپور مظاہرہ کیا اور خوب خوب داد وصول کی۔ دونوں محفلوں میں بڑے بڑے اساتذہ موجود تھے مگر تمام اساتذہ کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ اب اس کی شہرت آسمان کو چھو رہی تھی۔

جنوری 1944ء میں بمبئی کی اکھل بھارتیہ سنگیت سمیلن میں اور پھر اسی سال بمبئی ہی میں وکرم سموت کانفرنس کے زیر اہتمام محفلیں منعقد ہوئیں۔ بمبئی کی محفل میں برصغیر کے جید فنکار جمع تھے۔ ان میں جے پور گھرانے کے استاد اللہ دیا خان، آگرہ کے استاد فیاض خان اور جے پور گھرانے کے کیسر بائی کیرکر بھی موجود تھے۔ اس محفل میں اس نے راگ پوریا اور ماروا گائے اور اس خوب صورت طریقے سے گائے کہ تمام مشہور اساتذہ نے اسے صف اول کا فنکار مان لیا۔

1944ء میں وہ مگدھ پہنچ گیا (بہار) میں منعقدہ محفلوں میں انہوں نے اپنے فن کا مظاہرہ کیا اور اس طرح برصغیر کی سطح پر وہ ایک اعلیٰ پائے کے فنکار تسلیم کر لیے گئے۔ اب انہیں استاد بڑے غلام علی خان کہا جانے لگا۔

مہاتما گاندھی نے 1945ء میں فرمائش کر کے خان صاحب کا گانا دو بار سنا۔ یہ بھی ان کے لیے اس زمانے میں ایک اعزاز تھا۔ بمبئی میں قیام کے دوران ان کا گانا کئی کئی بار بمبئی ریڈیو اسٹیشن سے نشر ہوتا تھا۔ خان صاحب انتہائی سادہ آدمی تھے۔ کھلے دل کے مالک تھے اور روپے پیسے کے لالچ سے بلند۔ بھکاری ان سے جب بھی سوال کرتے جیب میں ہاتھ ڈال کر جو کچھ نکلتا وہ دے دیتے تھے۔ کہتے ہیں کہ قیام پاکستان کے وقت وہ افغانستان سے بارہ ہزار روپے کما کر لائے تھے۔ وہ ساری کی ساری رقم انہوں نے ہندوؤں کا ظلم و ستم سہہ کر پاکستان آنے والے مہاجروں میں تقسیم کر دی۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ ان دنوں وہ بہت زیادہ ڈپریسڈ رہتے تھے۔ دوستوں کی ہر محفل میں بار بار ایک ہی تذکرہ کرتے تھے کہ کیا انسان اتنا ظالم بھی بن سکتا ہے۔ ہندوؤں کو مسلمانوں سے اتنی نفرت کیوں ہو گئی۔ کیا انسانیت اس جہاں سے رخصت ہو چکی ہے۔

دوستوں نے عزیزوں نے محسوس کر لیا تھا کہ اگر انہیں اس ذہنی دباؤ سے نکالا نہیں گیا تو نتیجہ خطرناک نکلے گا۔

لاہور مہاجرین کی پناہ گاہ بنا ہوا تھا۔ کراچی کی حالت بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ کچھ دوستوں کے زور دینے پر وہ کوئٹہ چلے آئے۔ گو کہ کوئٹہ کا قیام مختصر تھا مگر اس کا نتیجہ حوصلہ افزا تھا۔ اب وہ پہلے کی طرح ریاض کرنے لگے تھے۔ یوں بھی وہ ریاض پر بہت زور دیتے تھے۔ ایک ساز ان کو بہت مرغوب تھا جسے سرمنڈل کہتے ہیں۔ آج بھی سرمنڈل ہر فنکار کے ہاتھوں میں ہوتا ہے اور اس کے بغیر ان مغنیوں کی آواز ان کے گلے سے نہیں نکلتی۔ ایسا لگتا ہے جیسے گلے کے ریاض کے لیے یہ ساز ضروری ہے۔ وہ پو پھٹنے سے پہلے ہی سرمنڈل لے کر ویران پہاڑی پر کھلی ہوا میں بیٹھ جاتے اور ریاض شروع کر دیتے۔ جب ذہنی کیفیت میں نمایاں تبدیلی آ گئی تو وہ دوبارہ سے لاہور آ گئے۔

لاہور اب پہلے جیسا نہیں رہا تھا۔ شہر وہی تھا مگر لوگ بدل گئے تھے، رویے بدل گئے تھے۔ وہ ایک سچے فنکار تھے۔ اس نئے رویوں کا اثر زیادہ لے رہے تھے۔ دیکھ رہے تھے کہ اب کم ظرفوں کے ہاتھوں میں جام آ رہا ہے۔ ان کی اہمیت کو لوگ نظر انداز کر رہے ہیں، اسی دوران میں ان کے ساتھ ایک سانحہ گزر گیا۔

ریڈیو کے سیاہ و سفید کے مالک زیڈ اے بخاری بنے ہوئے تھے۔ انہوں نے موسیقی کی سرپرستی سے انکار کر دیا۔ یہ سلوک انہیں بہت گراں گزرا۔ دیگر استادوں نے اس حکم پر سر تسلیم خم کر دیا مگر بڑے غلام علی خان نے بغاوت کا پرچم بلند کر دیا۔ انہوں نے پاکستان سے ہجرت کا فیصلہ کیا اور بمبئی پہنچ گئے۔

وہاں ان کی سرکاری اور عوامی سطح پر بڑی آؤ بھگت ہوئی اور یہی وہ چیز ہے جو فنکار کی زندگی کا اثاثہ ہوتی ہے۔ بمبئی جیسے شہر میں رہنے کے لیے انہیں مکان دیا گیا۔ سرکاری طور پر وظیفہ بھی مقرر ہوا اور موسیقی کی ترقی و ترویج کا کام ان کے ذمے لگا دیا۔

ڈاکٹر راجندر پرشاد کے عہد صدارت میں انہیں دلی میں راشٹر یہ پتی بھون میں گانے کے لیے بلایا گیا۔ یہ بھی ایک بہت بڑا اعزاز تھا۔ کلکتہ یونیورسٹی نے خان صاحب کو ایک بلند پایہ موسیقار تسلیم کیا اور ''ایل ایل ڈی'' کی اعزازی ڈگری دی۔ ہندوستان کا سب سے بڑا فنی اعزاز ''پدم بھوشن'' ہے۔ یہ بھی خان صاحب کو موسیقی میں خدمات کے سلسلے میں پیش کیا گیا۔

بمبئی میں بی آر دیودھر ایک میوزک اسکول چلاتے تھے۔ خان صاحب کا ان کے ہاں کثرت سے آنا جانا تھا اور رموز موسیقی پر دیودھر سے اکثر گفتگو رہتی تھی۔ انکی دیودھر صاحب نے اپنی ان صحبتوں کی روداد پر مشتمل ایک مضمون ''سنگیت کلا وہار'' نامی رسالے میں شائع کیا کہ ایک دن خان صاحب اس کے ودیالہ میں پہنچ گئے اور دیودھر سے کہا کہ ''تمبورا نکلوائیے، میں ریاض کرنے کا طریقہ آپ کو بتاتا ہوں۔''

انہوں نے کہا ''اپنے چچا کالے خان سے میں نے اگر کچھ سیکھا ہے تو وہ یہی آواز کا لگاؤ ہے۔'' پھر انہوں نے دیودھر سے کہا کہ پوری آواز کھول کر سرگم کہیے اور ساتھ ساتھ وہ بھی بلند آواز میں سرگم کہنے لگے۔ کچھ دیر کے بعد انہوں نے اس زور سے سرگم کہنے شروع کیے کہ پورا کمرا سرگموں سے گونج اٹھا۔ سرگم کہنے کے بعد آپ ہر ایک سُر کن کے ساتھ لگانے لگے۔ سا کے ساتھ رے کا کن اور رے کے ساتھ گا کا۔ اسی طرح سر لگاتے ہوئے وہ تار سپتک کے شڑج تک پہنچ گئے۔ بعد میں پھر اسی طرح اوروہ کرتے ہوئے وہ مدھیہ سپتک کی شڑج پر آ گئے۔ اس مظاہرے کے بعد آپ نے الٹے کن لگانا

شروع کر دیا اور پھر قریبی سُر کو چھوڑ کر آگے سُر کا کن لگانے لگے یعنی گا پر سا کا کن اور دھ پر رے کا کن وغیرہ۔

خان صاحب کا کہنا تھا کہ کن کے ساتھ سُر لگانا موسیقی میں اہم مقام رکھتا ہے۔ یہی وائس کلچر ہے اور یہی گائیکی کا سب کچھ ہے۔ ان کے خیال میں ایک زوردار تان کو پانچ یا چھ الاپوں کے برابر سانس کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ عمر کے ساتویں سال سے ان کی موسیقی کی تعلیم شروع ہوئی۔ اس وقت سے وہ متواتر ریاض کر رہے ہیں اور آخر دم تک کرتے رہیں گے۔ ان کے اس جملے میں ہمارے فن کاروں کے لیے ایک نصیحت ایک پیغام ہے۔ ہمارے فنکار جو آواز لگاتے ہی استاد کہلانے کے مرض میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

خان صاحب کی گائیکی کی سب سے بڑی خوبی ان کی محنت اور ریاضت سے تیار کی ہوئی آواز کی حیران کن نغمگیت تھی۔ اس آواز کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ موسیقی کے تینوں سپتکوں پر بڑی آسانی سے محیط ہو جاتی تھی۔ بے سُرا ہونا تو در کنار ان کے گلے سے کوئی درشت یا غنا سے عاری سُر بھی برآمد ہی نہیں ہوا۔ ان کے نچلے سُروں کا اتار چڑھاؤ یا پھیلاؤ نا قابلِ تقلید تھا۔ تار سپتک میں سُر کے پھٹنے کا یا چھپن کا کبھی کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اگر کبھی کوئی انسانی آواز کسی ساز کی آواز سے مماثل ہو سکتی ہے تو یہ آواز بڑے غلام علی خان ہی کی تھی۔ برسوں کی ریاضت کے بعد وہ اپنی آواز کو اس مرحلے میں پہنچانے میں کامیاب ہوئے تھے۔ پھر بھی وہ اکثر شاکی رہتے تھے کہ برصغیر کے فنکار وائس کلچر یا آواز کی پرورش کی طرف پوری توجہ نہیں دیتے۔

ناقدین کا کہنا ہے ان کی آواز کی یہ خصوصیت تھی کہ تان کتنی ہی پیچیدہ یا جھلک کیوں نہ ہو مگر ان کی آواز میں لرزش یا ڈگمگاہٹ پیدا نہیں ہوتی تھی۔ اپنی ایک ٹھمری "کیا کروں سجنی" میں وہ سولہ سُر پل بھر میں عبور کر جاتے ہیں اور اس خوبی کے ساتھ کہ ہر سُر صاف اور علیحدہ علیحدہ نظر آتا ہے۔ اس آواز کا ایک اور نمونہ ان کا راگ گن کلی کا گایا ہوا خیال ہے جہاں نچلے سُروں کا نکھار اور ان سُروں پر ان کی قدرت واضح نظر آتی ہے۔ دراصل خان صاحب سُر کی صفائی اور پاکیزگی پر خصوصی توجہ دیتے تھے۔ انہوں نے یہ کمال برسوں کے ریاض کے بعد حاصل کیا تھا۔ سُر پر ان کا اختیار اور ضبط اس قدر مضبوط تھا کہ وہ اکثر ماتکونس میں پنچم بڑی سہولت سے لگا دیتے اور سننے والوں کو اس کی ناموزونیت کا قطعاً کوئی احساس نہیں ہوتا تھا۔ (یاد رہے کہ راگ ماتکونس میں یہ سُر متروک ہے)۔

پٹیالہ گھرانے کی پہچان یہ ہے کہ یہ سادگی سے سادی چیز کو پیچ دار بنا دیتی ہے۔ راگ میں جھلک بہت جڑ دینا ان کی خوبی ہے اس انداز کی گائیکی کا مظاہرہ خاص طور پر کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس گائیکی میں تکنیک کو ہی خوبی اور مقصد فن کیا جاتا ہے۔ تاثر یا سوز تک پہنچنا پٹیالہ گھرانے کے گائیکوں کا مقصد اولین نہیں ہے لیکن بڑے غلام علی خان نے پٹیالہ گائیکی کے نمایاں خدوخال کو برقرار رکھنے کے باوجود اپنا ایک مخصوص انداز اختیار کر رکھا تھا۔ ان کے لیے پٹیالہ گائیکی کی حدود میں محبوس رہنا ممکن نہ تھا، ان کی گائیکی کی اس خصوصیت کا مظاہرہ ان کے راگ میگھ ملہار میں گائے ہوئے سادھرا میں واضح طور پر نظر آتا ہے۔ اس سادھرے میں دھرو پد کا کوئی عنصر نہیں۔ اس راگ کے آغاز میں ہی خان صاحب جھلک اور پیچ دار تانوں سے اجتناب کرنے میں ناکام رہے ہیں۔

دراصل خان صاحب کے اندر کا فنکار ان کے ہنرمند موسیقار سے بڑا تھا اور ان کی فنکارانہ قدرتی صلاحیتیں ان روایات سے بڑی تھیں جو انہیں ورثے میں ملیں۔

خان صاحب بمبئی سے آتے ہی تو حیدرآباد دکن چلے گئے۔ وہیں ان پر فالج کا حملہ ہوا۔ اس سے تو خیر وہ وقتی طور پر سنبھل گئے لیکن ان کی موسیقی میں وہ بات نہ رہی۔ آخر 23 اپریل 1968ء کو انہوں نے وطن سے دور غریب الدیاری میں ہی حیدرآباد دکن میں انتقال کیا اور وہیں مدفون ہیں۔ ان کی وفات پر ہندوستان اور پاکستان کے اخبارات میں تعزیتی کالم چھپے اور فن سے محبت کرنے والے کئی دنوں تک سوگوار رہے۔

خان صاحب نے اپنے پیچھے دو بیٹے چھوڑے۔ کرامت علی خان اور منور علی خان۔ ہندوستان کو ہجرت کے وقت کرامت علی خان نے پاکستان میں ہی رہنا پسند کیا لیکن منور علی خان اپنے والد کے ساتھ ہندوستان چلے گئے۔ کرامت علی خان 1974ء میں گلے کے کینسر سے انتقال کر گئے لیکن منور علی خان نے ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم پائی اور موسیقی میں ایک اہم مقام حاصل کیا۔

اس تحریر کی تکمیل کے لیے [illegible] عباس جعفری کی تحریر سے استفادہ کیا گیا ہے۔

گولڈن وائس

نور فرہاد

برصغیر میں گلوکاری کی باکمال گائیکوں کی ایک طویل فہرست ہے لیکن ان میں سے منفرد آواز کے چند ایک ہی گلوکار ہیں۔ انہی میں سے ایک طلعت محمود بھی ہیں ان کی آواز میں ایک ایسی انفرادیت ہے جو کسی اور کی آواز میں نظر نہیں آتی ان کی آواز میں ایک ایسی خوب صورت تھرتھراہٹ تھی جو کسی اور کی آواز میں نہیں اسی لیے ان کی آواز کو گولڈن وائس کہتے تھے۔

سید صاحب نے مجھے ڈرائنگ روم تک پہنچایا تھا کہ ڈرائنگ روم سے ملحقہ کمرے سے آتی ہوئی گانے کی مدھم آواز سنائی دی۔ صوفے پر بیٹھنے کی بجائے میں ملحقہ کمرے کے دروازے تک دبے قدموں گیا کہ دیکھوں داداجی کون سا گانا سن رہے ہیں۔ میرے پیچھے سید صاحب بھی آگئے تھے۔

"محبت ہی نہ جو سمجھے وہ ظالم پیار کیا جانے"

یہاں آنے کے بعد گیت کے بول سمجھ میں آئے۔

"ہائے کیا گیت ہے۔" سید صاحب آہستہ سے بولے۔

"آہستہ بولیے۔ دادا جی نے ہماری آواز سن لی تو ڈسٹرب ہوں گے۔" میں نے سرگوشی کے انداز میں اسے ٹوکا۔

"میں نے سن لی ہے تم لوگوں کی آواز۔ سو اندر آجاؤ۔"

"واہ دادا ابو! اتنی اچھی آواز سن کر ہم سے رہا نہ گیا۔" سید صاحب میرے ساتھ کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولے۔

دادا جی نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر ریڈیو کی طرف اشارہ کیا۔ "فی الحال یہ طلسمی آواز سنو، باتیں پھر ہوں گی۔"

ہم دونوں بھی گوش بر آواز ہو گئے اور اس آواز کا شہد اپنی سماعت میں ٹپکانے لگے۔ اس گانے کے بعد دوسرا گانا شروع ہوا۔

مری یاد میں تم نہ آنسو بہانا
نہ دل کو جلانا مجھے بھول جانا

دادا جی پر عجیب کیفیت طاری تھی۔ پتا نہیں اس آواز کا جادو تھا یا اس کے بولوں کا اثر تھا۔ سید صاحب نے بھی مجھے معنی خیز نظروں سے دیکھا۔

یہ گیت بھی اپنے اختتام کو پہنچا تو اسی آواز میں ایک نئے گانے کے بول لہرائے۔

جلتے ہیں جس کے لیے، تیری آنکھوں کے دیے
ڈھونڈ لایا ہوں وہی گیت میں تیرے لیے

ایک تو گانے کے بول، اس پر گانے والے کی آواز۔ دونوں نے مل کر ایسا سحر طاری کیا کہ ہم اس وقت چونکے، جب گانا ختم ہوا اور اناؤنسر کی آواز سنائی دی۔ "سنہری آواز کا آج کا پروگرام اختتام پذیر ہوا۔"

دادا جی ذرا دیر تک گم صم بیٹھے رہے۔ شاید اب تک ان پر اس آواز کی سحر آفرینی برقرار تھی۔ پھر جب آہستہ آہستہ اس جادو کا اثر کم ہوا تو وہ ہماری طرف دیکھ کر مسکرائے۔

"اب تم لوگ صحیح معنوں میں انسان بن گئے ہو کہ تمہیں شعر سے پیار ہو گیا ہے۔"

سید صاحب چہکے۔ "دادا ابو! آپ ہی نے تو ہم سے کہا تھا۔ شعر سے جس کو پیار نہیں ہے۔ وہ موذی ہے انسان نہیں۔"

"تم میں انسانیت موجود تھی۔ اس لیے سرگیت سے تمہیں پیار ہو گیا۔" اتنا کہہ کر وہ ذرا رکے۔ ہماری طرف دیکھتے ہوئے کچھ سوچا پھر سوالیہ انداز میں بولے۔ "سرگیت ہے کیا؟ موسیقی کیا ہے؟" پھر خود ہی جواب دیتے ہوئے بولے۔ "موسیقی ایک جادو ہے جو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ دنیا میں شاید ہی کوئی ایسا آدمی ہو جو سرگیت سے لطف اندوز نہ ہوتا ہو۔ اب تم دونوں خود کو ہی دیکھو میرے کمرے سے آنے والی گانے کی آواز نے تمہیں کھینچ کر میرے کمرے تک پہنچا دیا۔ ایسا کیوں ہوا؟ اس لیے ہوا کہ موسیقی ایک ایسی حس لطیف ہے جس سے انسان سر سے پیر تک متاثر ہوتا ہے۔ جس کے بعد وہ کیفیت پیدا ہونا شروع ہو جاتی ہے کہ بندہ اس میں کھو کر دل ہی دل میں حرکتیں کرنا شروع کر دیتا ہے۔ جھومتا ہے، تھرکنا شروع کر دیتا ہے۔ چھوٹے بچے تک ٹی وی پر کوئی خوب صورت دھن سن کر جھومنے اور تالیاں بجانے لگتے ہیں۔ گویا موسیقی سن کر خود پر انسان کا کنٹرول نہیں رہتا۔"

دادا جی پھر ذرا رکے اور ہمیں اپنی طرف سراپا متوجہ دیکھ کر بولے۔ "یہ کوئی نئی یا موجودہ دور کی بات نہیں۔ شروع ہی سے انسان موسیقی کا گرویدہ رہا ہے۔ اس سلسلے میں حضرت داؤد علیہ السلام کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ تم لوگوں کی معلومات میں اضافہ ہو۔ ان کی آواز کے لیے لحن داؤدی کا لفظ استعمال ہوتا ہے تو اس کی یہی وجہ ہے کہ وہ بہت اچھا حمد سناتے تھے۔ کوئی اگر یہ کہتا ہے کہ وہ لحن یا موسیقی سے متاثر نہیں ہوتا تو وہ جھوٹ بولتا ہے۔" وہ لمحہ بھر کو رکے تھے کہ سید صاحب بول پڑے۔

"دادا ابو! اب تو موسیقی کے ذریعے کئی بیماریوں کا علاج بھی کیا جاتا ہے۔"

دادا جی پہلے مسکرائے پھر بولے۔ "تم نے تو میرے منہ کی بات چھین لی۔ میں بھی یہی بتانا چاہ رہا تھا۔ جیتے رہو۔ تم بہت اچھے جا رہے ہو۔ اب تمہیں اندازہ ہو گیا ہو گا کہ تمہارے دادا اگر موسیقی کے دلدادہ ہیں تو وہ کوئی خبطی یا پاگل نہیں ہیں۔ سرگیت روح کی غذا ہے۔ یہ جو تم دونوں نے اس پروگرام "سنہری آواز" کے دو تین گانے سنے تمہیں کیسے لگے؟"

"بہت اچھے۔ ہم تو اس کے سحر میں کھو گئے۔"

"ہر گانے کا دو حصہ ہوتا ہے۔ ایک موسیقی۔ ایک گانے والے کی آواز۔" دادا جی نے سمجھانے کے انداز میں کہنا شروع کیا۔ "موسیقی کی اچھی دھنوں کے ساتھ اگر گانے والے کی آواز بھی اچھی ہو تو سونے پر سہاگہ والی بات ہوتی ہے۔ سننے والوں کو گیت اپنے سحر میں جکڑ لیتا ہے۔ مثال کے طور پر ابھی جو دو تین گانے تم لوگوں نے سنے، ان ہی کی طرف اشارہ کروں گا۔ ان کی دھنیں بہت ہی اچھی اور خوب صورت نہیں

تھیں۔ طلعت محمود کی آواز بھی طلسمی خوبیوں کی حامل تھی۔

"طلعت محمود۔ کیا بات تھی اس کی بھی۔" میں بول پڑا۔ "اس کی آواز اپنے تمام ہم عصر گلوکاروں سے مختلف اور منفرد تھی۔ ایسی آواز جس کی کوئی نقل نہ کر سکا۔"

"تو پھر کیوں نہ آج اس جادوگر کے بارے میں باتیں کی جائیں کہ ہم جیسے بے خبر بھی اس کی خوبیوں سے باخبر ہو سکیں۔" سید صاحب نے اپنی خواہش کا اظہار کر دیا۔ اس سے پہلے کہ دادا جی کچھ کہتے۔ میں جھٹ بول پڑا۔

"اب یہ دادا جی پر ہی منحصر ہے کہ وہ آپ کی خواہش پر کیا کہتے ہیں۔ کیونکہ طلعت محمود کے بارے میں میرا مطالعہ بہت محدود ہے۔ دادا جی یقیناً اس سریلے گلوکار کے بارے میں بہت زیادہ باخبر ہوں گے۔"

دادا جی نے میری طرف دیکھ کر معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ گویا دل ہی دل میں کہہ رہے ہوں کہ میں سمجھ گیا تمہاری چالاکی کو۔ مگر منہ سے کچھ نہ بولے۔ پھر بولنا شروع کیا تو یوں بولے۔

"طلعت محمود کے بارے میں نقادوں کی رائے ہے کہ سوز و گداز اور ادا سے بھرپور تھرتھراتی مخملی آواز جو رگ و پے میں سرایت کر جائے وہ کسی اور کی ہو ہی نہیں سکتی۔ اس آواز کا خالق اور مالک طلعت محمود اور صرف طلعت محمود ہی ہو سکتا ہے۔ اس کا لہجہ۔ اس کی ادائیگی، شستہ اور لکھنوی انداز، غزل گائیکی میں منفرد رچے نقل نہیں کیا جا سکا۔ یہ وہ باتیں وہ خوبیاں ہیں جو طلعت محمود کے بارے میں مشہور ہیں۔"

یہ تو اس کی نمایاں خصوصیات تھیں۔ اس کی مزید خوبیوں کے ذکر سے پہلے ضروری ہے کہ اس کے بارے میں یہ بتا دیا جائے کہ وہ کون تھا اور گلوکاری کے میدان میں کب اور کیسے قدم رکھا۔

لکھنؤ بھارت کا وہ شہر ہے جو اپنی نرم و نازک ثقافت کی وجہ سے مشہور ہے۔ اسی شہر میں وہ 24 فروری 1924ء کو منظور محمود کے گھر پیدا ہوا۔ منظور محمود ایک سیدھے سادے کاروباری آدمی تھے۔ لیکن روشن خیال تھے۔ کاروباری لوگ عام طور پر ثقافتی سرگرمیوں میں کم ہی دلچسپی لیتے ہیں۔ اس لیے منظور محمود کے گھرانے میں بھی ادب اور آرٹ سے کسی کو رغبت نہیں تھی۔ اس کے باوجود اس گھرانے میں جنم لینے والے طلعت محمود کو اپنے لڑکپن کے دور ہی سے موسیقی سے دلچسپی پیدا ہو گئی۔ جیسے جیسے وہ بڑا ہوتا گیا اس کا یہ ذوق و شوق

زندگی نامہ

نام: طلعت محمود

والد کا نام: منظور محمود (بزنس مین)

تاریخ و جائے پیدائش: لکھنؤ 24 فروری 1924ء

تعلیم: گریجویشن

تعلیمی ادارے: علی گڑھ یونیورسٹی۔ میرس کالج آف میوزک لکھنؤ۔

گلوکاری کا آغاز: آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ (بطور غزل گائیک 1940ء/1939ء۔

پہلا گیت جو ریکارڈ ہوا: سب دن ایک سمان نہیں تھا (غیر فلمی) 1941ء، HMV کلکتہ۔

فلمی کیریئر کا آغاز: بطور اداکار و گلوکار فلم راج لکشمی 1945ء۔

اولین فلمی گیت۔ "جاگو مسافر جاگو" اور "اس جگ سے کچھ آس نہیں"۔ فلم راج لکشمی 1945ء۔

پہلا مقبول عام غیر فلمی گیت: تصویر تری دل مرا بہلا نہ سکے گی، 1944ء۔ شاعر فیاض ہاشمی۔

پہلا مشہور فلمی گیت: اے دل مجھے ایسی جگہ لے چل جہاں کوئی نہ ہو۔ فلم "آرزو" شاعر مجروح سلطان پوری، 1950ء۔

کل گیت۔ فلمی + غیر فلمی: اردو، ہندی، بنگالی، پنجابی کی تقریباً 800۔

آخری گیت: رہے گا جہاں میں تیرا نام۔ فلم "محبت اور خدا"۔ موسیقار نوشاد علی۔ 1986ء۔

وفات: 9 مئی 1998ء بمبئی بھارت۔

بھی بڑھتا گیا۔ وہ جو کسی نے کہا ہے۔

وقت کرتا ہے پرورش برسوں
حادثہ ایک دم نہیں ہوتا

قدرت کو چونکہ اسے ایک بڑا اور نامور گلوکار بنانا تھا۔ اس لیے اس کی فطرت میں ابتدا ہی سے گیت سنگیت سے بہت بڑھ جانے کی پیاس تھی۔ باپ خوش حال تھے اور بچوں کی تعلیم و تربیت سے غافل نہیں تھے۔ انہوں نے طلعت کی ابتدائی تعلیم لکھنؤ میں کی پھر بیٹے کی خواہش پر برصغیر کی مشہور علی گڑھ یونیورسٹی میں داخل کرا دیا۔ مگر اس وقت تک موسیقی

موسیقاروں نے بھی ان گیتوں کے لیے طلعت کی آواز کو بڑی خوش اسلوبی سے استعمال کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے سب سے زیادہ مقبول گیت وہ ہیں جو انہوں نے دردِ بھرے سُر میں گائے ہیں۔

آخری بار طلعت محمود نے 1985ء میں فلم "ولی اعظم" کے لیے گیت ریکارڈ کروایا۔ یہ دوگانا تھا جسے ان کے ساتھ انیتا نے گایا تھا۔ پارکنسن کے مرض کی وجہ سے وہ لفظوں کی ادائیگی ٹھیک سے ادا نہیں کر سکتے تھے لیکن ان کا دماغ اور ان کی سماعت آخر دم تک بڑی اچھی رہی۔ اب ان کی پہلی جیسی آواز نہیں تھی مگر دل کی تسکین کے لیے وہ اپنے گائے ہوئے پرانے گیت سن کر خوش ہوتے اور اپنا غم ہلکا کرتے تھے۔ اس دور میں وہ اکثر کہا کرتے تھے۔

"میں کبھی کبھی اپنے گیت سن کر اداس ہو جاتا ہوں۔ مجھے اپنے گائے ہوئے گیتوں میں ایک کمی سی محسوس ہوتی ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ میں اپنے ان گیتوں کو اور بھی اچھی طرح گا سکتا تھا۔"

بڑے لوگوں کی ایسی ہی انکساری کی باتیں ان کے بڑے پن کو اور بڑا کرتی ہیں۔

ہے یہ وہی آسماں اور ہے وہی زمیں
پر میری تقدیر کا اب وہ زمانہ نہیں

یہ فلم "چار چاند" کا نغمہ ہے۔ اس کے موسیقار نا شاد اور نغمہ نگار اے کریم ہیں۔ طلعت محمود کی آواز میں ریکارڈ ہونے والا یہ گیت اس قدر مقبول ہوا تھا کہ ریڈیو پر اس کی بازگشت اکثر سنائی دیتی تھی۔ نوشاد نے یوں تو انڈیا میں کئی مشہور فلموں کی موسیقی دے کر اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا جیسے فلم نغمہ "زندگی یا طوفان" اور "بارہ دری" لیکن "چار چاند" کا یہ مقبول گیت دیگر فلموں کے گیتوں کے مقابلے میں زیادہ مقبول ہوا۔ گیت نگار اے کریم کا نام اگر فلمی تاریخ میں یاد رکھا جائے گا تو صرف اس گیت کی وجہ سے۔ "چار چاند" اگرچہ فلاپ ہو گئی تھی مگر اس کا یہ مقبول گیت طلعت محمود کی آواز کی وجہ سے آج بھی ماضی کے لوگوں کو یاد ہے۔

اس کے رگ و پے میں اس قدر سرایت کر گئی تھی کہ تعلیم کی طرف سے رغبت روز بروز کم ہوتی گئی۔ گریجویشن کرنے کے بعد علی گڑھ یونیورسٹی سے ناتا توڑ کر گھر واپس آ گیا۔ گھر والوں نے اس طرح آنے کی وجہ پوچھی تو بولا۔ "بس میں اور نہیں پڑھوں گا۔"

باپ نے سوچا۔ چلو اتنا پڑھ لیا ہے یہی کافی ہے۔ اسے کوئی ملازمت تو نہیں کرنی ہے۔ اپنے ساتھ کاروبار میں لگا لوں گا لیکن جب بیٹے کو باپ کے ارادے کی بھنک ملی تو کہا۔

"میں فی الحال کوئی کام نہیں کروں گا بلکہ مزید پڑھوں گا۔"

"اگر مزید پڑھنا تھا تو علی گڑھ سے واپس کیوں آئے؟"

"اب میں موسیقی کی تعلیم و تربیت حاصل کروں گا۔"

باپ کو بیٹے کے شوق کا اندازہ تھا۔ انہیں اس سے پیار بھی تھا اور وہ کوئی دقیانوسی خیال کے انسان بھی نہیں تھے۔ اس لیے بڑی فراخدلی سے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ وہی کرو جو تمہارا دل چاہے۔"

اس طرح نوجوان طلعت محمود نے لکھنؤ کے میرس کالج آف میوزک میں داخلہ لے لیا۔ کالج گیا تو اساتذہ کو اس کی آواز بہت پسند آئی۔ جب کہ وہ موسیقی کی ساری کلاسوں میں جی لگا کر اپنی دلچسپی اور وابستگی کا مظاہرہ کرتا۔ اساتذہ اس کی کارکردگی سے بہت خوش تھے اور انہیں اس بات کا یقین تھا کہ ان کا یہ شاگرد ان کا نام روشن کرے گا۔ ابھی وہ میرس کالج آف میوزک میں زیرِ تعلیم ہی تھا کہ اس نے لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے بطور غزل گائیک اپنے فن کے مظاہرے کی ابتدا کر دی۔ ریڈیو جانے اور آڈیشن کے مرحلے سے گزرنے میں اسے کوئی دشواری نہیں آئی تھی۔ ریڈیو میں طلعت محمود کے گانے کا عرصہ 1939ء سے 1940ء تک رہا۔ یہ وہ دور تھا جب پورے برصغیر میں کے ایل سہگل اور پنکج ملک وغیرہ کی آواز سننے والوں کے دل و دماغ پر راج کرتی تھی۔ طلعت محمود نے ریڈیو پر گانا شروع کیا تو لکھنؤ میں اسے خاصی شہرت حاصل ہو گئی اور لکھنؤ کے ادبی اور سماجی تقریبات میں بھی اسے گانے کی دعوت دی جانے لگی۔ ایسی ہی ایک محفل میں اس کی ملاقات معروف بنگالی موسیقار کمل داس گپتا سے ہوئی۔ گپتا جی اس ابھرتے ہوئے نوجوان کی آواز سن کر دنگ رہ گئے۔ کمل داس گپتا ان دنوں کلکتہ کی گراموفون کمپنی HMV میں کمپوزر تھے۔ گپتا جی نے کلکتے جا کر گراموفون

کمپنی کے منتظمین سے لکھنؤ کے ابھرتے ہوئے گلوکار کا ذکر کیا تو انہوں نے فوراً ایک ٹیم لکھنؤ روانہ کی۔ یہ ٹیم طلعت محمود سے ملی اور اس کی جادو بھری آواز سنی تو طلعت کو کلکتہ آنے اور HMV کے لیے گانے کی دعوت دی۔"

دادا جی نے ذرا توقف کے بعد کہا۔ "تم لوگوں کو تو شاید گراموفون کے بارے میں زیادہ علم نہیں ہوگا۔"

"زیادہ تو نہیں، تھوڑا بہت ہم جانتے ہیں۔" سیٹھ صاحب نے کہا۔ "تصویروں میں دیکھا ہے۔"

"اب بھی کبھی کبھی فلموں اور ڈراموں میں اس دور کے اس میوزیکل انسٹرومنٹ کو اس دور کی عکاسی کرتے ہوئے دکھایا جاتا ہے۔" میں نے بھی اپنا خیال ظاہر کیا۔

"البتہ ہماری موجودہ نسل جس کو موبائل فون میں ہی سب کچھ دستیاب ہو جاتا ہے۔ وہ اس دور کے اس ریکارڈ پلیئر سے بالکل ناواقف ہے۔ ایک ڈبہ جس میں ایک ایسی چابی لگی ہوتی تھی جیسے موٹر کا پہیا لگاتے وقت آلے کو جڑھانے اور گھمانے کے لیے ہوتی ہے۔ ڈبے میں ایک طشتری نما پلیٹ جس کے بیچوں بیچ ایک کیل جس میں گانے کا ریکارڈ لگایا جاتا تھا۔ ریکارڈ کے بیچوں بیچ سوراخ ہوتا تھا۔ اس ابھرے ہوئے کیل میں ریکارڈ پھنسا دیا جاتا تھا۔ اس ڈبے کا ایک ہاتھ بھی ہوتا تھا۔ یوں کہیے جس کے پنجے میں سوئی لگانے کی گنجائش ہوتی تھی وہ سوئی ریکارڈ کے اوپری حصے میں رکھ دی جاتی تھی تو اس ریکارڈ سے آواز ابھرتی تھی۔ یہ ہوتا تھا گراموفون، جو چابی دینے سے چلتا تھا۔"

"شاباش! تم نے گراموفون کو سمجھانے کی بہت حد تک کامیاب کوشش کی ہے۔" دادا جی بولے۔ "یہ ریکارڈ جو سیاہ رنگ کا ہوتا تھا اور غالباً پلاسٹک نما کسی میٹریل سے تیار کیا جاتا تھا۔ اس میں گانے والے یا گانے والی کی آوازیں ریکارڈ کی جاتی تھیں۔ His Master voice (HMV) برصغیر کی بہت بڑی گراموفون کمپنی تھی۔ جس کا مونوگرام بھی بڑا دلچسپ تھا۔ ایک گراموفون کے سامنے ایک کتا بیٹھا ہوتا تھا۔ گویا گانا سن رہا ہوتا تھا۔

"وقت بدلتا گیا۔" دادا جی ذرا رک کر بولے۔ "سائنس ترقی کرتی گئی۔ گراموفون کی جگہ ٹیپ ریکارڈر آ گیا۔ پھر وہ بھی متروک ہو گیا۔ خیر اس بحث کو یہیں ختم کرتا ہوں۔ HMV کمپنی کی ٹیم نے طلعت محمود کو کلکتہ آنے کی دعوت دی اور وہ کلکتہ چلا گیا۔ اگر یہ کہا جائے کہ ان دنوں کلکتہ اس زمانے میں بالی وڈ تھا تو غلط نہ ہوگا۔ نیو تھیٹرز جیسے ادارے

جن فلموں میں اداکاری کی

کلکتہ میں بنی فلمیں

1۔ راج لکشمی۔ 1945ء 2۔ تم اور میں۔ 1947ء 3۔ سمپتی۔ 1949 ممبئی میں بننے والی فلمیں: 4۔ آرام۔ 1951ء 5۔ دل نادان۔ 1953ء 6۔ ڈاکو بابو۔ 1954ء 7۔ وارث۔ 1954ء 8۔ رفتار۔ 1955ء 9۔ دیوالی کی رات۔ 1956ء 10۔ ایک گاؤں کی کہانی۔ 1957ء 11۔ لالہ رخ۔ 1958ء 12۔ مالک۔ 1958ء 13۔ سونے کی چڑیا۔ 1958ء۔

☆☆☆

غیر فلمی مشہور غزلیں

☆ تصویر تری دل میرا بہلا نہ سکے گی۔ فیاض ہاشمی
☆ غم زندگی کا یارب نہ گلہ کوئی سہارا۔ ادریس پنہائی
☆ ہونٹوں سے گل فشاں ہیں وہ۔ فیاض ہاشمی
☆ میرا پیار مجھے لوٹا دو۔ فیاض ہاشمی
☆ چودھویں منزل پہ ظالم آ گیا۔ فیاض ہاشمی
☆ تم عاشقی سے کہہ دو۔ شکیل بدایونی
☆ تمہارے محفل میں تیری میں بے قرار آیا ہوں
☆ خدا وہ وقت نہ لائے کہ سوگوار ہو تو

☆☆☆

دیکھ لی تیری خدائی بس میرا دل بھر گیا

یہ گیت فلم "کنارے کنارے" کا ایک ہٹ سونگ تھا۔ اس کے میوزک ڈائریکٹر جے دیو اور گیت نگار نیائے شرما تھے۔ موسیقار جے دیو نے طلعت محمود کی آواز میں اسے ریکارڈ کیا تھا۔ جے دیو نے یوں تو بہت سے ہٹ گیت اپنے مداحوں کو دیے ہیں لیکن یہ ایسے گیت ان کے کریڈٹ میں زبردست اضافے کا سبب بنا۔ فلم "کنارے کنارے" یوں تو ایک فلاپ فلم تھی مگر اس کے اس گیت کی وجہ سے جے دیو اور نیائے شرما کو بڑی شہرت ملی۔ جب کہ یہ دونوں اس گیت کی کامیابی کا کریڈٹ طلعت محمود کی گائیکی کو دیتے ہیں۔

طلعت محمود ایک خوبرو نوجوان تھے اس لیے فلمسازان کو اپنی فلموں میں بطور ہیرو بھی کاسٹ کرنا چاہتے تھے۔ مگر وہ ہمیشہ انکار کرتے رہتے تھے لیکن اسے آرکاروالان نے فرقدہ پیچھے پڑے کہ ان کو ہیرو کا رول قبول کرنا پڑا۔ اس طرح کلکتہ میں بطور ہیرو طلعت کی پہلی فلم کاردار صاحب کی فلم "دل نادان" تھی مگر وہ بطور ہیرو کامیاب نہ ہو سکے۔ انہوں نے بڑے بڑے سیٹ پر بننے والی فلموں میں ثریا، نوتن اور مالا سنہا جیسی ہیروئنوں کے مقابلے میں ہیرو کے کردار نبھائے۔ مجموعی میں ان کی بطور ہیرو فلموں کی تعداد 10 ہے۔ آخری فلم فلمساز و ہدایت کار شاہد لطیف کی "سونے کی چڑیا" تھی۔

☆☆☆

یوں تو طلعت محمود ہر طرح کے گیت گاتے تھے اگرچہ غزل گائیکی کے وہ اسپیشلسٹ تھے۔ اپنے ہم عصروں میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ وہ اس فن میں یکتا تھا۔ غزلوں کے حوالے سے یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ انہوں نے فلموں کے علاوہ ریڈیو پر بھی پرائیویٹ غزلیں ریکارڈ کرائی تھیں۔ انہی غزلوں میں ان کی یہ مشہور غزل جو

غم زندگی کا یارب نہ ملا کوئی کنارا

مشہور شاعر شکیل بدایونی کی تھی اور انہی کی ایک یادگار غزل تھی۔ اسی طرح مشہور نغمہ نگار شکیل بدایونی کی یہ غزل

غم عاشقی سے کہہ دو رہ عام تک نہ پہنچے
مجھے خوف ہے یہ تہمت مرے نام تک نہ پہنچے

طلعت محمود نے کچھ اس انداز میں گائی کہ جس سے بھی کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔

☆☆☆

محبت ہی نہ سمجھے وہ ظالم پیار کیا جانے

تم پر چھائیں کی یہ غزل نغمہ نگار نور لکھنوی کی کاوش فکر کا نتیجہ تھی۔ اس کی دھن نامور موسیقار کی دام بندہ نے بنائی تھی۔ طلعت محمود کی ریشمی آواز نے اس غزل کو زندہ جاوید کردیا۔ اس کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ اپنے دور میں بچے بچے کی زبان پر تھی۔ یہ مقبول غزل اس فلم میں فلمساز و ہدایت کار شانتا رام پر فلمائی گئی تھی۔ شاید یہ اس غزل کی مقبولیت کا نتیجہ تھا کہ "پرچھائیں" نے زبردست بزنس کیا۔ نغمہ نگار نور لکھنوی کا نام صرف وی شانتا رام کی فلموں "پرچھائیں" اور "سبج کا تارہ" میں سننے میں آیا۔ اس سے پہلے یا بعد میں ان کا نام کبھی نہ سنا گیا۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کبھی دنیا سے کیوں غائب ہو گئے۔

اسی کلکتے میں تھے۔ جن سے کے ایل سہگل، پنکج ملک، پہاڑی سانیال، کانن دیوی اور ہدایت کار پی سی بروا جیسی شخصیات منسلک تھیں۔ کے ایل سہگل طلعت محمود کے آئیڈیل گلوکار تھے۔ یہاں آکر ان کی دلی مراد بھی پوری ہوئی یعنی سہگل سے ملاقات بھی ہوگئی۔ وہ ہاتھی سیسر نامی فلم کے سیٹ پر "دو نیناں متوارے تمہارے" کی ریکارڈنگ کرا رہے تھے۔ طلعت محمود کا سہگل سے تعارف کرایا گیا تو پوچھا۔

"یہ کون ہے؟"

"ایک نیا اور ابھرتا ہوا گلوکار اور آپ کا پرستار۔"

"کہاں سے آئے ہو؟" پھر خود ہی بولے۔ "جہاں سے بھی آئے ہو، بہت اچھا کیا کہ یہاں آگئے ہو۔ یہاں آنے والے یہاں سے سیکھ کر اپنے فن میں کندن بن کر ہی جگمگاتے ہیں۔"

"واہ دادا! مجھے یاد ہے۔ یہ کون سا زمانہ تھا؟"

دادا جی نے سید صاحب کی طرف دیکھا۔ کچھ سوچ کر بولے۔ "یہ دور تھا طلعت محمود 1940ء میں لکھنؤ سے کلکتہ پہنچے تھے۔ گراموفون کمپنی سے اس کا معاہدہ ہوگیا تو وہ اس کے لیے گانے گانے لگے۔ ایک ریکارڈ کا معاوضہ انہیں 30 روپے ملتا تھا۔"

"ایک ریکارڈ میں ایک ہی گانا ہوتا تھا؟"

"نہیں بھئی، ریکارڈ کے دونوں طرف گانے ریکارڈ کرائے جاتے تھے۔ ابتدا میں کچھ دنوں تک طلعت کے گائے ہوئے گیتوں اور غزلوں کے گراموفون ریکارڈوں پر طلعت محمود آف لکھنؤ لکھا جاتا تھا۔ بعد میں یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔"

"دادا جی! طلعت محمود نے تو کچھ فلموں میں بھی کام کیا تھا نا؟" میں نے کہا۔

"ہاں... اس نے فلموں میں بھی کام کیا تھا اور اس کی ابتدا کلکتے ہی سے ہوئی تھی۔ دراصل اس وقت کی کلکتہ فلم انڈسٹری میں نئے فنکاروں کی بڑی حوصلہ افزائی ہوتی تھی۔ 1945ء میں "راج لکشمی" نامی فلم میں اسے ایک کردار دیا گیا جب کہ اس فلم کے دو گیت بھی اس سے گوائے گئے تھے۔ اس کے بعد "تم اور میں" 1947ء اور "سمپتی" 1949ء میں بننے والی اس کی فلمیں تھیں لیکن اسے کلکتے میں گلوکاری کی طرح اداکاری میں بھی کوئی نمایاں مقام حاصل نہ ہو سکا۔"

"ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔" سید صاحب ایک دم بول پڑے۔ "طلعت محمود تو جیسا کہ آپ نے بتایا پیدائشی لو...

پر گلوکار تھے۔ گانے بھی اچھا تھے۔ اس میں تجھ نام بھی کمایا تھا۔ پھر ان سے اداکاری کیوں کرائی گئی؟"

"اچھا سوال ہے۔" دادا جی بولے۔ "بات دراصل یہ ہے کہ فلم بنانے والے لوگ عام طور پر فلم میں کام کرنے کے لیے خوب صورت اور پرکشش افراد کو ترجیح دیتے ہیں۔ طلعت محمود اس معیار میں ہر طرح پورا اترتا تھا۔ اس لیے اسے اداکاری کا چانس بڑی آسانی سے مل گیا۔ البتہ یہ بات کا علم نہیں کہ اس میں اس کی اپنی خواہش بھی کارفرما تھی یا فلم والوں نے اسے اداکاری کرنے پر مجبور کیا۔ ویسے۔" پھر وہ کچھ سوچنے لگے۔ گویا اپنی یادوں کی راکھ کرید رہے ہوں۔ کچھ توقف کے بعد بولے۔ "تم لوگوں کو پتا نہیں معلوم ہے یا نہیں کہ برصغیر میں جب بولتی فلموں کا دور شروع ہوا تو اس وقت ریکارڈنگ کی ٹیکنالوجی سے واقفیت نہیں تھی اس لیے اداکار اور اداکارہ اپنے پر پکچرائز ہونے والے گانے خود ہی گاتے تھے۔ جس طرح اداکاری کرتے وقت مکالمے بولے جاتے تھے بالکل اسی طرح گانے بھی گائے جاتے تھے۔ اس لیے اس حصے میں گانے والے اور گانے والی ہی کو کلیدی کرداروں میں پیش کیا جاتا تھا۔ ریکارڈنگ ٹیکنالوجی سے متعارف ہونے کے بعد یہ سلسلہ ختم ہو گیا مگر اچھی شکل و صورت کے گلوکاروں اور گلوکاراؤں کو بطور اداکار اور اداکارہ پیش کرنے کی ریت جاری رہی۔ اس ضمن میں کے ایل سہگل، کشور کمار، ثریا اور نور جہاں کے نام قابل ذکر ہیں۔"

"دادا جی! آپ بتا رہے تھے کہ طلعت محمود کو فلموں میں قیام کے دوران کوئی نمایاں کامیابی نہیں ملی۔ گلوکاری کی طرح اداکاری میں بھی اس کی تسلی و تشفی نہ ہو سکی۔ اس کے بعد کیا ہوا؟"

"اس کے بعد کیا ہوا؟ یہ بتانے سے پہلے میں ایک خاص بات بتانا ضروری سمجھتا ہوں۔ طلعت محمود حقیقتاً پیدائشی گائیک تھا۔ اس کی آواز کا جادو سب پر چل جاتا تھا۔ 1949ء تک وہ اپنی غیر فلمی گیتوں اور غزلوں سے اپنے خدا داد فن کا لوہا منوا چکا تھا۔ کلکتہ بنگال کا دارالحکومت تھا اور بنگال میں بنگالیوں کی اکثریت تھی۔ یہ خطہ بنگالی تہذیب اور ثقافت کا مرکز تھا۔ اس لیے گراموفون کمپنی نے سوچا اگر اس سحر آفریں آواز میں گیت گوائے جائیں تو بنگال میں اس کے ریکارڈ ہاٹ کیک کی طرح بکیں گے۔ کاروباری طبقہ ہمیشہ اپنے فائدے کی بات سوچتا ہے۔ لہٰذا گراموفون کمپنی نے طلعت محمود کو بنگالی نغمے گانے پر رضامند کر لیا۔ تخلص تپن

میں تجھ کو اگر اک پھول ہوں

ترے رستے کی تو بچھنا ہے یہ

"سلام محبت" کے اس گیت کی موسیقی ہیمن (?) نے ترتیب دی تھی۔ بول انجم جے پوری کے تحریر کردہ تھے۔ گایا تھا طلعت محمود نے۔ بلاشبہ یہ ایک خوب صورت گیت تھا مگر لوگوں کو نہ اس فلم کا نام یاد رہا نہ اس کے موسیقار اور نغمہ نگار کو کسی نے یاد رکھا۔ طلعت محمود کے نام اور گائیکی کی وجہ سے اس گیت کی یاد وقتی رہ گئی۔

تم کو فرصت ہو مری

جاناں تو ادھر دیکھ بھی لو

ایک نظم تھی "بے وفا" یہ ایک گیت ہے جس کی موسیقی اے آر قریشی نے کمپوز کی تھی اور اس کے بول سرشار سیلانی نے تحریر کیے تھے۔ طلعت محمود نے اپنی دل میں اتر جانے والی آواز سے اسے گیت کا روپ دیا تھا۔ موسیقار اے آر قریشی نے بہت فلموں میں موسیقی دی اور نام کمایا۔ مگر ان کی یہ نظم "بے وفا" اس وجہ سے بھی مقبول ہوئی کہ اس میں اس وقت کے دو بڑے اداکار، اشوک کمار اور راج کپور ایک دوسرے کے مد مقابل پیش ہوئے تھے۔ بھولے بسرے گیتوں کے زمرے میں یہ گیت آج بھی سنا جاتا ہے۔

چاند میرا بادلوں میں کھو گیا

فلم کا نام "پٹھان" موسیقار فقیر محمد نغمہ نگار برق آواز طلعت محمود۔ اس فلم نے کوئی خاص کامیابی حاصل نہیں کی۔ طلعت کا گایا ہوا یہ گیت ضرور مقبول ہوا۔ اس کے موسیقار اور نغمہ نگار دونوں اتنے اجنبی تھے کہ فلمی دنیا میں اس گیت کے علاوہ ان کا اور کوئی کنٹری بیوشن نظر نہیں آتا۔ یہ طلعت محمود کی گائیکی کا کمال تھا کہ یہ گیت ہٹ ہوا ورنہ اس کی دھن کوئی خاص نہیں تھی۔ البتہ اس گیت کے مصرعے دل پر ضرور اثر کرتے تھے۔

ہووہی تو تمہاری آواز کا اصل حسن ہے۔ مجھے تمہاری آواز کی وہی کپکپاہٹ چاہیے۔"

"ارے واہ! اسے اپنی اس مخصوص خوبی کا خود اندازہ نہیں تھا۔" سید صاحب ایک دم بول پڑے۔

"ہاں، کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے مگر آواز کے جوہری موسیقار انیل بسواس نے اس آواز کی قدر و قیمت کا اندازہ لگا لیا۔ اس کے بعد طلعت محمود نے اپنی اس مخصوص تھرتھراہٹ کو دور کرنے یا دبانے کی کبھی کوشش نہیں کی جو اس کی آواز کی طرۂ امتیاز تھی۔"

"آرزو" کے اس نغمے کے بعد تو طلعت محمود چل پڑے ہوں گے۔" سید صاحب نے کہا۔ "انہیں ممبئی کی فلموں کے گانوں کا چانس ملنے لگا ہوگا؟"

"ہاں۔" دادا جی بولے۔ "آرزو 1950ء میں بنی تھی۔ 1950ء سے 1960ء کا دس سالہ دور طلعت محمود کا سنہری دور سمجھا جاتا ہے۔ اس دور میں طلعت نے بھارت کے بڑے بڑے میوزک ڈائریکٹروں کی کمپوز کی ہوئی دھنوں میں گیت ریکارڈ کرائے۔ ان موسیقاروں میں انیل بسواس، نوشاد، روشن، مدن موہن، سی رام چندر، وسنت ڈیسائی، بلو سی، لال بھگت رام، ایس ڈی برمن، چترگپت، غلام محمد، اے آر قریشی، سردول واترا، ونود، ہنس راج بہل، سجاد حسین، او پی نیئر، خیام، سردار ملک، روی، حفیظ خان، دھنی رام، شو رام کرشنا اور رام گنگولی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

ویسے تو طلعت محمود نے تقریباً سبھی اداکاروں کے پیچھے پلے بیک دیا ہے لیکن دلیپ کمار پر ان کی آواز بہت جچتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ایک طویل عرصے تک دلیپ پر پکچرائز ہونے والے گانے طلعت محمود ہی سے گوائے جاتے تھے۔

"دادا جی!" میں نے ان کی توجہ اپنی طرف مبذول کراتے ہوئے کہا۔ "مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ موسیقار اعظم نوشاد علی سے طلعت محمود کا کسی بات پر اختلاف ہو گیا تھا۔ یہ کیا قصہ تھا؟"

"ہاں، یہ ایک اہم واقعہ تھا۔ اچھا کیا تم نے اس کی یاد دلا دی۔ قصہ دراصل یہ تھا کہ نوشاد صاحب اپنے اصولوں کے بڑے پکے تھے۔ ان پر پورے نہ اترنے والوں کے ساتھ کام نہیں کرتے تھے۔ نوشاد صاحب نہ خود پیتے تھے نہ پینے والوں کو پسند کرتے تھے جب کہ طلعت محمود بادہ نوش تھے اور اسٹوڈیو میں بھی پی کر آتے اور اسی حالت میں ریکارڈنگ بھی کرتے تھے۔ فلم "بابل" کی ریکارڈنگ کے دوران جب نوشاد صاحب نے طلعت محمود کو اس رنگ میں دیکھا تو سخت برہم ہوئے۔ اور کہا کہ میں اس شرابی سے گانے ریکارڈ نہیں کراؤں گا۔ بڑی مشکلوں سے ہدایت کار نے انہیں رضا مند کیا کہ گانا ازبر ہو چکا ہے تو اس سے ریکارڈ کروا لیں۔ بہرحال تمام وہ اس بات پر راضی ہوئے کہ ریکارڈنگ سے

طلعت محمود کی موت پر موسیقار انیل بسواس نے بی بی سی پر انہیں خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا تھا۔ "یوں تو اس دنیا میں سیکڑوں خوب صورت آوازیں آئیں گی مگر طلعت محمود کی آواز اب کبھی دوبارہ سننے میں نہیں آئے گی۔"

طلعت محمود کو عروج پر پہنچانے میں انیل بسواس کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ اگر انیل بسواس 1950ء میں بننے والی دلیپ کمار اور کامنی کوشل کی مدہوش فلم "آرزو" میں مجروح سلطان پوری کی شہرۂ آفاق غزل

اے دل مجھے ایسی جگہ لے چل جہاں کوئی نہ ہو

ان سے نہ گواتے تو طلعت محمود کو اپنی منزل پانے میں مزید کچھ عرصہ اور لگ جاتا۔ اس غزل کی بدولت طلعت محمود کو زبردست شہرت ملی اور ان کی آواز اور فن گائیکی سے متاثر ہو کر موسیقار اعظم نوشاد نے فلم "بابل" اور شنکر جے کشن نے "داغ" میں دلیپ کمار پر فلمائے جانے والے گیت طلعت سے گوائے جس سے ان کی شہرت کو مزید چار چاند لگ گئے۔ ان تینوں موسیقاروں نے اور مشکل ترین دھن بنانے والے موسیقار سجاد حسین نے فلم سنگدل اور نو آموز موسیقار خیام نے فلم فٹ پاتھ میں بالترتیب یہ لاجواب غزلیں ان سے گوائیں۔

فلم سنگدل۔ یہ ہوا یہ رات یہ چاندنی تیری اک ادا پہ نثار ہے

فلم فٹ پاتھ۔ شام غم کی قسم آج غمگیں ہیں ہم۔ آ بھی جا آ بھی جا آج میرے صنم

"فٹ پاتھ" موسیقار خیام کی پہلی فلم تھی۔ طلعت کے گیت نے بطور موسیقار ان کی شہرت میں بڑا کلیدی کردار ادا کیا۔ سنگدل کے گیت نے بھی اس فلم کی مقبولیت میں اضافہ کیا۔

وقت وہ پیدا ہوا نہ ہو۔ دوسرا مرحلہ طلعت محمود کو راضی کرنے کا تھا کہ ریکارڈنگ کے وقت وہ نہ ہے۔ طلعت محمود کی رضامندی کے بعد نوشاد صاحب نے اس سے "بابل" کے چار گانے ہی ریکارڈ کروائے جو یہ ہیں۔

1۔ میرا جیون ساتھی بچھڑ گیا ختم کہانی ہو گئی۔

2۔ حسن والوں کو نہ دل دو یہ مٹا دیتے ہیں۔

3۔ ندی کنارے ساتھ ہمارے شام سہانی آ گئی (کورس گیت)

4۔ ملتے ہی آنکھیں دل ہوا دیوانہ کسی کا (دوگانا۔ ساتھی گلوکارہ شمشاد بیگم)

"بابل" کے ان گانوں کے بعد 15 سال تک نوشاد صاحب نے طلعت محمود کا بائیکاٹ جاری رکھا۔ ہاں 15 برسوں کے بعد فلم آدمی میں محمد رفیع کے ساتھ ایک دوگانے میں طلعت محمود کی آواز شامل کی مگر عجیب اتفاق ہے کہ یہ نغمہ اس فلم میں شامل نہیں کیا گیا۔ البتہ بہت بعد میں "محبت اور خدا" میں اس کا گیت "زمانے کا جہاں میں تیرا نام" ریکارڈ کروایا جو طلعت کا بھی آخری فلمی گیت ہے۔

"کوئی اور سوال ہو؟" دادا جی نے ہماری طرف دیکھ کر پوچھا۔

"طلعت محمود نے کچھ غیر فلمی گیت اور غزلیں بھی تو گائی ہیں؟" سید صاحب نے پوچھا۔

"ہاں۔"

"ان کی موسیقی انہوں نے خود ترتیب دی تھی یا کسی موسیقار نے؟"

"تمہیں اس کا کوئی غیر فلمی نغمہ یاد ہے؟ پہلے یہ بتاؤ پھر تمہارے سوال کا جواب دوں گا۔"

سید صاحب گھبرا گئے، شاید انہیں دادا جی سے یہ توقع نہیں تھی کہ وہ ان سے ایسا کوئی سوال پوچھیں گے۔ ذرا دیر بعد انہوں نے اپنے آپ پر کنٹرول کیا۔ پھر بولے۔ "ہاں ایک گیت یا غزل، جو انہوں نے گایا تو اس کے بول یاد ہیں۔"

"تو بتاؤ نا۔ وہ گیت یا غزل ہے کیا؟"

"تصویر تری دل مرا بہلا نہ سکے گی۔"

طلعت کے غیر فلمی گیتوں اور غزلوں میں یہ سب سے زیادہ مقبول غزل ہے۔ اس غزل کے شاعر فیاض ہاشمی تھے۔ گراموفون کمپنی نے کلکتہ کے دوران قیام یہ غزل طلعت محمود سے گوائی تھی۔ جس کے لاکھوں ریکارڈ بکے اور طلعت کی شہرت میں اس غزل نے بہت بڑا کردار ادا کیا۔

"اب تمہارے سوال کا جواب سن لو۔ طلعت ہارمونیم وغیرہ تو بجا لیتا تھا مگر اپنے گانوں کی کمپوزیشن اس نے کبھی نہیں کی۔ گراموفون کمپنی کے اپنے کمپوزر ہوتے تھے۔ اس کے غیر فلمی گیتوں اور غزلوں کے لیے جن موسیقاروں نے موسیقی ترتیب دی ان میں کمل داس گپتا، خیام، سرسن ماتے، تاج احمد اور کمل رجانی کے نام قابل ذکر ہیں۔"

"بمبئی میں بھی طلعت محمود کو فلم والوں نے بطور ہیرو پیش کیا۔" میں نے کہا۔ "ان فلموں کا کیا حشر ہوا؟"

دادا جی مسکرائے۔ "میاں! تم نے یہ نہ پوچھا کہ ان فلموں کا کیا حشر ہوا؟" کہہ کر ہی ان فلموں کے حشر نشر کی نشاندہی کر دی۔ بمبئی میں اس کی پہلی فلم "آرام" تھی جو 1951ء میں ریلیز ہوئی۔ پھر ایک سال کے وقفے سے یعنی 1953ء سے 1958ء تک اس کی نو فلمیں نمائش پذیر ہوئیں مگر شائقین فلم نے جانے کیوں طلعت کو بطور ہیرو قبول نہیں کیا۔ اگرچہ وہ خود خاصا قبول شکل وصورت کا بندہ تھا۔ اس دور کی مقبول اور حسین اداکارہ ثریا کے ساتھ بھی اس کی فلم "وارث" ناکام ثابت ہوئی۔ ان حالات میں اداکاری سے اس کا دل اچاٹ ہو گیا اور اس نے اداکاری سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ 1958ء میں اس کی تین فلمیں مالک، رخ، ایک اور سونے کی چڑیا اس کی آخری فلمیں تھیں۔ اگرچہ اس کے بعد بھی کچھ فلمسازوں اور ہدایت کاروں نے اسے اپنی فلموں میں اداکاری کی دعوت دی مگر اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ کیا فائدہ مجھے لے کر فلم بنانے کا جب کہ اس سے منافع پر بھروسا ہوگا نہ سہارا۔

"وہ گلوکار جس کا ہر گیت مقبول ہوتا ہو، جس کا ہر قدم شہرت کی بلندیوں کی طرف پہنچتا ہو جو کامیابیاں اور کامرانیاں سمیٹنے کا عادی ہو، اسے جب پے در پے فلمی ہیرو کی حیثیت سے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تو اس کی مایوسی اور شکستگی فطری تھی۔ اس نے سوچا فلموں میں اداکاری کے چکر میں، میں نے اپنی گلوکاری پر توجہ نہیں دی۔ وہ فن جو میری بنیاد ہے اس کے ساتھ جب میں نے بے اعتنائی کی، بے وفائی کی تو اس کی سزا تو مجھے ملنی ہی تھی۔ کاش کہ میں نے ان 6 برسوں میں صرف گلوکاری کی ہوتی۔ فلموں کے لیے ہی گاتا رہتا تو مجھے ایسی رسوائی کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔"

"ان کی یہ سوچ بالکل درست تھی۔" میں نے اپنا خیال پیش کیا۔ "بیٹا! آج کی گفتگو میں ہمیں ان کے بارے میں معلوم ہوا کہ ابتدا ہی سے کسی نے بھی ان کی دل شکنی نہیں کی۔ ان کے والد نے بھی بیٹے کی ہر خواہش کا

احترام کیا۔ ان کی خوشنودی اور دلجوئی کے لیے ان کی ہر بات مانی لیکن جب حالات نے انہیں اس موڑ پر لا کھڑا کیا جہاں ان کے لیے صرف مایوسی تھی تو انہیں ایسا سوچنا بھی چاہیے تھا۔ ایسا فیصلہ کرنا ہی چاہیے تھا۔ طلعت محمود، محمد رفیع، مکیش، جی ایم درانی، کشور کمار، خان مستانہ، سی ایم آتما اور منا ڈے کے ہم عصر تھے۔ اگر طلعت محمود آٹھ برس تک اداکاری کے چکر میں گلوکاری سے عدم دلچسپی کا ارتکاب نہ کرتے تو گلوکاری کے معاملے میں ان کی پوزیشن اپنے ہم عصروں کے مقابلے میں اتنی غیر مستحکم نہ ہوتی۔"

"تم نے جن گلوکاروں کو طلعت کا ہم عصر بتایا ہے۔ ان کے حوالے سے ایک دلچسپ واقعہ یاد آ رہا ہے۔ فلم "حقیقت" کے لیے موسیقار مدن موہن نے نغمہ نگار کیفی اعظمی کے ایک گیت کی کمپوزیشن کی جسے کورس کی شکل میں محمد رفیع، منا ڈے، طلعت محمود اور ایس بلبیر کی آوازوں میں ریکارڈ کروایا۔ کورس گانوں میں مختلف گانے والوں کی آوازیں ایسی گڈمڈ ہو جاتی ہیں کہ کسی خاص کی آواز کی شناخت مشکل ہو جاتی ہے مگر حقیقت کا وہ گیت جس کے بول تھے۔

ہو کے مجبور مجھے اس نے بھلایا ہوگا

میں تمام گلوکاروں میں طلعت محمود کی آواز صاف پہچانی جاتی ہے۔ یہ خوبی طلعت کی آواز کی تھی وہ سب سے الگ اور منفرد تھی۔"

"اسے تو عطیہ خداوندی ہی کہا جا سکتا ہے۔" سید صاحب نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

"منا ڈے کے ذکر پر منا ڈے کے ایک انٹرویو کی ایک بات یاد آ رہی ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں ہاں سناؤ وہ بات۔ یہ بات یقیناً اہم ہوگی۔ کیونکہ منا ڈے اور طلعت محمود کی دوستی بہت مشہور تھی۔" دادا جی جھٹ بول پڑے تھے۔

"منا ڈے نے اپنے ایک انٹرویو میں بتایا کہ بمبئی کے فوجی افسران کے کلب اور دیگر تقریبات میں جب میں اور طلعت اکٹھے شریک ہوتے تو طلعت کو مجھ سے پہلے گانے کی دعوت دی جاتی۔ مجھے کلاسیکل گلوکار ہونے کی وجہ سے سب سے آخر میں گانے کو کہا جاتا۔ اس موقع پر جو داد طلعت کو ملی ہوتی مجھے اس کا عشر عشیر بھی حاصل نہیں ہوتا۔ اس پر میں احتجاج کرتا کہ مجھ سے گوانا ہے تو میری باری طلعت سے پہلے رکھو تاکہ لوگ مجھے بھی سنیں۔ ورنہ ساری داد تو طلعت سمیٹ کر لے جاتا ہے۔"

میں دل ہوں اک ارمان بھرا
تو آ کے مجھے پہچان ذرا

موسیقار روشن نے نغمہ نگار ستیندر آتھیا کے لکھے ہوئے اس گیت کو طلعت محمود کی آواز میں فلم "انہونی" کے لیے ریکارڈ کیا تھا۔ اس نغمہ نگار کا نام پھر کسی گیت کے حوالے سے سننے میں نہیں آیا۔ یہ ایک دل آویز نغمہ ہے جسے سننے کے بعد اس کے بول ذہن میں گونجتے رہتے ہیں۔ روشن ہلکی پھلکی دھنیں بنانے کے بڑے ماہر موسیقار مانے جاتے تھے۔ یہ گیت طلعت محمود کے گائے ہوئے بہترین گیتوں میں شمار ہوتا ہے۔ ماضی کا یہ انمول گیت راجکپور پر فلمایا گیا تھا جو لوگوں کو ہمیشہ یاد رہے گا۔

دل کی دھڑکن پہ گا عمر بھر مسکرا
پیار کو جیت لے زندگی ہار جا

طلعت محمود نے یہ گیت فلم "لکیریں" کے لیے گایا تھا۔ اس کی دھنیں موسیقار حفیظ خان نے مرتب کی تھیں جبکہ گیت کے بول تنویر نامی شاعر نے لکھے تھے۔ حفیظ خان کا نام یا تو سید شوکت حسین رضوی کی مشہور فلم "زینت" کے حوالے سے سنا گیا تھا یا اس گیت کے حوالے سے سننے میں آیا۔ انہوں نے فلمی دنیا میں ایک طویل عرصہ گزارا مگر ان کے مقبول گیت چند ہی ہیں جن میں یہ گیت بھی شامل ہے۔ جبکہ نغمہ نگار تنویر کا نام بالکل نیا ہے لیکن اس نے یہ گیت لکھ کر اپنا نام بھی تاریخ میں رقم کروا لیا۔ جس فلم کا یہ گیت ہے وہ ایک ناکام فلم ثابت ہوئی تھی۔

"ہاں یہ درست ہے۔" دادا جی نے تائید کی۔ "طلعت محمود اپنی منفرد آواز اور غزل گائیکی کے مخصوص اسلوب کی وجہ سے اپنے تمام ہم عصروں میں سب سے نمایاں خصوصیات کا حامل گلوکار تسلیم کیا جاتا تھا۔ یہ صد فیصد درست ہے کہ اس کی آواز عطیہ خداوندی تھی۔ اسے شہنشاہ غزل کا خطاب یونہی نہیں دیا گیا تھا۔"

"مگر دادا جی۔ شہنشاہ غزل تو مہدی حسن کو کہا جاتا ہے۔"

"دونوں اپنے اپنے دور کے شہنشاہ غزل تھے۔"

سیموئیل بٹلر
Samuel Butler
(1835ء۔1902ء)

انگریز مصنف۔ دادا بھی پادری تھا اور باپ بھی۔ 1859ء میں نیوزی لینڈ چلا گیا جہاں بھیڑوں کی گلہ بانی کی بدولت رئیس بن گیا۔ اپنے رسائل میں اپنے فلسفیانہ مضامین چھپوائے۔ 1864ء میں واپس انگلستان آ کر اپنی زندگی مصوری، موسیقی، حیاتیات اور ادب کے لیے وقف کر دی۔ 1872ء میں سرتامس مور کی "یوٹوپیا" کے رنگ میں ایک تمثیلچہ Erewhon لکھا جس کا ماحول نیوزی لینڈ کا ہے۔ اس نے اپنے دوست ڈارون کے نظریہ ارتقا کی سخت مخالفت کی۔ وہ ارتقا کے بنیادی اصول کو تو قبول کرتا تھا لیکن ڈارون کی پیش کردہ تفسیر کو ماننے سے انکاری تھا۔

مرسلہ: بشیر حسین عابدی۔ جہلم

بٹیر Quail

تیتر کی قسم کا ایک ننھا سا پرندہ جو کھانے اور لڑانے کے کام آتا ہے۔ یہ پرندہ فصلی ہے جب گیہوں کے کھیت پکنے پر آتے ہیں تو آ موجود ہوتا ہے اور سردی کے موسم میں غائب ہو جاتا ہے۔ دریا کی وادیوں میں جہاں گھاس پھوس اور دانہ دنکا عام ہوتا ہے تمام سال جھاڑیوں میں چھپا رہتا ہے۔ میدانوں سے اس وقت بھاگ جاتا ہے جب اس کے چھپنے کے لیے بڑی بڑی فصلیں نہ ہوں۔ بٹیروں کو جال سے پکڑتے ہیں۔ بندوق سے شکار نہیں کرتے کیوں کہ یہ چھروں سے ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے۔ جو لوگ بٹیر پالنے کے شوقین ہیں ان کو بٹیر باز کہتے ہیں۔ وہ ان کی لڑائی پر بڑی بڑی شرطیں لگاتے ہیں۔ مغل حکومت کے دور زوال میں لکھنؤ میں بٹیر بازی کا عام رواج تھا۔ پاکستان میں پشاور، اٹک اور ملتان کے اضلاع کسی زمانے میں بٹیر بازی کے مرکز تھے۔

مرسلہ: ایاز راہی۔ مانسہرہ

طلعت نے اپنے کیریئر کا آغاز 1939/1940ء میں کیا تھا۔ جب کہ مہدی حسن 1955ء میں منظر عام پر آئے۔ ہم لوگ مہدی حسن اور طلعت محمود کا مقابلہ کرتے ہیں جو غلط ہے۔ جس طرح طلعت محمود کا کے ایل سہگل سے کوئی مقابلہ نہیں اسی طرح مہدی حسن کا طلعت سے کوئی جوڑ نہیں۔"

"طلعت محمود نے تو شاید......" میں نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "پاکستان میں بھی کچھ فلمی اور غیر فلمی نغمے گائے ہیں؟"

"شاید تمہیں یہ نئی بات ہے اس نے فلم "چراغ جلتا رہا" کے لیے 2 نغمے اور ایک سلام ریکارڈ کروایا۔" دادا جی نے میری بات کی تصدیق کر دی۔ "قصہ یوں ہے کہ طلعت محمود کے ایک بھائی اور دو بہنیں کراچی میں رہائش پذیر تھے۔ جن سے وہ ملنے پاکستان آتے رہتے تھے۔ 1962ء میں وہ پاکستان آئے تو فضل احمد کریم فضلی اپنی پہلی فلم "چراغ جلتا رہا" بنا رہے تھے۔ طلعت کی موجودگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے انہوں نے اپنی فلم کے لیے گانے کی درخواست کی۔ طلعت نے انکار نہیں کیا۔ اسی موقع پر ریڈیو والوں نے بھی طلعت سے غیر فلمی گیت اور غزلیں بھی ریکارڈ کروائیں۔"

"مجموعی طور پر وہ اچھے ہی آدمی تھے۔" سید صاحب بولے۔ "ہر ایک کی خواہشوں کا احترام کرنا بھی ایک اچھائی ہے۔ وہ چاہتے تو پاکستانی فلم میں گانے سے انکار بھی کر سکتے تھے کیوں کہ ان دنوں پاکستانی فلموں کا معیار بہت پست تھا۔"

دادا جی بولے۔ "ہاں اپنی کچھ کمزوریوں کے باوجود وہ ایک اچھا انسان تھا جب کہ اس کی اچھی گلوکاری نے اسے اور اچھا بنا دیا ہے۔ دیکھو اسے ہم سے جدا ہوئے کوئی 17 برس بیت گئے ہیں مگر ہم اسے بھولے نہیں۔ جب تک اس کی آواز کانوں میں شہد ٹپکاتی رہے گی۔ وہ زندہ و تابندہ رہے گا۔"

"دادا جی!" میں نے انہیں مخاطب کیا۔ "اگر آپ اجازت دیں تو اس موقع کی مناسبت سے اپنا ایک شعر سناؤں۔"

"ارے ہاں بھئی ضرور سناؤ۔"

اس سے پہلے کہ مرجاؤ کچھ ایسے کام بھی کر جاؤ
اندھیر دل کے تر جاؤ [illegible]

سفرِ امریکا

علیم شاہد

سفر وسیلہ ظفر کہلاتا ہے مگر اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ سفر تجربے کی دولت سے بھی مالا مال کرتا ہے۔ علیم شاہد کا تعلق قلم قبیلے سے ہے اس لیے انہوں نے اس سفر کو ایک نئے زاویے سے احاطہ تحریر میں لایا ہے۔ اس سفر نامے میں آپ کو امریکا ایک نئے انداز میں سامنے آتا محسوس ہوگا۔

میرے بیٹے فیصل نے 1989ء میں کراچی سے O-Level کیا اور اسی سال لندن چلا گیا۔ وہاں کامیابی سے A-Level کلیئر کیا۔ لندن کے قیام کے دوران اسلم کے دوست سعید فیصل کا اسے تعاون حاصل رہا۔ سوئٹزرلینڈ میں میرے دوست جو حبیب بینک اے جی زیورخ میں اعلیٰ عہدے پر فائز ہیں۔ انہوں نے بھی فیصل کا بہت خیال رکھا۔ حاتم حسین کی کوشش سے فیصل کو لندن سے امریکا کا ویزا ملا۔ فیصل کے دوست خورشید نے اسی سال نمو چشائر

یونیورسٹی جوائن کی تھی اس نے فیصل کے لیے داخلہ کا
بندوبست کیا اور 1990ء میں فیصل نیو ہمپشائر یونیورسٹی
بوسٹن پہنچ گیا۔ بہت محنت سے دل لگا کر پڑھا گریجویشن کیا۔
ماسٹرز مکمل کرنے سے پہلے یہ اپنے دوست اظفر کے پاس
لاس ویگاس آ گئے اور لاس ویگاس میں مشہور Aone
Vac & Seuing میں سروس کرلی۔ A1 کی ایک
شاخ ہیورڈ میں تھی لہٰذا اس کے انچارج بن کر ہیورڈ سان
فرانسسکو منتقل ہو گئے۔ کاروباری صلاحیت موروثی تھی
کامیابی سے اسٹور چلایا مارکیٹ میں ریپوٹیشن قائم کی اور
1997ء میں Aone Vaccume کی ہیورڈ برانچ
خرید لی۔ امریکا میں رہ کر یہ بہت مشکل فیصلہ تھا لیکن اللہ کی
مدد ہر حال میں شامل حال رہی۔ اسلم اور مالک نے سرپرستی
کا حق ادا کر دیا۔ آج فیصل ایک کامیاب بزنس مین ہے
Tax Payer ہے۔ الحمد للہ مارکیٹ میں ریپوٹیشن
ہے۔ امریکن نیشنل ہے۔ میری بہو راحت کے پاس بھی
کینیڈا کی نیشنلٹی اور امریکا کا گرین کارڈ ہے دونوں اللہ کی
مہربانی سے بہت خوش و خرم زندگی گزار رہے ہیں۔ اللہ سے
دعا ہے کہ ہر قدم پر کامیاب رہیں اور رزق حلال میں برکت
ہو۔ پچھلی مرتبہ ہم گئے تھے تو وہ الامیڈا میں رہ رہے تھے اب
نیشا بہترین بستی ڈبلن میں مکان لیا ہے جو بڑا ہے خوب صورت
ہے باسہولت ہے لہٰذا مکان تبدیل کرتے ہی ان کی یہ
خواہش تھی بلکہ ضد تھی کہ ہم امریکا جائیں اور ساتھ رہیں۔
ہمارے پاس ملٹی پل ویزا موجود تھا لہٰذا 18 اکتوبر 2010ء
میں امریکا کے لیے روانہ ہو گئے۔

کراچی سے ہم ایمریٹس کی شاندار فلائیٹ میں سوار
ہوئے اور تھوڑے ہی وقت میں دبئی انٹرنیشنل ایئرپورٹ پر
اتر گئے۔ دبئی جو عرصہ دراز سے خریداروں کی جنت شمار ہوتی
ہے اس کا ایئرپورٹ بھی اسی کے شایان شان ہے۔ اتنی
بڑی اتنی خوب صورت اتنی جدید اور روشن duty
free market شاید دنیا کے کسی ایئرپورٹ پر نہ ہو۔
بہرحال ٹرانسٹ لاؤنج پہنچے۔ باتھ روم سے فریش ہو کر
آئے۔ چائے پی تھی کہ اگلی فلائٹ کا وقت قریب آ گیا۔
ایئرپورٹ شٹل میں بیٹھے گیٹ پر پہنچے۔ سان فرانسسکو کے
لیے جہاز میں سوار ہو گئے۔ یہ فلائٹ جتنی آرام دہ تھی اس
سے بہت زیادہ صبر آزما اور تھکا دینے والی تھی۔ 16 گھنٹے
نان اسٹاپ جہاز میں گزارنے کے دوران اچھے اچھے فیشن
ایبل، قابل اور تجربہ کار مسافروں کا پتا پانی ہو جاتا ہے۔
دوران پرواز جہاز کے عملے نے ہر وجہ سہولتیں بڑی محبت
سے فراوانی سے اور اخلاق سے مہیا کیں تاکہ مسافروں کی
زیادہ سے زیادہ دل بستگی ہو سکے۔ اللہ اللہ کر کے جہاز سان
فرانسسکو ایئرپورٹ پر اتر گیا۔ سان فرانسسکو امریکا کے
صوبے کیلی فورنیا کے مغرب میں پیسفک اوشن کے کنارے
آباد ایک خوب صورت شہر ہے۔ جنوب میں لاس اینجلس
اور سان ڈیاگو جیسے عظیم شہر ہیں۔ سان فرانسسکو کے تین
طرف پانی ہے۔ مغرب میں ٹھاٹھیں مارتا ہوا بحر ہے جو
ہزاروں میل دور جاپان تک گیا ہوا ہے۔ مشرق میں اس کا
چھوٹا سا حصہ ایسٹ بے اوشن کہلاتا ہے۔

سان فرانسسکو کو ایسٹ کے علاقے سے اس کے عظیم
الشان، خوب صورت، دنیا کے طویل ترین اور مضبوط ترین
پل ملاتے ہیں۔ سان فرانسسکو کی خوب صورتی ان پلوں اور
خوش گوار موسم کی وجہ سے مشہور ہے ان پلوں سے روزانہ
لاکھوں لوگ ایسٹ کے دور دراز علاقوں سے آتے جاتے
ہیں۔

سان فرانسسکو کے شمال میں دنیا کا حیرت انگیز
گولڈن گیٹ برج واقع ہے جو اس شہر کو شمالی کاؤنٹیوں سے
ملاتا ہے پھر اوک لینڈ بے برج ہے۔ سان ماٹیو برج ہے۔
ڈمبرٹن برج ہے۔ ہر برج کی اپنی اپنی خصوصیات ہیں۔ ہر
برج پر دن رات لاکھوں گاڑیوں کی آمد و رفت بھی حیرت
کے دروازے کھول دیتی ہے۔ بہرحال ہم سان فرانسسکو
ایئرپورٹ پر اتر گئے۔

سان فرانسسکو ایئرپورٹ: امریکا بلکہ دنیا کے بہترین
ایئرپورٹس میں ممتاز مقام رکھتا ہے۔ یہ ایئرپورٹ شہر کے
جنوب میں پیسفک اوشن کے کنارے ایک وسیع و عریض
علاقے پر قائم ہے۔ ایئرپورٹ کی بلڈنگ بہت بڑی، بہت
سادہ اور بہت زیادہ جدید سہولتوں سے آراستہ پیراستہ ہے۔
بلڈنگ کی دوسری منزل پر بے ایریا ریپڈ ٹرانسپورٹ ریلوے
اسٹیشن ہے جہاں سے ہر 15 منٹ بعد سان فرانسسکو کے
ہر اسٹیشن اور ایسٹ بے ایریا کے مجموعی 44 اسٹیشنوں کے
لیے نہایت آرام دہ ٹرینیں بہت مناسب رعایتی ٹکٹوں پر
دستیاب ہیں۔ کوئی بھی مسافر امیگریشن سے فارغ ہو کر
ایسکیلیٹر یا لفٹ کے ذریعے اسٹیشن پر جائے۔ ٹرین پکڑے
اور بڑی آسانی سے 70-80 میل تک کی اپنی منزل مقصود
پر پہنچ جائے۔

ہم امیگریشن سے بہت جلد فارغ ہوگئے۔ باہر

اسماعیل لاؤنج میں آ گئے۔ فیصل، راحت، عتیق، سعدیہ اور بچے استقبال کے لیے موجود تھے۔ بچوں سے گلے مل کر دل باغ باغ ہو گیا۔ روح میں تازگی آ گئی۔ تھکن دور ہو گئی۔

گاڑیوں میں بیٹھے۔ جنوب میں واقع برج سان ماتیو سے ہوتے ہوئے ہیورڈ شہر پہنچ گئے۔ یہ پل پانی پر آٹھ میل سفر کرتا ہے۔ ہیورڈ میں ڈیکوٹو بلیوارڈ مشہور سڑک کے کنارے وکٹن کمپلیکس میں فیصل کا Aone Vaccume اسٹور ہے۔ آگے مشرق کی جانب کیسٹرو ویلی ہے۔ کیسٹرو ویلی ایک خوب صورت وادی کا شہر ہے اس کے بعد ڈبلن کی سرسبز پہاڑیاں شروع ہو جاتی ہیں۔ تقریباً دس میل تک ان پہاڑیوں کی درمیانی سڑک پر گاڑی سفر کرتی ہے اور ہم ڈبلن شہر میں داخل ہوتے ہیں۔ یہ شہر نیا، کشادہ، صاف ستھرا اور پُرسکون ہے اس کی مشہور سڑکیں Tasahara اور Gleason اور Tasahara کے درمیان Creek View medaws کی بستی ہے جس میں نفیس مکانات اور خوب صورت گلیاں ہیں۔ یہ خالص ریزیڈنشل علاقہ ہے اس کے سان وسانتے لوپ کے کنارے کارنر کا مکان فیصل کا ہے۔ مکان میں داخل ہوتے سخت تھکن کے باوجود آنکھوں میں روشنی اور دل میں سکون آ گیا۔ نیچے ڈرائنگ روم، ڈائننگ لاؤنج، لیونگ، کچن، گیسٹ روم، باتھ روم ہے۔ کچن کے پیچھے بیک یارڈ یعنی کھلا صحن ہے جس کے کنارے کیاری میں پودے اور پھول لگے ہیں۔ اوپر تین بیڈ روم، باتھ روم اور وارڈ روب ہے۔ ہم اپنے کمرے میں پہنچے۔ کچھ دیر آرام کیا۔ نہائے دھوئے کھانا کھایا۔ اللہ کا شکر ادا کیا اور سو گئے۔ مجھے صبح واک کرنے کی عادت ہے میں صبح اٹھا۔ اکتوبر کی ہلکی ٹھنڈک تھی۔ باہر نکلا مکان کے پیچھے ہی گلیسن (Gleason) پر ایکڑ گلیسن پارک ہے۔ وہاں ٹہلنے ورزش کرنے اور تازہ ہوا کھانے چلا گیا۔ پارک کے پیچھے گلیسن کے متوازی Park Way سڑک ہے۔ سڑک کے کنارے بہت عمدہ 2 منزلہ Appartment ہیں جن کے ساتھ ہی مال ہے جس میں چھوٹے چھوٹے ریستوران، کافی ہاؤسز اور سیف وے کا مشہور اسٹور ہے۔ تھوڑا آگے جائیں تو ڈبلن بولیوارڈ کی بڑی سڑک، ڈاؤن ٹاؤن، کمرشل ایریا اور ہارٹ اسٹیشن آ جاتا ہے۔ یہاں مارکیٹ کا علاقہ بہت وسیع اور بہت خوب صورت ہے یہاں Cenema ہے۔ آس پاس کافی شاپس ہیں۔ آئس کریم کی دکانیں ہیں۔ چھوٹے چھوٹے ریستوران ہیں اور اچھے خاصے ڈیپارٹمنٹل اسٹورز ہیں جن میں Pier one Imports, P.J.Max, Mountain, Old nany, Best Buy, Bables R us, Bed Bath & Ultha casmetic کے مشہور اسٹور ہیں جن میں ملبوسات، کراکری، کچن ویئر، بیڈ روم کا سامان، سامان فیشن، میک اپ کا سامان، الیکٹرونک کا سامان، فوڈ، جوس، بسکٹ، چاکلیٹ، فرنیچر، کھلونے غرض دنیا بھر کی عمدہ سے عمدہ چیزیں اچھی بے تحاشا اقسام سے بھری پڑی ہیں۔ ہر سیزن میں ہر تہوار میں نئی سے نئی چیزیں روشناس کرائی جاتی ہیں اور وہی

سامان آدھی قیمت پر ملنا شروع ہو جاتا ہے۔ خریدار پہلے تو ضرورت کے لیے خریداری کرتا ہے اور پھر خریداری کے لیے ضرورت پیدا کرتا ہے۔

یہاں لوگوں کو مجبور کر دیا جاتا ہے کہ وہ ضروریات زندگی کے لیے محنت نہ کریں بلکہ نئی سے نئی چیزوں کو نئے سے نئے فیشن ڈیزائن سے نئی سہولت کو حاصل کرنے کے شوق کو پورا کریں۔ زندگی میں رنگ بھرنے کے لیے محنت کریں اور آرام و آسائش کی زندگی گزاریں۔

کریڈٹ کارڈ کی سہولت ہر شخص کو میسر ہے جو کچھ بھی خریدنا ہے ادھار خرید لو اور ساری عمر کماتے رہو اور جمع کراتے رہو۔

بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

☆.....☆

آج اتوار ہے صبح دیر سے واکنگ کے لیے باہر نکلا تو سردی تھی اور بارش ہو رہی تھی۔ واپس گھر میں داخل ہوا۔ فیصل نے چھتری دی اور میں ایمرالڈ گلین پارک کی طرف چل پڑا۔ راستے میں بارش تیز ہوتی رہی اور پارک میں واکنگ کے عادی آتے رہے۔ میں بھی واک کرتا ہوا واپس گھر آ گیا۔ حسب معمول ناشتا کیا۔ دوپہر کو فیصل اور شگفتہ کے ہمراہ ہم موسم کو انجوائے کرنے نکل پڑے۔ سردی کی بارش گہرے کالے بادل، سرسبز وادیوں میں عجب رنگ دکھا رہے تھے۔ ہم بے برج میں داخل ہوئے اور ٹریژر آئی لینڈ یعنی یربا بونا جزیرہ میں پہنچ گئے۔ یہ جزیرہ سان فرانسسکو اور اوک لینڈ کے درمیان واقع ہے۔ بے برج اوک لینڈ سے یربا بونا تک اور یربا بونا سے سان فرانسسکو تک جاتا ہے۔ اس پل کے مشرقی حصے میں 1500 فیٹ کا نئی لیور برج اور دو عدد 510 فٹ کے سسپنشنز ہیں۔ یہ پل دو منزلہ ہے تیسری منزل بصورت اندرونی ٹیوب کی صورت میں ہے۔ یہ پل جو اوک لینڈ سے ٹریژر آئی لینڈ تک آتی ہے یہاں سے بورنگ کے ذریعے نکال کر پھر پانی میں سان فرانسسکو تک لے جائی گئی ہے۔ یہ دنیا کی سب سے لمبی بورنگ پل کہلاتی ہے۔ ہم آئی لینڈ میں داخل ہوئے۔ یہ چھوٹا سا، سادہ سا آئی لینڈ ہے جس میں نیوی بیس، کالج اور نیوی کے رہائشی مکانات ہیں۔ دفاتر اور بہت خوب صورت منظر ہے۔ ہم کچھ دیر گھومتے رہے اور پھر سان فرانسسکو شہر کی اونچی نیچی گلیوں، عمارتوں، پہاڑیوں اور پہاڑی سبزوں کے جنگل میں کھو گئے۔ بارش تھم گئی تھی لیکن سردی اور اندھیرا شروع ہو گیا تھا۔ موسم شاندار تھا۔ مختلف علاقوں سے گزرتا ہوا میں Twin Pics پر لے گیا۔ یہ اونچائی پر دو پہاڑوں کی چوٹیاں ہیں۔ یہاں سردی زیادہ تھی اور ہم تقریباً 950 فٹ کی بلندی پر تھے جہاں سے مشرق کی طرف بے برج ڈاؤن ٹاؤن شہر کی روشنیاں اتنی تیز نظر آ رہی تھیں کہ میلوں میل تک شہر بقعہ نور بنا ہوا، سجی ہوئی دلہن کے روپ میں نظر آ رہا تھا۔ اس حسن و رعنائی میں آنکھیں خیرہ ہوئی جا رہی تھیں۔ شمال کی جانب گولڈن گیٹ برج اس کے آس پاس اور اس کے آگے کا علاقہ سوسالیٹو تک جگمگا رہا تھا۔ بارش کے بعد ہواؤں نے سردی بڑھا دی تھی۔ درجہ حرارت گر رہا تھا۔ لہٰذا بادل نخواستہ ان دل کش، دل آویز اور دل فریب مناظر کو چھوڑنا پڑا۔ ہم نیچے اترے اور سان فرانسسکو کے بازاروں میں گھومنے لگے۔ سان فرانسسکو ایک عجیب و غریب شہر ہے یہاں ایشیا کے لوگ، یورپ کے لوگ، جنوبی امریکا اور افریقا کے لوگ، آسٹریلیا نیوزی لینڈ کے لوگ، گورے، کالے، چپٹے براؤن، لمبے چوڑے، پست قد، خوب صورت، قبول صورت، بدصورت لوگ بستے ہیں۔ شاید دنیا کے کسی ملک کسی شہر میں اتنے مختلف رنگ و نسل کے لوگ نہیں رہتے۔ بلکہ امریکا میں یہ شرف صرف اس شہر کو حاصل ہے جہاں اتنی قوموں کے لوگ باہم مل جل کر بڑے امن اور آشتی سے رہتے ہیں۔

یہاں Multi Cultural لوگ رہتے ہیں۔

یہاں کے لوگ ہر رنگ و نسل اور ہر مذہب سے تعلق رکھتے ہیں۔ آزاد خیال، جدید فیشن کے دل دادہ بھی ہیں اور قدامت پرست Orthodox بھی ہیں۔ یہاں یونیورسٹیوں میں پڑھتے ہوئے دنیا بھر کے طالب علم، پروفیسرز اور دانش ور بھی ہیں۔ دنیا بھر سے آئے ہوئے سیاح بھی بڑی آزادی سے یہاں کے گلی کوچوں میں گھومتے پھرتے کھاتے پیتے اور خوشیاں سمیٹتے نظر آتے ہیں۔ دنیا بھر سے روزگار کی تلاش میں لوگ یہاں آتے ہیں۔ کوشش کر کے ورک پرمٹ حاصل کرتے ہیں۔ یہاں کے ہو جاتے ہیں، سٹیزن بن جاتے ہیں۔ یہاں ہر شعبے میں ایک اصول ہے، ضابطہ ہے اور میرٹ ہے۔ یہاں زندگی گزارنے کے بنیادی اصولوں پر سب کو اتفاق ہے۔ یہاں کے قانون کو قبول کرنا اور اس پر کاربند رہنا یہاں رہنے والے ملکی غیر ملکی پر یکساں فرض ہے۔ یہاں دنیا کی بہترین یونیورسٹیاں

موجود ہیں جن میں تعلیم حاصل کرنے دنیا کے ہر ملک سے طالب علم آتے ہیں جن کی بڑی تعداد یہاں گرین کارڈ حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ بعد از تعلیم یہاں سروس اور کاروبار کو ترجیح دیتی ہے۔ اس کے علاوہ روزگار کی تلاش میں ساری دنیا سے لوگ کسی نہ کسی طرح ویزا حاصل کر کے پہنچتے ہیں۔ ان کی کوشش اور جدوجہد انہیں ورک پرمٹ، گرین کارڈ اور روزگار دلا ہی دیتی ہے۔ یہاں دنیا بھر کے لوگوں کو سیاسی پناہ بھی مل جاتی ہے۔ امریکا بہت بڑا ملک ہے قدرتی نعمتوں اور وسائل سے مالا مال ہے۔ یہاں محنتی، قابل لوگوں کی ہر وقت ضرورت رہتی ہے۔ غیر ملکیوں کے لیے انہوں نے قوانین بنا رکھے ہیں۔ یہاں آنے والوں کو اس بات کا اس تعلیم کا اس تربیت کا موقع فراہم کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو یہاں کی زندگی اور ماحول میں ڈھال سکیں اور اچھے شہری ثابت کر سکیں۔

قابل لوگوں کو یہاں تعلیم ملتی ہے۔ روزگار ملتا ہے اور آہستہ آہستہ یہاں کی شہریت بھی مل جاتی ہے۔ یہاں کی شہریت دنیا کی ہر قوم ہر نسل ہر مذہب اور ہر ملک کے لوگوں کے پاس ہے اور وہ صرف امریکن ہیں اور امریکا سے پیار کرتے ہیں۔ امریکا سب کو برابری سے حقوق دیتا ہے۔ برابر کا انصاف دیتا ہے۔ دنیا کے کسی ملک کا امریکی شہری امریکا کے لیے قابل اعتماد ہوتا ہے۔ اسے زندگی کے ہر شعبے میں رسائی حاصل ہے۔ یہاں کے لوگ ایک دوسرے پر اعتماد کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ خاموشی سے اپنے کام میں منہمک رہتے۔ دوسرے کے کاموں میں دخل نہ دینا، مل جل کر امن آشتی اور خوشی سے رہنا یہاں کا وصف ہے۔

ہم سان فرانسسکو کے مشہور بازاروں سے گزر رہے ہیں جن میں چینیوں کے خوب صورت اسٹور ہیں جو چینی سامان سے بھرے پڑے ہیں۔ ساتھ میں چینی تہذیب اور کلچر کا مظاہرہ بھی کر رہے ہیں۔ یہاں کے میکسیکن ریسٹورنٹ مشہور ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم میکسیکو کی گلی میں آگئے ہیں۔ یہاں کی سڑک پر جاپانی دکانوں کی کثرت ہے۔ کوئی اسٹریٹ جاپانی بازار ہے۔ کہیں تائیوان کہیں ویت نام کا کلچر نظر آتا ہے۔ یہاں ہر مذہب و ملت کی قومیں آباد ہیں۔ ہر قوم کو پوری مذہبی آزادی ہے۔ یہاں بے شمار چرچ ہیں۔ مسجدیں ہیں۔ سناگوگ ہیں۔ معبد خانے۔ عبادت خانے۔ جماعت خانے ہیں۔ لوگوں کو اجازت ہے کہ وہ اپنے مذہب اپنے عقیدے کے مطابق عبادت کریں لیکن عبادت خانے میں یا گھر کے اندر گھر سے باہر سب کا ایک مذہب اور ایک عقیدہ ہے یعنی امن اور احترام۔ یہاں ہر قوم اپنے تہوار مناتی ہے۔ اپنے مخصوص بازاروں اور اسٹوروں کو اپنی روایت، رسومات کے مطابق سجاتی ہے اور اپنے کلچر اور روایات کا بھرپور مظاہرہ کرتی ہے

جاندار طبقہ

حیوانات کی کل دنیا کو جاندار کہتے ہیں لیکن سائنس کی جدید تحقیقات کے مطابق اب نباتات کو بھی جانداروں میں شامل کیا جانے لگا ہے۔ اس جاندار طبقے میں کئی قسم کے درجے ہیں اور ان درجوں میں بھی جانوروں کی کئی اصناف شامل ہیں۔ بڑے بڑے درجے یہ ہیں۔ اول: امیبا کی قسم کے نہایت سادہ اور مختصر جانور، مونگے کے کیڑے بھی انہی میں شامل ہیں۔ دوم: کرم یا گینڈوے کی قسم کے بغیر ہڈی کے جانور۔ سوم: کیڑے مکوڑے جن میں اندرونی ہڈیوں کی جگہ بیرونی ڈھال سی ہوتی ہے جو ڈھانچے کو قائم رکھتی ہے۔ چہارم: مسوتیا جانور، جو لعاب کی طرح کے جسم رکھتے ہیں اور سیپیوں میں رہتے ہیں۔ سیپی دراصل جانور کا بیرونی پنجر ہوتا ہے اور اندرونی جسم کی حفاظت کرتا ہے۔ پنجم: ستارہ مچھلی کی قسم کے جانور یہ بھی گھونگوں اور سیپیوں میں رہتے ہیں۔ ششم: ریڑھ کی ہڈی والے جانور جن کی مزید پانچ اقسام ہیں۔ (1) مچھلی کی قسم کے آبی جانور (2) مینڈک کی قسم کے جانور (3) سانپ، گرگٹ اور کچھوے کی قسم کے رینگنے والے جانور (4) فضا میں اڑنے والے جانور یعنی پرندے ان میں نہ اڑنے والے پردار جانور بھی شامل ہیں۔ یہ سب کے سب انڈے دیتے اور بچوں کو چوگے سے پالتے ہیں (5) چمگادڑ کی قسم کے دودھ پلانے والے پرندے۔ ہفتم: نباتات، جن میں درخت اور پودے شامل ہیں۔ درخت عمر میں انسان کی عمر طبعی سے کئی گنا بڑے ہوتے ہیں اور پودے عموماً چھ ماہ، سال دو سال کے بعد فنا ہو جاتے ہیں۔

مرسلہ: اصغر حسین کاشغری۔ گلگت

اور خوشیاں مناتی ہے۔ اس طرح نیشنل، چینی گجرز شہر میں دن رات لوگ گھومتے پھرتے رہتے ہیں۔ یہاں سیاحوں کی دل بستگی کا ہر سامان مہیا ہے۔ یہاں کی تفریح گاہوں کا بڑا حصہ نائٹ کلبوں، شراب خانوں، جوئے خانوں اور ہر قسم کے کلبوں پر مشتمل ہے۔ جہاں دل لگی، دل بستگی کے خوب صورت، حیرت ناک، شرمناک، بندوبست اور مظاہرے ہوتے ہیں۔ نوخیز جوانیوں کے سودے ہوتے ہیں۔ لیکن کسی کو کسی پر زبردستی کرنے حکم چلانے کی اجازت نہیں ہے۔ کسی

جگہ شور کرنے، جھگڑا کرنے اور امن عامہ کو خراب کرنے کی ہمت ان سورماؤں کو بھی نہیں ہے جن کے نام سے ان کے ملک کے لوگ کانپتے ہیں۔

☆......☆

سان فرانسسکو اپنے موسم، پلوں، میوزیم پچر کی وجہ سے مشہور ہے یہی وجہ ہے کہ اس خطے میں پورے مہینے سیاح کی آمد ورفت چہل پہل اور رونق لگی رہتی ہے اور پورا شہر میلہ و نمائش کی طرح سجا رہتا ہے۔ شہر بھر میں پھیلے ہوئے اسٹور بھی اپنی مثال آپ ہیں جن میں شوق کی، ضرورت کی، فیشن کی نت نئی چیزیں روشناس اور فروخت کی جاتی ہیں۔ سیاحوں کے لیے اسٹوروں میں جانا، نئی سے نئی چیزوں سے آگاہی حاصل کرنا اور ضرورت و فیشن کے لیے خریداری کرنا بھی سیاحت کا لازمی جز بن گیا ہے۔ پوری پوری فیملیاں بچوں کے ہمراہ اس طرح آتی ہیں۔ جیسے پکنک منانے آئی ہیں دنیا کی ہر چیز ایک چھت کے نیچے مہیا ہے۔ لہٰذا لوگ جی بھر کے کپڑے، کراکری، جوتے، کھلونے، کاسمٹک، نانیاں، کچن اور الیکٹرونک کا سامان خریداری کرتے اور چلے جاتے ہیں۔ یہاں ہر چھوٹے بڑے علاقوں میں ہر قسم کے اسٹور ہیں جو ضروریات زندگی کی چیزوں سے وافر مقدار میں بھرے پڑے ہیں۔ آپ کو جس چیز کی ضرورت ہو متعلقہ اسٹور میں چلے جائیں وہ چیز آپ کو اپنی لاتعداد اقسام کے ساتھ مل جائے گی۔ میں فیصل کے سیلز مین کارلوس کے ہمراہ انڈسٹریل اسٹور گیا۔ وہاں چھوٹی بڑی مشینوں، ان کے پرزوں اور ٹولز کے انبار لگے ہوئے دیکھے۔ خاص بات یہ دیکھی کہ انہوں نے بجلی سے چلنے والی چیزوں کے لیے بیٹری سسٹم کا Net work اتنی جگہ پر قائم کر دیا ہے۔ ہر انسٹرومنٹ کو چلانے اور رواں رکھنے کے لیے اس کی ضرورت اور طاقت کے مطابق بیٹری موجود ہے جسے با آسانی چارج کیا جا سکتا ہے۔ کسی بھی علاقے میں جو کشادہ ہو، تنگ ہو وہاں بجلی موجود ہو نہ ہو، یہ بیٹریاں لے جائی جا سکتی ہیں۔ یہ اپنا کام کرتی ہیں۔ بہت سارے چھوٹے موٹے کارخانے انہیں بیٹریوں کے مرہون منت ہیں۔ آپ کی مضبوط دیوار ہے تو 1-2 انچ کا سوراخ ڈرل سے کر سکتے ہیں صرف بیٹری کا بٹن دبانا پڑے گا۔ میں ہزار ہا چھوٹی بڑی بیٹریوں کو دیکھ رہا تھا۔ مجھے ان میں بڑی دلچسپی ہوئی۔ میں کچھ ٹولز اپنے کارخانے کے لیے بمعہ بیٹریوں کے خریدنا چاہتا تھا۔ چونکہ یہ بیٹریاں 11V0 پر چارج ہوتی تھیں اور

ہمارے ملک میں یہ سہولت نہیں ہے۔ لہٰذا میں نہ خرید سکا۔

فیصل نے بیک یارڈ میں لگی کیاریوں کو صاف کرایا اور کچھ پھول پودے لینے مجھے نرسری کے اسٹور میں لے گیا۔ یہ ایک ایگریکلچرل اسٹور تھا لیکن جسامت ایک چھوٹے سے باغ کے برابر تھی جس میں ہزاروں قسم کے ڈھکوں پھول پودوں کے ہر سائز کے گملے مہیا تھے۔ ہر قسم کے پھل پھول، سبزیاں، ترکاریاں پودوں کی شکل میں ان گملوں میں موجود تھیں اور جہازی سائز کے تصویری کیٹلاگ بھی تھے۔ آپ کیٹلاگ میں سے پودا، پھول، بیج پسند کرلیں وہ آپ کو مہیا کردیں گے۔ پودا مقامی ہو یا امپورٹڈ ہو۔ Cactus ہو Caroten ہو گلاب ہو کہ چنبیلی ہو، انار ہو کہ انناس ہو، ناریل ہو کہ چیکو ہو۔ فیصل سوچ میں پڑ گیا کہ کیا خریدے کیا چھوڑے۔ یہ کیفیت یہاں کے ہر اسٹور کی ہے۔ میڈیکل اسٹور میں سر درد کی گولی لینے جاؤ تو ہزاروں قسم کی دنیا کے بیشتر ممالک کی سر درد کی گولیاں دیکھ کر سر کا درد بڑھ جائے گا۔

میں Office Max کے اسٹور میں بھی گیا یہاں اسٹیشنری کے سامان کا دریا بہتا ہے۔ جس میں بچوں کے لیے لنچ باکس، اسکول بیگز، واٹر بوتلز، سیکڑوں قسم کے ربڑ پنسل، کلر باکس، شارپنرز، کاپیاں، ڈائریاں۔ بڑوں کے لیے کیلکولیٹرز، ڈائریز، نفیس قسم کے کارڈ ہولڈرز، قیمتی پین ہولڈرز، کاپیرز، کمپیوٹرز، لیپ ٹاپس، آفس بیگز، پاؤچ، ڈوکیومنٹ کیسز، عمدہ پین سیٹ۔ مجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ اسٹیشنری کا اسٹور ہے یا فینسی گفٹ شاپ ہے۔ میں نے بھی یہاں سے چند ڈائریاں خریدیں جو کسی طرح گفٹ آئٹم سے کم نہیں تھیں اور گھر آگیا۔

جاری ہے

احسان

صالحہ اقبال

جنگ عظیم دوم عروج پر تھی۔ اتحادی افواج جرمن و جاپانی افواج کا راستہ روکنے کے لیے ہر ممکن کوشش کررہی تھی۔ وہ ایک پائلٹ تھا اسے اطلاع ملی کہ افریقا کے گھنے جنگل میں جاپانی مستقر بنا رہے ہیں اس نے بمباری کے لیے اڑان بھری مگر راستے ہی میں جاپانی ہوائی بیڑے نے اسے نشانہ بنا دیا۔ جہاز تباہ ہونے سے قبل وہ چھاتا لگا کر کود گیا۔ انتہائی گھنے جنگل میں جہاں خونخوار درندے بھی تھے اور حشرات الارض بھی۔ دشمن بھی اسے ڈھونڈ رہا تھا ایسے وقت میں وہ ایک ایسے قبیلے میں جا پہنچا جو تہذیب سے بھی نابلد تھے مگر ان میں انسانیت تھی انہوں نے اسے محفوظ رکھنے کی مثال پیش کی۔ ان کی اس قربانی کا بدلہ اس پائلٹ نے کس طرح دیاکہ ایک نئی تاریخ رقم ہو گئی

یہ ایک خاموش جزیرہ ہے۔ ساحل پر چپ کی دھند چھائی ہے۔ نیل بوٹوں سے ڈھکے پہاڑوں پر اجنبیت کا بسیرا ہے۔ پنچھیوں کی چہک میں پُراسراریت گھلی ہے اور وہاں کے باسیوں کو دیکھ کر لگتا ہے جیسے وقت کا پہیہ صدیوں قبل ٹھہر گیا ہو۔

یہ غوگی جزائر پر مشتمل ریاست ہے۔ بحرالکاہل کے پانیوں میں پھیلے خشکی کے ان ٹکڑوں میں غوبرٹن نامی ایک وسیع و عریض جزیرہ بھی ہے۔ یہ اسی جزیرے کے ایک پُرسکون

سیاحل کا تذکرہ ہے، جہاں اس روز ایک عجیب سرگرمی جاری تھی۔ ایسی سرگرمی جو ماحول سے لگا نہیں کھاتی تھی۔

جنگل کے کنارے ایک اونچے ٹیلے پر ایک سفید فام شخص کھڑا تھا۔ فریڈ ہارگ شیمر نامی اس پرجوش آدمی کا تعلق خوابوں کی سرزمین امریکا سے تھا۔ وہ ایک تاجر تھا۔

بلند قامت درختوں اور قدیم پہاڑوں کے درمیان اُس کی موجودگی کچھ عجیب معلوم ہوتی تھی مگر اس سے بھی عجیب تھے اس کے سامع۔

ان کی تعداد ایک ہزار کے لگ بھگ تھی۔ ہاتھوں میں نیزے اور چاقو۔ سیاہ چہروں پر راکھ ملی ہوئی تھی اور گلے میں ہڈیوں سے بنی مالائیں لٹک رہی تھیں۔ وہ اس جزیرے کے قدیم ترین قبائل میں سے ایک تھے جنہیں سیارۂ زمین پر آنے والی ہمہ گیر تبدیلیاں چھو کر بھی نہیں گزری تھیں۔ جدید ٹیکنالوجی اُن سے کوسوں دور تھی۔

اور پتھر کے دور کے یہ انسان جنہیں دیکھ کر دلوں پر ہیبت طاری ہو جائے... سر جھکائے فریڈ کو سن رہے تھے۔

جنگل میں فریڈ کی جوشیلی آواز گونج رہی تھی۔ ایک مقامی شخص مترجم کے فرائض انجام دے رہا تھا جس کے الفاظ مقامیوں میں محبت اور احترام کا جذبہ اجاگر کرتے، اُن میں امید جگاتے۔

وہ اجنبی کو ایک محسن، ایک مسیحا کے روپ میں دیکھتے تھے مگر فریڈ اس خیال سے متفق نہیں تھا۔ امریکی تاجر کے کاندھوں پر زمانے سے بچھڑے اُن قبائلیوں کا احسان تھا۔ وہ آج اُن ہی کی وجہ سے زندہ تھا۔ وہ اس احسان کا بدلہ چکانے یہاں آیا تھا۔

تو فریڈ اور قبائلیوں کے درمیان ایک انوٹ رشتہ تھا۔ دوستی کا رشتہ۔ جو جنگ عظیم دوم کی راکھ سے جنم لینے والی ایک انمول کہانی بن گئی جس نے لاکھوں دلوں کو چھو لیا تھا۔

☆☆☆

وہ جون 1943 کی صبح تھی۔ آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ جنگ اپنے اوج پر پہنچ چکی تھی۔

امریکی ایئرفورس کا فرسٹ لیفٹیننٹ فریڈ ہارگ شیمر کا طیارہ بادلوں کو چیرتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا۔ گھنگریالے بالوں والے نوجوان کے لبوں پر ایک لوک گیت تھا اور آنکھوں میں اپنی محبوبہ کی یاد چمک رہی تھی۔

ستائیس سالہ فریڈ کا دو انجنوں پر مشتمل پی 38 طیارہ نیو برٹن کے ساحلی علاقے سے گزر رہا تھا۔ وہ ایک اہم مشن پر تھا۔ راباؤل میں جاپانی فوج نے بیس قائم کر رکھی تھی۔ اتحادی فوج اس بیس پر حملے کا منصوبہ بنا رہی تھی اور اُسے فضا سے اُس کی تصاویر اتارنے کی ذمے داری سونپی گئی تھی۔ یہ ایک پُرخطر مشن تھا۔ جاپانی انڈی چپے چپے پر گشت کیا کرتے تھے۔

ساحل پیچھے رہ گیا۔ اب وہ جنگل کے اوپر سے گزر رہا تھا۔ جو نقشہ اُسے سونپا گیا تھا، اس کے مطابق ان ہی گھنے جنگلات میں کہیں دشمن کا اڈا تھا۔ مگر اس کی تلاش سہل نہ تھی۔ ہر طرف سبزہ تھا، جس کے اوپر دبیز دھواں تیر رہا تھا۔ کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

تصاویر حاصل کرنے کے لیے وہ طیارے کو نیچے لے گیا۔ یکدم پریشانی بڑھنے لگی۔ طیارے نے غوطہ کھایا۔ اب اُس کی ناک زمین کی سمت تھی۔

یہ ایک بھیانک غلطی ثابت ہوئی۔ اچانک جنگل میں فائرنگ کی آواز گونجی۔ خوف زدہ پنچھیوں نے گھونسلے چھوڑ دیے۔ اُسے اپنے دائیں انجن سے شعلے اٹھتے دکھائی دیے۔ وہ دھڑ دھڑ جل رہا تھا۔

فریڈ کو اپنی غلطی سدھارنے کا موقع نہیں ملا۔ اُس کی پشت پر موت چنگھاڑی۔ وہ جاپانی لڑاکا طیارہ تھا۔ گولیوں کی ایک اور بوچھاڑ... اور اس کا دوسرا انجن بھی ناکارہ ہو گیا۔

طیارے کو زوردار جھٹکا لگا۔ اُس کا سر کسی شے سے ٹکرایا۔ اس سے پہلے کہ حواس جواب دے جاتے، اس نے ایمرجنسی بٹن دبا دیا۔

ایک زوردار دھماکا۔ سیٹ نے اسے تین سو کلومیٹر فی گھنٹا کی رفتار سے فضا میں اچھال دیا۔ اگلے ہی پل طیارہ زمین سے ٹکرایا۔ اُس سے شعلے اٹھنے لگے۔

فریڈ ایک ماہر پائلٹ تھا۔ اُس نے فوراً پیراشوٹ نہیں کھولا، ورنہ وہ دشمن کی نظروں میں آجاتا۔ اس نے اپنے چھریرے بدن کو گولی کی رفتار سے زمین کی سمت گرنے دیا۔ پیراشوٹ کی رسی کھینچنے کے بعد وہ فقط کچھ سیکنڈز فضا میں رہا اور پھر درختوں کی شاخوں سے رگڑتا ہوا دلدلی زمین پر آن گرا۔

حیران کن طور پر اُسے زیادہ چوٹیں نہیں آئی تھیں۔ اور زخم گننے کا وقت بھی نہیں تھا۔ اُسے چھپنے کا انتظام کرنا تھا۔ جاپانی طیارہ اب بھی فضا میں منڈلا رہا تھا۔ جانے کتنی دیر وہ جھاڑیوں میں دم سادھے بیٹھا رہا۔

جب دشمن اسے مردہ سمجھ کر بیس کی سمت لوٹ گیا، تب وہ سرکتا ہوا باہر آیا۔ اپنی چوٹوں پر مرہم رکھنے کے بعد اس نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ اس کے سامنے خوف کی بھول بھلیاں تھیں۔

☆☆☆

نیوبرٹن اتحادی فوج کے لیے ایک ڈراؤنا خواب تھا۔ سپاہی یہاں بھیجنے پر موت کو ترجیح دیتے۔

چیف سوکوبیتر پر بھیجے جانے کا مطلب یہی تھا۔ اس جزیرے پر ہمیشہ کی بندرگاہ کو جاپانیوں کا مضبوط ترین اڈا تصور کی جاتی تھی۔ یہاں قبضے سے جب اتحادی افواج کی مشکلات میں اضافہ ہوگیا تھا۔ نیوگنی سے تبدیل ہونے والے تعینات افسران دونوں کو براہ راست خطرہ تصور کرتے تھے۔

اور اب اس سے بڑا خطرہ فریڈ سے روبرو تھا۔ وہ جاپانیوں کے جال میں آن پھنسا تھا۔ اگر کسی طرح انہیں چکمہ دے بھی دیتا، تب بھی ڈیڑھ سو کلومیٹر پر محیط جنگل سے مقابلہ کرنا دشوار تھا۔ وہاں درندوں کا راج اور آدم خور دلدلوں کی بھرمار تھی۔ اگر وہ کسی طرح جنگل کے زہریلے چوہوں کو شکست دے لے، تب بھی نیوگنی تک پہنچنے کے لیے اسے تین سو کلومیٹر پر محیط سمندر عبور کرنا پڑتا جو ناممکن تھا۔

اس نے ہنگامی بیگ کا جائزہ لیا۔ وہ ایک چاقو، ماچس، قطب نما، تھوڑی سی چاکلیٹ، چند ادویہ اور پانی کے ایک تھیلے پر مشتمل تھا۔ یہی اس کا کل اثاثہ تھا۔

اس نے گہرا سانس لیا اور خود کو اس جنگل کے سپرد کر دیا۔

آنے والے دن اذیت ناک تھے۔ تنہائی عذاب بن گئی۔ درندوں کی چاپ اس کا تعاقب کرتی۔ راتوں کو ہولناک مچھر حملہ کر دیتے۔ دلدلی زمین بار بار قدم روک لیتی۔ راستہ تلاش کرنے کی ہر کوشش ناکام گئی۔ دس دن بعد اس کے دشمنوں کی فہرست میں بھوک نامی عفریت کا بھی اضافہ ہوگیا۔ چاکلیٹ ختم ہوچکی تھی۔

جنگلی پھل کھانے کی کوشش بے کار گئی۔ وہ کڑوے اور بدذائقہ تھے۔ ناتوانی اس پر حملہ کرچکی تھی۔ چلتے چلتے اس کی پیر شل ہوگئے۔ لباس تار تار ہوگیا اور جلد پھٹ گئی۔

وقت گزرتا جا رہا تھا... فریڈ کے ذہن سے لوگ گیت محو ہوگئے۔ اس کی محبوبہ کی تصویر ماند پڑ گئی تھی۔ وہ حقیقت اور وہم میں فرق کرنے سے قاصر تھا۔ غنودگی کی لہر آتی۔ جب وہ جاگتا، تو غنودگی میں اپنے دوستوں کے درمیان ہوتا۔ پھر غنودگی کی لہر آتی۔ جس بار آنکھ کھلتی، تو خود کو اپنے مکان سے ملحقہ باغ میں پاتا۔ پھر غنودگی حملہ کرتی۔ اور اس بار جو آنکھ کھلتی تو جہنم سامنے ہوتا۔ وہی بھیت ناک جنگل، جن کی قاتل شاخیں اسے دبوچنے کو لپکتیں۔ آسمان اس کی بے بسی پر قہقہے لگاتا اور دلدل اسے اپنی سمت پکارتی۔

وہ چلتا رہا، چلتا رہا۔ یہاں تک کہ سمت کھو بیٹھا۔ قطب نما خاموش ہوگیا تھا۔ جنگل خاموش تھا۔ وہاں تاریکی اور نمی تھی۔ ہر گزرتا لمحہ موت کی سمت بڑھ رہا تھا مگر پھر... ایک واقعہ ہوا۔

اس دوزخ میں فریڈ کا چوتھا ہفتہ تھا۔ اس سہ پہر وہ پیٹ بھرنے کے لیے گدلے چشمے سے پانی پی رہا تھا، جب تلاش میں سرگرداں اس کی نظر ایک کشتی پر پڑی۔

اس پر سیاہ بھوت سوار تھے۔ ان کے ہاتھوں میں نیزے تھے۔ بالوں میں راکھ اٹی تھی اور کمر کی جلد مگرمچھ کی مانند سخت تھی۔ جوں ہی مقامیوں کی نظر اس بدحال سفید فام پر پڑی، جھیل کے پانیوں پر ایک چیخ گونجی۔

فریڈ کے لیے زندگی کی امید دم توڑ گئی۔ زمین نے اس کے پاؤں پکڑ لیے تھے۔ اب وہ بھاگ نہیں سکتا تھا۔ جنگل اسے موت تک لے آیا۔ اس کا تخیل خود کو جاپانیوں کے فائرنگ اسکواڈ کے سامنے کھڑا دیکھ سکتا تھا۔ وہ "فائر" کا حکم دینے والے کمانڈر کے لہجے کی گونج محسوس کر سکتا تھا، بارود کی بو اس کے نتھنوں میں گھسی جا رہی تھی۔

"ماسا ماسا۔" ایک مقامی چلایا۔ ڈونگی کنارے کی سمت آ رہی تھی۔

فریڈ نے آنکھیں بند کرلیں۔

"ماسا... تم کمال ہو۔" ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں ادا ہونے والے ان الفاظ کو فریڈ اپنا وہم سمجھا، مگر جب یہ دہرائے گئے، تب اس نے بے یقینی کی حالت میں آنکھیں کھولیں۔

"تم بھی... کمال ہو دوست۔" اس کی آواز لڑکھڑا رہی تھی۔

گھنگریالے بالوں والا ایک پست قد آدمی ڈونگی سے اتر کر اس کے پاس آیا۔ مسکراہٹ اس کے نوکیلے سیاہ دانت عیاں کیے دیتی تھی۔

"میں... نیاو۔" گھٹے ہوئے جسم والے آدمی نے سینے کی جانب اشارہ کیا۔ پھر اس نے ایک رقعہ فریڈ کو سونپا۔

وہ اتحادی فوج کے مشترکہ انٹیلی جنس بیورو کی آسٹریلوی شاخ کی جانب سے جاری کردہ تعارف نامہ تھا۔ اس پر جون اسٹوک نامی افسر کے دستخط تھے۔ تعارف نامہ اس قبیلے کو اتحادیوں کا وفادار ٹھہراتا تھا۔

خوشی کا احساس نمی کی صورت فریڈ کی آنکھوں سے چھلک پڑا۔ یہ وہم نہیں، حقیقت تھی۔

"میں سردار۔" اپنا نام لیاد بتانے والے اس شخص نے کہا۔ اگلے لمحے اس کے ہاتھ میں کیلے اور سیب تھے۔ فریڈ کی بھوک ان پھلوں کو ایک پل میں چٹ کر گئی۔ اب اسے بھنی ہوئی مچھلی پیش کی گئی۔ وہ ناقابل بیان حد تک خوش ذائقہ تھا۔

اسے سہارا دے کر اس ڈونگی میں سوار کیا گیا جو گدلے پانی پر دھیرے دھیرے تیر رہی تھی۔ آدی نے اپنا بدن ڈھیلا چھوڑ دیا۔

کچھ دیر بعد ڈونگی جھاڑیوں سے اٹے خشک حصے کے پاس آن رکی۔ اسے بازوؤں سے پکڑ کر اتارا گیا۔ جھاڑیوں کا دریا عبور کرنے کے بعد فریڈ نے خود کو گھاس پھونس کی چند جھونپڑیوں پر مشتمل ایک گاؤں میں پایا۔

چولھوں کے پاس بیٹھی عورتیں اس سفید فام کو دیکھ کر شرما رہی تھیں۔ برہنہ بچے اپنا کھیل روک کر اسے دیکھنے لگے۔ کچھ مقامیوں نے آگے بڑھ کر اس سے مصافحہ کیا۔

وہ مسرور تھا۔ زندگی کا احساس اس کے رگ و پے میں دوڑ رہا تھا۔ اچانک منظر دھندلا گیا۔ وہ کسی شہتیر کی طرح زمین پر آرہا۔

کیا یہ غنودگی کی لہر تھی... کیا یہ سب ایک خواب تھا؟

☆☆☆

آنکھ کھلی مگر اندھیرا قائم رہا۔

وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ جسم ٹوٹ رہا تھا۔ اس نے اپنا ماتھا چھوا۔ وہ بری طرح تپ رہا تھا۔

کچھ لمحوں میں آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہوگئیں، تو اس نے خود کو خشک گھاس کی ایک چھوٹی سے جھونپڑی میں پایا۔ ایک سمت کچھ روشنی تھی۔ شاید وہ دروازہ تھا۔ وہ لڑکھڑاتے ہوئے باہر آیا ہی تھا کہ دو سائے اس کی سمت بڑھے۔ ان کا لہجہ اجنبی اور انداز درشت تھا۔ اسے اٹھا کر جھونپڑی میں ڈال دیا گیا۔

"کیا میں جاپانیوں کی قید میں ہوں؟" اندیشے ذہن میں لپکے۔

کچھ دیر بعد قدموں کی آواز سنائی دی۔ کچھ لوگ جھونپڑی کی سمت آرہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں مشعل تھی۔ زرد روشنی میں اس نے کچھ قبائلیوں کو دیکھا۔ وہ دروازے پر آکر رک گئے۔ وہ ان کی آوازیں سن سکتا تھا۔ پھر ایک سایہ مشعل لیے جھونپڑی میں داخل ہوا۔ فریڈ کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ پھر اسے لیاد نظر آیا۔

اس کے دانت تو کیلے ضرور تھے مگر اس کی مسکراہٹ میں کسی دوست کی سی گرمجوشی تھی۔

اس کے ہاتھ میں کچھ پھل اور دودھ تھا۔ پھل سخت تھے اور دودھ سے عجیب سی بو اٹھ رہی تھی مگر بھوک سے بے حال فریڈ نے انہیں لمحوں میں معدے میں اتار لیا۔

فارغ ہونے کے بعد وہ سردار کی جانب متوجہ ہوا۔

"میں کہاں ہوں؟" اس نے اپنی بات کی وضاحت کے لیے اشاروں کی مدد لی۔

سردار نے زمین کی سمت اشارہ کیا۔ "ہنتوچو۔ یہ ہنتوچو۔ میں لیاد۔ میں سردار!"

پھر اس نے انگریزی میں کہا۔ "فرینڈ، گڈ نائٹ۔"

"گڈ نائٹ۔" ان جملوں کی ادائیگی کے ساتھ اس نے خود کو انتہائی ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ ایک عرصے بعد نیند کی مہربان دیوی سے ملاقات ہوئی تھی۔

مرغ کی بانگ نے اسے جگایا۔ سورج طلوع ہو چکا تھا۔ سورج کی کرنیں گھاس کی چھت سے چھن کر آرہی تھیں۔ فضا میں شوربے کی مہک تھی۔ شاید کوئی عورت قریب ہی کھانا تیار کررہی تھی۔

ایک ننگ دھڑنگ سے بچے نے اندر جھانکا۔ اس نے اشارے سے اسے پاس بلایا تو بچہ بھاگ نکلا۔ تھوڑی دیر بعد وہ بچہ پھر دروازے پر دکھائی دیا۔ اس کے ساتھ اور بچے بھی تھے جو سفید فام اجنبی کو دیکھ کر دھیرے دھیرے ہنس رہے تھے۔

کچھ دیر بعد ایک عورت مٹی کے برتن میں پانی لیے اندر آئی۔

"کیا میں لیاد سے مل سکتا ہوں؟" اس نے پوچھا۔

عورت نے سردار کا نام پہچان لیا۔ وہ سر ہلاتے ہوئے چلی گئی۔ کچھ دیر بعد کسی نے نیزے سے زمین بجائی۔ لیاد کھنکتے زیور پہنے آرہا تھا۔

"آؤ۔ سورج کی روشنی میں۔" اس کے اشارے ٹوٹی پھوٹی انگریزی کو سہارا دے رہے تھے۔

باہر بچوں کا ہجوم تھا۔ وہ نظروں میں اشتیاق لیے اس کے قریب آتے، اس کی پتلون چھوتے اور پھر دوڑ کر اپنی ماؤں کے پیچھے چھپ جاتے۔ اُن کی معصوم ہنسی زندگی کی علامت تھی۔

وہ سردار کے ساتھ نسبتاً بڑی اور مضبوط جھونپڑی میں پہنچا۔ وہاں کچھ اور لوگ بھی تھے۔ سب نے اٹھ کر اس کی سے ہاتھ ملایا۔

پھر وہ آپس میں باتیں کرنے لگے۔ یہ ایک سنجیدہ بحث تھی۔ کبھی ان کی آواز بلند ہوتی، کبھی وہ سرگوشیوں میں بدل جاتی۔ چھوٹے چھوٹے پیالوں میں زردی مائل گرم دودھ لایا گیا۔ باقی تو غٹاغٹ پی گئے، مگر اس کی ناگوار بو کے باعث فریڈ بمشکل اسے حلق میں اتار سکا۔

ابھی بحث جاری تھی کہ ایک نوجوان دوڑتا ہوا آیا۔ اس کا سانس پھولا ہوا تھا اور چہرے سے پریشانی عیاں تھی۔ اس نے مقامی زبان میں کچھ کہا۔

سردار کے چہرے پر اندیشے لشکنے لگے۔ وہ فریڈ کی سمت مڑا۔ "خطرہ۔ جاپانی ادھر ہیں۔"

فریڈ کا سانس رک گیا۔ پل بھر پہلے جو جھونپڑی اُسے جنت نظیر لگ رہی تھی، اس پر جہنم کا گمان ہونے لگا۔

سردار اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر تیزی سے باہر نکلا۔ وہ جنگل کی سمت جا رہے تھے۔ دونوں ایک گھنے درخت کے سامنے جا کر رکے۔ اُس نے بڑی احتیاط سے کچھ جھاڑیاں ہٹائیں۔ درخت کی جڑوں میں ایک کھوہ تھی۔

"تم یہاں ٹھہرو۔" یہ کہہ کر سردار چلا گیا۔

وہ تنگ سی جگہ تھی۔ جھاڑیوں کی وجہ سے اوٹ سی بن گئی۔ جاپانی بڑے تندہ ساز تھے۔ دشمن کی بو سونگھتے پھرتے۔ گو فریڈ مذہبی آدمی نہیں تھا، مگر اس پل اُس کے لبوں پر دعائیں تھیں۔

سردار بہت دیر بعد لوٹا۔ چہرے پر اطمینان تھا۔ وہ اسے واپس اسی جھونپڑی میں لے گیا۔ فریڈ نے دیکھا، ایک نوجوان اُن کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ وہ فریڈ کے جوتوں کے نشان مٹاتا جا رہا تھا۔ گاؤں والے خاصے محتاط تھے۔

جھونپڑی میں پہنچ کر سردار نے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں، اشاروں کی مدد سے فریڈ کو صورت حال سے آگاہ کیا۔

فریڈ کو متنبہ کیا گیا کہ دن کی روشنی میں کم سے کم باہر نکلے، کیونکہ اس علاقے سے اکثر جاپانی طیارے گزرتے ہیں۔ طیاروں کی گشت کے موقع پر فریڈ کو خبردار کرنے کے لیے ایک سگنل بھی ایجاد کیا گیا تھا۔

وہ مقامی زبان کے چار الفاظ پر مشتمل تھا، جو پھیپھڑوں کا پورا زور لگا کر بولے جاتے۔ ان کا انگریزی میں مطلب کچھ یوں نکلتا تھا "یہ پرندہ جاپانی ہے!"

فریڈ کو ہدایت کی گئی کہ جب کبھی یہ الفاظ سنے، فوراً قریبی کھوہ یا جھونپڑی کا رخ کرے اور اس وقت تک وہاں رہے، جب تک خطرہ ٹل نہ جائے۔

ایک دل پذیر کہانی کی 'کہانی'

فریڈ ہارگ سمبر کی یہ متاثر کن کہانی 60ء کی دہائی کے وسط میں مشہور زمانہ ریڈرز ڈائجسٹ کا حصہ بنی تھی۔ اس وقت تک نیو برٹن میں "ایزمین میموریل اسکول" قائم ہو چکا تھا۔ اخوت و بھائی چارے کی اس ناقابل فراموش داستان نے لاکھوں انسانوں کو متاثر کیا۔ قارئین نے اسے ڈائجسٹ کی بہترین کاوشوں میں سے ایک قرار دیا۔ ان کا اصرار تھا کہ اسے ری پرنٹ کیا جائے۔ 2014 میں ڈائجسٹ نے اپنی بہترین کہانیوں کو یکجا کرنے کا فیصلہ کیا، تو ایک امریکی ہوا باز اور قبائلی سردار کی گہری دوستی کے اس یادگار قصے کا بھی انتخاب کیا۔ انہوں نے اپنی ادارتی نوٹ میں لکھا، "گو کئی برس گزر چکے ہیں، مگر اس کہانی کو پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ محبت کا جذبہ کبھی باسی نہیں ہوتا۔"

آنے والے دنوں میں تین بار یہ عمل انجام دیا گیا۔ جاپانی طیارے کی گھن گرج سے پہلے ہی اسے سگنل مل جاتا اور وہ رینگتا ہوا محفوظ مقام پر پہنچ جاتا۔

کبھی کبھار جاپانی فوج کے پیدل دستے بھی ساحلی پٹی کا گشت کرتے۔ لیاو نے اس کا بھی انتظام کر رکھا تھا۔ گاؤں کے ہر فرد کو ہدایت کی گئی تھی کہ جوں ہی ان کی نظر کسی جاپانی سپاہی پر پڑے، وہ سنکھ بجا کر سفید فام کو خبردار کر دیں۔

خطرے کے پیش نظر دن کی روشنی میں فریڈ باہر نکلنے سے اجتناب برتتا۔ ہاں، سورج ڈھلنے کے بعد جب خطرہ کچھ کم ہو جاتا، وہ پناہ گاہ سے نکل کر آگ کے گرد بیٹھے مقامیوں میں شامل ہو جاتا۔ ان کے لوک گیت وہ سمجھ تو نہ سکتا تھا، مگر ان گیتوں کی چاشنی اس کے دل میں اتر جاتی۔ اُن کے درمیان اُسے انسیت اور تحفظ کا احساس ہوتا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ اُن کی محبت ہے، جو اس کے اور جاپانی فوج کے درمیان دیوار بنی کھڑی ہے، ورنہ وہ اب تک دشمن کے ہتھے چڑھ چکا ہوتا۔

دھیرے دھیرے وہ ان کے اشارے، ان کی باتیں سمجھنے لگا۔ مقامی زبان کے چند الفاظ بھی سیکھ لیے۔

رات رات بھر جاری رہنے والی نشستوں کے وسیلے فریڈ کو کئی دلچسپ باتوں کا پتا چلا۔ عام قبائل کے برعکس اس گاؤں

کے باسی ارواح پرست نہ تھے۔ جھونپڑیوں میں چھوٹے چھوٹے بت تو رکھے ہوئے تھے، مگر وہ ان کی پوجا نہیں کرتے تھے۔ حیران کن طور پر دنیا سے کٹے ہوئے یہ انسان وحدانیت پرست تھے۔ یہ ایک خدا کو مانتے اور اس کے نیک بندے کی شان میں مناجات پڑھا کرتے، جس نے انسانیت کے لیے قربانی دی تھی۔

فریڈ ششدر رہ گیا، جب اسے اندازہ ہوا کہ یہ نیک بندہ کوئی اور نہیں، بلکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ دراصل مختصر میں مسیحیت کے بنیادی عقائد کی پیروی کی جا رہی تھی۔ ان کے ہاں نیکی اور بدی کا واضح تصور موجود تھا۔ اور یہ کیتھولک مشنریوں کی کوششوں کا ثمر تھا۔

"یہ جنگ سے پہلے کی بات ہے۔" لیاو نے اسے بتایا۔ "وہ کشتیوں پر یہاں آئے تھے اور کتنے ہی روز ہمارے ساتھ رہے۔"

وقت جھیل کا موسم دھیرے دھیرے گزر رہا تھا۔ شامیں ویران ہو گئیں۔

اس دوران کتنے ہی جاپانی طیارے آسمان سے گزرے، فوجی دستوں نے ساحلی پٹی کا گشت کیا، انھوں نے جنگل کھنگالا، ایک دو بار گاؤں بھی آئے، مگر کسی شخص نے سفید فام اجنبی کو دھوکا نہیں دیا۔

ایک بار تو صورت حال خاصی بگڑ گئی تھی۔ جاپانی لیاو کو اپنے ساتھ لے گئے۔ انھوں نے کئی گھنٹے تفتیش کی۔ بہلایا پھسلایا۔ دھمکیاں بھی دیں۔ آخر میں تلوار سونت لی، مگر اس نے اپنی زبان نہیں کھولی۔

لوٹنے کے بعد جب وہ فریڈ سے ملا، تو اس کی باچھیں کھلی ہوئی تھیں۔ "وہ مجھ سے پوچھ رہے تھے، تم نے کوئی سفید فام پرندہ تو نہیں دیکھا۔"

"سفید فام پرندہ۔" وہ ہنسا۔ "تو تم نے کیا کہا؟"

"میں نے کہا...." اس نے آنکھ ماری۔ "یہاں کوئی سفید فام نہیں، سب پرندے سیاہ فام ہیں۔"

☆☆☆

وہ دھند میں لپٹی صبح تھی۔ باہر ہوا چنگھاڑ رہا تھا۔

فریڈ نے بستر سے اٹھنے کی کوشش کی، مگر ناکام رہا۔ ایک اور کوشش۔ ایک اور ناکامی۔ اس نے مدد کے لیے پکارا، مگر آواز نے ساتھ نہیں دیا۔

اس نے تمام تر قوت ٹانگوں میں مجتمع کی۔ باہر پُر سرار سناٹا تھا۔ سورج گھبرایا ہوا تھا اور ہر سو چپ کا پہرا تھا۔ نہ تو وہ بچے تھے، جو کھیل کھیل میں اس کے جوتوں کے نشانات پر چلا کرتے، نہ ہی وہ عورت، جو ہر صبح اس سے چشمے کا پانی لا کر دیا کرتی۔

اس نے آگے بڑھنے کی کوشش کی، مگر جسم نے ساتھ چھوڑ گیا۔ وہ زمین پر آ رہا۔

جب آنکھ کھلی، جھونپڑی میں دھواں بھرا ہوا تھا۔ کچھ دیر بعد شمع کی مدھم روشنی میں اس نے ایک چہرہ دیکھا۔ ایک اجنبی چہرہ۔

"میں ڈاکٹر ہوں۔" اس سیاہ فام شخص کی بڑی بڑی آنکھوں میں پیار کی چمک تھی۔ "میرا تعلق مقامی مشنری سے ہے۔"

اس نے اٹھنے کی کوشش کی، مگر آدمی نے سینے پر ہاتھ رکھ کر روک دیا۔ "افسوس۔ تمھیں آرام کی ضرورت ہے۔"

فریڈ میں شک کا سانپ پھنکارا۔ اس نے نظر دوڑائی۔ دروازے میں دھند سے لپٹا لیاو کھڑا تھا۔

"یہ دوست ہے۔" سردار نے کہا۔

فریڈ نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلایا۔

"یہ نمونیا کا مرض ہے۔" اجنبی نے کہا۔ "میرے پاس کچھ پین کلرز تو ہیں، مگر نمونیا کی میڈیسن نہیں۔ اگر شہر جا کر حاصل کرنے کی کوشش کی تو جاپانیوں کو شک ہو جائے گا۔"

جھونپڑی میں اداسی در آئی۔ لیاو سر جھکائے کھڑا تھا۔ اس نے کچھ کہنا چاہا، مگر آواز حلق میں اٹک گئی۔

"ہمارے پاس دوا تو نہیں۔" پادری جیکس کی پُر اعتماد آواز گونجی۔ "مگر ایک نسخہ ہے، دعا!"

اس کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی۔ فریڈ نے دیکھا، وہ بائبل کا نسخہ تھا۔ پادری کے دو بچے بھی بیٹھے تھے۔

آدمی نے سردار کو اشارہ کیا۔ کچھ لوگ سر جھکائے جھونپڑی میں داخل ہوئے۔ جیکس نے کتاب کھولی۔

"خدا تمہارے ساتھ ہے فریڈ۔ اگر تم پر اس کا سایہ نہ ہوتا، تو اب تک تم مر چکے ہوتے۔" یہ کہہ کر وہ مقامیوں کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ دھیمی آواز میں کتاب مقدس کے الفاظ دہرانے لگے۔

دھندلی رات میں نغمگی کا جنم ہوا۔ غنودگی میں جانے سے قبل فریڈ نے روشنی کا ایک ستون دیکھا۔ صحت بخش حدت جسم میں اتر رہی تھی۔ امید کا دیا طوفان سے مقابلہ کر رہا تھا۔

اب یہ معمول تھا۔ ہر شب جیکس گاؤں والوں کے ساتھ اس کی صحت یابی کی دعا کرتے۔ پھر جڑی بوٹی کا کڑوا عرق اس

کے حلق میں انڈیلا جاتا۔ دونوں جوان اُس کی تیمارداری پر مامور تھے۔ شام میں ایک بار پھر دعائیہ تقریبات ہوتیں۔

محبت دھیرے دھیرے اثر کر رہی تھی۔ وہ خود بھی بائبل پڑھنے لگا۔ اس عشق سے بچپن کی حسین یادیں وابستہ تھیں۔ ان دنوں کی یادیں، جب وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ گرجے جایا کرتا تھا۔

بیماری کے اثرات کم ہونے لگے۔ طبیعت سنبھل تو رہی تھی مگر کمزوری پیچھا چھوڑنے کو تیار نہیں تھی۔ اس کا ایک سبب تو کڑاکے کی سردی تھی، دوسری وجہ یہ تھی کہ اس کا معدہ ٹھوس غذا ہضم کرنے سے قاصر تھا۔ وہ جو کچھ کھاتا، قے کی صورت باہر آجاتا۔

ایک صبح لیاو کی موجودگی میں اس نے اپنی اس پریشانی کا ذکر ہیلس سے کیا۔

آدمی سر جھکائے کچھ سوچتا رہا۔ پھر گردن ہلاتے ہوئے باہر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد لوٹا، تو ایک چپٹی ناک کی عورت اس کے ساتھ تھی۔ ایک بچہ اس کے سینے سے چپٹا ہوا تھا۔

ہیلس نے ایک پیالہ فریڈ کی سمت بڑھایا۔ ”یہ بکری کا دودھ ہے۔ امید ہے، تم اسے ہضم کر لو گے۔“

اس نے ایک ہی جرعے میں پیالہ خالی کر دیا۔ عورت نے آگے بڑھ کر پیالہ اس سے لے لیا۔ جب وہ جانے لگی، تو لیاو کی گمبھیر آواز جھونپڑی میں گونجی۔ وہ مقامی زبان میں ہیلس سے کچھ کہہ رہا تھا۔

ہیلس کچھ نہ بولا۔ بس مسکرا دیا۔ لیاو نے پھر کچھ کہنا چاہا، مگر عورت نے آگے بڑھ کر اسے روک دیا۔ بچہ رونے لگا۔ عورت اسے چمکارتے ہوئے باہر نکل گئی۔

بکری کا دودھ آبِ حیات ثابت ہوا۔ ہڈیوں میں بسا بخار کچھ کم ہونے لگا۔ اگلی صبح بھی ہیلس اپنی بیوی کے ساتھ وہاں موجود تھا۔ اس بار لیاو سر جھکائے خاموش کھڑا رہا۔ کچھ نہ بولا۔

یہ سلسلہ دس روز تک جاری رہا تھا۔ اس کی طبیعت سنبھل گئی تھی۔ وہ بیٹھنے کے قابل ہوگیا۔ معدہ اب جنگلی پھل اور شوربہ ہضم کرسکتا تھا۔

سردی کا موسم دھیرے دھیرے بہار میں تبدیل ہو رہا تھا۔ پیڑوں پر پھل نکلنے لگے۔

ہیلس گزشتہ دو روز سے نہیں آیا تھا۔ ایک شام اس نے لیاو سے پوچھا۔ ”وہ نیک دل میاں بیوی کہاں ہیں؟“

”ہاں، واقعی وہ نیک لوگ ہیں۔“ لیاو نے آواز میں

جذبات کی لہک تھی۔ ”غربت کی وجہ سے بکریاں پالنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ ہیلس کے لیے بھی یہ دشوار تھا، مگر اسے اپنے بچے کی وجہ سے یہ کرنا پڑا۔“

”اس کا بچہ۔ ہاں... وہ مجھے کچھ بیمار لگا تھا۔“ فریڈ نے کہا۔

”بچہ نہیں، اس کی ماں بیمار تھی۔“ اس نے گلوگیر لہجے میں کہا۔ ”اس کی چھاتیاں خشک ہوگئی ہیں۔ اسی وجہ سے تو بکری پالی۔“

”یعنی وہ اپنے بچے کی غذا...“ فریڈ نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”ہاں، وہ اپنے ننھے بیٹے کی غذا تم سے بانٹ رہا تھا۔“ سردار مسکرایا۔ ”وہ واقعی نیک انسان ہے۔“

فریڈ کچھ نہ کہہ سکا۔ تشکر کی نمی آنکھوں میں اتر آئی تھی۔ الفاظ حلق میں رہ گئے۔

اس نے آسمان کی سمت دیکھا۔ دور... بادلوں کے پار کوئی مسکرا رہا تھا!

☆☆☆

اُسے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ پھر کوئی دوڑنے لگا۔ دو آدمی سرگوشیوں میں بات کر رہے تھے۔

وہ ایک تاریک رات تھی، جب گاؤں میں یکدم پراسراریت دوڑ گئی۔ کچھ تو عجیب تھا۔

فریڈ نے بستر چھوڑ دیا۔ اس کا خیال تھا کہ ابھی کوئی چلائے گا ”یہ جاپانی پرندہ ہے!“ یا پھر شنکھ بجے گا... مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔ دوسری طرف پُراسرار سرگرمیاں جاری تھیں۔

اندھیرے میں اسے لیاو نظر آیا۔ اُس نے فریڈ کو اپنی جھونپڑی میں آنے کا اشارہ کیا۔ وہاں ایک اجنبی بیٹھا تھا، جس کے بالوں پر دھوئیں کے بادل کا گمان ہوتا۔

”یہ تمہارے لیے ایک خبر لایا ہے۔“ لیاو نے دھیرے سے کہا۔

آدمی نے مقامی زبان میں کچھ کہا۔ اس کے ہاتھ تیزی سے حرکت کر رہے تھے۔ دور کسی جانور کے رونے کی آواز سنائی دی۔

”اس نے پہاڑوں پر کچھ دیکھا ہے...“ لیاو مترجم کا کردار نبھا رہا تھا۔ ”دشمن گورے... ان کے پاس عجیب سی مشین ہے... وہ چوٹی پر درختوں پر چھپے ہوئے ہیں...“

فریڈ کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ اس نے سنا تو تھا کہ آسٹریلیا کی سراغ رساں ٹیم اس خطے میں متحرک ہے

مگر گزشتہ چند ماہ میں رونما ہونے والے پے در پے حادثات کے باعث وہ انہیں یکسر بھلا بیٹھا تھا۔

"یہ تمہیں وہاں لے جا سکتا ہے۔" لیاو کے الفاظ اسے نئے حال میں لے آئے۔

"میں تیار ہوں!" اس نے فوراً کہا۔

"لیکن تم ابھی بہت کمزور ہو۔" سردار کے لہجے میں تشویش تھی۔ "کچھ روز ٹھہر جاؤ۔ پھر میں کچھ نوجوان تمہارے ساتھ کر دوں گا۔"

وہ دن امید اور اندیشوں میں گزر رہے تھے۔ جنگ میں شدت آتی جا رہی تھی۔ وہ جلد از جلد آسٹریلوی دستے تک پہنچنا چاہتا تھا۔

ایک شب لیاو نے کاندھا جھنجھوڑ کر اسے جگایا۔ سردار کے ساتھ دو نوجوان تھے۔

"تیار ہو جاؤ دوست۔ جانے کا وقت آ گیا۔" آواز میں خوشی کے ساتھ کہیں کوئی دکھ بھی تھا۔ ایک دوست سے جدا ہونے کا دکھ۔

فریڈ اٹھ کر اس سے گلے ملا۔ وہ اپنے محسنوں سے جدا ہو رہا تھا، مگر وہ ان کا شکریہ ادا کرنے سے، انہیں الوداع کہنے سے قاصر تھا کہ ابھی رات تھی۔ گاؤں سو رہا تھا۔

جاتے ہوئے لیاو نے اسے کبوتر کی ہڈیوں سے بنا ایک تعویذ دیا۔ "یہ تمہیں میری یاد دلاتا رہے گا۔"

تین افراد کی یہ ٹولی جنگل کی سمت بڑھ گئی۔ کچھ دیر میں وہ جھاڑیوں میں غائب ہو گئے۔ لیاو نے اپنے آنسو پونچھے اور جھونپڑی میں چلا گیا۔

غمگین تو فریڈ بھی تھا، مگر یہ لمحے گریہ کرنے کے نہیں تھے۔ انہیں تیزی سے سفر کرنا تھا۔ اس کے ساتھ آنے والے مقامی نوجوان جنگل کے چپے چپے سے واقف تھے۔ راستوں کے علاوہ چھپنے کے مقامات کا بھی انہیں خوب علم تھا۔

سورج طلوع ہونے کے بعد ان کی نقل و حرکت محدود ہو گئی۔ شام میں انہوں نے پھر تیزی سے سفر کیا۔ رات گئے وہ اس پہاڑی پر پہنچے، جہاں تین آسٹریلوی چھپے ہوئے تھے۔ انہوں نے اونچے درختوں کی شاخوں پر ڈیرا ڈال رکھا تھا۔

وہ امریکی ہوا باز سے بڑی گرم جوشی سے ملے۔ فریڈ بھی بے حد مسرور تھا۔ جب دونوں مقامی رخصت ہونے لگے تو آسٹریلوی فوجیوں نے انہیں بسکٹ کے پیکٹ دیے۔

"آپ لوگ کس مشن پر ہیں؟" فریڈ نے پوچھا۔

"ہم ربااؤل سے اڑان بھرنے والے طیاروں پر نظر رکھتے ہیں۔" ایک نے کہا۔ "اس پہاڑ کے ادھر سمندر ہے اور سمندر کے پار نیوگنی۔ جوں ہی ہم کوئی طیارہ دیکھتے ہیں، وائرلیس پر اطلاع کر دیتے ہیں۔"

"تو آپ ہی کی وجہ سے جاپانیوں کو ہر بار ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔" وہ ہنسا۔

انہوں نے بھی قہقہہ لگایا۔ پھر یکدم ان کا لیڈر سنجیدہ ہو گیا۔ "ہنسی مذاق تو ہوتا رہے گا دوست۔ پہلے اپنے بیس کو اطلاع دو۔ وہ بے چارے تمہیں مردہ سمجھ بیٹھے ہوں گے۔"

وائرلیس جلد ہی اس کی آواز نیوگنی میں امریکی بیس تک لے گیا، جہاں اس کا پرجوش استقبال کیا گیا۔ کچھ ہی دیر بعد اس کا کمانڈر لائن پر تھا۔ "فریڈ، تمہیں زندہ پا کر خوشی ہوئی۔ تیار رہو، ہم جلد تمہیں وہاں سے نکال لیں گے۔"

"مجھے یقین ہے سر۔" فریڈ نے دھیرے سے کہا۔ "مجھے یقین ہے!"

☆☆☆

تین روز بعد وائرلیس سیٹ کی بتیاں جھلملائیں۔ وہ پیغام موصول ہوا، جس کا فریڈ منتظر تھا۔ جہنم سے فرار کا وقت آن پہنچا تھا۔

اسی شام دو آسٹریلوی ہوا باز ان سے آن ملے۔ ان کے جہاز بھی جاپانیوں نے مار گرائے تھے۔ انہوں نے جنگل میں چھپ چھپا کر اپنی جان بچائی۔ خوش قسمتی سے انہیں بھی فریڈ کے مانند اچھے دوست ملے تھے، ورنہ وہ آج زندہ نہ ہوتے۔

تینوں سفید فام کچھ مقامی باشندوں کے ساتھ ساحل کے شرقی حصے کی سمت روانہ ہو گئے۔ یہ انتہائی مشکل سفر تھا۔ دشوار علاقہ۔ لمبی لمبی جھاڑیاں۔ دلدلی زمین۔ حشرات الارض کی بھرمار۔

ایک طویل اور تھکا دینے والے سفر کے بعد وہ ایک ویران اور تباہ حال ساحل پر پہنچے۔ سمندر گدلا تھا اور پانی میں عجیب سی بو تھی۔ امید کی کوئی کرن دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

وہ ایک اداس رات تھی۔ آگے کوئی راستہ نہیں تھا۔ چوبیس گھنٹے بعد انہوں نے پہاڑ کے دوسری طرف جانے کا فیصلہ کیا۔ پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ کر انہیں سمندر میں سیاہ دھبا نظر آیا۔

"یہ کیا ہے؟ کوئی جزیرہ؟" یہ فریڈ کے الفاظ تھے۔

"نہ نہ... کشتی معلوم ہوتی ہے۔" مقامی نے ہاتھ کی اوٹ بنا کر دیکھا۔

"ارے یہ تو آبدوز ہے۔" ایک آسٹریلوی چیخا۔

انہوں نے سگنل دیئے۔ دھبا حرکت کرنے لگا۔ پھر وہ ایک چھوٹی سی کشتی کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ وہ دھیرے دھیرے ساحل کی سمت بڑھ رہی تھی۔ ان کی دھڑکن تیز ہوگئی۔

وہ پانی میں اتر گئے۔ اگلے لمحے میں پہنچ کر کشتی رک گئی۔ اس پر موجود فوجیوں نے انہیں کھینچ کر اوپر چڑھا دیا۔

"دوست کہاں رہ گئے تھے۔ ہم کب سے منتظر تھے۔" انہوں نے کہا۔

"بھٹک گئے تھے۔" فریڈ نے آہستہ سے کہا۔

اس نے ساحل کی سمت دیکھا۔ ساتھ آنے والے مقامی ہاتھ ہلا کر الوداع کہہ رہے تھے۔

☆☆☆

اگر فریڈ کی کہانی یہیں ختم ہو جاتی... تو یہ ایک عام سی کہانی ہوتی، جسے شاید کچھ برس بعد بھلا دیا جاتا۔

اگر یہ کہانی فریڈ کے جنگ سے لوٹ کر اپنی محبوبہ سے شادی کرنے، ایک سرسبز علاقے میں مکان تعمیر کرنے اور اپنے بچوں کی پرورش تک محدود رہتی... تو دنیا اسے بھول چکی ہوتی۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ قدرت کو کچھ اور منظور تھا۔

یہ یادیں تھیں، جو اسے بے چین رکھتیں۔ یادیں، جن میں ماضی کی مہک تھی۔ کبھی جنگلوں میں سکھ بجتا۔ کبھی کھیتوں میں بازگشت سنائی دیتی۔ "یہ پرندہ جاپانی ہے!" کبھی تنہائی میں اُسے احساس ہوتا کہ سیاہ فام بچے اس کے جوتوں کے نشان کا تعاقب کر رہے ہیں۔ ان کے معصوم قہقہے سماعتوں میں رس گھولتے۔ خوابوں میں اسے بنیاو اور ہاس کا چہرہ دکھائی دیتا، اس بچے کی قلقاری سنائی دیتی، جس کی آدھی غذا نے اسے زندگی بخشی۔

جنگ میں جاپان کی شکست کے بعد نیو برٹن میں حالات خاصے بہتر ہوگئے تھے۔ اتحادی فوج اس کی تعمیر نو کا مرحلہ کامیابی سے طے کر چکی تھی، مگر فریڈ جانتا تھا کہ جن نیک افراد نے اس کی جان بچائی، ان کی زندگی میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی ہے۔ وہ آج بھی پتھر کے عہد میں زندہ ہیں۔

وہ ان کے لیے کچھ کرنا... چاہتا تھا۔ ہر کرسمس پر وہ کچھ رقم بطور تحفہ انہیں بھجوایا کرتا، جو شہر سے گاؤں میں کام کرنے والی ایک مشنری کے ذریعے گاؤں پہنچ جاتی۔ جواب میں اسے شکریے کا رقعہ بھی ملتا، مگر وہ اپنی اس کوشش کو ناکافی خیال کرتا تھا۔

جب وہ اپنے بچوں کے ساتھ لان میں کھیل رہا ہوتا، تو اُسے اُن تنگ دھڑنگ بچوں کی یاد آتی، جو اس کی جھونپڑی کے باہر اکٹھے ہو جاتے تھے۔

جب بیوی جدید کچن میں کھانا پکا رہی ہوتی، تو وہ عورتیں یاد آتیں، جو چولہوں پر جڑوں کا شوربہ پکایا کرتی تھیں۔ جب وہ اپنے اہل خانہ کو علاج کی غرض سے اسپتال لے جاتے دیکھتا، تو اُس گاؤں میں پہنچ جاتا، جہاں پین کلر جیسی معمولی شے بھی نایاب تھی۔

یادیں شدت اختیار کرتی جا رہی تھیں۔ وہ اسے ایک سفر پر اکسا رہی تھیں۔ اُسی سنسان جزیرے کی سمت جانے کی تحریک دیتیں، جہاں اس نے زندگی کے مشکل ترین دن گزارے تھے۔

جب کبھی وہ جنگ میں حصہ لینے والے پرانے ساتھیوں سے ملتا، تو بیتے دنوں کا ذکر چھڑ جاتا۔ اس کے دوست اپنے تجربات بیان کرنے میں تو گرم جوشی کا مظاہرہ کرتے، مگر جب اُن سے پوچھا کرتا۔ "کیا آپ وہاں دوبارہ جانا چاہتے ہیں گے؟"

تو جواب نفی میں ملتا۔ "کیا سٹھیا گئے ہو۔ ان ویران جزیروں میں فقط اکتاہٹ کا بسیرا ہے۔"

لیکن فریڈ کے احساسات مختلف تھے۔ ان جنگلات میں اُسے دوستی کا الاؤ نظر آتا تھا۔ وہاں زندگی سے مہکتے پھول تھے۔

آخر اپنے محسنوں سے ملنے کی خواہش اتنی پرقوت ہوگئی کہ ایک صبح وہ بستر سے اٹھتے ہی چلا دیا۔ "مجھے نیو برٹن جانا ہوگا۔"

اس کی بیوی سمجھ دار عورت تھی۔ وہ اپنے شوہر کی بے چینی سے واقف تھی اور ان سیاہ فام قبائلیوں کا احترام کرتی تھی۔

"میں تمہارے ساتھ ہوں۔" عورت نے کہا۔

اہل خانہ کی حمایت حاصل ہوگئی۔ مگر اصل مسئلہ تھا، اس سفر کے لیے سرمائے کا اہتمام کرنا۔ اسے ذاتی کاروبار شروع کیے کچھ ہی وقت ہوا تھا۔ مکان کے قرضے کی اقساط ابھی پوری نہیں ہوئی تھیں۔

"ہم گرمیوں کی چھٹیوں کی قربانی دے سکتے ہیں۔" یہ تجویز اس کی بیوی نے پیش کی۔ "کچھ فرنیچر بھی بیچ دی جائے تو مضائقہ نہیں۔"

"مگر یہ سب..." وہ تھوڑا متذبذب تھا۔

عورت مسکرائی۔ "ہم اگلے برس چھٹیاں منا لیں گے، ابھی نیو برٹن کا سفر زیادہ اہم ہے۔"

تو یہ 1960 کا موسم گرما تھا، جب وہ امریکا سے نمونی جانے والے طیارے میں سوار ہوا۔ وہاں اس کی ملاقات اُس سابق آسٹریلوی فوجی سے ہوئی، جو جنگ کے دوران نیو بریٹن میں سراغ رسانی کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ اب وہ ریٹائر ہوگیا تھا اور یہاں ایک ٹریول ایجنسی چلا رہا تھا۔

وہاں سے اس نے راباؤل کا رخ کیا۔ جنگ کے دنوں میں تو فریڈ یہ علاقہ نہیں دیکھ سکا تھا کہ یہ خوف کی علامت بنا ہوا تھا، اب جو یہ شہر دیکھا، تو اُس کے حسن نے آنکھیں خیرہ کر دیں۔ راباؤل کا سبزہ جنگ کے تباہ کاریوں سے ابھر آیا تھا۔

گھومنے پھرنے کے لیے ایک گائیڈ درکار تھا۔ یہ بہ مشکل آسانی سے ملتا ہے نہیں چہ گی۔ نوجوان گائیڈوں کے لیے یہ گاؤں یکسر اجنبی تھا۔ اور پھر وہ گھنے جنگلوں میں جانے میں دلچسپی نہیں رکھتے تھے۔ آخر انہیں ایک بوڑھا گائیڈ ملا، جو جنگ کے زمانے میں کچھ وقت ادھر گزار چکا تھا۔

انہوں نے دریا کا راستہ اختیار کیا۔ راستہ.... جو دوستوں کی سمت جاتا تھا۔

☆☆☆

وہ ایک خاموش رات تھی۔

پانی ٹھہرا ہوا تھا۔ بوٹ کی موٹر بند ہونے کے بعد سناٹا چھا گیا۔ ساحل پر اندھیرا تھا۔ وہ پانی میں اتر گیا۔ دل میں جہاں تجسس تھا، وہیں یہ خدشہ بھی تھا کہ شاید گاؤں والے اُس امریکی کو بھول چکے ہوں، جس کی انہوں نے سترہ برس قبل جان بچائی تھی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ لیاوو کا انتقال ہو چکا ہو۔ کسی نوجوان نے اس کی گدی سنبھال لی ہو جسے اُس کا وہاں آنا ناگوار گزرے۔

تو وہ ایک خاموش رات تھی اور اس کا دل مضطرب تھا۔

دور جھاڑیوں میں روشنی لہرائی۔ کچھ جگنو اس سمت آ رہے تھے۔ قریب آئے تو اندازہ ہوا کہ وہ مشعل اٹھائے مقامی باشندے تھے۔ ان کے بدنوں پر لنگوٹی تھی اور ہاتھوں میں نیزے تھے، مگر آنکھوں میں وہ احساس تھا، جس کا فریڈ منتظر تھا۔

پہلے سنکھ بجایا۔ وہ مخصوص نعرہ لگا، جو گاؤں والے اسے خبردار کرنے کے لیے لگایا کرتے تھے۔ پھر ایک شناسا آواز سنائی دی۔ ”فریڈ میرے دوست۔“

لیاوو اس کے سامنے تھا۔ ہاں وہ بوڑھا ہو گیا تھا۔ مگر فریڈ بھی تو اب جوان نہیں رہا تھا۔ وہ دونوں یوں ملے، جیسے پرانے دوست ملتے ہیں۔

اپنے دوستوں کی رہنمائی میں وہ گاؤں تک پہنچا۔ قیام کا انتظام اسی جھونپڑی میں کیا گیا تھا، جہاں کبھی وہ چھپا کرتا تھا۔ وہی گھاس کا بستر۔ وہی منظر۔

اُس بستر پر سترہ برس پرانی نیند منتظر تھی۔ خواب اُسے جھولا جھلانے لگے۔

صبح وہ پرندوں کی چہچہاہٹ سے بیدار ہوا۔ گاؤں میں جشن کا سماں تھا۔ ہر شخص نے بہترین ملبوسات زیب تن کر رکھے تھے۔ لیاوو کے سینے پر وہ تمغہ دمک رہا تھا، جو اُسے ملکۂ برطانیہ نے وفاداری کے اعتراف میں عطا کیا تھا۔ عورتوں کے گلے میں زیورات دیکھے جا سکتے تھے۔ بچے پُرجوش تھے۔

وہاں پتھر کا ایک چھوٹا سا اسٹیج تھا۔ فریڈ سے تقریر کی درخواست کی گئی۔ پرانے دوستوں کے درمیان وہ خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ اس نے اپنی مختصر سی تقریر میں سب کا شکریہ ادا کیا۔ پھر امریکا سے لائے تحائف تقسیم کیے۔

قبیلے کی جانب سے فریڈ کو وہ سنکھ تحفے میں دیا گیا، جسے بجا کر گاؤں والے اُسے جاپانیوں سے خبردار کیا کرتے تھے۔

تقریب کے بعد بچے اور بوڑھے قطار میں کھڑے ہو گئے۔ فریڈ فرداً فرداً ان سے ملا۔

جب جشن تمام ہوا، تب اس نے لیاوو سے وہ سوال کیا، جو اُسے صبح سے پریشان کر رہا تھا۔

”میرا دوست محسن بطس اور اس کی بیوی اڈی کہاں ہے؟“

لیاوو کا چہرہ بجھ گیا۔ ”ہمارا وہ محسن، وہ شریف النفس بطس خدا کے پاس لوٹ چکا ہے۔“

فریڈ کو لگا، جیسے کسی نے اس کے دل پر گھونسا مارا ہو۔

”اور اس کی بیوی؟“

”وہ پاس کے ایک جزیرے میں جا بسی۔“ سردار نے کہا۔ ”وہ بھلی عورت تھی۔“

گاؤں سے لوٹتے وقت اس کے دل میں مسرت کا احساس تھا، جو اس وقت دگنا ہو گیا، جب راباؤل میں اسے اطلاع ملی کہ ایک عورت اس سے ملنے آئی ہے، جو اپنا نام اڈی بتاتی ہے۔

وہ اپنے سات بچوں کے پہلو میں بنچ پر بیٹھی تھی۔ فریڈ نے سترہ برس قبل جو اُجالا اس کی آنکھوں میں دیکھا، وہ آج بھی منظر کو روشن کر رہا تھا۔ وہ ایک چھوٹی سی کشتی میں چالیس کلومیٹر کا طویل فاصلہ طے کر کے اپنے پرانے دوست سے ملنے آئی تھی۔

عورت اسے دیکھ کر کھڑی ہو گئی۔ فریڈ اس شفیق عورت

کے ہاتھ تھام کر گئی تھی وہ مرحوم ہیلس کو یاد کرتا رہا۔ وہ مہرباں تھا اور اڈی ایک ماں کی طرح اسے دنا سے ادعیں تھی۔

پھر اس نے اپنے بڑے بیٹے کو متعارف کروایا۔ ”یہ رابرٹ ہے۔ میرا بیٹا۔“

فریڈ نے آنسو پونچھے۔ لڑکے کے ماتھے پر بوسہ دیا۔

”عزیز، اگر تم اپنی غذا کی قربانی نہیں دیتے تو تمہارا چچا آج زندہ نہیں ہوتا۔“

☆☆☆

وہ خواب کی سی کیفیت تھی۔

اس نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ وہ دوبارہ اپنے محسنوں سے مل پائے گا، مگر قدرت نے اسے ایک موقع دیا۔ اور وہ اس موقع سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ اسے شدت سے احساس تھا کہ گاؤں والے آج بھی انتہائی مشکل حالات میں زندگی گزار رہے ہیں۔ تھوڑی بہت زرعی اراضی، کچھ مویشی اور ماہی گیری کے محدود سے امکانات پر ان کی زندگیوں کا انحصار ہے۔ نہ صحت کی سہولیات ہیں، نہ ہی آگے بڑھنے کے امکانات۔

ہوائی سفر کے دوران ایک سوال مسلسل ذہن میں گردش کرتا رہا۔ ”میں ان مظلوم انسانوں کی کس طرح مدد کرسکتا ہوں؟“

یہی سوچتے سوچتے وہ غنودگی میں اتر گیا۔ اس نے حقیقت اور وہم کے درمیان ایک منظر دیکھا۔ ہر سوں دھند چھائی ہے۔ کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی' وہ بیماری کی حالت میں بستر پر پڑا ہے اور ہیلس اس کے سرہانے کھڑا کتاب مقدس پڑھ رہا ہے۔

تو حقیقت اور وہم کے دوران ایک بھولی بسری یاد کندی تھی۔ وہ لمحہ جب بیمار فریڈ نے ہیلس کا ہاتھ تھام کر کہا تھا کہ وہ اوروں سے بالکل الگ ہے۔ اور جواب میں آدمی نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ ”نہیں، میں باقی لوگوں جیسا ہی ہوں۔ بس ایک فرق ہے۔ میں پڑھ سکتا ہوں اور یہ پڑھ نہیں سکتے۔“

سپنا چھن سے ٹوٹ گیا۔ وہ حقیقت کی دنیا میں لوٹ آیا تھا۔ اسے جواب مل گیا۔ ایک شے جو گاؤں والوں کی زندگی بدل سکتی تھی، انہیں بہتری کی ڈگر پر ڈال سکتی تھی، وہ تھی تعلیم!

گھر لوٹ کر اس نے اپنی بیوی سے تذکرہ کیا۔ کچھ دیر وہ سر جھکائے بیٹھی رہی۔

”یہ بہت بڑا منصوبہ ہے۔“ اس نے دھیمی آواز میں

شیخ جاد الحق علی

(1917ء_1996ء)

جامعہ الازہر (قاہرہ) کے ریکٹر اور ممتاز عالم دین۔ وہ مصر میں سب سے اعلیٰ مذہبی شخصیت کے طور پر جانے جاتے تھے۔ انہیں 1982ء میں مصر کے صدر حسنی مبارک نے شیخ الازہر (قاہرہ) مقرر کیا تھا (یہ عہدہ تاحیات ہوتا ہے) وہ متعدد کتب کے مصنف تھے۔ ان کی اسلامی خدمات کے اعتراف کے طور پر 1995ء میں انہیں شاہ فیصل ایوارڈ دیا گیا۔ قاہرہ میں حرکت قلب بند ہوجانے کی بنا پر انتقال کیا اور اپنے آبائی گاؤں تل کے دلتائی علاقے میں سپرد خاک کیے گئے۔

مرسلہ: مقرب علی خاشخیلی۔ جامشورو

Georgia

ریاست ہائے متحدہ امریکا کی ابتدائی 13 ریاستوں میں سے ایک ریاست۔ فلوریڈا اور جنوبی کیرولینا کی ریاستوں کے مابین بحراوقیانوس پر واقع ہے۔ دارالحکومت اٹلانٹا اور سب سے بڑی بندرگاہ سوانا ہے۔ اس علاقے میں کئی دریاؤں کی گزرگاہ ہے۔ بیشتر حصہ نشیب میں ہے جہاں دلدلیں بہت ہیں۔ پہاڑوں میں گندم اور پھلوں کی اعلیٰ فصلیں ہوتی ہیں۔ نشیبی زمین میں چاول اور ساحل کے ساتھ ساتھ کپاس بافراط ہوتی ہے۔ 1733ء میں اس ریاست کا نام جارج دوم کے نام پر جارجیا رکھا گیا۔ اسے جیمز اوگل تھارپ نے دریافت کیا تھا۔ رقبہ 59441 مربع میل ہے۔

مرسلہ: فریدہ یاسمین (اوباڑو)

جالندھر Jalandhar

بھارتی پنجاب کا مشہور شہر، یہ ایک صنعتی تجارتی اور زرعی مرکز ہے۔ یہاں کھیلوں کا سامان تیار کرنے کے کارخانے ہیں۔ کبھی یہاں مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد تھی مگر تقسیم کے ہنگامے نے اس پورے علاقے کو مسلمانوں سے خالی کرادیا۔

مرسلہ: زوہیب مظفر۔ سکھر

کہا۔ ”مگر یہ ممکن نہیں۔“

”ہاں، ہم کوئی نہ کوئی راستہ تلاش کرلیں گے۔ میں اس بارے میں ایک مضمون لکھوں گا۔ ہم فنڈ اکٹھا کر سکتے ہیں۔“

”تمہارا جذبہ نیک ہے۔“ عورت نے تائید کی۔ ”شاید تھوڑا وقت لگے، مگر راستہ نکل آئے گا۔ خدا کوشش کرنے والوں کا ساتھ دیتا ہے۔“

”معجزے کے توقف“ میں نامی وہ مضمون ایک مقامی اخبار میں شائع ہوا، جس میں اس نے ایک اسکول قائم کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ اس نے ان الفاظ میں مضمون کا اختتام کیا تھا۔ ”ہاں یہ دشوار ہے، کوئی معجزہ ہی اسے ممکن کرسکتا ہے، مگر دوستو ذرا میری زندگی پر تو نظر ڈالیں۔ کیا میرا زندہ بچنا بھی معجزہ نہیں تھا۔“

اس کے الفاظ سے جھلکتی سچائی نے قارئین کے دل موہ لیے۔ ردعمل حوصلہ افزا رہا۔ نیو برٹن کی انتظامیہ تک بھی اس فلاحی منصوبے کی خبر پہنچی۔ گو ان کے وسائل محدود تھے، مگر انہوں نے فریڈ کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا۔ اس ضمن میں وہاں کام کرنے والے مشنری اداروں کا کردار کلیدی تھا۔ کسی نے نصاب فراہم کرنے کی حامی بھری، کسی نے ادویہ کی فراہمی کا ارادہ ظاہر کیا۔ پھر اسے نیو برٹن کی ایک تعمیراتی کمپنی کا خط موصول ہوا، جو رضاکارانہ طور پر مزدور فراہم کرنے کو تیار تھی۔

فریڈ نے انجینئروں سے میٹنگ طے کی۔ تخمینہ لگایا گیا۔ ایک مناسب اسکول تعمیر کرنے اور اسے چلانے کے لیے انہیں پندرہ ہزار ڈالر درکار تھے۔

یہ بڑی رقم تھی، لیکن دل میں جذبہ تھا، آنکھوں میں خواب تھا اور قدرت اس کے ساتھ کھڑی تھی۔

اسے مختلف اداروں میں لیکچرز کے لیے مدعو کیا جانے لگا۔ اس نے طلبا سے خطاب کیا، مختلف فلاحی تنظیموں کے پلیٹ فورم سے اپنے منصوبے کا اظہار کیا، گرجا گھروں میں تقریریں کیں۔

وہ اپنی تقریر کے اختتام میں کہا کرتا۔ ”پندرہ ہزار ڈالر بڑی رقم ہے، اس کا حصول مشکل لگتا ہے، لیکن میری بیوی کی سوچ مختلف ہے۔ وہ کہتی ہے، اگر پندرہ سو افراد دس ڈالر کا تعاون کریں، تو یہ رقم ایک دن میں اکٹھی ہو سکتی ہے۔ مگر میں آپ سے کہوں گا، اگر آپ کے پاس دس ڈالر نہیں ہیں، تو پانچ ڈالر بھی بہت ہیں۔ اور اگر پانچ بھی نہیں، تو ایک ڈالر بھی کافی ہے۔ اور وہ بھی نہیں، تب بھی میں آپ سے دعاؤں کی درخواست کروں گا، وہی بہت ہیں۔“

اس کے الفاظ نے لوگوں میں نئی روح پھونک دی۔ ان کے دل جذبات سے معطر تھے۔ ہر شخص اپنی بساط کے مطابق چندے کے بکس میں رقم ڈالنے لگا۔ ایک خاتون نے تو موقع ہی پر پانچ سو ڈالر کا چیک کاٹ کر اسے تھما دیا۔

ہاں... قدرت اس کے ساتھ تھی۔ فقط دو برس میں اس نے یہ رقم اکٹھی کرلی۔

☆☆☆

وہ جون 1963 کی ایک گداز سہ پہر تھی، جب فریڈ اور اس کے جواں سال بیٹے ڈک نے راباؤل کے ہوائی اڈے پر قدم رکھا۔

دونوں پُرجوش تھے۔ خصوصاً لڑکے کا تجسس تو آسمان کو چھو رہا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا، جب وہ امریکا سے باہر آیا تھا اور پہلی منزل ہی وہ ملک ٹھہرا، جہاں اس کے باپ نے نئی زندگی پائی تھی۔

انہوں نے سیمنٹ کی چار سو بوریاں، اینٹیں اور بجری ایک پرانے ٹرک پر لادیں اور سمبو کی سمت روانہ ہوگئے۔

ان کی آمد کی خبر پہلے ہی پہنچ چکی تھی۔ گاؤں والوں نے ان کا والہانہ استقبال کیا۔ بوڑھے ولیا نے فریڈ کے بیٹے کو گلے لگایا تو لڑکے نے اپنائیت کا احساس اپنے سینے میں دوڑتا محسوس کیا۔ اگلے روز مزدور وہاں پہنچ گئے۔ یہ مقامی مزدور محنتی اور خوش باش تھے اور مگن دکھائی دیتے... ان کو کے دھنوں میں اڑا دیا کرتے تھے۔

نقشہ بچھا دیا گیا۔ انہیں تین ایکڑ کا رقبہ صاف کرنا تھا۔ اس عمل میں گاؤں والوں نے بھی مزدوروں کا بھرپور ساتھ دیا۔ وہ کلہاڑی اور درانتی لیے نکل آئے۔

آنے والے دن مصروفیات سے بھرپور تھے۔ فریڈ اور اس کا بیٹا نہ صرف تعمیراتی کاموں کی نگرانی کررہے تھے، بلکہ ضرورت پڑنے پر مزدوروں کا ہاتھ بھی بٹاتے۔ جب وہ شام کے وقت گاؤں لوٹتے تو ان کے تھکے ہوئے بدن کو مقامی مشروب اور بھنی ہوئی مچھلی نئی توانائی بخشتی۔ وہ گھاس کے بستر پر اطمینان بخش نیند لے کر چند گھنٹوں بعد پھر کام کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے۔

تو اس سرسبز دنیا میں جہاں پنچھیوں کی چہک میں پُراسرار بہت گندگی تھی، جہاں کے باسیوں کو دیکھ کر لگتا تھا، جیسے وقت صدیوں قبل ٹھہر گیا ہو... وہاں ایک پُراسرار سرگرمی

جاری تھی۔

ایک اونچے ٹیلے پر فریڈ کھڑا تقریر کر رہا تھا۔ اس کے سامعین کی تعداد ہزاروں میں تھی۔ ان کے ہاتھوں میں تیز سے اور چاقو تھے اور سیاہ بدنوں پر راکھ ملی تھی۔

تین ہفتے بعد جب وہ امریکا لوٹا، اس کے دل میں خوشی کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ تین عمارتوں پر مشتمل اسکول کا بنیادی ڈھانچا کھڑا ہو گیا تھا۔ کتابوں اور فرنیچر کا آرڈر دیا جا چکا تھا۔

پتھر کے عہد کے انسان کو جدید دنیا سے متعارف کروانے کا خواب پورا ہونے والا تھا۔

☆☆☆

یکم فروری 1964 کا دن جادوئی تھا۔

وہاں بچوں کا جمگھٹا تھا، جن کی معصوم آنکھوں میں سپنے چمک رہے تھے، لبوں پر تبدیلی کے گیت تھے۔

جنگلات اور پہاڑوں کے درمیان قائم ہونے والے پہلے اسکول نے، جس کی بنیاد دوستی اور اخوت پر قائم تھی، کام شروع کر دیا تھا۔

ٹیچنگ اسٹاف ایک آسٹریلوی اور دو مقامی اساتذہ پر مشتمل تھا۔ دیکھ ریکھ کی ذمے داری آسٹریلیا کے شعبۂ سیاحت نے سنبھال رکھی تھی۔ پہلے بیچ میں 130 طلبا و طالبات شامل تھے۔ کچھ تو ایسے تھے، جو میلوں کا پیدل سفر کر کے وہاں پہنچے تھے۔ کچھ نے ڈونگیوں سے سمندر عبور کیا تھا۔ تعلیم کی کشش انہیں اس انوکھی درس گاہ کی سمت کھینچ لائی تھی۔

جولائی 1964 میں فریڈ نے دوبارہ جزیرے کا رخ کیا۔ اس بار آسٹریلوی سراغ رساں ایجنسی کا سابق افسر ویم ٹاؤن سینڈ بھی ساتھ تھا۔ وہ ان تین فوجیوں میں سے ایک تھا، جنہوں نے سترہ برس قبل جاپانی فضائیہ کی سرگرمیوں پر نظر رکھنے کے لیے گھنے اور بلند درختوں پر ڈیرا ڈال رکھا تھا۔

میڈیا والے بھی وہاں موجود تھے۔ کیمرے کا فلیش چمک رہا تھا۔ پریس کانفرنس میں فریڈ نے اسکول کو اس علاقے کے لیے امریکی عوام کا تحفہ قرار دیا۔ اس نے ان متوسط طبقے کے نیک خاندانوں کا ذکر کیا، جنہوں نے اپنے بجٹ میں کٹوتی کر کے انہیں چندہ دیا۔ ان بچوں کو یاد کیا، جنہوں نے اپنی پاکٹ منی اسے سونپ دی تھی۔

درس گاہ کو "ایبڑمین میموریل اسکول" کا نام دیا گیا تھا۔ جب ایک صحافی نے اس بابت پوچھا، تو اس نے قہقہہ لگایا۔ "میں گاؤں والوں کا اور اپنے دوست لیاو کا ممنون ہوں کہ انہوں نے اسے مجھ سے موسوم کیا، مگر میرے نزدیک اس کا نام دوستی درس گاہ ہونا چاہیے، کیونکہ یہی جذبہ اس کی بنیاد بنا۔ دوستی کا رشتہ، جس نے میری زندگی بدل دی۔"

نیو برٹن کے مغربی صوبے اوکی میں قائم ہونے والا وہ اسکول خواب کی تکمیل نہیں، فقط پہلا قدم تھا۔

نیک دل فریڈ رکا نہیں، اس نے نوبیا کے غریب علاقے میں بھی ایک اسکول قائم کیا۔ اس بار فنڈز اکٹھا کرنا نسبتاً آسان رہا۔ اب وہ ایک جانا مانا اور قابل احترام شخص تھا۔ لوگ اس سے محبت کرتے تھے۔ اس کے اہل خانہ نے بھی اس مہم میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

نوبیا میں اسکول کے ساتھ ایک چھوٹی سی لائبریری اور کلینک بھی قائم کیا گیا۔ دو اساتذہ اور چالیس طلبا و طالبات سے شروع ہونے والے اس اسکول نے تیزی سے ترقی کی۔ اس ادارے نے علاقے کا حلیہ بدل دیا۔

ان درس گاہوں میں داخلہ لینے والے قبائلی بچے صرف پرائمری اسکول تک محدود نہیں رہے۔ کتابوں نے انہیں گرویدہ بنا لیا تھا۔ ان میں آگے بڑھنے کی آگ تھی۔ بہت سوں نے سیکنڈری اسکول کا رخ کیا۔ کچھ تو ایسے بھی تھے، جنہوں نے گریجویشن کا مرحلہ طے کیا اور سرکاری اداروں میں اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوئے۔ ایک لڑکی نے تو امریکی یونیورسٹی کی اسکالرشپ بھی حاصل کی۔

فریڈ اور اس کے خاندان نے آنے والے برسوں میں کئی بار اس خطے کا دورہ کیا۔ وہ گرمیوں کی چھٹیاں یہیں گزارا کرتے۔ وہاں سیمینارز منعقد کرتے۔ تربیتی ورکشاپس کا انعقاد کرتے۔

2000 میں اس علاقے کے قبائل کی جانب سے اس سفید فام تاجر کو "سالار اعظم" کے خطاب سے نوازا گیا۔ آج سے قبل کسی غیر ملکی کو یہ اعزاز نہیں ملا تھا۔ اس موقع پر فریڈ نے کہا۔ "اس خطاب کے لیے شکریہ، مگر آپ کی محبت کے بعد مجھے کسی اعزاز کی ضرورت نہیں۔ اور سچ کہوں تو میں آپ کا محسن نہیں، آپ میرے محسن ہیں۔"

دسمبر 2010 میں، زندگی کی 94 بہاریں دیکھنے کے والے اس بلند حوصلہ شخص کا انتقال ہوا۔ اس کی موت کے بعد نیو برٹن کے دیگر علاقوں میں قائم اسکولوں میں اسے ویسے ہی یاد کیا گیا، جیسے کسی عظیم سورما کو کیا جاتا ہے۔

سراب

راوی : شہباز ملک

تحریر: کاشف زبیر

قسط نمبر: 100

وہ پیدائشی مہم جو تھا۔ بلند و بالا پہاڑ، سنگلاخ چٹانیں، برف پوش چوٹیاں اور نگاہ کی حدوں سے آگے کی بلندیاں اسے پیاری تھیں۔ اسے ان میں ایک کشش اور ایک للکار سی ابھرتی محسوس ہوتی کہ آؤ ہمیں دیکھو مسخر کرو اور ہمارے سحر میں مسحور ہو کر اپنا آپ مٹا ڈالو۔ اسے یہ سب حقیقت لگتا مگر کیا واقعی یہ حقیقت تھا یا محض سراب... ایسا سراب جو آنکھوں کے راستے ذہن و دل کو بھٹکاتا ہے۔ جذبوں کو مہمیز دیتا ہے مگر آسودگی اور اطمینان چھین لیتا ہے... سیرابی لمحوں کے فاصلے پر دکھائی دیتی ہے مگر وہ لمحہ حقیقت میں کبھی نہیں آتا۔ اس کی زندگی بھی سرابوں کے ایسے دائروں میں گزری اور گزرتی رہی۔ وقت کے گرداب میں ڈوبتے ہوئے نوجوان کی سنسنی خیز اور ولولہ انگیز داستان حیات۔

بلند حوصلوں اور بے مثال ولولوں سے گندھی ایک تہلکہ خیز کہانی

(گزشتہ اقساط کا خلاصہ)

میری محبت سویرا، میرے بھائی کا مقدر بنا دی گئی تو میں ہمیشہ کے لیے حویلی سے نکل آیا۔ اسی دوران میں نادر علی سے ٹکراؤ ہوا اور یہ ٹکراؤ ذاتی انا میں بدل گیا۔ ایک طرف مرشد علی، فتح خان اور ڈیوڈ شا جیسے دشمن تھے تو دوسری طرف سفیر، مریم اور وسیم جیسے جاں نثار دوست۔ پھر ہنگاموں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا جس کی کڑیاں سرحد پار تک چلی گئیں۔ فتح خان نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں ڈیوڈ شا کے ہیرے تلاش کرنے ہوں گے۔ میں ہیروں کی تلاش میں نکل پڑا۔ میں شہلا کے گھر کی تلاشی لینے پہنچا تو باہر سے گیس بم پھینک کر مجھے بے ہوش کر دیا گیا۔ ہوش آنے کے بعد میں نے خود کو انڈین آرمی کی تحویل میں پایا مگر میں ان کو ان کی اوقات بتا کر نکل بھاگا۔ جب تک پہنچا تھا کہ فتح خان نے گھیر لیا۔ میں نے کرنل زرونگی کو زخمی کر کے بہانا اپنے حق میں کر لی۔ میں دوستوں کے درمیان آ کر ٹی وی دیکھ رہا تھا کہ ایک خبر نظر آئی۔ مرشد نے بھائی کو راستے سے ہٹانے کی کوشش کی تھی۔ ہم مانسہرہ پہنچے۔ وہاں وسیم کے ایک دوست کے گھر میں ٹھہرے۔ اس دوست کے بیٹے نے ایک خانہ بدوش لڑکی کو پناہ دی تھی وہ لڑکی مہرو تھی۔ وہ ہمیں بریف کیس تک لے گئی مگر وہاں بریف کیس نہ تھا۔ کرنل زرونگی بریف کیس لے بھاگا تھا۔ ہم اس کا پیچھا کرتے ہوئے چلے تو دیکھا کہ کچھ لوگ ایک گاڑی پر فائرنگ کر رہے ہیں۔ ہم نے حملہ آوروں کو بھگا دیا۔ اس گاڑی سے کرنل زرونگی ملا۔ وہ زخمی تھا۔ ہم نے بریف کیس لے کر اسے اسپتال پہنچانے کا انتظام کر دیا اور بریف کیس کو ایک گڑھے میں چھپا دیا۔ واپس آیا تو فتح خان نے ہم پر قابو پا لیا۔ پستول کے زور پر وہ مجھے اس گڑھے تک لے گیا مگر میں نے جب گڑھے میں ہاتھ ڈالا تو وہاں بریف کیس نہیں تھا۔ اتنے میں میری امداد کو ایمبولینس والے پہنچ گئے۔ انہوں نے فتح خان پر فائرنگ کر دی اور میں نے ان کے ساتھ جا کر بریف کیس حاصل کر لیا۔ وہ بریف کیس لے کر چلے گئے۔ ہم واپس عبداللہ کی کوٹھی پر آ گئے۔ سفیر کو واپس بھیجنا تھا۔ اسے ائیرپورٹ سے سی آف کر کے آ رہے تھے کہ راستے میں ایک چھوٹا سا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ وہ گاڑی ممتاز حسن نامی سیاست داں کی بیٹی کی تھی وہ زبردستی ہمیں اپنی کوٹھی میں لے آئی۔ وہاں جو شخص آیا اسے دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ وہ میرے بدترین دشمنوں میں سے ایک تھا۔ وہ راج کنور تھا۔ وہ پاکستان میں اس گھر تک کس طرح آیا اس سے میں بہت کچھ سمجھ گیا۔ اس نے مجبور کیا کہ میں ہر روز نصف لیٹر خون اسے دوں۔ بحالت مجبوری میں راضی ہو گیا لیکن ایک روز ان کی چالاکی کو پکڑ لیا کہ وہ زیادہ خون نکال رہے تھے۔ میں نے ڈاکٹر پر حملہ کیا تو نرس مجھ سے چمٹ گئی پھر میرے سر پر وار ہوا اور میں بے ہوش ہو گیا۔ ہوش آیا تو میں اندھیرے میں تھا۔ پانو بھی اغوا ہو کر پہنچ چکی تھی۔ وہ لوگ ہمیں گاڑی میں بٹھا کر آگے بڑھے تھے کہ ہماری گاڑی کو دو طرف سے گھیر لیا گیا۔ وہ فتح خان تھا۔ اس نے ڈیوڈ شا کے اشارے پر مجھے گھیرا تھا۔ میں اس کے ساتھ ڈیوڈ شا کے پاس پہنچا۔ ڈیوڈ نے پر اسرار وادی میں پہنچنے کی بات کی۔ اس نے ہر کام میں مدد دینے کا وعدہ کیا۔ سعدیہ کو کنور کی جیل سے آزاد کرانے کی بات بھی ہوئی اور اس نے بھرپور مدد دینے کا وعدہ کیا۔ ہماری خدمت کے لیے پوجا نامی لڑکی کو مقرر کیا گیا تھا۔ وہ کمرے میں آئی تھی کہ اس کے مائیکروفون سے شکتی ول جی کی آواز سنائی دی "شاجی، شہباز ملک کسی عورت کو چھڑانے آیا ہے۔" ڈیوڈ شا کا جواب سن نہیں پایا کیونکہ پوجا نے مائیک بند کر دیا تھا۔ اس دن کے بعد سے پوجا کی ڈیوٹی کہیں اور لگا دی گئی۔ میں ایک جھاڑی کی آڑ میں بیٹھ کر موبائل پر باتیں کر رہا تھا کہ کسی نے پیچھے سے وار کر کے بے ہوش کر دیا اور محل میں پہنچا دیا۔ مجھے پتا تھا ہر جگہ ڈیکٹا فون لگا ہوا ہے۔ تبھی فائرنگ شروع ہوئی اور میں نے چیخ کر کہا "کنور ہوشیار" ساوی کو نے رتھیر" مگر جملہ ادھورا رہ گیا اور ساوی کی چیخ سنائی دی پھر شکتی ول نظر آیا۔ اس کے آدمیوں نے بڑے کنور کے وفاداروں کو ختم کرنا شروع کر دیا تھا۔ میں اس سے نمٹ رہا تھا کہ فتح خان نے آ کر مجھے اور ساوی کو نشانے پر لے لیا۔ تبھی راج کنور آ گیا۔ اس نے گولی چلائی جو جیتا کی گردن میں لگی۔ میں نے غصے میں پورا پستول راج کنور پر خالی کر دیا۔ جیتا مر چکا تھا۔ اس کی لاش کو ہم نے چتا کے حوالے کیا اور ایک ہیلی کاپٹر کے ذریعے سرحد تک پہنچے۔ وہاں سے اپنے شہر۔ وہاں پہنچا ہی تھا کہ ڈیوڈ کی کال آ گئی۔ اس نے تصفیہ کرانے کی بات کی اور کال کٹ گئی۔ ہم بنگلے میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ گیس پھینک کر ہمیں بے ہوش کر دیا گیا اور جب ہوش آیا تو میں قید میں تھا۔ شا کی قید میں۔ شا نے مجھے کہا کہ میں فاضل کی مدد کروں کیونکہ میرے ہاتھوں میں ایک ایسا کڑا پہنا دیا گیا تھا جو فاضل سے 500 میٹر دور جاتے ہی زہر انجیکٹ کر دیتا۔ میں حکم ماننے پر تیار ہو گیا۔ فاضل نے مرشد کی جعلی خانقاہ پر حملے کا پروگرام بنایا۔ ہم نے فاضل کے آدمیوں کے ساتھ مل کر حملہ کیا۔ حملہ کامیاب رہا۔ فاضل مارا گیا اور مجھے سانپ نے ڈس لیا مگر سانپ کا زہر مجھ پر کارگر نہ ہوا۔ فاضل نے جو کڑا مجھے پہنایا تھا اس کا الٹا اثر ہوا اور وہ خود تڑپتے میں سانپ کے زہر سے مارا گیا۔ میں مرشد کی خانقاہ سے نکل کر دوستوں کے پاس پہنچا پھر راجا صاحب سے ملنے جیپ کے ذریعے ان کے علاقے کی طرف چل پڑا۔ راستے میں وہ علاقہ بھی تھا جہاں بہت شا نے ہیرے چھپائے تھے۔ میں اسے تلاش کرنے کے لیے وہاں پہنچا تھا کہ فائر ہوا اور میں کھسک کر پیچھے گر رہا تھا کہ فتح خان کی آواز آئی کہ تم ٹھیک تو ہے پھر وہ مجھے قید کر کے لے چلا۔ راستے میں اس کے ساتھیوں نے غداری کی مگر میری مدد سے فتح خان ذبح ہو گیا۔ پھر آگے جا کر میں نے فتح خان کو گولی مار دی اور واپس وہاں آیا جہاں گاڑی کر کے گیا تھا۔ وہ لاش پڑی تھی۔ ابھی میں اسے دیکھ ہی رہا تھا کہ پولیس والے آ گئے اور مجھے تھانے لے آئے۔ وہاں سے رشوت دے کر چھوٹا پھر راجا صاحب کے گاؤں پہنچا مگر وہاں کے حالات بدل چکے تھے۔ میں واپس ہو گیا کہ راستے میں ایک عورت اور دو جوانوں نے مجھے گھیر لیا اور میرے سر پر کسی چیز سے وار ہوا۔ میں

بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ ہوش آیا تو میں شیر خان کی قید میں تھا۔ وہ لوگ مجھے افغانستان کے راستے بھارت لے آئے تب پتا چلا کہ وہ لڑکی ڈیوڈ کی کارندہ ہے لیکن اس نے ڈیوڈ شاہ کے گلے لگ کر کہا "پاپا" تو میں حیران رہ گیا۔ میں نے خواب میں بھی ایسا نہیں سوچا تھا ڈیوڈ نے اوشا کو بھی وہیں قید کر رکھا تھا۔ وہیں میری ملاقات ایک نیپالی سے ہوئی جو انجیس کا کارندہ تھا اس نے مجھے ایک موبائل فون دیا جس سے میں نے ایمن سے باتیں کیں مگر اس کا راز کھل گیا اور شا نے اسے قتل کر دیا۔ دو دن کے بعد تاریک وادی کا سفر شروع ہو گیا۔ ہم ..... پنچے جا رہے تھے کہ باسو کا پیر پھسلا اور وہ ایک خندق میں گرنے لگا۔ ہم سب برف پوش پہاڑوں پر چڑھنے کے لیے ایک ہی رسی میں خود کو باندھے ہوئے تھے اس لیے میرا توازن بگڑا اور میں آگے کی سمت گرا تھا کہ زیلی نے سنبھال لیا۔ کرنل نے باسو کی رسی کو پھینک کر بچا لیا۔ ہمارا سفر جاری رہا۔ ایک جگہ برفانی آدمیوں کے ایک غول نے گھیر لیا۔ ان سے بچ کر نکلا تو راستہ بھٹک گیا اور ایک سرنگ میں پہنچ گیا جو برف والے آدمی کی تھی۔ برف والے سے ملاقات ہوئی برف والے نے گھونسا دبا کر بے ہوش کر دیا جب ہوش آیا تو میرے سر پر تیر کمان سے لیس کچھ سپاہی کھڑے تھے۔ سپاہی مجھے گرفتار کر کے وادی کے حکمران ریناٹ کی قید میں پہنچا دیا، وہاں ایک بدرو گیرٹ نے مجھے فرار میں مدد دی اور میں برف والے کے کہنے کے مطابق سامیرا کی فوج کی مدد کرنے کے لیے اس کے علاقے میں پہنچ گیا۔ میں نے فوج کو از سرِ نو تیاری کرانا شروع کر دی تھی کہ ریناٹ کے قصبہ آرگون کی طرف سے نرسنگھے بجائے جانے کی آواز بلند ہوئی سامیرا کا چہرہ زرد ہو گیا اور اس نے زیرِ لب کہا "اعلانِ جنگ"

اب آگے پڑھیں،

"اعلانِ جنگ؟" میں نے سامیرا کے الفاظ دہرائے۔

"ہاں یہ آرگون کی طرف سے اعلانِ جنگ ہے۔"

میں نے دیکھا کہ وہاں کھلبلی سی مچ گئی تھی اور جو سپاہی اور رضا کار نہتے اٹھائے خالی ہاتھ چلے آئے تھے اب وہ اپنے قلعوں اور گھروں کی طرف ہتھیار لینے جا رہے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ بھی جانتے تھے کہ اس آواز کا مطلب اعلانِ جنگ ہے۔ عورتیں، بچے اور بوڑھے پہلے ہی گھروں میں تھے۔ ان کی بیرونِ گھر سرگرمیاں عام طور سے دن چڑھے ہوتی تھیں اس لیے قلعوں اور گھروں سے باہر صرف سپاہی تھے اور سرکاری حکام تھے۔ بہت سے لوگ دیکھنے بھی آئے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ کیا اس طرف سپاہ کی نقل و حرکت سے آرگون والے کسی غلط فہمی میں مبتلا ہوئے تھے اور انہوں نے اعلانِ جنگ کر دیا تھا۔ ممکن ہے ایسا نہ ہوتا اگر ہم مزید جنگ کے لیے تیار ہو جاتے تو شاید ریناٹ کو یہ نہ سوجھتا۔ میں نے سامیرا سے کہا۔ "مجھے ایک دستہ چاہیے۔"

"تم کیا کرو گے؟"

"میں قلعے کی طرف جاؤں گا۔"

اس نے بے ساختہ کہا۔ "نہیں اس میں خطرہ ہے ہمیں قلعہ بند ہو کر مدافعت کرنی ہے۔"

"سامیرا۔" میرا لہجہ سخت ہو گیا۔ "یہ میرا حکم ہے، اس پر فوری عمل کیا جائے۔"

اس کا چہرہ ایک لمحے کو متغیر ہوا۔ شاید اسے مجھ سے ایسے لہجے کی توقع نہیں تھی۔ مگر اس نے خود مجھے یہاں کا حکمران اور فوج کا سپہ سالار بنایا تھا۔ اتفاق سے کانیور وہاں موجود تھا اور سامیرا نے اسے حکم دیا۔ اس نے فوری طور پر میرے لیے دو درجن سپاہیوں پر مشتمل ایک دستے کا بندوبست کر دیا۔ ان کے پاس تیر کمان اور ڈھالیں تھیں۔ میں نے سامیرا کے توسط سے فوج کے لیے حکم دیا کہ قلعوں میں حفاظتی پوزیشنیں لے لی جائیں اور تمام افراد کو قلعوں میں بلا لیا جائے۔ حکم دے کر میں دستے کے ساتھ آرگون کی طرف بڑھا۔ روبیر میرے ساتھ تھی کیونکہ وہی میری ترجمان تھی۔ ان قلعوں اور آرگون کے درمیان کوئی چھ میل کا فاصلہ تھا۔ اتنی دوری سے قلعے تو دکھائی دیتے تھے مگر اس سے زیادہ اور کچھ واضح نہیں تھا۔ دوری کے باوجود میں نے محسوس کیا تھا کہ ریناٹ کی فوج قلعے سے باہر نہیں نکلی تھی۔ کیونکہ نہ تو کوئی شور سنائی دیا تھا اور نہ ہی گرد مٹی اڑتی دکھائی دی تھی۔ جو بڑے پیمانے پر فوجی نقل و حرکت میں لازمی ہوتی ہے۔

لیکن یہ میرے محسوسات تھے جو غلط بھی ہو سکتے تھے۔ ممکن تھا کہ آرگون کی فوج قلعے سے باہر آ کر ہماری طرف پیش قدمی کر رہی ہو اور وہ خاموشی سے آ رہی ہو۔ اگرچہ اس صورت میں اعلانِ جنگ کی قطعی ضرورت نہیں تھی۔ میں کنفیوز ہو رہا تھا اس لیے میں نے نزدیک جا کر دیکھنے کا فیصلہ کیا۔ قلعوں سے کچھ آگے نکل کر میں نے ایک جگہ رکتے ہوئے روبیر کے توسط سے تیر اندازوں کو ہدایات دیں۔ ایک تو یہ کہ وہ ممکن حد تک چھپ کر چلیں گے۔ دوسرے آواز نہیں پیدا ہو اور نہ ہی وہ میرے حکم کے بغیر تیر چلائیں گے۔ بے شک ان پر حملہ بھی کیا جائے۔ تب بھی وہ جوابی کارروائی کے لیے میرے حکم کا انتظار کریں گے۔ میں

کوشش کر رہا تھا کہ باغات کے درمیان سے گزروں۔ اوّل مجھے خدشہ تھا کہ آرگون کے گشت کرنے والے دستے یہاں موجود ہو سکتے ہیں۔ دوسرے مجھے ہارن، اسمارا اور گوز جیسے جانوروں کی طرف سے بھی خدشہ تھا۔ ان سب خطرات سے بچنے کے لیے درختوں کی آڑ اور خاموشی بہترین دفاع ہوتی۔ ہم تیز لیکن چپ چاپ قدموں سے آگے بڑھ رہے تھے۔ یہ درمیانی رفتار سے بھاگنے جیسی چال تھی۔ مجھے رودبہ کا خیال بھی تھا کہ وہ لڑکی تھی اور شاید ہماری جتنی رفتار سے نہیں بھاگ سکتی تھی۔ حفظ ماتقدم تیر اندازوں نے تیر کمانوں سے لگا رکھے تھے اور وہ ایک سیکنڈ میں تیر چلانے کو تیار تھے۔

آدھے گھنٹے بعد ہم قلعے کے سامنے کھیتوں تک پہنچ گئے تھے اور یہاں سے باغات کا سلسلہ ختم ہو گیا تھا جو ہمیں آڑ مہیا کر رہا تھا۔ قلعہ اب بھی کوئی دو میل کی مسافت پر تھا۔ مگر اسے فاصلے سے اس کی فصیل اور گیٹ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ گیٹ بند تھا۔ نہ صرف بڑا ایک چھوٹا گیٹ بھی بند تھا اور فصیلوں پر سپاہ نظر آ رہی تھی۔ گیٹ کے ساتھ ہی فصیل پر چوڑی سی جگہ لوگ زیادہ جمع تھے اور ان کے رنگ برنگے ملبوسات مجھے اتنی دور سے بھی دکھائی دے رہے تھے۔ ہم جس جگہ نکلے تھے یہ گیٹ سے خاصی دور تھی۔ یعنی ہم بائیں طرف نکل آئے تھے اور آرگون کے مغرب کی طرف تھے ہمیں گیٹ کے سامنے پہنچنے کے لیے مشرق کی طرف جانا تھا۔ ہم ایک بار پھر باغوں میں گھسے اور اس طرف بڑھنے لگے۔ تیکی بار قرنا کوئی ایک منٹ تک پھونکا گیا تھا مگر اس کے بعد خاموشی تھی۔

سوال یہ تھا کہ اگر قرنا اعلان جنگ کے لیے پھونکا گیا تھا تو ایک بار کے بعد دوبارہ کیوں نہیں پھونکا گیا اور یہاں جنگ کی بجائے مجھے دفاعی انتظامات نظر آ رہے تھے یعنی قلعہ بند تھا اور فصیلوں پر سپاہ لگی ہوئی تھی جو دفاع کے لیے لگائی جاتی ہے۔ دس منٹ بعد ہم قلعے کے گیٹ کے عین سامنے تھے اور یہاں سے فصیل کا بچ جوم حصہ بھی دکھائی دے رہا تھا۔ اس جگہ سے قلعے کے دروازے تک کوئی فصل لگی ہوئی تھی اور اس کے پودے کوئی چار فٹ اونچے ہو چکے تھے۔ اگر ہم ان میں چھپ کر آگے بڑھتے تو شاید ہم قلعے والوں کی نظروں سے چھپ سکتے تھے۔ مگر زیادہ لوگ اس میں نہیں چھپ سکتے تھے۔ میں نے فصل کا معائنہ کیا اور رودبہ سے کہا۔ "میرے ساتھ آؤ ہمیں قلعے تک جانا ہے۔"

وہ خوفزدہ نہیں ہوئی تھی مگر اس نے تجسس سے پوچھا۔ "میں وجہ جان سکتی ہوں جناب اور ان کو بھی ساتھ رکھنا ہے۔"

"نہیں یہ یہیں رہیں گے۔" میں نے حکم دیا۔ "ان سے کہو اگر کوئی ہنگامی حالت دیکھیں تو ہماری مدد کو آئیں ورنہ اسی جگہ موجود رہیں اور چھپ کر رہیں سامنے آنے سے گریز کریں۔"

رودبہ نے میرا حکم ان کے گوش گزار کیا اور ہم فصل میں آگے بڑھے۔ ایک چھوٹا سا خالی حصہ تھا جو ہم نے چاروں ہاتھوں پیروں سے طے کیا اور پھر فصل تک آئے۔ جیسے ہمارے ہاں گندم کی فصل میں راستے بنے ہوتے ہیں اسی طرح یہاں فصل میں راستے تھے۔ پودے کسی حد تک گندم سے مشابہ تھے مگر ان پر اب تک بالیاں نہیں آئی تھیں میں نے رودبہ سے پوچھا۔ "یہ کس چیز کی فصل ہے۔"

"اس پر بیج آتے ہیں۔" اس نے بتایا۔ "ہم ان بیجوں کو بالیوں سے نکال کر اور خشک کر کے ذخیرہ کر لیتے ہیں اور پھر انہیں پیس کر اور سالم بھی خوراک کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔"

اس نے دانوں کا جو رنگ اور سائز بتایا وہ بھی گندم سے ملتا جلتا تھا۔ شاید یہ گندم کی تبدیل شدہ شکل تھی۔ میں نے بہت بلندی پر اگنے والی گندم بھی دیکھی ہے جسے بگ وائٹ کہتے ہیں۔ اس کا پودا پست قامت اور بالیاں ذرا مختلف انداز کی ہوتی ہیں۔ اس کا رنگ بھی سنہری کی بجائے سفید ہوتا ہے۔ مگر یہ پودا بلندی اور انداز میں ہماری دیسی گندم سے مشابہ تھا۔ رودبہ نے کہا۔ "ہم چھپ کر جا سکتے ہیں۔"

"وہ کیسے؟"

"اس نے چند پودے توڑے اور ان کا گٹھا بنا کر اپنے سر کے سامنے کر لیا۔ اگر ہم اسے یوں لے کر چلیں تو دور سے دیکھنے والا انہیں پودے ہی سمجھے گا۔"

"تم نے اچھی ترکیب بتائی ہے۔" میں نے تعریفی انداز میں کہا تو وہ خوش ہو گئی۔ میں نے اپنے لیے بھی چند پودے توڑ کر ان کا گٹھا بنایا اور اسے چہرے کے آگے کر لیا۔ اب ہم جھک کر اور پودے آگے کیے ہوئے چل رہے تھے۔ جیسے جیسے فصیل نزدیک آ رہی تھی ہم مزید جھکتے جا رہے تھے۔ اگرچہ یہ کام آسان نہیں تھا رودبہ کا نہیں معلوم مگر میری کمر دکھنے لگی تھی۔ کہیں کہیں فصل پانچ فٹ تک بھی اونچی ہوئی تھی اور یہاں ہم سیدھے ہو کر چلتے تھے۔ فصیل نزدیک آنے سے دیکھ لیے جانے کا خطرہ بڑھ رہا تھا۔ اوپر سے ہمارے

لباس بھی سفید تھے اور پودوں کی سبزی میں یہ رنگ نمایاں نظر آتا۔ خود کو کیموفلاج کرنے کے لیے ہم نے مزید پودے توڑ کر گٹھا بڑا کیا۔ اس کا وزن خاصا ہو گیا تھا اور روبیر اب تھکی ہوئی لگ رہی تھی۔ وہ نازک لڑکی تھی مگر ہمت کر کے میرا ساتھ دے رہی تھی۔ اب ہم قلعے سے کوئی نصف میل کے فاصلے پر تھے اور جلد ہی فصل کی حد ختم ہو گئی اور اس کے بعد ایک چوتھائی میل تک کھلا میدان تھا اگر ہم اس میں قدم رکھتے تو فوراً ہی نظروں میں آ جاتے۔

مگر آگے جانے کی ضرورت نہیں تھی قلعے کی فصیل پر ہونے والی سرگرمیاں یہاں سے بھی صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ میں نے دیکھا کہ گیٹ کے پاس چوڑے حصے پر مسلح سپاہ کی بجائے سرکاری حکام اور معبد کے پجاریوں کے لباس میں ملبوس افراد زیادہ دکھائی دے رہے تھے۔ کیونکہ اکثر افراد نے سنہری اور سرخی مائل لباس پہن رکھے تھے۔ ایک کے بارے میں مجھے شبہ ہوا کہ وہ فیرون تھا کیونکہ وہ پستہ قد اور گول مٹول سے چہرے والا فرد تھا۔ وہ پجاریوں کے مجمع میں تھا۔ پھر اس مجمع میں ہلچل ہوئی اور ریناٹ کی آمد ہوئی میں نے اسے اس کے مخصوص سرخ اور سنہری لباس سے پہچانا۔ ورنہ اتنے فاصلے سے چہروں کے نقوش واضح نہیں تھے۔ اب تک یہ واضح نہیں تھا کہ بیک وقت مہا پجاری اور ریناٹ یہاں کیوں جمع ہوئے تھے۔ کیا وہ جنگ کا آغاز کرنے جا رہے تھے مگر کیرٹ نے مجھے جو بتایا تھا اس کے مطابق فیرون کو سوائے عیاشی کے اور کسی چیز سے دلچسپی نہیں تھی۔ تب وہ یہاں ریناٹ کے ساتھ کیوں آیا تھا؟

میں پودوں کے درمیان اس طرح چھپا ہوا تھا کہ صرف میری آنکھیں باہر دیکھ رہی تھیں۔ روبیر میرے برابر میں بیٹھی تھی اور اس نے بھی خود کو پودوں کے درمیان چھپایا ہوا تھا۔ پودوں میں کیڑے مکوڑے تھے مگر ان کی تعداد کم تھی اور دوسرے انہیں جسم کا ہر شئی لاحق نہیں تھا جو عام طور سے کیڑوں کو ہوتا ہے اور وہ فوراً لباس میں گھس کر ممنوعہ حصوں کی سیاحت شروع کر دیتے ہیں۔ یہاں کا لباس بھی ایسا تھا کہ کیڑوں مکوڑوں کو پوری آزادی دیتا تھا کہ وہ گردن سے لے کر پاؤں تک جہاں چاہیں گھستے پھریں اور اگر وہ گھستے تب بھی ہم سوائے صبر کے اور کیا کر سکتے تھے۔ میری توجہ ویسے بھی فصیل پر تھی۔ تب میں نے دیکھا کہ ایک لمبی سی لکڑی کی بلی لا کر اسے فصیل پر نصب کیا جانے لگا اور اس کے سرے پر جو فصیل سے باہر نکلا ہوا تھا ایک پھندا سا ہوا میں جھول رہی تھی۔ روبیر نے اضطرابی انداز میں کہا۔ ”یہ کسی کو پھانسی دینے جا رہے ہیں۔“

میں حیران ہوا۔ ”صرف پھانسی دینے کے لیے انہوں نے اعلان جنگ والا قرنا پھونکا تھا۔“

”یہ حیران کن بات ہے کیونکہ آج تک ایسا ہوا نہیں ہے۔“ روبیر نے کہا۔ وہ مقامی رسم و رواج اور سرکاری اور مذہبی طور طریقوں سے واقف لگ رہی تھی۔ میں نے پوچھا۔

”کیا یہ قرنا اعلان جنگ کے علاوہ کسی اور موقع پر بھی پھونکا جاتا ہے؟“

روبیر نے سر ہلایا۔ ”کسی بہت ہی اہم موقع پر جب معاملہ ایسا ہو جس کے بارے میں وادی کے سارے لوگوں کو بتانا ہو۔“

”عام طور سے سورج نکلنے تک آرگون کے لوگ کام کرنے کے لیے باہر نکل آتے ہیں مگر اس وقت تک کوئی باہر نہیں آیا ہے بلکہ چھوٹا گیٹ بھی بند ہے۔“

”وہ لوگ اس وقت اندر میدان میں جمع ہوں گے۔ شاید کسی اہم اور بڑے فرد کو سزائے موت دی جا رہی ہے۔ اس لیے سب جمع ہوں گے۔“

روبیر کی بات سن کر میرے اندر سرسراہٹ سی ہوئی تھی۔ مگر میں نے اس وقت توجہ نہیں دی تھی میری توجہ فصیل پر ہونے والی سرگرمیوں پر تھی۔ ریناٹ کی آمد ہو چکی تھی مگر اس کے علاوہ مکمل سکون تھا۔ وہ ایک جگہ بیٹھ گیا تھا جہاں سے وہ واضح دکھائی دے رہا تھا۔ مہا پجاری دوسری طرف پجاریوں کے جھرمٹ میں براجمان تھا۔ میں نے اس کے آس پاس کیرٹ کو دیکھنے کی کوشش کی مگر وہ تھا تب بھی نظر نہیں آیا تھا۔ ریناٹ کی آمد کے چند لمحے بعد فصیل پر ایک بڑا سا بگل نما آلہ نمودار ہوا۔ یہ اتنا بڑا تھا کہ اسے پہیوں والی گاڑی پر رکھا ہوا تھا اور اسے فصیل کے کنارے تک لایا گیا۔ بگل کا منہ باہر کی طرف تھا۔ میں نے پوچھا۔ ”یہ اعلان کرنے والا قرنا ہے؟“

”ہاں یہی ہے۔ اسے دوبارہ بجایا......“

ابھی روبیر کا جملہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ فضا میں اس آلے کی مہیب آواز گونجی۔ کسی انسان میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ پھونک مار کر اس سے آواز برآمد کرتا اس کام کے لیے اس کے ساتھ ہی ہوا پھینکنے والا آلہ لگا ہوا تھا ایک آدمی اس کی چرخی گھما رہا تھا اور قرنے سے آواز برآمد ہو رہی تھی۔ میں نے روبیر سے پوچھا۔ ”اسے پھر کیوں بجایا جا رہا ہے۔“

اس کے چہرے پر تشویش تھی۔ ”میں نہیں جانتی لیکن

شاید یہ ہم لوگوں کے لیے کوئی اشارہ ہے۔''

''ہمارے لیے اشارہ؟''

''ہاں کیونکہ آرگون کے سب لوگ قلعے میں جمع ہو گئے ہوں گے تو اب یہ ہمارے لیے اشارہ ہے۔''

''کیا ہمارے لیے اس پر عمل کرنا لازمی ہے۔''

اس نے ہچکچا کر کہا۔ ''شاید۔''

میں نے سوچا اور فوری فیصلہ کیا۔ ''ہمیں واپس جانا ہوگا۔''

مجھے خیال آیا تھا کہ کہیں سامیرا کو میری طرف سے حکم کی ضرورت نہ ہو اور وہ اس کے بغیر قدم نہ اٹھائے۔ اس لیے میرا جانا ضروری تھا۔ کیونکہ شاید وقت نہیں تھا اور اب جاتے ہوئے احتیاط بھی ممکن نہیں تھی اس لیے اب میں اور روبیر واپسی کے لیے دوڑنے لگے۔ عقب میں کچھ شور ہوا تھا۔ شاید ہمیں دیکھ لیا گیا تھا۔ مگر غنیمت رہا تھا کہ ہم پر تیر نہیں برسائے گئے۔ ورنہ ہم بہت زیادہ دور بھی نہیں تھے۔ کم سے کم مشتی تیروں کی زد میں تو تھے۔ ڈیڑھ میل کا فاصلہ ہم نے دس منٹ میں طے کیا اور باغات تک پہنچ گئے تھے وہاں سے تیرانداز دستہ بھی ہمارے ساتھ ہولیا اور چار میل کا فاصلہ طے کر کے ہم آدھے گھنٹے بعد واپس سامیرا والے قلعے کے سامنے تھے۔ جب میں گیا تو قلعہ بند ہو رہا تھا مگر اس وقت نہ صرف سامیرا بلکہ بہت سے دوسرے لوگ بھی قلعے سے نکل آئے تھے۔ میں نے جاتے ہی سامیرا سے پوچھا۔ ''آپ لوگ باہر کیوں آئے ہو؟''

''آرگون کی طرف سے بلاوا ہے۔'' وہ بولی۔

میں نے سر ہلایا۔ ''وہاں کسی کو سزائے موت دینے کی تیاری ہو رہی ہے اور قرنا دوسری بار پھونکا گیا ہے۔ روبیر کا کہنا ہے اس کا کوئی خاص مطلب ہو سکتا ہے۔ آپ کیا کہتی ہیں؟''

''بالکل خاص مطلب ہے۔ یہ قرنا دوسری بار پھونکے جانے کا مطلب ہے کہ وادی کے سارے لوگ ابھی اس جگہ نہیں پہنچے جہاں ان کو کچھ دکھانا اور بتانا مطلوب ہے۔ انہیں ایک بار پھر حکم دیا جا رہا ہے کہ وہ پہنچ جائیں۔''

میں نے اس سے بھی وہی سوال کیا۔ ''کیا آپ لوگوں پر اس بلاوے کی تعمیل فرض ہے۔''

''ہاں کیونکہ قرنا اصل میں مہاپجاری کی طرف سے پھونکا جاتا ہے۔''

''لیکن اگر قرنا ریناٹ کے حکم سے پھونکا جا رہا ہے تو کیا یہ دھوکا نہیں ہو سکتا ہے۔ وہ اس بہانے ہمیں بلائے اور اچانک حملہ کر دے۔''

سامیرا کے چہرے پر تشویش تھی۔ ''ایسا ہونے کا امکان ہے لیکن بہت ہی کم کیونکہ قرنا پھونکنے کا اختیار اصل میں معبد کے پاس ہے اور ہماری خانہ جنگی میں معبد اب تک غیر جانبدار ہے۔''

''برف والے کے بارے میں بھی بات کہی جاتی ہے کہ وہ غیر جانبدار ہے لیکن وہ اس جنگ میں واضح طور پر تمہاری حمایت کر رہا ہے کیا اسی طرح ریناٹ کسی طریقے سے معبد کی حمایت حاصل نہیں کر سکتا ہے۔''

سامیرا کے چہرے پر اب بے بسی کے آثار نظر آنے۔ اس نے کہا۔ ''تم ٹھیک کہہ رہے ہو حالات بہت تیزی سے بدل رہے ہیں جو پہلے نہیں ہوتا تھا وہ اب ہو رہا ہے۔ تم جانتے ہو کئی صدیوں بعد شاید یہ قرنا اس طرح پھونکا گیا ہے۔ ورنہ جب موران کو سزائے موت دی جا رہی تھی تب بھی قرنا نہیں پھونکا گیا تھا۔ دوبارہ سے پھونکنے کا مطلب یہی ہے کہ وادی کا ہر باسی حاضر ہو جائے۔''

''تب آپ نے کیا سوچا ہے؟''

''یہی بات ہے میں الجھ گئی ہوں اس لیے اب فیصلہ تم نے کرنا ہے؟''

''کیا آپ کسی طرح برف والے سے رابطہ کر کے مشورہ کر سکتی ہیں؟''

وہ چونکی اور پھر جوش سے کہا۔ ''یہ تم نے اچھا مشورہ دیا ہے۔ جب تک تم یہاں موجود لوگوں کو منظم کرو میں آتی ہوں۔''

سامیرا قلعے کے اندر چلی گئی۔ میں نے سومرو، بیناٹ اور کانیٹوری کی مدد سے پہلے ان کی سپاہ کو منظم کیا۔ اس بار وہ جلدی اور بہتر انداز میں دستوں کی صورت میں آ گئے۔ میں نے ان سے کہا کہ وہ ممکنہ جنگ کے لیے تیار ہو کر چلیں گے۔ میرے فیصلے کے بعد وہ خود کو تیار کرنے لگے۔ عام افراد کا جانا بھی لازمی تھا کیونکہ سامیرا بتا چکی تھی کہ سب کا حاضر ہونا ضروری تھا۔ میں نے عام افراد کو بھی مختلف گروہوں میں بانٹ دیا۔ ایسے معمر خواتین و حضرات جو از خود مشکل سے چلتے پھرتے تھے ان کے ساتھ نوجوان عورتیں لگا دیں کہ وہ انہیں کسی بھی موقع پر بوڑھے گئے میں سہارا دیں۔ اسی طرح جن عورتوں کے زیادہ چھوٹے بچے تھے ان کے ساتھ ہی لڑکیاں اور عورتیں لگا دیں کہ وہ ان کی مدد کریں۔ مقصد کسی دھوکے کی صورت میں منظم انداز میں پسپا ہونا تھا تاکہ جانی نقصان کم سے کم ہو۔

ممکن تھا کہ برف والا ہمیں نہ جانے کا مشورہ دیتا مگر میں نے خود کو دوسری صورت حال کے لیے تیار کر لیا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ قرنا دو گھنٹے کے وقفے کے بعد پھونکا گیا تھا اور شاید اب مزید دو گھنٹے بعد پھونکا جاتا۔ ابھی سامیرا نہیں آئی تھی مگر میں نے چار چار رضاکار سپاہیوں پر مشتمل کوئی ایک درجن دستے آگے روانہ کر دیے کہ وہ جا کر آرگون کی فوج کی حرکت پر نظر رکھیں اور اگر وہ ہمارے خلاف کہیں جانی بچھایا جا رہا ہو تو پیشگی خبردار کریں۔ سامیرا کو گئے ہوئے ایک گھنٹا ہونے کو آیا تھا۔ تینوں قلعوں کی ساری ہی آبادی باہر آ چکی تھی۔ سامیرا کی آمد میں دیر ہو رہی تھی اور میں نے تینوں فوجوں کو حکم دیا کہ وہ بتدریج نیم دائرے میں پھیل کر آگے بڑھیں۔ حکم ملنے پر عام افراد فوج کے پیچھے جائیں گے۔ دوسری صورت میں وہ بھی واپس آ کر قلعوں کی حفاظت کے فرائض سنبھال لیں۔ اسی اثنا میں سامیرا باہر آ گئی۔ مجھے اس کا چہرہ دمکتا ہوا لگا تھا۔ میں نے پوچھا۔

''رابطہ ہوا؟''

اس نے سر ہلایا۔ ''ہاں اور برف والے نے جانے کا مشورہ دیا ہے اس نے ایک بات اور کہی ہے کہ وہاں جو دیکھیں اسے صبر اور حوصلے سے برداشت کریں۔''

میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ ''شاید ایسا ہی کرنا پڑے۔ آؤ اب چلیں ورنہ وہ پھر قرنا پھونکیں گے۔''

''جب تک سب جمع نہیں ہو جائیں گے وقفے وقفے سے قرنا پھونکا جاتا رہے گا۔'' سامیرا نے تصدیق کرتے ہوئے کہا۔

''بس تو پھر چلنا چاہیے۔'' میں نے قدم آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ سامیرا میرے ساتھ تھی۔ ہم روانہ ہوئے تو قلعے کے عام لوگ بھی ہمارے ساتھ چل پڑے تھے۔ میں نے روبیر کی مدد سے پہلے ہی انہیں سمجھا دیا تھا کہ وہ ہجوم کی صورت میں سفر نہ کریں بلکہ ٹکڑیوں کی صورت میں پھیل کر چلیں اور ہر ٹکڑی کے ساتھ حفاظت کے لیے کچھ سپاہی بھی ہوں۔ آرگون کی طرف سے نہ سہی لیکن راستے میں جانوروں کا خطرہ بھی تھا۔ میں نے سامیرا سے پوچھا۔ ''اس وادی میں اتنے خطرناک جانور ہیں تو تم لوگوں نے انہیں ختم کیوں نہیں کر دیا؟''

''کیونکہ برف والے اس سے منع کرتے ہیں۔ کئی بار ایسا ہوا کہ ان جانوروں کو ختم کرنے کی بات کی گئی اور حکمران اور پجاری اس کے لیے راضی بھی ہو گئے تھے مگر برف والے کا حکم آ گیا اور کوئی اس سے انحراف نہیں کر سکا۔''

''مگر اب برف والے کی بات نہیں مانی جا رہی ہے اس کے خلاف سازشیں ہو رہی ہیں۔''

''میں نے کہا نا حالات بہت تیزی سے بدل رہے ہیں۔'' سامیرا بولی۔ اس نے ایک لاٹھی تھام رکھی تھی اور اسے زمین پر رکھتی ہوئی چل رہی تھی۔ اگرچہ وہ پوری طرح صحت مند تھی اور اسے سہارے کی ضرورت نہیں تھی مگر شاید یہ اس کا عصائے حکمرانی تھا۔ لوگ بہت تھے اور ان میں بہت سے ضعیف، بچے اور حاملہ عورتیں بھی تھیں اس لیے قافلے کی رفتار سست تھی۔ جو فاصلے ہم نے جاتے ہوئے پون گھنٹے اور آتے ہوئے آدھے گھنٹے سے کچھ اوپر وقت میں طے کیا تھا وہی فاصلہ اس بار طے کرنے میں کوئی سوا گھنٹا لگ گیا اور تب ہم قلعے کے سامنے پہنچے۔ سامیرا کی سپاہ پہلے ہی پہنچ گئی تھی اور قلعے سے کچھ دور پوزیشن لیے ہوئے تھے۔ شاید پہلی بار دونوں فوجیں آمنے سامنے آئی تھیں۔ سامیرا کے پہنچتے ہی اوپر کچھ ہلچل مچی تھی اور ایک فرد آگے آیا۔ اس نے بھونپو نما چیز اٹھا رکھی تھی اور اسے اپنے منہ سے لگا کر اس نے چلا کر کہا۔

''شاہ اعظم اور مہا پجاری سامیرا اور اس کے ساتھیوں کو قلعے کی فصیل کے پاس آنے کی دعوت دیتے ہیں تاکہ وہ ٹھیک سے دیکھ سکیں اس منظر کو جس کے لیے انہیں یہاں بلایا ہے۔''

ایسے بھونپو اور گرجدار آواز والے سامیرا کے پاس بھی تھے اس نے اشارہ کیا تو ایک آدمی آگے آیا اور اس نے بھونپو منہ سے لگا کر سامیرا کا جواب اوپر تک پہنچایا۔ ''اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ تم لوگوں کی طرف سے کوئی حملہ یا کارروائی نہیں ہوگی۔''

دوسری طرف سے چند لمحے بعد جواب دیا گیا۔ ''مہا پجاری اور شاہ اعظم ضمانت دیتے ہیں۔ یہ ضمانت سب سن رہے ہیں۔''

''ہمیں جانا ہوگا۔'' سامیرا بولی۔

''مجھے ان لوگوں پر اعتماد نہیں ہے۔'' میں نے صاف گوئی سے کہا۔ ''ہمیں منہ اٹھا کر ہرگز نہیں جانا چاہیے۔''

''تب؟''

''ہمیں پورے حفاظتی انتظامات کے ساتھ جانا چاہیے تاکہ اگر فصیل سے حملہ بھی ہو تو ہم اپنا دفاع کر سکیں۔'' میں نے کہا۔ کانیٹور کو اشارہ کیا وہ آگے آیا۔ ''کانیٹور ہم اوپر سے آنے والے تیروں اور نیزوں سے کیسے محفوظ رہ سکتے ہیں۔''

”میرے پاس سپاہی ہیں جن کے پاس بڑی اور بھاری ڈھالیں ہیں وہ مشینی تیر بھی روک سکتی ہیں۔“

”ان سپاہیوں کو بلا لو اور اپنے بہترین تیر اندازوں کو تیار کر لو اگر آرگون کی طرف سے حملہ ہوا تو وہ فصیل پر موجود ریحانت اور اس کے آدمیوں کو نشانہ بنانے کی کوشش کریں گے۔“

کانیتو رنجیدہ ہوا۔ ”وہاں مہا پجاری اور دوسرے پجاری بھی ہیں۔“

میں اس کی ہچکچاہٹ سمجھ رہا تھا۔ ”اپنے آدمیوں سے کہنا کہ انہیں بچاتے ہوئے حملہ کریں۔ اس کے ساتھ ہی وہ گیٹ کے آس پاس موجود پہریداروں کو نشانہ بنائیں۔“

کانیتو نے سر ہلایا اور اپنے آدمیوں کو دے دیا۔ یہ وہ دیرینہ افراد تھے جنہوں نے بڑی ڈھالیں اٹھا رکھی تھیں اگرچہ یہ لکڑی کی بنی ہوئی تھیں لیکن ان پر چمڑے کے ٹکڑے بھی نصب کیے گئے تھے جن سے ان کی مضبوطی میں اضافہ ہوا تھا۔ جنہیں سنبھالے ہوئے سامیرا اور دوسرے لوگوں کے گرد دستہ بنا رہا تھا اور ہم اس دستے میں آگے بڑھے۔ چوکی یہ میں ہم فصیل سے کوئی سو گز دور تھے۔ یہاں اب فصیل کا منظر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اس سے زیادہ آگے جانے کی صورت میں فصیل کی بلندی کی وجہ سے اس کے اوپر کا منظر اتنا واضح نظر نہیں آتا۔ سامیرا نے خود اونچی آواز میں پوچھا۔ ”ریحانت تم نے مجھے اور سب لوگوں کو کیوں بلایا ہے اور قرنا پھونکنا صرف معبد والوں کا حق ہے تم نے کب یہ حق حاصل کیا؟“

”قرنا معبد کی طرف سے ہی پھونکا گیا ہے۔“ بھونپو والے نے جواب دیا۔ ”معاملہ بھی معبد کا ہے۔ اسی لیے وادی کے ہر فرد کو یہاں جمع کیا گیا ہے۔“

”ایسا کون سا معاملہ ہے جس کے لیے سب کو یہاں بلایا گیا ہے۔“

اس بار مہا پجاری فیرون اٹھ کر آگے آیا اور اس نے اپنی مخصوص پُر خمار آواز میں کہا۔ ”اب تک تنازعہ وادی کے لوگوں کے درمیان تھا۔ اس لیے معبد اس جھگڑے میں غیر جانبدار تھا۔ مگر اب جھگڑے میں کچھ غیر وادی والے بھی شامل ہو گئے ہیں اور ان میں سے ایک فرد اس وقت بھی سامیرا کے ساتھ ہے۔ یہ اوپر سے وادی میں آیا اور معبد کی طرف سے اسے سزائے موت سنائی گئی مگر یہ بارن کے سامنے سے فرار میں کامیاب رہا۔ یہ سامیرا کے پاس ہے اور میری اطلاع کے مطابق یہ سامیرا کی فوج کا سربراہ بن گیا ہے۔ گویا معبد کا مجرم سامیرا کے ساتھ ہے اور اسی لیے اب معبد نے اس جنگ میں ریحانت کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا ہے۔“

”شہباز غیر ہے لیکن یہ از خود یہاں نہیں آیا ہے۔“ سامیرا نے بلند آواز سے کہا۔

”کیا میں بات کر سکتا ہوں؟“ میں نے سامیرا سے پوچھا۔ اگرچہ وہ مختار کل بن چکی تھی مگر یہ موقع ایسا تھا کہ میں نے اس سے پوچھ لینا مناسب سمجھا۔ سامیرا نے سر ہلایا اور آہستہ سے بولی۔

”کیا تم ایوڈشا اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں بات کرنا چاہ رہے ہو؟“

”ہاں میں ان لوگوں کو بتانا چاہتا ہوں کہ ریحانت نے بھی غیر لوگوں کو پناہ دی ہے اور وہ اس جنگ میں اس کی مدد کر رہے ہیں۔“

”برف والے نے فی الحال اس سے منع کیا ہے۔“

میں حیران ہوا۔ ”مگر کیوں؟“

”برف والے کی باتیں وہ خود ہی جانے۔“

”مگر اس سے میری پوزیشن کمزور ہو جائے گی اور مجھے تمہارے لوگوں کی طرف سے بغاوت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مہا پجاری میرے خلاف ہو گیا ہے اس سے بہت اثر پڑے گا۔“

”مجھ سے جو برف والے نے کہا وہ میں نے تم کو بتا دیا ہے اب آگے تمہاری مرضی ہے کہ تم اس معاملے میں کیا کرتے ہو۔“ سامیرا بولی تو میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔

”ٹھیک ہے میں برف والے کی بات مانتا ہوں اب ان لوگوں سے پوچھو کہ انہوں نے کیوں بلایا ہے اور یہ کسے سزا دینے جا رہے ہیں۔“

سامیرا نے بلند آواز سے پوچھا۔ ”مہا پجاری ہمیں کیوں بلایا گیا ہے؟“

فیرون نے سامیرا کی طرف دیکھا۔ ”معبد کے مفرور مجرم کی مدد کرنے والے کو یہاں سب کے سامنے سزا دی جائے گی۔ تاکہ آئندہ کوئی بھی معبد کے مجرم کی مدد کا سوچ بھی نہ سکے۔“

”کیرت۔“ میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

سامیرا مغموم نظر آنے لگی۔ ”ہاں برف والے نے مجھے بتا دیا تھا کہ آج اس اچھے انسان کا آخری دن ہے۔ اس نے اسی کی موت پر صبر کرنے کو کہا تھا۔“

مہا پجاری بات مکمل کر کے پیچھے اپنی جگہ بیٹھ گیا اور

اب ایسا لگ رہا تھا کہ کیرٹ کو یہاں لایا جانے والا تھا۔ ایسا ہی تھا کیونکہ چند لمحے بعد وہ معبد کے سپاہیوں کے نرغے میں فصیل پر نمودار ہوا۔ پتا نہیں یہ راز کیسے کھلا کہ کیرٹ اصل میں ہمارا ساتھی تھا۔ شاید کسی پجاری نے اسے مجھ سے بات کرتے سن لیا تھا یا جس پجاری سے اس نے کام لیا تھا اس نے غداری کی اور اسے پکڑوا دیا۔ مگر یہاں کے انتظامات دیکھ کر لگ رہا تھا کہ کیرٹ پر مقدمہ چلا کر اسے سزا سنا دی گئی ہے اب صرف عمل ہونا باقی رہ گیا تھا۔ کیرٹ کو باہر نکلی ہوئی جگہ کے پاس لایا گیا۔ یہ دیکھ کر میرے اندر دکھ ابھرنے لگا کہ کل تک معبد کے مہا پجاری کے نائب کے عہدے پر فائز شخص کے جسم پر چوغا تو کیا اس نے صرف پاجامہ پہن رکھا تھا اور اس کا جسم زخموں سے داغ دار تھا۔ یقیناً اس پر بے پناہ تشدد ہوا تھا۔ اس سے نہ تو ٹھیک سے چلا جا رہا تھا اور نہ ہی سیدھا کھڑا ہوا جا رہا تھا۔ مگر کیرٹ کا چہرہ پرسکون تھا۔ اس کی آنکھوں میں وہی چمک تھی اور چہرے پر استقلال تھا۔ حالانکہ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ اسے یہاں کیوں لایا گیا ہے۔ شاید اس نے تبھی یہ اس نے آنے والی موت کو پہلے ہی بھانپ لیا تھا اور برف والے نے بھی پیش گوئی کی تھی۔ اس کے آتے ہی مہا پجاری فیرون اپنی جگہ سے کھڑا ہوا اور اس نے تقریر کرنے کے انداز میں کہنا شروع کیا۔

"یہ شخص جو کل تک میرا نائب اور عظیم معبد کے رازوں کا امین تھا۔ اس نے نہ صرف معبد سے بلکہ مجھ سے اور اس ساری وادی سے غداری کی۔ اس نے معبد کے مجرم کی فرار میں مدد کی۔ اسے ہارون اور اسے جانوروں سے بچانے والا شربت دیا جو معبد کے مقدس رازوں میں سے ایک ہے۔ یہی نہیں اس نے مجرم کو فرار کے لیے راستے بھی سمجھائے۔ اس کی وجہ سے معبد کا ایک اہم ترین خادم مارا گیا۔ باہر سے آنے والوں کی مدد کر کے یہ سزا کا مستحق ہو گیا ہے۔ میں اسے سزائے موت دینے کا حکم دیتا ہوں۔ سزا کے بعد اس کی لاش نامعلوم مقام پر دفنا دی جائے۔"

یہ کہہ کر مہا پجاری واپس اپنی جگہ جا کر بیٹھ گیا اور کیرٹ کو پھانسی دینے کی تیاری کی جانے لگی۔ ایک جلاد سامنے آیا۔ سب دم بخود سے یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ جلاد نے رسی کا پھندا کیرٹ کی گردن میں ڈالا۔ میں بے چین ہو گیا تھا میں نے سامیرا سے کہا۔ "کیا ہم کچھ نہیں کر سکتے کیرٹ کو بچانے کے لیے؟"

"ہم کیا کر سکتے ہیں؟" وہ مغموم لہجے میں بولی۔ "اگر ہم حملہ بھی کر دیں تب بھی کیرٹ نہیں بچے گا۔ یہ اسے فوراً مار دیں گے۔"

"اس جیسے انسان کو اتنی جلدی نہیں مرنا چاہیے۔"

"موت چھوٹا بڑا، اچھا برا نہیں دیکھتی ہے وہ اپنے وقت پر آتی ہے۔" سامیرا نے وہی کہا جو ہمارا بھی عقیدہ ہے۔

"سنو میں فیرون سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"کیا بات کرو گے؟"

"آپ دیکھ لیں گی۔" میں نے کہا اور دو محافظوں کے درمیان سے نکل کر آگے چلا گیا۔ مجھے دیکھتے ہی مہا پجاری اور ریناٹ اپنی جگہوں سے کھڑے ہو گئے تھے۔ مہا پجاری نے چلا کر کہا۔

"یہ رہا معبد کا مجرم۔"

"اگر میں معبد کا مجرم ہوں تو میں خود کو تمہارے حوالے کرنے کو تیار ہوں مگر تم کیرٹ کی سزا معاف کر دو اور اسے واپس اس کا منصب لوٹا دو۔"

ریناٹ نے ترجمے کے فرائض سنبھال لیے تھے۔ اس نے میری بات کا ترجمہ کر کے مہا پجاری اور دوسروں تک پہنچایا۔

"یہ نہیں ہو سکتا۔" وہ سخت لہجے میں بولا۔ "مہا پجاری کے فیصلے تبدیل نہیں ہوتے ہیں۔"

میں نے دیکھا کہ میری پیشکش نے ریناٹ کو مضطرب کر دیا تھا اور اس نے اپنے برابر میں وزیر اعظم مردان سے کچھ کہا۔ وہ اٹھ کر مہا پجاری کی طرف بڑھا تھا۔ میں نے کہا۔ "ریناٹ تم جانتے ہو جو الزام مجھ پر لگا ہے اس کے مرتکب کچھ لوگ اور بھی ہیں اور کیرٹ کو جس جرم کی سزا دی جا رہی ہے وہ یہاں کے کچھ اعلیٰ ترین لوگ کر چکے ہیں۔ تو کیا اکیلے کیرٹ کو سزا دینا قرین انصاف ہو گا۔"

اس کا جواب مردان نے دیا اور وہ آگے آیا۔ "تم ایک مجرم ہو اور تمہیں کوئی حق نہیں ہے کہ شاہ اعظم سے سوال کر دیا ان سے مخاطب ہو۔"

کیرٹ جواب تک خاموش کھڑا تھا اس نے مجھ سے کہا۔ "شہباز ان لوگوں سے بات کرنا بیکار ہے تم اپنی ساری توجہ اس کام پر لگاؤ جس کے لیے تم یہاں آئے ہو اور وادی کو ان ظالموں سے نجات دلا دو۔"

"اس کی زبان بند کر دی جائے۔" ریناٹ نے غضب ناک لہجے میں حکم دیا۔ مگر جلاد ساکت کھڑا رہا۔ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"شاہ اعظم بھول رہے ہیں معبد کے مجرم کو وہ نہ سزا دے سکتے ہیں اور نہ اس پر عمل کروا سکتے ہیں۔"

ریناٹ کھسیا گیا تھا اور فیرون کے چہرے پر قہقہہ سا تاثر آیا اور اس نے بہت غرور سے جلاد کو حکم دیا۔ "اسے لٹکا دیا جائے۔"

میں بے اختیار چند قدم آگے گیا کیونکہ جلاد نے اچانک ہی کیرٹ کو دھکا دیا۔ وہ فصیل کے بالکل کنارے کھڑا تھا اس کا جسم خلا میں گیا اور اگلے ہی لمحے گردن کے بل پھندے کے سہارے جھولنے لگا۔ پھندا سخت ہو گیا تھا اور یقیناً اس کی سانس رک گئی تھی۔ جھولنے کے ساتھ اس کا جسم کچھ دیر کے لیے کانپتا رہا اور پھر ساکت ہو گیا۔ میں نے شدت کرب سے آنکھیں بند کر لیں۔ کچھ لوگ بہت مختصر وقت کے لیے آپ کی زندگی میں آتے ہیں اور وہ آپ کی زندگی کا ایک اہم حصہ بن جاتے ہیں۔ کیرٹ بھی ایک ایسا ہی انسان تھا۔ میں نے اس کا نام سنا، اسے دیکھا، اس سے کچھ دیر کو ملا اور اب میرے سامنے اس کی لاش جھول رہی تھی۔ میں نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا اور دل ہی دل میں کہا۔ "میرے اللہ! اگر میرے نصیب میں کامیابی ہے تو ان لوگوں پر مجھے قابو دینا جو کیرٹ کی موت کے ذمے دار ہیں میں خود ان سے اس موت کا حساب لوں گا۔" پھر میں نے بلند آواز سے کہا۔ "ہمارے ساتھی کیرٹ کی لاش ہمارے حوالے کی جائے۔"

"اس کے بارے میں فیصلہ ہو گیا ہے کہ اسے نامعلوم قبر میں دفنا دیا جائے گا۔"

"شہباز واپس آجاؤ۔" سامیرا نے مضطرب لہجے میں کہا۔ تب میں چونکا۔ فصیل پر ہلچل ہو رہی تھی میں پیچھے ہٹا تھا کہ ایک تیر اوپر سے آیا اور اس جگہ زمین میں لگا جہاں کچھ دیر پہلے میں تھا۔ تیر کسی نے اوپر سے مارا تھا۔ میں بال بال بچا تھا مگر اس وقت مجھے خوف محسوس نہیں ہوا ایسا ہی کوئی دوسرا تیر میرے جسم میں اتر جائے گا۔ میں نے زمین سے تیر اکھاڑا اور اسے بلند کر کے ریناٹ اور فیرون کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ ہے تم لوگوں کی زبان اور ضمانت۔"

چند سپاہی ایک سپاہی کو قابو کر رہے تھے جس نے یہ تیر چلایا تھا۔ سامیرا چلائی۔ "ریناٹ تم دغاباز انسان ہو۔"

"یہ اس شخص کا ذاتی فعل ہے۔" ریناٹ آگے آ کر بولا۔ "اسے سزا دی جائے گی۔"

"تم لوگ اپنی سازشوں پر ایک اور انسان کو قربان کرنے والے ہو۔" میں نے کہا اور پیچھے آ گیا۔ سامیرا نے مجھے ڈھالوں کے پیچھے گھسیٹ لیا تھا۔

"یہ کیا حماقت کر رہے تھے وہیں کھڑے رہے اگر کوئی دوسرا تیر چلا دیتا تو؟"

"میں دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ ایک فرد کی حرکت ہے یا اس میں اور کوئی بھی شامل ہے۔"

"شہباز تمہاری جان بہت قیمتی ہے تمہیں اپنا خیال رکھنا چاہیے۔"

"ابھی آپ کہہ رہی تھیں کہ موت کسی کو نہیں دیکھتی اور وہ اپنے وقت پر آتی ہے۔"

"ہاں مگر کوئی ماں اپنی اولاد کو خطرے میں نہیں دیکھ سکتی۔ میں تمہیں بتا چکی ہوں تم میرے لیے بیٹے کی طرح ہو۔"

میں نے سر ہلایا۔ "یہ آپ کی مہربانی ہے اب ہمیں واپس چلنا چاہیے مگر آپ کی طرح میرا الیقین بھی پختہ ہے کہ موت اپنے وقت پر ہی آتی ہے۔"

میں نے پہلے عام لوگوں کو واپسی کا حکم دیا اور ان سے کہا کہ وہ جس طرح ٹکڑیوں میں آئے تھے اسی طرح واپس جائیں۔ ان کے بعد فوجی دستوں کو پیچھے ہٹنے کو کہا۔ ان میں سے بہت سے دستے پہلے ہی لوگوں کی حفاظت کے لیے دائیں بائیں چل رہے تھے۔ منظم انداز میں پسپا ہوتے ہوئے ہم ایک سوا گھنٹے میں واپس قلعے تک پہنچ گئے۔ کیرٹ کی موت نے دل بوجھل کر دیا تھا مگر ساتھ ہی مجھے اطمینان ہوا تھا کہ فی الحال ریناٹ کا فوج کشی کا ارادہ نہیں تھا اور شاید میرے پاس مہلت تھی کہ میں قلعے کی پیشہ ور سپاہ اور رضا کاروں کو منظم اور جنگ کے لیے تیار کر سکوں۔ عورتیں، بچے اور بوڑھے اس بلا وجہ کے سفر سے تھک گئے تھے واپس آنے پر انہوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ سپاہی اور رضا کار بھی خوش تھے کہ آج کا دن وہ جنگ سے بچ کر آ گئے۔ اب آنے والے دن کی بعد میں دیکھی جائے گی۔ سامیرا نے مجھ سے کہا۔

"تم رات سے مصروف ہو اب کچھ آرام کر لو۔"

"نہیں آج کے لیے میرے ذہن میں اور بھی کام ہیں آرام میں رات میں ہی کروں گا۔"

یہ باقی دن میں نے بہت مصروف گزارا۔ سب سے پہلے اسلحہ خانے کا معائنہ کیا۔ ان کے پاس ہتھیار تسلی بخش مقدار میں تھے۔ مگر میں نے اسلحہ خانے کے انچارج کو مزید ہتھیاروں کی تیاری کا حکم دیا۔ پھر میں نے خوراک کے

ذخیروں کا جائزہ لیا۔ یہ لوگ کئی طرح کے اجناس کھاتے تھے مگر مرکزی خوراک وہی گندم نما اناج تھے۔ کچھ سبزیاں اور پھل ذخیرہ کیے جا سکتے تھے لیکن تازہ سبزیاں اور پھل روز کے روز اتار کر لائے جاتے تھے۔ ان کی مقدار گھٹتی اور بڑھتی رہتی تھی۔ گوشت، دودھ، مکھن، دہی اور انڈوں کے لیے ان کے پاس جانور اور پرندے تھے۔ مگر ان کی تعداد اتنی زیادہ نہیں تھی کہ اس پوری آبادی کی خوراک کی ضروریات پوری کی جا سکتیں۔ روشنی ختم ہونے سے پہلے میں نے قلعوں کے کمزور پہلوؤں کا جائزہ لیا۔ جہاں جہاں مجھے کمزوری نظر آئی میں اسے ٹھیک کرنے کا حکم بھی دیتا رہا۔ قلعوں کے آس پاس زمین پر مٹی، پتھر اور ملبہ جمع ہو گیا تھا جس سے فصیلوں کی اونچائی کم ہوئی تھی۔ میں نے اسے بھی اٹھانے کا حکم دیا۔ میں جو حکم بھی دے رہا تھا اس کی فوری تعمیل کی جا رہی تھی۔ تمام شعبوں کے انچارج میرے ساتھ ہی تھے۔

جس شعبے سے متعلق فرد کی ضرورت ہوتی میں روہیر کی مدد سے اس سے بات کر لیتا تھا۔ یوں رفتہ رفتہ میں یہاں کے لوگوں سے بھی واقف ہو رہا تھا۔ ان میں سے کچھ باصلاحیت نوجوان بھی تھے۔ میں نے ان میں سے نصف درجن نوجوان چن لیے اور انہیں اپنے لیے مخصوص کر لیا کہ جب میں کوئی کام کہوں یا کوئی حکم دوں تو ان کے توسط سے اس کی تعمیل ہو سکے۔ ایک طرح سے وہ میرے قاصد ہوتے۔ ان سب سے فارغ ہو کر میں نے سومرو، عیناث اور کانفیور سے ایک میٹنگ کی اور ان سے کہا کہ کل اپنے اپنے دستوں کے بہترین آدمی قلعے کے عقب میں صبح سویرے جمع کریں۔ میں ان کی کارکردگی دیکھوں گا۔ ہر آدمی کم سے کم پچاس آدمی لائے۔ مجھے امید تھی کہ ہزار سپاہیوں کی فوج میں ڈیڑھ سو اعلیٰ درجے کے سپاہی ضرور ہوں گے۔ ساتھ ہی میں نے واضح کر دیا کہ میرے حکم کی حرف بہ حرف تعمیل ہو اس میں کوئی کوتاہی برداشت نہیں کی جائے گی۔ جب میں نے یہ بات کہی تو سومرو کے چہرے پر کسی قدر تکدر نظر آیا تھا۔ شاید اس لیے کہ اب تک وہ اپنے طور پر سپاہ سالار رہا تھا اور اب اسے میری ماتحتی کرنا پڑ رہی تھی اور دوسرے میں یہاں کے مقامی فنون جنگ کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا تھا۔ البتہ کانفیور اور عیناث فرماں برداری سے مجھے یقین دلا رہے تھے کہ میرے حکم کی پوری طرح تعمیل کی جائے گی۔

میں جب رات گئے سامیرا کے مکان پر واپس آیا تو روہیر میرے ساتھ تھی اور سامیرا میرے انتظار میں جاگ رہی تھی۔ اس نے کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ ہم تینوں نے ساتھ ہی کھانا کھایا۔ میں نے اس دوران میں سپاہ کو منظم کرنے اور جنگ کی تیاری کے لیے اپنا بنایا ہوا خاکہ سامیرا کے سامنے پیش کیا۔ سامیرا نے اس کی تائید کی۔ ”تم نے بہت اچھا پلان بنایا مجھے پہلے ہی یقین تھا کہ تم میں قیادت کی صلاحیت ہے اب مجھے پورا یقین ہو گیا ہے۔“

میں نے اس سے کہا۔ ”لیکن مجھے آپ کی رہنمائی کی ضرورت رہے گی۔“

”میرا پورا تعاون تمہارے ساتھ ہے۔“

کیونکہ روہیر کی خدمت میں نے چوبیس گھنٹے کے لیے حاصل کر لی تھی۔ اس لیے سامیرا نے فیصلہ کیا کہ اب وہ بھی سامیرا کے مکان میں رہے کہ میں جب چاہوں اسے طلب کر سکوں۔ سامیرا کے مکان میں کئی کمرے تھے۔ ان میں سے ایک روہیر کے سپرد کر دیا گیا۔ میں گزشتہ رات بلکہ اس سے بھی پہلے سے مصروف تھا اور سونے کا وقت بہت کم ملا تھا۔ اس لیے جب کھانے کے کچھ دیر بعد بستر پر لیٹا تو مجھے خبر بھی نہیں ہوئی اور میں سو گیا۔ اب تک مجھے کچھ سوچنے اور اپنے پیاروں کو یاد کرنے کا موقع بہت کم ملا تھا۔ مگر رات خواب میں، میں نے سویرا کو دیکھا۔ وہ میرے پاس آئی تھی اور میرے بستر کے کنارے بیٹھی تھی۔ اس نے جھک کر اپنا نرم و نازک ہاتھ میرے بالوں میں پھیرا اور پھر سمٹ کر میرے پاس لیٹ گئی۔ میں نے اس کی طرف کروٹ لی اور سرگوشی میں پوچھا۔

”سویرا میں کب سے منتظر ہوں کہ تم اس طرح میرے پاس آؤ۔ مگر تم نہیں آتیں۔“

”میں تو ہوں ہی آپ کی۔“ اس نے تیز سانسوں کے درمیان کہا۔ ”اب آپ کے پاس ہوں۔“

اس کے قرب کی گرمی مجھے محسوس ہو رہی تھی۔ ”سویرا تم کبھی میرے اتنے پاس نہیں آئیں۔“

”اب آؤں گی۔“ اس نے کہا اور میری طرف جھکی تھی کہ میری آنکھ کھل گئی۔ سویرا میری طرف ہی جھکی ہوئی تھی اور اس کے نرم و نازک لبوں کا لمس میرے چہرے پر تھا۔ اچانک مجھے جھٹکا لگا۔ سویرا بھلا یہاں کہاں؟ میں اٹھا تھا کہ وہ ہڑبڑا کر پیچھے ہٹی۔ اس سے پہلے کہ وہ دور ہوتی میرا بازو اس کے گرد حائل ہو گیا تھا۔ کمرے میں تاریکی تھی مگر نرم و گداز جسم کی ساخت اور اس سے اٹھتی خوشبو نے مجھے بتا دیا کہ وہ روہیر تھی۔ میں ششدر رہ گیا تھا جو لڑکی سارے دن میرے ساتھ رہی اور اس نے ایک بار بھی مجھ پر اپنی

نسوانیت نہیں جتائی اور نہ آزمائی تھی وہ رات کی اس تاریکی میں یوں چوری چھپے کیوں چلی آئی اور یہ سب کیوں کررہی تھی۔ میں نے آہستہ سے کہا۔ "روبیر تم ..."

"مجھے معاف کردیں۔" وہ بے بسی کے لہجے میں بولی۔

میں اٹھ بیٹھا اس کے گرد سے اپنا بازو ہٹالیا تھا مگر اس کی کلائی پکڑلی۔ "روبیر یہ کیا حرکت ہے تم رات کی تاریکی میں میرے پاس آئی ہو اس کا کیا مطلب ہے؟"

وہ کسمسائی۔ "مجھے جانے دیں۔"

اب مجھے سمجھ میں آیا کہ میں خواب اور حقیقت کو ملا کر دیکھ رہا تھا۔ روبیر میرے پاس آئی اور جو خواب میں ہو رہا تھا وہی سب حقیقت میں روبیر کررہی تھی۔ میری آنکھ بر وقت کھل گئی ورنہ شاید میں بہک جاتا اور گناہ کا ارتکاب کر بیٹھتا۔ ابتدائی جذبات تو روبیر کو محسوس کرتے ہی اڑ گئے تھے اور اب مجھے غصہ آرہا تھا۔ مگر میں نہیں چاہتا تھا کہ بات اس سے آگے جائے اور سامیرا کو علم ہو۔ اگر میں غصہ کرتا یا اس سے بات کرتا تو لازمی سامیرا کے علم میں بات آجاتی۔ اگرچہ وہ میرے بارے میں اچھا گمان کرتی تھی مگر آدمی کی فطرت ہے کہ اسے بدگمان ہونے میں بھی زیادہ دیر نہیں لگتی ہے۔ روبیر سے میں بعد میں بھی بات کرسکتا تھا۔ میں نے اس کی کلائی چھوڑ دی اور آہستہ سے کہا۔ "ٹھیک ہے جاؤ لیکن کسی کو علم نہ ہو کہ تم رات کو یوں میرے پاس آئی تھیں۔"

وہ خاموشی سے لباس سمیٹ کر اٹھی تب مجھے پتا چلا کہ اس نے اپنے کرتے کا پٹکا بھی کھول دیا تھا۔ یہاں مرد اور عورت دونوں میں اندر کا رخش پہننے کا رواج نہیں تھا۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ وہ اس سے نابلد تھے۔ میں نے اب تک یہاں صرف یہی گھٹنوں تک آتے کھلے کرتے اور پاجامے دیکھے تھے۔ اس کے علاوہ بھی کوئی لباس تھا تو ابھی تک میرے مشاہدے میں نہیں آیا تھا۔ وہ کچھ دیر وہیں کھڑی اپنا پٹکا بند کرتی رہی پھر کمرے سے نکل گئی۔ ایک لمحے کو پردہ ہٹا تو باہر کہیں روشن مشعل کی روشنی اندر تک آئی تھی۔ یہاں سردی تھی اور میں نے سوتے وقت کرتا اتار دیا تھا صرف پاجامے میں تھا۔ مجھے پیاس لگ رہی تھی۔ جذبات کی گرمی اور پھر غصے نے میرا گلا خشک کردیا تھا۔ میں نے اٹھ کر پاس رکھے جگ سے پانی پیا اور دوبارہ لیٹ گیا۔ شیطان نے اس حوالے سے دماغ خراب کرنے کی کوشش کی تو لاحول پڑھی اور کچھ دیر بعد میں دوبارہ سوگیا تھا۔ اس کے بعد میری آنکھ خود بہ خود ہی صبح کے قریب کھل گئی۔ ابھی باہر تاریکی تھی اور میرے پاس وقت جاننے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا مگر میری چھٹی حس نے خبردار کیا کہ صبح قریب تھی۔

میں اٹھ کر باہر آیا تو سامیرا اپنے کمرے میں سو رہی تھی۔ میں نے آسمان کی طرف دیکھا وہاں تارے چمک رہے تھے۔ اگر چاند نکلا ہوتا تو پھر دھند چھا جاتی۔ میں نے نہانے دھونے کے لیے مخصوص ٹب کے پانی سے ہلکا پھلکا غسل کیا۔ یہاں گرد نہیں تھی اور نہ ہی گرمی ایسی تھی کہ پسینہ آئے لیکن کل میں نے خاصا سفر کیا تھا اور مجھے دونوں چیزوں سے واسطہ پڑا تھا اس لیے میں نے غسل کرلینا مناسب سمجھا۔ کپڑے صاف تھے میں نے نہا کر وہی پہن لیے۔ اس دوران میں آسمان پر روشنی نمودار ہونے لگی اور اس کے ساتھ ہی زمین سے بخارات اٹھنے لگے تھے۔ یعنی صبح ہو رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی پرندوں کی چہچہاہٹ شروع ہوگئی۔ وادی میں پائے جانے والے پرندے وہی تھے جو باقی دنیا میں پائے جاتے ہیں۔ یہاں میں نے چڑیا، مینا، کوے اور دوسرے پرندے دیکھے جو آبادیوں میں بھی نظر آتے ہیں۔

جنگل میں نظر آنے والے پرندے الگ قسم کے تھے۔ میں باہر نکل آیا۔ البتہ یہ لوگ مرغی سے ملتے جلتے پرندے پالتے تھے اور ان کے انڈے اور گوشت ان کی خوراک کا ایک حصہ تھا۔ مگر ان کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔ شاید یہ ہماری مرغیوں کی طرح زود نسل نہیں تھیں۔ جیسے ایک زمانے میں ہماری دیسی مرغی کم انڈے دیتی تھی اور کڑک زیادہ رہتی تھی۔ انڈوں اور مرغی کے گوشت کی بہتات فارمی مرغی آنے کے بعد ہوئی تھی۔ میں نے روبیر کو نہیں جگایا تھا۔ اسے آواز دیتے اور جگاتے ہوئے مجھے جھجک سی ہو رہی تھی۔ مگر اس کے بغیر چارہ بھی نہیں تھا یہاں سامیرا کے بعد میری زبان صرف وہی سمجھتی تھی اور اس لحاظ سے دیکھا جائے تو وہ میری ترجمان تھی۔ ابھی میں واپس جا کر اسے بلانے کا سوچ رہا تھا کہ وہ خود باہر نکل آئی۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ "آپ اٹھ گئے؟ مجھے کیوں نہیں آواز دی۔"

"میں اٹھانے والا تھا۔" میں نے کہا۔

"میں آپ کے لیے ناشتا لاتی ہوں۔" اس نے اپنے سنہری مائل بے پناہ گھنے بال سمیٹ کر ان کا جوڑا بناتے ہوئے کہا۔ اس کے بال لمبے زیادہ نہیں تھے مگر گھنے بہت تھے۔ اس وقت وہ سادگی و پرکاری کی مثال نظر آئی اور میں کچھ دیر کے لیے اسے دیکھتا رہ گیا۔ اس کا گلابی رنگ سرخ ہوگیا اور وہ جلدی سے اندر کی طرف بڑھ گئی۔ اس

کے جانے کے بعد میں نے لاحول پڑھی۔ اب تک میں نے اسے اس نظر سے دیکھا نہیں تھا وہ میرے لیے بس ایک ساتھی تھی مگر گزشتہ رات کے واقعے کے بعد میرے اندر تبدیلی آنا فطری بات تھی۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ میرے لیے بس عورت بن کر رہ گئی تھی۔ مگر اب وہ پہلے جیسی ساتھی بھی نہیں رہی تھی۔ مجھے رہ رہ کر خیال آ رہا تھا کہ اس نے رات میرے کمرے میں اور میرے پاس آنے کی کوشش کیوں کی؟

اگر اسے مجھ سے دل چسپی تھی تو یہ دل چسپی دن میں کیوں نظر نہیں آئی جب وہ سارا دن میرے ساتھ ہوتی تھی اور بہت سارے مواقعوں پر ہم بالکل اکیلے ہوتے تھے۔ تب بھی وہ کوشش کر سکتی تھی۔ مجھ پر اپنی پسند واضح کر سکتی تھی۔ مگر شاید یہاں اس کا رواج نہیں تھا۔ جیسا کہ ساری دنیا کا چلن ہو گیا ہے کہ اب محبت کا مطلب جسمانی تعلق ہوتا ہے تو شاید وہ بھی یہی سوچ کر رات کی تاریکی میں میرے پاس آئی تھی۔ لیکن اگر یہ یہاں کی عام سوچ ہوتی تو سامیرا نے بھی راجا عمر دراز سے محبت کی تھی مگر اس نے اس کے پاس آنے کی کوشش نہیں کی جب کہ راجا عمر دراز بہت دنوں تک اس کے ساتھ اسی گھر میں رہا اور بہت وقت اکیلا بھی رہا جب سامیرا کا باپ اور گان کسی کام سے باہر گیا ہوتا تھا۔ مگر اس کی محبت ایک روایتی مشرقی لڑکی کی محبت تھی جس میں جسمانی تعلق کا خیال بھی نہیں آیا تھا۔ صرف سامیرا ہی نہیں راجا عمر دراز بھی کردار کا پکا تھا۔ میں برآمدے میں ناشتے کا انتظار کر رہا تھا۔ بھوک تو نہیں تھی مگر میں نے سوچا کہ ایک بار نکلنے کے بعد نہ جانے کب فرصت نصیب ہو اس لیے ناشتا کر لینا ہی مناسب تھا۔ کچھ دیر بعد روویر نے ناشتا تیار ہونے کی اطلاع دی۔ میں نے سر ہلایا۔ ”ٹھیک ہے لے آؤ لیکن جلدی، آج کام بہت زیادہ ہیں۔“

ناشتے میں وہی دلیہ نما چیز تھی جو میٹھی ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ میٹھی ٹکیاں اور ساتھ میں چائے تھی۔ رات کے برعکس روویر نے میرے ساتھ ناشتا نہیں کیا تھا۔ میں نے کہا لیکن وہ بولی کہ اسے بھوک نہیں ہے۔ رات اس نے کچھ زیادہ کھا لیا تھا۔ میں ناشتا کر رہا تھا کہ سامیرا بھی اٹھ کر آ گئی۔ اس نے پوچھا۔ ”شہباز کیسے ہو رات ٹھیک سے نیند آئی تھی؟“

میں نے بے ساختہ روویر کی طرف دیکھا تو اس نے نظریں جھکا لی تھیں۔ میں نے جواب دیا۔ ”ہاں ٹھیک سے نیند آئی۔ لیکن آج آپ دیر سے اٹھی ہیں۔“

”میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔“ اس نے بتایا۔ ”لیکن اب ٹھیک ہے۔“

شاید اس نے کل بہت سفر کیا تھا اور پھر کیرٹ کا صدمہ بھی تھا۔ میں نے اسے مختصراً بتایا کہ آج میں کیا کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں اور استدعا کی۔ ”میں نے کل قلعوں کی مرمت کے کام شروع کرائے تھے۔ آپ ان کا معائنہ کر لیں کہ وہ کام ٹھیک سے ہوئے ہیں یا مزید کام کرانے کی ضرورت ہے۔ میں نے حکم دیا تھا کہ کسی جگہ دیوار کی اونچائی دس ہاتھ سے کم نہ ہو اور ہر پانچ ہاتھ کے بعد فصیل پر برج بنائے جائیں جہاں سے حملہ آوروں پر تیر برسائے جا سکیں۔“

”میں دیکھ لوں گی۔“ سامیرا نے کہا۔ ”تم بہت تیزی سے سب کر رہے ہو۔ یہاں کے لوگوں کو اتنی عجلت میں کام کی عادت نہیں ہے۔“

”کیونکہ وقت نہیں ہے۔“ میں نے چائے کا آخری سپ لیا اور کھڑا ہو گیا۔ ”ان لوگوں کو تیزی سے کام کرنے کی عادت ڈالنی ہو گی۔ مجھے بہر صورت جنگ سے پہلے فوج کو اس قابل بنانا ہے کہ وہ کم سے کم آرگون کی فوج کا مقابلہ کر سکے۔ اب مجھے اجازت دیں۔“

”مجھے یقین ہے تم ایسا کر لو گے۔“ سامیرا ہمیں دروازے تک چھوڑنے آئی تھی۔ ”یہاں کے لوگوں میں یہ چیز نہیں ہے شاید تبھی برف والے نے تمہارا انتخاب کیا ہے۔“

”آپ شاید مجھ سے بہت زیادہ توقع لگا رہی ہیں لیکن یہی بات ہے کہ میں صرف ایک انسان ہوں اور پہلی بار ایسا کوئی کام کرنے جا رہا ہوں۔ میری پوری کوشش ہو گی کہ آپ کو مایوس نہ کروں۔ مگر کامیابی یا ناکامی اوپر والے کے ہاتھ میں ہے۔“

”مجھے تمہاری صلاحیت اور قسمت پر پورا یقین ہے کیونکہ تم اچھی نیت والے انسان ہو۔ اوپر والا ہمیشہ انسان کی نیت دیکھتا ہے۔“ سامیرا نے کہا اور مجھے رخصت کر کے اندر پلٹ گئی۔ روویر میرے ساتھ تھی۔ اب مجھے موقع ملا تھا۔ قلعے سے باہر جاتے ہوئے میں نے اس سے پوچھا۔

”رات تم کیوں میرے کمرے میں میرے پاس آئی تھیں؟“

اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ اس نے کسمسا کر کہا۔ ”میں نہیں بتا سکتی۔“

”کیوں؟“

"بس نہیں بتا سکتی۔" اس نے بے بسی سے میری طرف دیکھا۔ "آپ چاہیں تو مجھے سزا بھی دے سکتے ہیں۔ مجھے خود سے الگ کر سکتے ہیں۔"

"سامیرا نے مجھے تمام اختیارات دے دیے ہیں مگر میں کسی کو سزا نہیں دے سکتا اور تم کو بھی نہیں دے سکتا۔ ٹھیک ہے اگر تم بتانا نہیں چاہتیں تو تم اس کی مجاز ہو۔ مگر میں بتا دوں مجھے یہ بات بالکل اچھی نہیں لگی ہے اور اگر تمہارے ذہن میں اس حرکت کا پھر سے ارادہ ہے تو اسے فوراً ذہن سے نکال دو۔"

اس نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔ "مجھے خود بھی یہ بات اچھی نہیں لگی اور میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ اب آپ کو شکایت نہیں ہوگی۔"

مجھے حیرت ہوئی کہ اس حرکت کے پیچھے کیا اسرار تھا جب کہ خود اسے بھی یہ حرکت پسند نہیں آئی تھی۔ ہم قلعے کے سامنے والے حصے میں پہنچ گئے تھے جہاں رات کو نگرانی اور حفاظت کرنے والے دستے موجود تھے۔ میں نے قلعوں کی حفاظت کرنے والے سپاہیوں کی تعداد بڑھا دی تھی تاکہ کسی غیر متوقع حملے کی صورت میں باقی فوج کے آنے تک وہ حملہ آوروں کا مقابلہ کر سکیں۔ پہلے رات کے وقت کسی بھی قلعے پر ایک درجن سے زیادہ سپاہی نہیں ہوتے تھے۔ اب ان کی تعداد ہر قلعے میں تیس سے کم نہ تھی۔ قلعوں کے چاروں طرف فصیلوں پر تیز روشنی والی مشعلیں لگائی گئی تھیں تاکہ کوئی تاریکی میں چھپ کر ان کے نزدیک نہ آ سکے۔ جب ہم قلعے سے باہر آئے تو اسی وقت تینوں قلعوں سے سپاہیوں نے باہر نکلنا شروع کر دیا تھا۔ آج سب پوری طرح مسلح اور تیار ہو کر آ رہے تھے۔

سب کو بڑے قلعے کے عقب میں واقع میدان تک جانا تھا اور میں ایسی جگہ کھڑا ہو گیا جہاں سے تینوں قلعوں سے نکلنے والوں کو دیکھ سکوں۔ وہ سب قطار بنائے بڑے قلعے کے عقب میں جا رہے تھے۔ جب سب نکل گئے تو میں اور سدھیر ان کے پیچھے قلعے کے عقبی حصے میں پہنچے جہاں تینوں فوجوں کے دستے الگ الگ کھڑے تھے۔ انہوں نے مکمل جنگی لباس، کھوپڑی سے بنی زرہ بکتر اور خود پہنے ہوئے تھے۔ کلائیوں اور پنڈلیوں پر لکڑی کے ہی ٹکڑے بندھے تھے جو ہاتھوں اور پیروں کو لاٹھی کی ضرب سے بچاتے۔ تقریباً سب ہی بہترین صحت کے مالک تھے۔ اور اپنے انداز سے ہی پیشہ ور سپاہی نظر آتے تھے۔ ان کے ہتھیار تیز اور بہترین حالت میں تھے۔ اپنے اپنے آدمیوں کے سامنے سو مرد، ہتھیار اور کانٹے رکھے کھڑے تھے۔

میں نے گھوم پھر کر ان کا معائنہ کیا۔ ہر دستے میں کم و بیش پچاس افراد تھے۔ یہ سب جسمانی طور پر مضبوط، چاق و چوبند اور اپنے انداز سے ہی تربیت یافتہ نظر آتے تھے۔ میں نے ان میں سے بھی انتخاب کیا اور ہر دستے سے دس بارہ افراد الگ کیے۔ میں جس کی طرف اشارہ کرتا وہ الگ ہو جاتا۔ وہ ایک طرف جا کر کھڑا ہو جاتا۔ اب سب ہی جان گئے تھے کہ اس جگہ کا حکمران یا منتظم میں تھا اور میرے ہر حکم کی تعمیل ان لوگوں پر لازمی تھی۔ کچھ دیر میں میں نے کوئی پینتیس افراد الگ کر لیے تھے اور سدھیر کی مدد سے ان سے کہا۔ "میرا خیال ہے تم سب اچھے لڑاکے ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ تم دوسروں کو تربیت دو لیکن اس سے پہلے تمہیں ثابت کرنا پڑے گا کہ تم لوگ اس قابل ہو۔"

"ہم ہر امتحان سے گزرنے کو تیار ہیں۔" انہوں نے جواب دیا۔

انہیں ان کی کیٹگری کے لحاظ سے الگ کیا گیا اور ان کا امتحان لیا جانے لگا۔ تقریباً دو گھنٹے تک جاری رہنے والے اس امتحان میں انہوں نے ثابت کیا کہ وہ سب نہایت اہل اور ماہر لڑاکا تھے۔ معمولی لڑائی سے لے کر دست بدست لڑائی میں انہوں نے اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کیا تھا۔ میں نے ان پر جو اعتماد کیا تھا وہ اس پر پورا اترنے کے اہل تھے۔ میں نے ان سے کہا۔ "اب تم لوگ براہ راست میری نگرانی میں اور میرے ماتحت ہو۔ تم میں سے ہر فرد رضاکاروں میں سے بیس افراد چنے اور آج ہی سے ان کی تربیت شروع کر دے جو تم کو آتا ہے وہ انہیں اپنے طور پر سکھاؤ اور اس کام میں جس سامان اور مدد کی ضرورت ہو تم مجھ سے کہو گے۔ یاد رہے سیکھنے اور سکھانے کا یہ کام کل وقتی ہوگا اور تم لوگ بس یہی کرو گے۔ تمہیں اپنے ماتحتوں پر مکمل اختیار ہوگا۔ ان کی کارکردگی یا نااہلی کی ذمہ داری تم لوگوں پر ہوگی۔"

وہ پُرجوش نظر آنے لگے۔ اب تک وہ ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے تھے یا بس آپس میں ہی کچھ مشقیں کر لیتے تھے اب ان کو باقاعدہ ایک پروگرام ملا تھا اور ان سے کچھ کر گزرنے کو کہا گیا تھا۔ میں نے واضح کیا کہ وقت کم ہے اور انہیں آج کے دن ہی نہ صرف اپنے لیے افراد چن لینے ہیں بلکہ ان کی تربیت بھی شروع کر دینی ہے۔ چنے ہوئے افراد کو انکار کا حق نہیں ہوگا۔ اگر ایک فرد کو دو استاد منتخب کر لیں تو اسے حق ہوگا کہ وہ کس کے پاس تربیت حاصل کرنا چاہتا

ہے۔بہترین کارکردگی دکھانے والوں کو آگے فوج میں عہدے دیے جائیں گے۔ میں نے کہا۔ "شام تاریکی سے پہلے میں تم سب کو یہاں دیکھوں گا۔"

یہ لوگ چلے گئے تو میں نے سومرو، ریناٹ اور کا نیٹور سے کہا۔ "اب اپنی باقی فوج کو بلاؤ۔ آج میں ان کی مشقیں دیکھنا چاہتا ہوں۔ اگر ان میں کوئی کمی ہے تو اسے دور کرنا تم تینوں کی ذمے داری ہوگی۔ ہمیں فوج کو جلد از جلد اس قابل بنانا ہے کہ وہ ریناٹ کی فوج کے کسی ممکنہ حملے کا مقابلہ کر سکیں۔"

وہ میرے حکم کی تعمیل میں لگ گئے۔ ایک گھنٹے سے بھی کم وقت میں باقی تمام فوج بھی میدان میں آ گئی تھی اور ان کی ایک ایک سپاہی کی بنیاد پر جانچ ہونے لگی۔ سومرو، ریناٹ اور کا نیٹور خود اپنے سپاہیوں کی عملی استعداد کا جائزہ لے رہے تھے اور مجھے لگ رہا تھا کہ شاید انہوں نے پہلی بار یہ کام کیا تھا۔ ورنہ اس سے پہلے فوج بس لگے بندھے انداز میں مشقیں کرتی تھی اور از خود تربیتی پروگرام پر عمل پیرا تھی۔ یہ پہلا موقع تھا جب انہیں گروپ کی صورت میں مشقیں کرائی جا رہی تھیں۔ فوج میں بنیادی یونٹ نہیں تھے۔ بس سو سوا سو افراد پر مشتمل ایک بڑا گروپ ہوتا تھا جس کا سربراہ براہ راست سومرو، ریناٹ اور کا نیٹور کے ماتحت ہوتے تھے۔ گویا افسران کی تعداد کم تھی۔ میں نے ان تینوں کو ٹاسک دیا کہ بیس سے پچیس افراد پر مشتمل گروپ تیار کریں ان کا سربراہ ایک فرد ہو۔ ہر چار گروپ پر ایک بڑا افسر ہو اور وہ افسران کو جواب دہ ہو۔

میں چاہتا تھا کہ ہمارے پاس کم سے کم سترہ سو افراد پر مشتمل اور مکمل تربیت یافتہ فوج ہو۔ جسے معلوم ہو کہ کن حالات میں اسے کیا کرنا ہے۔ جنگ کے لحاظ سے کوئی پہلو اس کی حکمت عملی سے باہر نہ ہو۔ یہ آسان کام نہیں تھا۔ اوّل تو اتنی بڑی فوج کو تیار کرنا کہ وہ ایک منظم جتھے کی صورت اختیار کرے۔ مہینوں کا کام تھا اور ہمارے پاس بالکل بھی اتنا وقت نہیں تھا۔ ریناٹ لازمی جنگ کا منصوبہ بنائے ہوئے تھا مگر کسی وجہ سے وہ اب تک جنگ ٹال رہا تھا۔ مگر جب اسے اطلاع ملتی (جو لازمی ملتی، مجھے یقین تھا کہ یہاں ریناٹ کے جاسوس موجود تھے اور اس تک یہاں کی رپورٹس پہنچائی جا رہی تھیں۔) کہ سامیرا کی فوج کو تیزی سے بڑھایا اور منظم کیا جا رہا ہے تو وہ یقیناً حرکت میں آتا اور تب ہمیں قبل از وقت جنگ کا سامنا کرنا پڑ سکتا تھا۔

میں نے سب سے زیادہ ترجیح تیر اندازوں کو دی تھی۔ یہ شعبہ جتنا موثر ہوتا دشمن کو اتنا ہی نقصان پہنچاتا۔ سترہ سو کی فوج میں سات سو تیر انداز ہوتے، پانچ سو لاٹھی بردار اور پانچ سو دوسرے طریقوں سے جنگ لڑنے والے ہوتے۔ رضا کاروں کے بارے میں، میں نے ابھی نہیں سوچا تھا مگر موقع ملتا تو میں انہیں دوسرے شعبوں میں استعمال کرتا۔ فوج کو لڑنے کے لیے عقب سے مسلسل رسد کی ضرورت ہوتی ہے اور فی الحال اس کا بھی کوئی باقاعدہ نظام نظر نہیں آ رہا تھا۔ مجھے اس پر کام کرنا تھا مگر پہلے دن میں سب نہیں کر سکتا تھا۔ یہ سارا دن اسی میں گزر رہا تھا۔ بہ مشکل مجھے دوپہر کا کھانا کھانے کا موقع ملا۔ عملی طور پر میں ان کے طریقہ جنگ میں حصہ لینے کے قابل نہیں تھا کیونکہ مجھے نیزہ، تیر کمان اور لاٹھی میں سے کچھ بھی چلانا نہیں آتا تھا۔ مگر میں یہ جان سکتا تھا کہ ان ہتھیاروں کو استعمال کرنے والوں کی کارکردگی جانچ سکوں۔ میں یہی کام کر رہا تھا۔

باقاعدہ سپاہ میں جن سپاہیوں کی کارکردگی مطلوبہ معیار سے کم تھی۔ ان کے لیے الگ سے تربیتی گروپ بنائے گئے اور انہیں دوسرے تمام کاموں سے ہٹا کر صرف تربیت حاصل کرنے اور اپنی جنگی استعداد بڑھانے پر لگا دیا گیا۔ ان کی بڑی تعداد پہرے داروں پر مشتمل تھی۔ میں نے باقاعدہ سپاہ کو فی الحال پہرے سے ہٹا لیا اور یہ کام رضا کاروں کے سپرد کر دیا۔ تین سو رضا کاروں پر مشتمل ایک دستہ تشکیل دیا۔ جو دن رات چوبیس گھنٹے قلعے اور اس کے آس پاس کی نگرانی کرتا۔ تینوں قلعوں میں نگرانی کے لیے ٹاورز تھے مگر ان کی اونچائی چالیس فٹ سے زیادہ نہیں تھی۔ میں نے ان کی بلندی ستر فٹ تک کرنے کا حکم دیا۔ لکڑی سے بنے ان ٹاورز کی بلندی بڑھانا اتنا مشکل کام نہیں تھا اور دو دن میں یہ کام ہو سکتا تھا۔ بڑھئی اس کام میں لگ گئے۔

اگلے دن میں نے سامان رسد کا جائزہ لینا شروع کیا۔ یہاں خوراک کا انچارج سیبوٹ نامی شخص تھا۔ اجناس، پھل، سبزیاں اور کھانے پینے کا دوسرا سامان جیسے گوشت، دودھ، انڈے، مکھن، شہد اور دوسری اشیا اس کے پاس آتی تھیں وہی ان کو ذخیرہ کرنے اور آگے لوگوں میں تقسیم کرنے کا ذمے دار تھا۔ یہ بہت اہم ذمے داری تھی اور سیبوٹ بہت طویل عرصے سے اسے خوش اسلوبی سے ادا کر رہا تھا۔ میں نے اس سے دریافت کیا کہ سپاہیوں کے لیے خوراک کا الگ کوٹہ ہے۔ اس نے بتایا کہ ایسے کسی کوٹے کا وجود نہیں ہے۔ میں نے اس کے ذمے لگایا کہ سپاہیوں

کے لیے الگ سے کوئی مخصوص کیا جائے اور ان کے لیے تینوں وقت کا کھانا تیار کر کے مہیا کیا جائے۔ کھانے کا معیار اور مقدار سپاہیوں کے حساب سے رکھی جائے۔ قوت بخش ترجیحی بنیاد پر پہلے سپاہیوں کو دی جائیں اور اس کے بعد دوسرے افراد کو یہ چیزیں دی جائیں۔

اب تک سپاہی ڈیوٹی دیتے اور گھر چلے جاتے تھے میں نے ان پر پابندی لگا دی کہ وہ ڈیوٹی کے بعد گھر نہیں جائیں گے بلکہ اپنی یونٹ کے ساتھ رہیں گے۔ ان کو صرف محدود مدت کے لیے گھر جانے کی اجازت ہوگی اور وہ بھی انہیں پیشگی لینا ہوگی۔ بتائے بغیر یونٹ سے جانے والوں کو تعدیبی کارروائی کا سامان کرنا پڑے گا۔ اس کے علاوہ بھی میں نے کچھ قوانین و اصول بنائے اور ان کی پابندی لازمی قرار دے دی۔ ان میں سے ایک یہ تھا کہ سپاہی کسی عام جھگڑے میں ملوث نہیں ہوں گے اور نہ کسی عام آدمی کے خلاف اپنی جنگی تربیت یا ہتھیار استعمال نہیں کریں گے۔ ایسا کرنے والے کو سخت سزا دی جائے گی۔ کیونکہ فوج کی بنیادی ذمے داری عوام کی ان خطرات سے حفاظت کرنا ہوتا ہے جن سے عوام خود اپنی حفاظت نہیں کر سکتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے عوام سے پیسا لے کر فوج پر خرچ کیا جاتا ہے اور انہیں دنیا جہان کی سہولتیں دی جاتی ہیں۔ اس لیے عوام کا خیال رکھنا ان کا فرض ہے۔

ان لوگوں کو منظم اور مضبوط کرنے کے ساتھ ساتھ میں کسی ایسے ہتھیار یا جنگی تدبیر کے بارے میں سوچ رہا تھا جو ان میں رائج نہ ہو اور آرگون والے اس سے بے بس ہو جائیں۔ مگر فی الحال میرے ذہن میں ایسا کوئی ہتھیار نہیں آ رہا تھا جو یہاں مہیا کیا جا سکے اور ہم اس سے کام لے سکیں۔ یہاں دھاتیں نہیں تھیں اور تقریباً ہر چیز لکڑی یا پتھر سے بنائی جاتی تھی۔ یہاں کے لوگ گوپھن کے ماہر بھی تھے۔ یعنی رسی کے سرے پر پتھر باندھ کر اور اسے گھما کر مارنے کے ماہر تھے۔ محدود فاصلے کی جنگ میں یہ مہلک ہتھیار تھا اور اس کی درست ضرب آدمی کا کام تمام کر سکتی تھی۔ اس طرح سخت لکڑی کے دو طویل ٹکڑے رسی کی مدد سے آپس میں جوڑ کر اس سے لڑنے کے ماہر بھی تھے۔ یہ ہمارے ہاں چینی مارشل آرٹ کے ہتھیار نن چکو سے ملتا جلتا ہتھیار تھا۔ مگر اسے اس طرح استعمال نہیں کیا جاتا تھا جیسے نن چکو استعمال کیا جاتا ہے۔

میں اس قسم کی جنگوں کے بارے میں اپنی محدود معلومات سے کام لے رہا تھا جو میں نے مطالعے سے حاصل کی تھیں یا فلموں میں دیکھا تھا۔ میرے بنائے تربیتی دستے نے اپنا کام شروع کر دیا۔ اپنے اپنے زیر تربیت افراد انہوں نے پہلے دن ہی چن لیے تھے۔ تینتیس افراد نے کوئی سات سو افراد کو تربیت کے لیے چنا تھا۔ یہ سب تقریباً نوجوان یا جوان تھے۔ ان کی عمریں سولہ سے چالیس کے درمیان تھیں۔ تقریباً سب کی صحت بہت اچھی تھی۔ مگر میں نے پھر بھی ان کا معائنہ کیا اور جو مجھے ٹھیک نہیں لگا اسے خارج کر دیا اور اس دستے کے سربراہ کو دوسرا فرد چننے کو کہا۔ ساتھ ہی انہیں گائیڈ لائن دے دی۔ "تم جسے چنو اس کی صحت اچھی ہونی چاہیے تاکہ وہ مسلسل تربیت کے عمل سے گزر سکے۔ یوں سمجھو کہ اب صبح سے شام تک تم لوگوں کا کام یہی ہوگا۔"

میں صبح کا جاتا اور رات گئے واپس آتا تھا۔ کھانا کھا کر میں کچھ دیر سامیرا سے تبادلہ خیال کرتا۔ اسے رپورٹ دیتا اور اس کے ذمے کوئی کام لگایا ہوتا تو اس کی رپورٹ لیتا تھا۔ سامیرا نے اپنے چند ماتحت رکھ لیے تھے ان سے معمولی کام لیتی تھی جن کے لیے پہلے اسے خود جانا پڑتا تھا۔ میں نے جن چھ افراد کو منتخب کیا تھا وہ یا تو میرے ساتھ ہوتے تھے یا پھر جس کام میں لگاتا وہ کام کرتے تھے۔ ابتدائی چند دن میں، میں نے کم سے کم اپنے بنائے خاکے کے مطابق پروگرام پر عمل شروع کر دیا تھا۔ میری سب سے زیادہ توجہ فوج پر مرکوز تھی کہ اسے جلد از جلد بہترین حالت میں لے آؤں۔ اس کے ساتھ میں اپنے لیے کچھ لوگ منتخب کر رہا تھا اس وقت میں نے سوچا نہیں تھا کہ میں ان سے کیا کام لوں گا۔ مگر میں پھر بھی چن رہا تھا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ کون با صلاحیت اور مخلص ہے۔ میں ایسے ہی لوگوں کو ترجیح دے رہا تھا اور یہ تقریباً سارے ہی تیس بائیس برس کے نوجوان تھے۔ میں نے خاص خیال رکھا تھا کہ وہ سب لڑنے کے ماہر ہوں۔

روبیر ویسے تو ترجمان کے طور پر میرے ساتھ تھی مگر میں نے اسے کہا کہ وہ فارغ وقت میں تربیتی مشقوں میں حصہ لیا کرے۔ خود میں بھی مشقوں میں حصہ لے رہا تھا۔ لاٹھی چلانا مجھے آتا تھا اس لیے میں تیر اندازی کی مشقیں کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی جسمانی مقابلوں میں حصہ لیتا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ میں مقامی لوگوں کو ٹریننگ کرتا تھا جب میں کسی سے تماشائی مقابلہ کرتا تو دیکھنے والے خاصے جمع ہو جاتے تھے۔ بہت سے داؤ پیچ ان کے لیے نئے اور انوکھے ہوتے تھے۔ میں ان سے کہتا کہ وہ دیکھیں سیکھیں

اور اپنی جسمانی مشقوں میں یہ داؤ پیچ شامل کریں۔ ایک ہفتے سے بھی کم وقت میں وہاں کا ماحول بدل کر رہ گیا تھا۔ سپاہیوں اور سیکھنے والوں میں ایک جوش و خروش آ گیا تھا۔ وہ دل و جان سے سب کر رہے تھے۔ ان کی وجہ سے قلعوں کا ماحول بھی بدل گیا تھا۔ بچے اور عورتیں تک ان تربیتی سیشن میں دلچسپی لینے لگے تھے۔

میں اس رات میں واپس آیا تو گزشتہ روز سے زیادہ تھکن تھی کیونکہ آج میں نے جسمانی مقابلوں میں بیک وقت تین افراد سے لڑ کر انہیں زیر کرنے کا مظاہرہ کیا تھا۔ مجھے خاصی چوٹیں بھی لگی تھیں اور تھکن بھی ہو رہی تھی۔ مگر مجھے سامیرا سے کچھ باتیں کرنی تھیں۔ ایک تو میں جاننا چاہتا تھا کہ اس کے جاسوسوں نے آرگون سے کیا رپورٹ بھیجی ہے اور اس نے جو بتایا۔ وہ مایوس کن تھا۔ اس سے کہیں زیادہ تو میں دیکھ کر آیا تھا۔ بہ قول جاسوسوں کے آرگون میں امن و سکون تھا۔ میں نے کہا۔ "مجھے لگ رہا ہے وہاں آپ کے جاسوس شاید گوشہ نشین قسم کے لوگ ہیں جن کو علم ہی نہیں کہ باہر کیا ہو رہا ہے؟"

سامیرا نے بھری تائید کی۔ "تم ٹھیک کہہ رہے ہو جاسوس بالکل بھی ٹھیک اطلاع نہیں بھیج رہے ہیں۔"

سامیرا نے بتایا تھا کہ شہر میں موجود جاسوس اصل میں جناث کا شعبہ تھے اور وہی ان سے رابطہ کرتا تھا۔ مجھے خیال آیا۔ "گیرٹ نے مجھ سے کہا تھا کہ شہر میں ایک درجن گروہ ہیں جو بیرونی حملے کی صورت میں اندر سے ہماری مدد کریں گے۔ اس نے مجھے نقشے پر ان کی نشان دہی بھی کی تھی کہ یہ کہاں کہاں ہیں۔"

سامیرا نے نفی میں سر ہلایا۔ "ہم ان کے بارے میں مکمل نہیں جانتے ہیں۔ جناث نے کبھی مجھ سے ان کا ذکر نہیں کیا۔"

جناث ذرا ست الوجود اور دماغی لحاظ سے بھی ست آدمی لگتا تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ اس نے اتنی اہم ذمے داریاں کیوں لی ہوئی تھیں۔ جب کہ وہ ٹھیک سے انہیں پورا بھی نہیں کر پا رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ اس سے خود بات کروں گا اور موضوع بدل دیا۔ "میں نے فوج کی تنظیم نو شروع کر دی ہے۔ مستقل سپاہیوں کی تعداد بڑھا رہا ہوں اور رضا کاروں کی تعداد کم کر دی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ قاسم رہنے والے لوگ میرے سپرد کیے جائیں میں ان سے کچھ کام لینا چاہتا ہوں۔"

"تم جیسے چاہو گے ویسا ہی ہوگا۔" سامیرا نے جواب دیا۔

"دوسرے میں چاہتا ہوں کہ آپ اپنے لوگوں کو حریت کے لحاظ سے متحرک کریں۔ ان سے بات کریں بلکہ ہر دوسرے تیسرے دن سب کو جمع کر کے انہیں بتائیں کہ آرگون میں ان کو پھر سے غلام بنانے کی سازشیں ہو رہی ہیں اور اگر انہوں نے ان سازشوں کو ناکام نہ بنایا تو ان کی آنے والی نسلیں ان کی بدترین غلامی کریں گی۔"

"میں کروں گی۔"

میں رات سونے کے لیے لیٹا تو مجھے کئی دن کے بعد رودیر کی حرکت کا خیال آیا تھا۔ بہت زیادہ مصروفیت میں اس کے بارے میں سوچنے کا موقع کم ملتا تھا۔ سچ تو یہ ہے میں نے رودیر میں کردار کی کوئی خامی نوٹ نہیں کی تھی۔ وہ اس رات کے بعد بالکل ویسی رہی جیسے اس رات سے پہلے تھی۔ پھر اس نے یہ حرکت کیوں کی؟ جب میں نے اس سے پوچھا تو اس نے بہت بے بسی سے جواب دینے سے انکار کیا تھا اور اس انکار کے بدلے ہر سزا بھگتنے کو بھی تیار ہو گئی تھی۔ کیا اسے کسی نے بھیجا تھا؟ کوئی چاہتا تھا کہ میں اس سے غلط تعلق قائم کروں؟ مگر یہاں ایسا کون ہو سکتا تھا؟ ان ہی سوچوں کے درمیان مجھے نیند آ گئی اور تھکن زیادہ تھی اس لیے بے خبر سویا کہ صبح کا پتا نہیں چلا۔ مجھے سامیرا نے اٹھایا تو باہر روشنی نمودار ہو رہی تھی اور سامیرا میرے لیے دوسرا صاف ستھرا لباس لائی تھی۔ یہاں کپڑے گندے نہیں ہوتے تھے مگر وہ ہر دوسرے دن مجھے صاف لباس مہیا کرتی تھی۔ اس نے کہا۔

"تم نہا لو تب تک میں ناشتا بناتی ہوں۔"

"مجھے شرمندگی ہوتی ہے آپ اس طرح میرے لیے سب کرتی ہیں۔ آپ کا رتبہ اس سے کہیں بلند ہے۔"

وہ مسکرائی۔ "ایک ماں کے لیے سب سے بلند رتبہ اپنی اولاد کے لیے کچھ کرنا ہے اس لیے میں جو کر رہی ہوں وہی میرا مقام ہے۔"

"آپ یہاں کی حکمران بھی ہیں۔"

"ہاں مگر یہ عارضی ہے کیونکہ وادی کے قانون کے مطابق کوئی عورت نہ تو حکمران بن سکتی ہے اور نہ مہا پجارن، اس لیے میں نے یہاں بھی حکمران بننے کی کوشش نہیں کی۔ میں صرف ایک منتظم ہوں۔ میں نے بارہا یہاں کے لوگوں سے کہا کہ وہ کسی شخص کو حکمران چن لیں مگر وہ اس کے لیے راضی نہیں ہیں۔"

"مجھے آپ کے علاوہ کوئی ایسا فرد نظر بھی نہیں آیا جو

یہاں کے معاملات دیکھ سکے۔''

''تب تک مجبوری تھی مگر اب تم آگئے ہو۔''

میں ناشتا کر کے روویر کے ساتھ باہر آیا۔ ہوا میں نمی تھی اور ایسا لگ رہا تھا کہ بارش ہو گی اور ایسا ہی ہوا۔ میرے یہاں آنے کے بعد جو ایک دو بار بارش ہوئی وہ بھی رات میں ہوئی اور ہلکی سی تھی۔ یہ خاصی تیز اور دیر تک برسنے والی بارش تھی۔ جب میں مشقیں دیکھ رہا تھا تو بارش شروع ہو گئی۔ سپاہی اور سیکھنے والے رضا کار اس بارش میں ہی مشقیں کرتے رہے۔ روویر نے مجھ سے کہا۔ ''بارش ہو رہی ہے آپ اندر چلے جائیں۔''

''تمہارا کیا خیال ہے بارش میرا کچھ بگاڑ لے گی۔'' میں نے کہا۔ ''میں یہیں رہوں گا۔''

خود روویر بھی بھیگ رہی تھی اور اس کا کرتا اس کے جسم سے چپک گیا تھا اور وہ کچھ عجیب ہو رہی تھی کیونکہ اس کا بدن نمایاں ہو رہا تھا۔ اگرچہ یہاں کوئی اس کی طرف توجہ نہیں دے رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ ایسی جگہ چلی جائے جہاں بارش سے محفوظ رہ سکے مگر اس نے بھی انکار کر دیا۔ مشقوں کے دوران میں سپاہیوں اور رضا کاروں کو گھوم پھر کر دیکھتا رہا تھا۔ سومرو، بیناث اور کانیو ربھی وہیں موجود تھے اور اپنے اپنے دستوں کی مشقوں کی نگرانی کر رہے تھے۔ آج فل اسکیل مشقیں تھیں جن میں قلعے کی ساری پیشہ ور سپاہ اور نئے تربیت پانے والے رضا کار شامل تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ رضا کاروں کی کارکردگی اور صحت پہلے سے بہت بہتر ہوئی تھی۔ ان کے نرم جسموں پر سخت پٹھے نمودار ہو رہے تھے۔ جو اوور ویٹ تھے ان کا اضافی وزن گھٹ گیا تھا اور جو انڈر ویٹ تھے ان کا وزن بڑھ جاتا تھا۔

میں روزانہ کی بنیادوں پر گزشتہ روز دیئے جانے والے احکامات کی رپورٹ لیتا تھا اور اگر مجھے تسلی بخش جواب نہیں ملتا تو آگے کے لیے مزید احکامات دیتا۔

سپاہیوں کے لیے الگ سے میس قائم کر دیا گیا تھا جہاں انہیں تین وقت کا کھانا مہیا کیا جاتا۔ فوجی یونٹوں کے لیے الگ سے رہائش گاہیں فراہم کی گئی تھیں جہاں سپاہی چوبیس گھنٹے یونٹ کے ساتھ رہتے تھے۔ چند گھنٹے بعد بارش رک گئی۔ اس دوران میں تربیت گاہ کیچڑ آلود ہو گئی تھی مگر سپاہی اسی میں مصروف تھے۔ یہاں کپڑے کی رسد محدود تھی اس لیے سپاہی اب صرف لنگوٹ میں مشقیں کر رہے تھے تاکہ لباس ضائع نہ ہوں۔ وہ لنگوٹ سے ناواقف تھے۔ میں نے ان کو بتایا کہ لنگوٹ کیا ہوتا ہے اور کیسے باندھا جاتا ہے۔ اس سے انہیں بہت آسانی ہو گئی تھی۔ وہ خوش تھے کہ پہلے انہیں لڑائی اور مشقوں کے دوران میں لباس کا خیال رکھنا پڑتا تھا اور اب وہ بے فکری سے سب کرتے تھے۔

بارش کئی گھنٹے جاری رہی تھی اور ہر طرف پانی نظر آ رہا تھا مگر بارش رکنے کے چند گھنٹے کے اندر ہی زمین نے سارا پانی چوس لیا اور اب زمین تقریباً خشک تھی۔ یہ بھی اس وادی کا کوئی نظام تھا ورنہ دھوپ کے بغیر پانی کا اتنی جلدی خشک ہونا ممکن نہیں ہوتا ہے۔ بارش سے پہلے موسم خاصا گرم ہو چلا تھا مگر بارش کے بعد موسم خوشگوار ہو گیا تھا۔ گھریلو استعمال کے لیے پانی کنوؤں سے لیا جاتا تھا اور یہ بہت اچھی قسم کا ہلکا پانی تھا جو نہ صرف پینے بلکہ نہانے دھونے، صفائی اور کھانا بنانے کے لیے بھی بہترین تھا۔ شاید اس وادی میں کوئی مصنوعی چیز یا کیمیکل استعمال نہیں ہوتا تھا اس لیے یہاں ہوا، پانی اور ماحول میں آلودگی بھی نہیں آئی تھی۔ یہ لوگ جہاں زمین کھودتے چند ہی فٹ بعد پانی نکل آتا تھا۔ مگر یہ ہر جگہ کنواں نہیں کھودتے تھے اور جہاں کنواں کھودتے اس جگہ کو مکمل طور پر ڈھک کر رکھتے تھے کہ اوپر سے پانی میں کوئی آلائش یا گند نہ جائے۔

پانی نکالنے کے لیے رہٹ کا نظام تھا۔ جسے مقامی نسل کے بیل چلاتے تھے۔ پانی مسلسل نکل رہتا تھا اور اضافی پانی نالیوں کی مدد سے باہر باغوں تک پہنچایا جاتا تھا۔ سامیرا نے مجھے بتایا کہ آرگون کا سسٹم اس سے کہیں زیادہ ترقی یافتہ تھا۔ وہاں نہ صرف پانی مٹی کے بنے پائپوں کی مدد سے گھروں میں پہنچایا جاتا تھا بلکہ گندے پانی کے نکاس کے لیے زیر زمین سیوریج لائنیں تھیں۔ پختہ سڑکوں پر جمع ہونے والے بارش اور دوسرے پانی کے نکاس کا بھی خاص انتظام تھا۔ وسائل کی کمی اور ہنگامی حالات کی وجہ سے وہ ان قلعوں میں یہ انتظام نہیں کر سکی تھی۔ مگر لوگوں کو گندگی اور بیماریوں سے بچانے کے لیے یہاں بھی سیوریج کا زیر زمین نظام موجود تھا۔ جو گندے پانی کو عقب میں واقع جنگل تک پہنچاتا تھا اور کیونکہ اس میں کوئی کیمیائی چیز شامل نہیں ہوتی تھی اس لیے جنگل کے درختوں کے لیے یہ پانی بھی بہترین تھا کہ اس میں کھاد پہلے سے شامل ہوتی۔

اب تک کوئی تین ہزار کے قریب افراد جنگ کے لیے تیار کیے جا رہے تھے۔ میں نے ان میں سے ہزار مکمل فارغ کر دیئے اور سترہ سو کی فوج کے ساتھ باقی بچنے والے تین سو افراد کو فوج کے لیے ہی ضروری دوسرے کاموں کے لیے رکھ لیا تھا۔ جیسے میس چلانا یا سپاہیوں کے کام کرنا۔ یوں

سمجھ لیں کہ یہ فوج کا حصہ تھے اور سروس کرتے تھے۔ اگلے مرحلے میں ان کو بھی جنگی تربیت دینے کا اہتمام کیا جاتا۔ اگر یہ تربیت نہ بھی پاتے تب بھی سپاہ کے ساتھ رہ کر یہ بہت کچھ سیکھتے اور مسلسل اسی ماحول میں وقت گزار کر ان کا مزاج بھی جنگجوانہ ہو جاتا اس کے بعد انہیں تربیت دینا زیادہ مشکل نہ ہوتا۔ اس ایک ہفتے میں، میں یہ کامیابی حاصل کر سکا تھا کہ ایک سسٹم بنا دیا تھا جس میں ہر فرد کو علم تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ اس پر چیک رکھی تھی اور اس کی کارکردگی جانچی جا رہی تھی۔

اب مجھے دوسرے لوگوں کا خیال آیا جو دیگر کام کرتے تھے۔ جو لوگ اب تک رضا کاروں میں شامل تھے اور دوسرے کام بھی کرتے تھے میں نے ان کو فارغ کر دیا۔ اب وہ کھیتوں اور باغات میں کام کر رہے تھے۔ ہزار افراد مشتمل لیبر فورس تھی جو کھیتوں پر پھیلے ہوئے تھے اور کھیتوں کی نگہداشت کی دیکھ بھال کر رہی تھی۔ فصلیں درمیانی مرحلے میں تھیں اور اسی طرح باغوں میں پھل پک رہے تھے۔ اس لیے ان میں سے بھی بہت سے اصل میں بیکار تھے۔ میں نے فارغ لوگوں سے کام لینے کا سوچا تھا۔ مگر ان سے کیا کام لینا تھا یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ پیداواری اشیاء کے ماہرین تھے اور وہ اپنا کام کر رہے تھے ان کا کام ہر کوئی نہیں کر سکتا تھا۔ اب تک قصبوں میں صفائی کا خاص نظام نہیں تھا میں نے ان سب کی مدد سے عورتوں اور لڑکیوں کو جو کوئی کام نہیں کرتی تھیں یا ان پر معمر افراد اور بچوں کی ذمے داری نہیں تھی۔ انہیں گلیوں اور قصبوں کی صفائی پر معمور کرا دیا۔

میں غور کرتا رہا تھا کہ آرگون کی طرف سے حملے کی صورت میں کون سی آسان حفاظتی تدبیر ہو سکتی ہے جس سے یہاں کے لوگ واقف ہوں اور اگر اسے بروئے کار لایا جائے تو یہ حملہ آوروں کے لیے سرپرائز ہو۔ مجھے خیال آیا کہ پرانے زمانے میں قصبوں کو حملہ آور فوج سے بچانے کے لیے خندقوں اور آگ کا سہارا لیا جاتا تھا۔ یعنی خندق کھود کر اسے پانی سے بھر دیتے تھے یا پھر قلعے کے چاروں طرف آگ لگا دیتے جسے حملہ آور فوج پار نہیں کر پاتی۔ یہاں خندق کھودنا ممکن نہیں تھا کیونکہ تینوں قلعے بڑے رقبے پر تھے اور یہاں اتنی افرادی قوت نہیں تھی مگر آگ لگائی جا سکتی تھی۔ میں نے اس تدبیر پر جتنا سوچا مجھے یہ اتنی آسان لگی تھی۔ یہاں لکڑی، جھاڑیوں اور سوکھی گھاس کی کمی نہیں تھی۔ میں نے اسے آزمانے کا فیصلہ کیا مگر ساتھ ہی یہ فیصلہ بھی کیا کہ یہ تدبیر کسی کو بتانی نہیں ہے۔

بارش کے دوران میں نے روبیر سے کہا کہ وہ فارغ رضا کاروں میں سے سو افراد کو لے آئے اور ان کے پاس گھاس اور چھوٹی لکڑی کاٹنے کے اوزار ہوں۔ بارش رکنے کے بعد روبیر ان لوگوں کو جمع کر کے لے آئی اور میں انہیں لے کر جنگل کی طرف روانہ ہوا۔ ان سو افراد کی حفاظت کے لیے ایک درجن سپاہیوں کا ایک دستہ بھی ساتھ لیا تھا۔ وادی کے بڑے جنگل آرگون شہر اور معبد کے آس پاس اور عقب میں تھے۔ وادی کے اس حصے میں گھنے جنگلوں کی کمی تھی۔ کیونکہ یہاں جا بجا چٹانیں تھیں۔ ان میں کہیں کہیں درختوں کے جھنڈ تھے۔ بیشتر جگہوں پر چھوٹی جھاڑیاں یا درخت تھے اور موٹی گھاس تو تقریباً ہر جگہ اگی ہوئی تھی۔ میں نے رضا کاروں سے کہا کہ وہ جنگل سے خشک لکڑیاں اور گھاس کے بنڈل جمع کریں۔ لکڑیوں اور گھاس کو ایک خاص انداز میں بنڈل بنانے ہیں۔ میں نے عملی طور پر چند بنڈل بنا کر بھی دکھائے۔ ان میں گھاس زیادہ تھی۔ اور بنڈل کی ساخت برقرار رکھنے کے لیے اندر لکڑیاں بھی شامل تھیں مگر اس طرح کہ بنڈل کا وزن ایک خاص حد سے زیادہ نہ ہو۔ رضا کاروں نے سمجھ لیا اور اس کے بعد انہوں نے کام شروع کر دیا۔ روبیر متجسس تھی۔

"یہ آپ کیوں بنوا رہے ہیں۔"

"قصبوں کا دفاع کرنے کے لیے۔" میں نے کہا۔

روبیر حیران ہوئی۔ "قصبوں کا دفاع اور گھاس سے؟"

میں مسکرایا۔ "تم کیا سمجھتی ہو حملہ آور فوج کو روکنے کے لیے یہ بڑا موثر ہتھیار ہے۔"

میں نے ہر بندے کو ایک دن میں دس گٹھے تیار کرنے کا حکم دیا تھا۔ انہیں صبح سے شام تک یہی کام کرنا تھا۔ سو بندے ایک دن میں ہزار گٹھے تیار کر سکتے تھے۔ میں نے دیکھا کہ جنگل میں خام مال کی کوئی کمی نہیں تھی۔ سوکھی جھاڑیاں اور اونچی سوکھی گھاس بہت زیادہ مقدار میں تھی۔ یہاں مویشی اور چرنے والے جانور کم تھے اس لیے سبزہ زیادہ تھا۔ سردیوں میں جلانے کے لیے یہ لوگ لکڑی درختوں سے لیتے تھے اور اس کی بھی کمی نہیں تھی۔ شاید یہاں درخت اور پودے تیزی سے بڑھتے ہوں گے اس لیے وادی کی ضرورت آسانی سے پوری ہو جاتی ہو گی۔ تیار ہونے والے ایک گٹھے کا سائز چار بائی دو بائی دو تھا اور ہر گٹھے کا وزن تقریباً ایک من بن رہا تھا۔ ان لوگوں کو اس کام پر لگا کر میں قصبوں کے گرد گھومنے لگا اور زمین پر نشانات سے

نشان لگانے لگا۔
"یہ پتھر کیوں رکھ رہے ہیں؟" روبیر نے سوال کیا۔
"نشانی کے لیے بنائے جانے والے گٹھے یہیں رکھے جائیں گے۔"
روبیر اب بھی نہیں سمجھی تھی کہ میں گٹھے کیوں رکھوا رہا اور وہ متجسس تھی۔ میں نے جن سو افراد کو اس کام پر لگایا تھا ان کو دس دس کے گروپوں میں تقسیم کر دیا تھا اور ہر گروپ کا ایک ذمے دار بنا دیا تھا۔ ان میں سے ایک جو کام میں سب سے مستعد اور آگے آگے تھا اسے میں نے اس کام کا سربراہ بنا دیا۔ رامیس نامی یہ شخص تیس کے آس پاس تھا۔ مضبوط جسم کے ساتھ اس میں ایک خاص نوع کی چستی اور تیزی بھی تھی۔ تینوں قلعوں کے گرد پتھروں سے نشان بنانے کے بعد میں نے ان دس ذمے داروں کو تیار ہونے والے گٹھوں سمیت بلوایا اور انہیں سمجھایا کہ گٹھے کس طرح رکھنے ہیں۔ یہ کام زیادہ مشکل نہیں تھا وہ آسانی سے سمجھ گئے اور اس شام تک انہوں نے گٹھے پتھروں کے نشانات پر مخصوص ترتیب سے لگانے شروع کر دیے تھے۔
سومرو، کانفیورا اور بیتاث سے لے کر سب متجسس تھے کہ میں یہ کیا کر رہا تھا۔ چند ایک نے براہ راست پوچھ لیا مگر میں نے واضح جواب نہیں دیا صرف یہ بتایا کہ یہ قلعوں کے دفاع کے لیے ہے۔ جب رضا کار گٹھے لا کر میرے لگائے نشانات پر رکھ رہے تھے تو بہت سے لوگ صرف دیکھنے کے لیے آئے تھے۔ کئی ایک نے پیشکش کی کہ وہ بھی یہ کام کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے انہیں رامیس کے سپرد کر دیا کہ وہ ان سے کام لے۔ جتنی جلدی یہ کام ہوتا ہمارے لیے اتنا ہی بہتر ہوتا۔ جب تک روشنی رہی یہ کام جاری رہا اور شام تک گٹھے بنانے والوں نے قلعوں کے سامنے والے حصے میں ایک لائن تیار کر دی تھی۔ مگر ابھی ہزار بارہ سو گٹھوں سے قلعوں کے گرد ایک لائن بھی مکمل نہیں ہوئی تھی۔ یقیناً یہ خاصا طویل کام تھا مگر یہ سوچے بغیر کرنا تھا کہ آرگون والے کب یہاں حملہ کریں گے۔
جب تاریکی چھا گئی تو کام ختم کر دیا گیا۔ سب قلعوں میں چلے گئے۔ مشعلیں روشن ہو گئی تھیں اور رات کے پہرے دار اپنی ڈیوٹی پر آ گئے تھے۔ مجھے اس سے متعلق ایک کام تھا مگر وہ میں سب کے سامنے نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں دوسرے کام نمٹاتا رہا۔ ذمے داروں سے رپورٹ لیتا اور اگلے دن کے لیے احکامات دیتا رہا۔ جب رات کو سامیرا کے مکان پر آیا تو میں نے روبیر کو بھیج کر سیبوٹ کو طلب کیا۔
وہ رات گئے طلبی پر حیران ہوا تھا۔ وہ روبیر کے ساتھ آیا۔ "حکم فرمائیں جناب۔"
مجھے معلوم تھا کہ یہ لوگ دیئے اور مشعلیں جلانے کے لیے جانوروں کے دودھ سے نکلنے والے روغن کے ساتھ کچھ اور بھی استعمال کرتے ہیں۔ گھروں میں عام طور سے حیوانی چربی اور مکھن سے روشنی کی جاتی تھی۔ باہر جلنے والی تیز روشنی کی مشعلوں پر کوئی خاص روغن ڈالا جاتا تھا۔ جو لکڑی میں جذب ہو جاتا اور نہ صرف اسے بہت دیر تک جلاتا تھا بلکہ اس کی روشنی بھی خاصی تیز ہوتی تھی۔ میں اسی کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔ میں نے پوچھا۔ "تم لوگ تیزی سے آگ لگانے کے لیے کیا چیز استعمال کرتے ہو؟"
اس نے جواب دیا۔ "ہمارے پاس آگ لگانے کے لیے دو ہی چیزیں ہیں۔ ایک چربی اور مکھن اور دوسرا ایک قسم کی رال۔"
"یہ رال کہاں سے ملتی ہے؟"
سیبوٹ نے سوچا اور بولا۔ "جناب آپ میرے ساتھ چلیں میں آپ کو سب چیزیں دکھاتا ہوں۔"
میں، روبیر اور سیبوٹ سرکاری گودام تک آئے۔ سیبوٹ نے مجھے ایک رال نما چیز لا کر دکھائی اور بتایا۔ "یہ درختوں سے نکلتی ہے۔"
یہ بالکل ویسی ہی رال تھی جیسی درختوں سے نکلتی ہے اور عام طور سے جم کر شفاف اور کسی قدر گدلے ٹکڑے کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ یہاں اس کے مٹی سے بنے مٹکے بھرے ہوئے تھے۔ میں نے پوچھا۔ "کیا یہ اسی صورت میں آگ پکڑتی ہے؟"
"نہیں جناب، اس میں ایک اور چیز ملائیں تو یہ اس شکل میں آ جاتی ہے۔" اس نے کہا اور دوسرے مرتبان میں موجود سیاہی مائل سیال دکھایا۔ "یہ بھی ایک پودے سے حاصل ہوتا ہے۔ ان کو دو اور ایک کے تناسب سے ملائیں تو یہ بہت تیزی سے آگ پکڑنے والا روغن بن جاتا ہے۔"
"یہ آگ کتنی تیزی سے پکڑتی ہے؟"
اس نے مجھے مظاہرہ کر کے دکھایا۔ اس نے ایک ہری شاخ تیار روغن میں ڈبوئی اور اسے آگ دکھائی اور بالکل ہری شاخ نے خشک لکڑی کی طرح آگ پکڑ لی اور دھڑا دھڑ جلنے لگی۔ اس روغن کی آگ پکڑنے کی صلاحیت تقریباً مٹی کے تیل جیسی تھی۔ میں مطمئن ہو گیا کہ جو چیز مجھے درکار تھی وہ یہاں موجود تھی۔ "اس کی کتنی مقدار ہے تمہارے پاس؟"
اس نے مجھے پورا گودام گھما پھرا کر دکھایا۔ مٹی کے

بڑے بڑے اونچے مٹکے اس سے بھرے رکھے تھے اور بہ ظاہر یہ مقدار کافی تھی مگر ہمیں آنے والی جنگ کا سامنا تھا جس کے لیے اس قسم کی چیزیں بہت زیادہ مقدار میں درکار تھیں۔ میں نے کہا۔ ”اگر مزید جمع کرنا چاہو تو کیا اسے ذخیرہ کرنے کا بندوبست ہے؟“

”ہاں مگر بہت زیادہ نہیں کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے پاس مٹکوں کی کمی ہے۔“

”گنجائش بڑھاؤ آنے والے دنوں میں اس کی بہت زیادہ ضرورت ہوگی۔ ان مٹکوں کو تیار کراؤ اور جہاں سے یہ روغن ملتا ہے وہاں سے حاصل کرلو۔ یہ کام ہنگامی بنیادوں پر ہونا چاہیے۔ صبح سے لے کر شام تک کام ہو۔ کل کا وقت بھی نہیں ہے ابھی سب متعلقہ افراد کو خبردار کردو تاکہ کل صبح سے اس پر کام شروع ہوجائے اور ہاں ایک بات یاد رکھنا یہ نہایت خفیہ معاملہ ہے کسی تیسرے فرد کو بالکل بھی علم نہ ہو کہ ہم آگ لگانے والے روغن کی مقدار بڑھا رہے ہیں۔ یوں سمجھو یہ ہماری سلامتی کا معاملہ ہے۔“

سیبوث حیران ہوا تھا مگر اس نے یقین دلایا کہ اس کی زبان بند رہے گی اور حکم کی فوری تعمیل کی جائے گی۔ روغن حاصل کرنے والے مخصوص افراد تھے اسی طرح جو ان کو ذخیرہ کرنے والے مٹکے تیار کرتے تھے وہ بھی ماہر لوگ تھے۔ دوسرے ساز و سامان کے ساتھ اسلحہ سازی میں بھی تیزی لائی گئی تھی۔ تیر کمان اور لاٹھیاں بن رہی تھیں۔ اگلے دن میں نے ان کی ورکشاپوں کا دورہ کیا اور وہاں کام کرنے والے کاریگروں سے بات کی۔ میں نے ان کو کچھ بڑی کمانیں اور بھاری تیر بنانے کا کام بھی دیا۔ یہاں قلعے میں کچھ شاندار صحت اور قوت والے تیر انداز بھی تھے اور وہ اس قابل تھے کہ بھاری کمان اور تیر استعمال کرسکیں۔ یہ تیر کمان میں ان کے لیے تیار کروا رہا تھا۔ ان کی مدد سے دور فاصلے پر موجود دشمن کو بھی نشانہ بنایا جا سکتا تھا۔

یہاں پتھر تراشنے والے کاریگر بھی تھے۔ یہ پتھر سے اوزار بناتے تھے۔ میں نے انہیں کچھ چیزوں کے ڈیزائن دیئے کہ اس کے مطابق پتھر تراش کردیں۔ ان کے لیے یہ مشکل کام نہیں تھا۔ ان کے تراشے پتھروں کو لکڑی کے دستوں پر نصب کیا گیا تو پتھر کے بنے ہتھوڑے اور کلہاڑیاں وجود میں آگئیں۔ قریبی جنگ کے لیے یہ بہترین ہتھیار تھے اگرچہ تلوار کا خنجر کا متبادل نہیں تھے مگر یہ لاٹھی اور گوپھن کے مقابلے میں کہیں موثر ثابت ہوسکتے تھے۔ میں نے یہ ہتھیار سپاہیوں کو دلوائے اور استعمال کے حوالے سے ان کی رائے طلب کی۔ سے تربیت پانے والے تقریباً دو سو سپاہیوں نے ان ہتھیاروں کو پسند کیا اور میں نے ان کا ایک الگ دستہ بنا کر انہیں ان ہتھیاروں کے لڑنے کے لیے مخصوص کردیا۔ کاریگر ان کے لیے ہتھیار سازی کرنے لگے۔

اس دوران میں قلعوں کی دیواروں کی مرمت کا کام بھی آخری مراحل میں تھا۔ بہت سی جگہوں پر دیوار خستہ حال ہوگئی تھی اور کچھ جگہوں پر اس کی اونچائی کم تھی۔ مرمت کا کام تسلی بخش ہوا تھا اور سامیرا خود اس کی نگرانی کررہی تھی۔ فصیلوں کے آس پاس کچرے اور ملبے کی صفائی کی جارہی تھی اور اسے اٹھا کر دور پھینکا جارہا تھا۔ آس پاس کی جھاڑیاں اور چھوٹے درخت بھی کاٹے جارہے تھے تاکہ قلعوں سے دور تک صاف نظر آئے۔ میں نے کہا تھا کہ قلعوں کے ہر طرف دو سو گز تک زمین بالکل صاف ہو۔ کاٹے جانے والے درختوں اور جھاڑیوں کی لکڑی بھی گتکے بنانے میں استعمال کی جارہی تھی میں نے کہا تھا کہ تازہ اور ہری لکڑی بھی استعمال کی جاسکتی تھی اگر یہ خشک نہ بھی ہوتی تو آگ پکڑنے کی صورت میں بہت زیادہ دھواں دیتی اور یہ بھی حملہ آوروں کو دور رکھنے میں معاون ثابت ہوتا۔

سامیرا نے میرے کہنے پر اپنے لوگوں کے حوصلے بلند کرنے کے لیے ان سے ملنا اور ان کو ابھارنا شروع کردیا تھا۔ وہ ہر دوسرے دن شام کے وقت مرکزی قلعے کے سامنے میدان میں لوگوں سے خطاب کرتی۔ اسے تقریر کا فن خوب آتا تھا۔ اسے تسلی دیتا اور کچھ وہ اپنی طرف سے شامل کرتی۔ اس کا مثبت اثر ہوا جو لوگ پہلے کسی قدر خوفزدہ اور آنے والے وقت سے پریشان تھے۔ اب ان میں جوش نظر آنے لگا تھا۔ وہ پرعزم تھے کہ آرگون کی طرف سے کی جانے والی کسی بھی جارحیت کا بھرپور مقابلہ کریں گے۔ سامیرا نے ان سے وعدہ کیا کہ اگر وہ آرگون پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہوگئے تو وادی میں صدیوں سے رائج اس نظام کے استحصالی حصوں کو ختم کردیا جائے گا۔ سب کی ایک سی حیثیت ہوگی اور مادی لحاظ سے کوئی چھوٹا بڑا نہیں ہوگا۔ فرد کو اپنی زندگی کے تمام فیصلے خود کرنے کی آزادی حاصل ہوگی۔

اگرچہ عملی طور پر یہ سب وعدے پورے کرنا بہت دشوار کام تھا مگر ساری دنیا کے لیڈر اپنی قوم سے کوئی کام کرانے کے لیے اس سے ایسے ہی وعدے وعید کرتے ہیں اور جب لوگ قربانیاں دے کر وہ مقصد حاصل کرلیتے ہیں تب انہیں معلوم ہوتا ہے کہ عملی طور پر ان وعدوں کا حصول

ممکن نہیں ہے۔ مگر وہ مستقبل کے بڑے نقصانات سے بچ جاتے ہیں۔ یہی صورتحال یہاں بھی تھی۔ وادی کے لوگوں کو شاید وہ سب نہ ملتا جو سامیرا ان سے چھین رہی تھی مگر ان کی نسلیں آنے والی غلامی سے بچ جاتیں اور ممکن ہے کہ وادی کے دروازے باہر کی دنیا کے لیے کھل جاتے اور یہاں کے لوگ بھی اس جدید دنیا اور اس کی ایجادات سے مستفید ہو سکتے جن سے وہ اب تک نا آشنا تھے۔ ان کے پاس تعلیم نہیں تھی کیونکہ تعلیم صرف اہل جادو اور خاص طور سے پجاریوں کے لیے مخصوص تھی۔ ان پر تعلیم کے دروازے کھل جاتے تو انہیں باقی دنیا کے برابر آنے میں زیادہ دیر نہیں لگتی۔ اگرچہ اس میں خطرات بھی بہت تھے۔ ایک بار دنیا ان کے وجود سے واقف ہو جاتی تو آس پاس کے طاقتور ممالک اس وادی پر قبضے کی کوشش کر سکتے تھے۔ کئی ایک بار میری سامیرا سے اس بارے میں بات ہوئی مگر وہ شاید اس حق میں نہیں تھی کہ اس وادی کا راز دنیا پر کھلے۔

مجھے یہاں آئے ہوئے نو دس دن ہو چکے تھے اور عجیب بات تھی کہ ہر طرف خاموشی اور ٹھنڈک تھی۔ پہلے مجھے لگا تھا کہ آرگون اور ریجانٹ کی طرف سے شاید ایک دو دن میں ہی حملہ کر دیا جائے۔ مگر اب لگ رہا تھا کہ ان کا حملہ کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ صرف کیرٹ کو سزا دی گئی تھی اور اس کے بعد سب اپنے اپنے کاموں میں لگ گئے تھے۔ مگر جب مجھے ڈیوڈ شا کا خیال آتا تو میں جیسے خواب غفلت سے چونک جاتا۔ ڈیوڈ شا کے ہوتے ہوئے یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ کوئی فتنے فساد والا کام نہ ہو۔ وہ یقیناً ریجانٹ کو پٹیاں پڑھا رہا تھا اور اس کی پوری کوشش ہوگی کہ کسی طرح وادی کے دونوں گروہوں کے درمیان بھرپور جنگ ہو جائے۔ یہ لوگ آپس میں لڑ کر کمزور ہو جائیں تو اس کے بعد وہ یہاں اپنا سکہ چلا سکے۔ ڈیوڈ شا مخصوص برٹش ذہنیت کا مظاہرہ کر رہا تھا یعنی لڑاؤ اور حکومت کرو۔ وادی میں تین ہزار سے زیادہ لوگ نہیں تھے اگر خانہ جنگی میں ان کی بڑی تعداد ماری جاتی تو پیچھے بچ جانے والوں میں اکثریت بوڑھے، بچوں اور عورتوں کی رہ جاتی جن پر قابو پانا زیادہ مشکل نہیں ہوتا۔

ڈیوڈ شا کی موجودگی کے باوجود آرگون کی طرف سے جنگ کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ دوسری طرف برف والا بھی مجھے یہاں بھیج کر بالکل خاموش تھا۔ اس نے ایک بار مجھ سے رابطہ کیا تھا اور ایک بار سامیرا نے اس سے رابطہ کیا تھا۔ جب ہم نے قرنے کی آواز پر آرگون کی طرف جانے یا نہ جانے کا فیصلہ کرنا تھا۔ اس کے بعد برف والے نے ہم سے کوئی رابطہ نہیں کیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ فی الحال اسے رابطہ کرنے یا ہمیں ہدایت دینے کی ضرورت محسوس نہیں ہو رہی تھی یا پھر اس نے سب ہم پر چھوڑ دیا تھا اور اب اوپر بیٹھ کر دیکھ رہا تھا کہ آگے کیا ہوتا ہے؟ اس شام میں مرکزی قلعے میں گھوم پھر کر دیکھ رہا تھا۔ جب سے اندر کی صفائی کا باقاعدہ انتظام کیا گیا تھا۔ راستے اور گلیاں صاف رہنے لگے تھے اور جو گلیاں کچی تھیں انہیں بھی پختہ کیا جا رہا تھا۔ بچے کھیل رہے تھے اور لوگ آ جا رہے تھے۔ میں بچوں کے پاس سے گزر رہا تھا کہ ایک بچے نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ میں اس کی طرف متوجہ ہوا تھا کہ اس نے کہا۔

"شہباز، شام کے بعد قلعے سے باہر جانے سے گریز کرنا۔"

آواز برف والے کی تھی اس پر میں اتنا حیران نہیں ہوا۔ میں نے سوال کیا۔ "کیوں؟"

بچے یا برف والے نے میرا سوال نظر انداز کیا اور پھر کہا۔ "اگر چلے جاؤ اور نہ آ سکو تب بھی کوشش کرنا اگلی صبح روشنی ہونے سے پہلے واپس آ جاؤ۔"

"میری بات سنیں۔" میں نے کہنا چاہا لیکن بچہ میرا ہاتھ چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔ میں اس کی طرف لپکا اور اس کا بازو پکڑ لیا۔ "میری بات سنیں۔"

بچہ سہم گیا اور اس نے معصومانہ لہجے میں کہا۔ "میں نے کچھ نہیں کیا ہے۔"

میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ اپنی بات کر کے برف والا جا چکا تھا۔ اس کی ہدایت یقیناً میرے لیے خاص اشارہ تھی اور مجھے اس کا خاص خیال رکھنا تھا۔ جیسے اس نے وادی میں بھیجنے سے پہلے مجھے کیرٹ کا نام بطور کنجی کہا تھا۔ یہ اس واقعے کے اگلے دن کی بات تھی۔ جاری کاموں کے ساتھ میں گھومنے پھرنے کے دوران میں دیکھتا رہتا تھا کہ کہیں کوئی کام کی چیز ہو جس سے یہ ناواقف ہوں مگر میں اسے کام میں لا سکوں۔ میں نے بتایا کہ وادی میں ذرائع کی کمی تھی اور یہ تقریباً تمام ہی اشیا بہت سادہ بناتے تھے۔ پتھر، مٹی، لکڑی، کھالیں اور جانوروں کی ہڈیاں ان کے لیے خام مال تھا۔ یہاں مجھے سوائے سونے و چاندی کے کوئی دھات نظر نہیں آئی تھی۔ سونا اور چاندی عام طور سے دوسری دھاتوں کے ساتھ ملتے تھے مگر یہاں شاید ایسا نہیں تھا اس لیے ان کے پاس صرف یہی دو دھاتیں تھیں۔ ان سے بھی کام نہیں لیا جا سکتا تھا اور یہ صرف اظہار زینت کے لیے استعمال کی جا سکتی تھیں۔ کبھی کبھی شام کے وقت عجیب جنگل

تک بھی چلا جاتا تھا اور وہاں چیزیں کھوجتا تھا۔ اس شام بھی میں نکلا اور میرا ارادہ زیادہ دور جانے کا نہیں تھا اس لیے میں نے صرف روبیر کو ساتھ لیا۔

"میرے ساتھ چلو۔"

اس نے حکم کی تعمیل کی اور میرے ساتھ ہو لی۔ قلعے کے عقب میں جنگل زیادہ گھنا نہیں تھا اور یہاں چند ایک مقامات پر درختوں کے جھنڈ تھے ورنہ بیشتر جگہوں پر جھاڑیاں، گھاس پھونس اور چھوٹے پودے تھے جہاں یہ سب نہیں تھا وہاں چٹانیں تھیں۔ ٹوٹ پھوٹ کا شکار یہ چٹانیں بہت سخت پتھر کی تھیں اور مقامی کاری گر ان سے ہی اوزار بنانے کے لیے پتھر لے جاتے تھے۔ نیلے رنگ کی یہ چٹانیں کہیں کہیں سے نیلے سرمئی رنگ کی تھیں۔ میں ان چٹانوں کا معائنہ کر رہا تھا۔ ان سے ٹوٹ کر الگ ہونے والے پتھر جابجا بکھرے ہوئے تھے۔ ان میں سے بعض تلوار کی طرح لمبے تھے ان کو کاٹ کر گھس کر چاقو کی شکل دی جا سکتی تھی یہاں چاقو اور تیز دھار والے اوزار اسی طرح کے پتھر سے بنتے تھے۔ کہیں گول اور آلو سے لے کر تربوز کے سائز تک کے پتھر پڑے تھے۔ ان سے چکی کے پاٹ اور دوسرے اوزار تیار کیے جاتے تھے۔

ایک جگہ چھوٹے سنگریزوں کے سائز کے پتھروں کا بہت بڑا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ یہ کئی طرف سے نوکوں والے پتھر تھے اور ان کی نوکیں کانٹوں کی طرح تیز تھیں۔ میں نے اٹھا کر دیکھا یہ گوکھرو جیسے پتھر تھے۔ گوکھرو ایک گول نباتی چیز ہوتی ہے جس پر چاروں طرف کانٹے لگے ہوتے ہیں۔ پہلے زمانے میں جنگوں کے دوران دفاع کرنے والے حملہ آور فوج کو مشکل میں ڈالنے کے لیے ان کے راستے میں گوکھرو بچھا دیتے تھے۔ جب دھات کا زمانہ آیا تو دھات سے گوکھرو تیار کیے جانے لگے جو کہیں زیادہ موثر ہوتے تھے۔ میں نے سوچا کہ اگر انہیں قلعوں کے آس پاس میدانوں میں بچھا دیا جائے تو شاید یہ بھی اسی کام آسکیں۔ ان سے حملہ آوروں کی پیش قدمی سست کی جا سکتی تھی۔ میں نے روبیر سے پوچھا۔ "آس پاس یہ سنگریزے بڑی مقدار میں دستیاب ہیں؟"

وہ سوچ میں پڑ گئی پھر اس نے چٹانوں کے ذرا دور ایک سلسلے کی طرف اشارہ کیا۔ "شاید اس طرف ہیں۔"

چٹانیں دور تھیں مگر ابھی روشنی باقی تھی اور آس پاس کوئی خطرہ نظر نہیں آرہا تھا۔ اس لیے میں نے کوئی حرج نہیں سمجھا۔ یہ چٹانیں قلعوں سے کوئی پون میل کے فاصلے پر تھیں۔ میرے پاس لاٹھی تھی اور روبیر کے پاس لاٹھی کے ساتھ تیر کمان بھی تھے۔ یعنی ہم مناسب حد تک مسلح تھے۔ وادی کی دیوار نزدیک ہونے کی وجہ سے یہاں چٹانیں بلند اور زیادہ ناہموار تھیں۔ ان میں ٹوٹ پھوٹ کہیں زیادہ تھی۔ شاید اسی لیے روبیر نے سنگریزوں کے لیے یہاں آنے کو کہا تھا۔ جیسے جیسے ہم چٹانوں میں آگے جا رہے تھے کئی مقامات پر سنگریزوں کا ڈھیر نظر آ رہا تھا۔ یہ خاصی مقدار میں تھے۔ عام طور سے چٹانوں کو توڑنے اور تراشنے کا کام درجہ حرارت کے ساتھ تیز ہوا کرتی ہے لیکن یہاں ہوا بہت معمولی سی چلتی تھی اور بارش زیادہ ہوتی تھی اس لیے چٹانوں کی توڑ پھوڑ میں مرکزی کردار حرارت کے ساتھ پانی کا تھا۔

یہاں چھوٹے جنگل تھے مگر ان میں درخت بہت بلند تھے۔ جہاں پتھریلی زمین نہیں تھی وہاں جھاڑیاں، پودے اور گھاس پھونس اگ آئی تھی۔ آبادی سے دور ہونے کے بعد چھوٹے موٹے جانور اور حشرات الارض نظر آنے لگے تھے۔ یہاں سانپ نہیں تھے۔ کم سے کم میں نے ایسی کوئی چیز نہیں دیکھی تھی جسے سانپ قرار دیا جا سکتا۔ البتہ چھپکلی اور گرگٹ جیسے رینگنے والے جانور بہت سارے تھے۔ اس طرف شہد کی مکھیاں تھیں کیونکہ بلند درختوں پر جابجا ان کے چھتے نظر آ رہے تھے۔ یہ لوگ شہد حاصل کرنے کے لیے چھتوں کے نیچے کٹ لگا کر مٹی کا برتن رکھ یا لٹکا دیتے تھے اور شہد رس کر اس میں گرتا رہتا تھا۔ جو چھتے مکھیاں ترک کر دیتی تھیں انہیں اتار کر یہ ان سے موم حاصل کرتے تھے۔ ہم قلعوں سے دور نکل آئے تھے اس لیے اب روبیر چوکنا تھی اور اس نے کمان ہاتھ میں پکڑ کر اس میں تیر لگا لیا تھا میں نے اس کی طرف دیکھا۔

"کیا یہاں کوئی خطرہ ہے؟"

"آبادی سے باہر یہاں کہیں بھی خطرہ ہو سکتا ہے۔"

اس نے آس پاس دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ "اگرچہ اس طرف بارن، اسار یا گونز نہیں آتے ہیں مگر وہ آ بھی سکتے ہیں۔"

مگر فی الحال ایسا کوئی خطرہ نظر نہیں آیا تھا۔ ہم چٹانوں کے ایک سلسلے کے پاس پہنچے۔ یہ کئی پچی چٹانیں تھیں جن میں بھول بھلیوں جیسے راستے تھے۔ ظاہر ہے میرا ان میں جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اب تک مجھے سنگریزے جیسے پتھر اچھی مقدار میں ضرور نظر آ گئے تھے کہ ہم انہیں قلعوں کے چاروں طرف زمین پر بچھا سکیں۔ یہ حملہ آور فوج کو مشکل

میں ڈال سکتے تھے جب کہ وہ ان سے نمٹنے کے لیے تیار بھی نہیں ہوگی۔ روبیر کے پاس ایک تھیلا تھا میں اس میں ہر جگہ سے کچھ سونے سے گرد ڈالتا جا رہا تھا۔ تھیلا خاصا بھر گیا تھا اور وزنی ہو گیا تھا اس لیے میں نے اسے شانے پر لاد دیا۔ روبیر تیار نہیں تھی اس کا اصرار تھا کہ میں تھیلا اسے تھما دوں۔ مگر میں نے اس سے کہا۔ "تم صرف اپنے کام پر توجہ دو اور آس پاس نظر رکھو۔ ویسے بھی یہ خاصا وزنی ہو گیا ہے۔"

وہ مجبوراً راضی ہوگی۔ "میں اٹھا سکتی ہوں لیکن جیسے آپ کہیں۔"

اس سے بے نیاز ہو کر کہ میں کیا کر رہا ہوں وہ چوکس ہو کر ہر طرف دیکھتی رہی اور اس کا نظر رکھنا ہی کام آ گیا کیونکہ اچانک اس نے ایک طرف اشارہ کیا اور مجھے آہستہ سے خبردار کیا۔ "اسمار..... وہ ہیں۔"

میں نے آہستہ سے سر گھما کر دیکھا۔ وہ کوئی سو گز کے فاصلے پر تھے اور شانہ بشانہ سست قدموں سے ہماری طرف بڑھ رہے تھے۔ روبیر نے تیر کا رخ ان کی طرف کر دیا اور میں نے لاٹھی سونت لی تھی۔ میں نے بتایا کہ یہ بھیڑیے کی شکل وصورت کے جسامت میں اس سے خاصے بڑے اور ہیبت ناک قسم کے درندے تھے۔ اسے آپ اس وادی کا شیر سمجھ لیں۔ ان ہتھیاروں کے ساتھ ان کا مقابلہ کرنا مشکل ہی نہیں بہت مشکل تھا اور فرار ہماری واحد پچت تھی۔ ان سے بچنے کے لیے ہمیں کسی ایسی جگہ پناہ لینی تھی جہاں یہ نہ پہنچ سکیں۔ بدقسمتی سے آس پاس کوئی بلند درخت نہیں تھا جس پر ہم چڑھ کر ان کی پہنچ سے دور چلے جاتے۔ ذرا دور چٹانیں تھیں میں نے ان چٹانوں کا جائزہ لیا اور روبیر سے کہا۔ "پیچھے ہٹنا ہے مگر آہستہ آہستہ انہیں تاثر نہ ملے کہ ہم فرار ہو رہے ہیں۔"

وہ فکر مند ہوگی۔ "چٹانوں میں ہم گھر نہ جائیں؟"

"دیکھتے ہیں کھلی جگہ ہم ان کے لیے آسان شکار ہوں گے۔ محدود جگہ اپنا دفاع کرنا آسان ہوگا۔"

ہم ایسی چٹان کی طرف سرکنے لگے جس میں اندر جانے کا راستہ نظر آ رہا تھا۔ اسمار شاید کچھ دیر سے ہمارے پیچھے تھے اور ان کی کوشش تھی کہ بے خبری میں ہمیں آلیں مگر روبیر نے بروقت انہیں دیکھ لیا۔ اگرچہ یہ بروقت دیکھنا بھی زیادہ کارآمد نہیں تھا کیونکہ ہم خطرے میں تو تھے۔ اسمار کے شیر جیسے پھیلے ہوئے پنجے جن میں تیز ناخن تھے اور بھیڑیوں جیسے لیکن ان سے بڑے پورے جبڑے میں پھیلے ہوئے دانت دور سے نمایاں تھے۔ وہ جان گئے تھے کہ ہم ان کی موجودگی سے باخبر ہو گئے ہیں اس لیے انہوں نے اب ہلکے ہلکے غرانے میں کوئی حرج نہیں سمجھا۔ شاید پہلے بھی غرا رہے تھے مگر ان کی آوازیں اتنی بلند نہیں تھیں کہ ہم تک آ جاتیں۔ جیسے جیسے وہ نزدیک آ رہے تھے ان کی غراہٹوں میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ پیچھے ہٹتے ہوئے روبیر نے لرزتی آواز میں کہا۔ "جناب ان سے بچیں، ہمارے ہتھیار ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔"

میرا بھی یہی خیال تھا۔ تیر کمان اور لاٹھی ان تین ساڑھے تین سو پونڈ وزنی درندوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے۔ ہم چٹان کے سوراخ کے پاس آ گئے تھے اور میں نے پہلے روبیر کو اندر جانے کو کہا۔ وہ میرے عقب میں آ گئی اور ہم الٹے قدموں چلتے ہوئے چٹانوں کے درمیان آ گئے۔ یہ صحن جیسی کھلی جگہ تھی اور بہ ظاہر یہاں بچنے کی کوئی جگہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ ابھی اسمار ہماری نظروں میں تھے اور جیسے جیسے وہ نزدیک آ رہے تھے میرے دل کی دھڑکن بڑھ رہی تھی۔ میری نظر ان پر تھی مگر روبیر نے دیکھ لیا کہ چٹانوں میں اندر کی طرف جاتا ایک تنگ سا راستہ تھا۔ اس نے اشارہ کیا۔ "یہاں میں ہم ان سے بچ سکتے ہیں۔"

میں نے ایک نظر خلا کو دیکھا اور مجھے روبیر کی بات درست لگی میں نے پہلے اسے اندر جانے کو کہا۔ وہ چھریرے جسم کی تھی آسانی سے اس خلا میں چلی گئی۔ جب وہ کئی گز اندر چلی گئی تو میں بھی اندر داخل ہوا اور مجھے جانے میں مشکل پیش آئی تھی۔ ذرا سا آگے جانے کے بعد خلا اتنا چوڑا بھی نہیں تھا کہ میں اس میں سیدھا جا سکتا۔ اس لیے ترچھا ہوا اور کسی نہ کسی طرح اس خلا میں گھس کر آگے پہنچ گیا۔ ایک جگہ پہنچ کر روبیر رک گئی کیونکہ اس سے آگے وہ بھی نہیں جا سکتی تھی اور اس کے بعد میں رک گیا۔ مجھے ذرا اطمینان ہوا کہ جب ہم اتنی مشکل سے اندر آئے ہیں تو اسمار اس دراز میں گھس نہیں سکتے تھے۔ جب تک ہم اندر گھسنے کی جدوجہد کر رہے تھے۔ اسمار وہاں آن پہنچے۔ ان کی ہلکی غراہٹیں بتا رہی تھیں کہ وہ چٹانوں کے اندر گھس آئے ہیں اور اب ہمیں تلاش کر رہے ہیں۔ ان کو تلاش کرنے میں دیر بھی نہیں لگی کیونکہ اس جگہ صرف ایک راستہ تھا جو چٹانوں کے باہر جاتا تھا۔ دوسری یہ دراز تھی۔ اندر گھسنے کی کوشش میں ہمارے لباس اور جسم رگڑ کھا گئے تھے۔ لباس پھٹ گئے تھے اور جسموں پر خراشیں آئی تھیں۔

"یہاں نکلنے کی جگہ نہیں ہے۔" روبیر نے کسمسا کر کہا۔ "ہم پھنس گئے ہیں۔"

"ہاں لیکن اسمار یہاں نہیں آ سکتے ہیں۔" میں نے اسے تسلی دی۔ "مدد آنے یا ان کے یہاں سے جانے تک ہم زندہ رہ سکیں گے۔ فکر مت کرو ہم یہاں محفوظ ہیں۔"

"یہ اندر نہ آ جائیں۔" روبیرا اب بھی خوفزدہ تھی۔

"میرا نہیں خیال کہ یہ اندر آ سکیں گے۔" میں نے جواب دیا اور اسی لمحے ایک اسمار دراڑ کے دوسری طرف نمودار ہوا۔ اس نے غرا کر دیکھا اور آنے کی کوشش کی مگر کچھ آگے آ کر اس کا چوڑا سینہ دراڑ میں پھنس گیا۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ ان کا سینہ چوڑا ہے اور میں ترچھا ہونے کے باوجود پھنس کر آیا تھا اس لیے مجھے امید تھی کہ وہ نہیں آ سکیں گے اور ایسا ہی ہوا۔ اسمار نے خوفناک سی آواز نکالی اور زور لگایا۔ وہ آگے آیا تھا۔ مگر اس بار وہ زیادہ پھنس گیا۔ کچھ دیر بعد اس نے محسوس کیا کہ آگے جانا مشکل ہے اور اسے واپس جانا چاہیے۔ اس نے اب واپس جانے کی کوشش شروع کی۔ میں نے سوچا کہ ایک درندہ نشانے پر آ گیا ہے اس لیے اسے واپس جانے نہ دیا جائے اور روبیرا سے پوچھا۔ "کیا تم اسے تیر کا نشانہ بنا سکتی ہو؟"

"کوشش کرتی ہوں۔" روبیرا نے میرے پیچھے سے بلند ہو کر تیر کا رخ اسمار کی طرف کیا اور میں ممکن حد تک نیچے ہو گیا۔ اسمار نے تیر دیکھ لیا اور اب وہ تیزی سے باہر نکلنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اس وقت جب وہ اپنی کوشش میں کامیاب رہا تھا روبیرا نے تیر چلانے سے اس کے سینے میں اتار دیا۔ روبیرا نے پوری قوت سے تیر مارا تھا اور فاصلہ بھی زیادہ نہیں تھا۔ تیر گردن کے عین نیچے خاصی گہرائی تک گیا تھا۔ اسمار نے بھیانک سی آواز نکالی اور دراڑ سے باہر نکل کر زمین پر لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ شاید اسی طرح وہ جسم میں اترا ہوا تیر نکالنے کی کوشش کر رہا تھا مگر بدقسمتی سے اس کوشش میں اس نے تیر جسم میں مزید اتار لیا اور پھر چیختا ہوا وہاں سے بھاگ نکلا۔ روبیرا خوش ہوئی۔ "یہ گیا۔"

میرا نہیں خیال کہ اسمار کو جان لیوا زخم لگا تھا مگر یہ زخم بہت دردناک ضرور تھا اور وہ اب ہمارے بجائے اپنی تکلیف کی فکر میں تھا۔ شاید اس نے بہتر سمجھا ہوگا کہ بھاگ جائے کہیں ایسا نہ ہو اسے کمزور سمجھ کر اس کا ساتھی ہی اس پر حملہ نہ کر دے جیسا کہ بھیڑیوں کا وتیرہ ہوتا ہے۔ یہ اپنے کمزور، معذور اور بوڑھے ہو جانے والے ساتھیوں کو مار کر کھا جاتے ہیں۔ اب وہاں ایک رہ گیا تھا۔ اس کی جھلک بھی فوری نظر آ گئی۔ وہ دراڑ کے پاس تھا مگر اس نے پہلے والے کے انجام سے عبرت پکڑی تھی اور سامنے آنے سے گریز کیا تھا۔ اسمار کم سے کم تیر سے واقف تھے۔ میں نے روبیرا کو شاباش دی۔ "تم نے شاندار نشانہ لگایا ہے۔ میرا خیال ہے وہ تو یہاں سے بھاگ گیا ہوگا۔ اب ایک ہی رہ گیا ہے۔"

روبیرا نے کہا۔ "مجھے آگے آنے دیں میں اسے بھی نشانہ بنانے کی کوشش کرتی ہوں۔"

میرا بھی یہی خیال تھا مگر مسئلہ یہ تھا کہ میرے پاس سے گزر کر وہ کسی صورت نہیں جا سکتی تھی۔ یہاں تنگی جگہ نہیں تھی اور اگر ہم آگے پیچھے ہونے کے لیے دراڑ کے شروع کے حصے میں جاتے تو وہاں اسمار کا خطرہ تھا۔ اگر ہم احتیاط کرتے اور تیزی سے آگے جا کر پوزیشن بدل کر واپس آتے تو یہ کام اتنی تیزی سے کرتے کہ اسمار کو حملہ کرنے کا موقع نہیں ملتا۔ مگر میں نے غور کیا تو یہ صورت مجھے عملی طور پر ممکن نظر نہیں آئی۔ روبیرا نے بھی اسے مسترد کر دیا۔ اس نے کہا۔ "اس میں بہت خطرہ ہے۔ اسمار بہت خوفناک جانور ہے یہ لمحوں میں انسان کو چیر پھاڑ کر رکھ دیتا ہے۔ اس کے پنجوں اور دانتوں کے زخم بہت گہرے ہوتے ہیں۔ میں نے آج تک اس کا نشانہ بننے والے کسی فرد کو زندہ بچتے نہیں دیکھا۔"

میں نے گہری سانس لی۔ "تب ایک ہی طریقہ تھا کہ تم میرے اوپر چڑھ کر دوسری طرف اتر جاؤ۔"

کام یہ بھی آسان نہیں تھا مگر کیا جا سکتا تھا۔ اس نے کہا۔ "میں کوشش کرتی ہوں۔"

میں نے سمجھایا۔ "تم میرے ہاتھ پر پاؤں رکھ کر میرا شانہ پکڑ کر اوپر ہو اور پھر میرے کندھے پر ایک پاؤں رکھتے ہوئے دوسرے شانے پر دوسرا پاؤں رکھو اور پھر میرے ہاتھ پر پاؤں رکھتے ہوئے دوسری طرف اتر جاؤ۔"

وہ ہچکچائی۔ شاید اسے یہ سوئے ادب لگ رہا تھا مگر میرے زور دینے پر وہ مان گئی۔ اس نے اپنا ترکش الگ کر کے نیچے رکھا اور پھر جوتے اتارتے ہوئے خالی پاؤں میرے ہاتھ پر رکھا میں نے اس کا پاؤں مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے میرے شانے کو تھام کر خود کو اوپر اٹھایا اور پھر دیواروں کا سہارا لیتے ہوئے میرے شانے پر ایک پاؤں رکھا اور دوسرے پر دوسرا پاؤں رکھا اور اس پر سے ہوتی ہوئی با آسانی دوسری طرف اتر گئی۔ اس نے جتنی آسانی سے یہ کام کیا تھا اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ جسمانی طور پر پرفیکٹ تھی۔ وہ چھریری سی تھی مگر اس کے جسم

میں مضبوطی اور طاقت موجود تھی۔ تبھی اس نے اتنی تنگ جگہ یہ مشکل کام اتنی آسانی سے کرلیا۔ میں نے اس کا سامان اٹھا کر اسے دینا چاہا مگر اس نے صرف تیر کمان لیا اور باقی چیزیں میرے سپرد کردیں۔

"جب میں مانگوں تو مجھے تیر دیتے جانا۔"

میں نے ترکش سے تیر نکال کر پکڑ لیے۔ وہ آگے سرکنے لگی۔ ترچھا ہونے کی وجہ سے وہ قدرتی طور پر تیر چلانے والی پوزیشن میں تھی۔ میں پیچھے ہی رہا تھا کہ اگر اسے تیزی سے پیچھے آنا پڑے تو میری وجہ سے دشواری نہ ہو۔ وہ مجھ سے کوئی دو گز آگے اس جگہ تک چلی گئی جہاں تک پہلا اسمار آکر پھنس گیا تھا۔ یہ خطرناک جگہ تھی۔ اگر ایک اسمار یہاں تک آسکتا تھا تو پھر دوسرا بھی آسکتا تھا۔ اب تک ہماری توجہ اسمار کی طرف نہیں گئی کیونکہ اس کی طرف سے ہمیں کوئی خطرہ نہیں تھا۔ روبیر مزید آگے جا رہی تھی۔ میں نے کہا۔ "احتیاط سے آگے مت جاؤ۔"

"وہ یہاں سے نظر نہیں آرہا ہے۔" اس نے کہا۔ روبیر درست کہہ رہی تھی۔ اسمار کی اب جھلک بھی نظر نہیں آرہی تھی۔ شاید اس نے محسوس کرلیا تھا کہ اب نظر آنا اس کے لیے خطرناک ہوگا اس لیے وہ پیچھے ہٹ گیا تھا۔

"وہ چالاکی سے کام لے رہا ہے تم اس حد تک آگے جاؤ گی تو وہ اچانک حملہ کردے گا اور ایک تیر اسے روک نہیں سکے گا۔ صبر سے کام لو اور اس کے سامنے آنے کا انتظار کرو۔"

معروب اسمار کی آوازیں آنا بند ہوگئی تھیں۔ وہ مر گیا تھا یا پھر یہاں سے چلا گیا تھا۔ مجھے دوسری صورت قرین قیاس لگ رہی تھی۔ تیر کے زخم نے اسے ہلاک نہیں کیا تھا بلکہ فرار پر مجبور کردیا تھا۔ البتہ دوسرا اسموجود تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر ہم مل کر حملہ کریں تو اس دوسرے اسمار کو بھی فرار پر مجبور کرسکتے تھے لیکن اگر وہ فرار نہ ہوتا تو ہماری جان خطرے میں پڑ جاتی۔ شیر کی طرح اکیلا اسمار بھی اتنا ہی خطرناک تھا جتنا کہ وہ ہوسکتے تھے۔ اب مجھے اپنی حماقت کا احساس ہو رہا تھا جو میں بغیر سپاہیوں کے یہاں تک چلا آیا تھا۔ اگر میں نصف درجن سپاہی بھی ساتھ لے لیتا تو ہم آرام سے اسماروں سے نمٹ سکتے تھے۔

میرے منع کرنے پر روبیر اپنی جگہ رک گئی تھی اور تیر چلانے کے لیے تیار تھی مگر دوسری طرف اسمار بھی کم مکار نہیں تھا۔ وہ غرا کر اور جھلک دکھا کر اپنی موجودگی کا احساس دلا رہا تھا مگر سامنے آنے سے گریز کر رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ ہم تیر سے مسلح تھے اور وہ اس کی ہلاکت خیزی دیکھ چکا تھا۔ اس دوران میں اندھیرا تیزی سے چھا رہا تھا۔ کچھ دیر میں مکمل تاریکی چھا جاتی۔ تاریکی سے ہمیں یا اسمار کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مسئلہ یہ تھا کہ اسمار کے ہوتے ہوئے ہم یہاں سے باہر جا نہیں سکتے تھے اور وہ اندر نہیں آسکتا تھا۔ اس لحاظ سے ہماری پوزیشن بہتر تھی کہ ہم یہاں انتظار کرسکتے تھے۔ جب کہ اسمار زیادہ دیر انتظار نہیں کرسکتا تھا۔ وہ جلد یا بدیر یہاں سے جانے پر مجبور ہو جاتا۔ لیکن اگر ہمیں ایک دو دن بھی اس تنگ دراز میں رہنا پڑ جاتا تو بھوک پیاس کے ساتھ کچھ اور مسائل بھی سامنے آتے۔ جن سے ہم شاید بہ مشکل ہی گزر پاتے۔ بہرحال ہمیں جان کا فوری خطرہ نہیں تھا۔

میں نے سوچا کہ اگر ہم چلائیں تو اس کا کیا اثر ہوگا؟ ہم جس جگہ تھے یہ قلعوں سے کوئی پون میل کے فاصلے پر تھی اور ہم ایک بند جگہ تھے۔ لیکن اگر ہم کھلی جگہ ہوتے جہاں سے قلعوں تک درمیان میں کوئی رکاوٹ نہ ہوتی تب بھی ہماری آواز وہاں تک نہ جاتی۔ میں نے روبیر سے پوچھا۔ "تم کتنی بلند آواز میں چلا سکتی ہو؟"

وہ مسکرائی۔ "بہت اونچی آواز میں، جب میں بچپن میں کسی بات پر چلاتی تھی تو میرے آس پاس موجود لوگ کانوں پر ہاتھ رکھ لیتے تھے۔"

"میں بھی اچھی خاصی آواز نکال سکتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اگر رات تک ہم یہاں سے نہ نکل سکے اور کوئی تلاش کرنے نہ آیا تو کل صبح ہم چیخ کر مدد طلب کریں گے۔"

وہ متفکر ہوگئی۔ "صبح تک؟ . . یعنی رات یہاں بھی گزر سکتی ہے؟"

"بالکل تم دیکھ رہی ہو یہ کتنی ثابت قدمی سے باہر موجود ہے۔" میں نے اسمار کی طرف اشارہ کیا۔ "اسے امید ہے کہ ہم جلد یا بدیر باہر آئیں گے۔"

"جب تک یہ باہر ہے میں کسی صورت باہر نہیں جاؤں گی بے شک یہاں بھوک پیاس سے مر جاؤں۔"

"اللہ نے چاہا تو ایسا نہیں ہوگا۔ رات نہ سہی صبح لوگ ہماری تلاش میں ضرور نکلیں گے۔" میں نے اسے تسلی دی۔

میں سوچ رہا تھا کہ کیا سامیرا یا دوسروں نے ہماری گم شدگی محسوس نہیں کی ہوگی اور اگر کی ہوگی تو ہمیں تلاش کیا جا رہا ہوگا۔ مگر اس کا امکان بہت زیادہ نہیں تھا کہ تلاش کرنے والے اس سمت آئیں۔ ہم نہ تو کسی کو بتا کر آئے تھے اور نہ ہی کسی نے ہمیں اس طرف آتے دیکھا تھا۔ فی الحال ہمیں قلعوں کے آس پاس اور خاص طور سے سامنے والی سمت

LEUCODERMA-VITILIGO
تمام جلدی بیماریوں کا موثر اور بے ضرر علاج
STEROIDS FREE MOST PROGRESSIVE TREATMENT
ASIAN EXCELLENCE
PERFORMANCE AWARD
AWARD OF
BEST ACHIEVEMENT
AWARD
PILLAR OF LEUCODERMA

تلاش کیا جا رہا ہوگا۔ سامیرا کے ذہن میں میری گم شدگی کے حوالے سے پہلا شک ریناٹ پر جائے گا کہ اس نے کوئی سازش کی ہے اور وہ اسی حوالے سے مجھے تلاش کرائے گی۔ اپنے آدمی آس پاس بھیجے گی اور آرگون میں اپنے جاسوسوں کو استعمال کرے گی۔ اس سے بے خبر کہ میں اور روبیر قلعوں کے پیچھے چٹانوں میں محصور ہیں۔

ہم جس دراڑ میں تھے اس کے اوپر چھت تھی اور صرف سامنے کا حصہ کھلا ہوا تھا۔ اس کا کوئی امکان نہیں تھا کہ اسمار اوپر چڑھ کر ہم پر حملہ کر سکے۔ اول تو دراڑ اوپر سے بھی اتنی ہی تنگ تھی۔ اگر چھت کھلی ہوتی تب بھی اسمار اوپر سے حملہ نہیں کر سکتا تھا۔ میں جس جگہ تھا یہاں تاریکی چھا گئی تھی۔ البتہ جہاں روبیر تھی وہاں کسی قدر روشنی تھی۔ اس سے آگے زیادہ روشنی تھی۔ شاید اسمار تاریکی کا انتظار کر رہا تھا کہ پھر حملہ کرے۔ پھر ایک اور خیال مجھے مضطرب کرنے لگا۔ ٹھیک ہے دراڑ بہت تنگ تھی لیکن اور اسمار آ جاتے جن میں کوئی چھریرے جسم والا ہوتا تو وہ اس جگہ گھس سکتا تھا۔ تاریکی میں ہم اس کے خلاف ٹھیک سے مزاحمت نہیں کر سکتے تھے اور اس کا امکان تھا کہ وہ ہمیں زخمی ضرور کر دیتا۔ ایک بار زخمی ہونے کے بعد ہم نہ تو مدافعت کے قابل رہتے اور نہ ہی پھر زیادہ دیر اس جگہ رہ سکتے تھے۔ یہی خیال روبیر کے ذہن میں بھی آیا تھا۔ اس نے کہا۔

”اگر بھاگنے والا اسمار دوسروں کو لے آیا تو......؟“

”مجھے بھی یہی خیال آیا ہے۔“ میں نے اعتراف کیا۔ ”ہم تاریکی میں ان جانوروں کی طرح نہیں دیکھ سکتے۔ مگر ہم کیا کر سکتے ہیں یہاں بے بس ہیں۔“

روشنی تیزی سے کم ہو رہی تھی۔ اچانک باہر موجود اسمار نے عجیب سی آواز نکالی۔ اس سے پہلے وہ صرف غرا رہا تھا اور جیسے ہمیں چیلنج کر رہا تھا کہ ہم باہر آئیں۔ مگر یہ آواز سہمی ہوئی تھی۔ پھر اچانک وہ بھاگا۔ اس کا رخ چٹانوں سے باہر والے حصے کی طرف تھا۔ دراڑ کے سامنے سے وہ لمحے میں گزر گیا۔ اس کی رفتار اتنی تیز تھی کہ ہم بس ایک جھلک دیکھ سکے اور پوری طرح تیار ہونے کے باوجود روبیر اسے تیر سے نشانہ نہیں بنا سکی تھی۔ اسمار کے اس طرح فرار پر ایک لمحے کو مجھے خیال آیا کہ شاید ہمیں تلاش کرنے والے یہاں تک آ گئے تھے۔ مگر اگلے ہی لمحے اسمار کی وحشت زدہ اور خوف میں ڈوبی چیخ نے میرے خیال کو غلط ثابت کر دیا۔ وہ انسانوں سے اس طرح ڈر کر نہ تو بھاگ سکتا تھا اور نہ ہی ڈر سکتا تھا۔ یہ کوئی اور ہی معاملہ تھا۔ اسمار کسی اور چیز سے ڈر کر بھاگا تھا۔

اس چیخ نے بتایا تھا کہ اسمار کے ساتھ کچھ برا ہوا ہے وہ شاید مارا گیا تھا یا بری طرح زخمی ہوا تھا۔ سچی بات ہے کہ اسمار کی چیخ نے مجھے فکرمند کر دیا تھا اور مجھے خوف سا محسوس ہوا تھا۔ روبیر بھی ڈر گئی تھی اور بے ساختہ پیچھے آنے لگی۔ اسمار کی طرف سے پہلی چیخ کے بعد خاموشی چھا گئی تھی پھر اس خاموشی میں ایسی آواز آئی جیسے کوئی زمین کو تھپتھپا رہا ہو اور میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں پہلے بھی یہ آواز سن چکا تھا اور یہ ہارن کے قدموں کی آواز تھی۔ اس کے چوڑے کھر نما پاؤں زمین پر لگتے تو ایسی ہی آواز آتی تھی۔ اسمار کے فرار سے پہلے اس کے قدموں کی چاپ نہیں سنائی دی تھی۔ شاید وہ یہاں تک بہت خاموشی سے آیا تھا۔ اسمار جیسے زود حس درندے کو بھی اس کی آمد کا پتا نہیں چلا اور جب پتا چلا تو بہت دیر ہو گئی تھی۔ میں نے بے ساختہ روبیر کو بازو سے پکڑ کر پیچھے کھینچ لیا۔ ہم دراڑ میں زیادہ سے زیادہ اندر جانے کی کوشش کر رہے تھے۔

اچانک کوئی چیز بہت تیزی سے آئی اور دراڑ کے سرے سے ٹکرا کر وہیں ڈھیر ہو گئی۔ روبیر نے چیخ ماری تھی اور فوراً ہی باہر سے خوفناک غراہٹ سنائی دی۔ چیز مارنے والا ہارن تھا اور جو چیز اس نے ماری تھی وہ مردہ اسمار تھا جو فرار کی کوشش میں ہارن کے ہاتھ لگ گیا تھا اور اس نے اسے ایک لمحے میں گردن توڑ کر مار دیا تھا اور پھر اس کی لاش دراڑ کے ساتھ والی چٹان پر کھینچ ماری تھی۔ شاید ہارن ہماری موجودگی سے واقف نہیں تھا مگر روبیر کی چیخ نے اسے متوجہ کر لیا تھا۔ اسے کچھ کہنا بیکار تھا۔ میں نے دل ہی دل میں اناللہ پڑھی۔ یہاں ایک نہ شد دو شد مصیبتیں آ گئی تھیں۔ پہلے اسمار آئے اور اب ہارن آ گیا تھا۔ جب کہ یہ جگہ ان دونوں کے مسکن سے خاصے فاصلے پر تھی۔ روبیر اندر گھس رہی تھی اور میں بھی پیچھے ہو رہا تھا۔ کچھ دیر بعد دراڑ کے سرے پر ہارن کا دیو قامت جسم نمودار ہوا۔ اس کا سر اس کی بلندی سے باہر تھا اس لیے اسے ذرا پیچھے ہو کر اور سر جھکا کر اندر جھانکنا پڑا تھا۔ اندر روشنی بہت کم ہو گئی تھی مگر ہارن کے لیے کافی تھی کہ وہ ہمیں دیکھ سکے۔

اس نے ہمیں دیکھ کر آواز نکالی اور پھر گھوم کر اپنا اگلا حصہ دراڑ میں داخل کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر اس کی جسامت کے لحاظ سے دراڑ آغاز میں ہی بہت تنگ تھی۔ اس کے پنجے نما ہاتھ ہی کچھ آگے تک آئے تھے مگر یہ ہاتھ بھی ہم سے کوئی چار گز کی دوری پر تھے۔ وہ یوں زور لگا رہا تھا

جیسا پانی ہے پناہ قوت کے بل بوتے پر دراز کو کشادہ کردے گا اور ہم تک پہنچ جائے گا۔ رودبہ نے اسے تیر مار دیا مگر وہ اس کے جسم میں پیوست ہونے کی بجائے پہلو سے ٹکرایا اور وہیں گر گیا۔ ہارن کو شاید اس کا پتا بھی نہیں چلا تھا۔ مجھے بھی علم نہیں ہوا تھا ورنہ میں اسے روک دیتا۔ رودبہ مجھ سے غیث کر دوسرا تیر لینے لگی تھی کہ میں نے اسے روک دیا۔ "نہیں اگر اسے زخم لگا تو اس کا کچھ نہیں بگڑے گا مگر اس کے بعد یہ پکا دشمن بن جائے گا۔ ہمیں مارے بغیر یہاں سے نہیں جائے گا۔"

بات رودبہ کی سمجھ میں آ گئی اور اس نے تیر لینے کا ارادہ ترک کر دیا۔ وہ اتنی خوفزدہ تھی کہ مجھ میں گھسی جا رہی تھی اور اس کا بدن کانپ رہا تھا۔ تیر بھی اس نے اضطراری طور پر چلایا تھا۔ ورنہ اسے بھی معلوم تھا کہ یہ معمولی تیر اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا ہے۔ ہارن ایسی ہی بلا تھی کہ اچھے اچھے بہادر مرد اس سے ڈرتے تھے رودبہ تو پھر بھی نازک سی لڑکی تھی۔ میں نے اسے تسلی دی۔ "فکر مت کرو یہ اندر نہیں آ سکتا ہے۔"

مگر رودبہ کا لرزہ کم نہیں ہوا تھا۔ "یہ چٹانیں توڑ دے گا۔"

"بے شک یہ بہت قوت رکھتا ہے مگر ان چٹانوں کو توڑنا اس کے بس کی بات نہیں ہے۔"

اس نے رودینے والے انداز میں کہا۔ "یہ چٹانیں اندر سے کھوکھلی ہیں اور ان میں سوراخ ہیں اگر ان کو زور سے مارا جائے تو یہ ٹوٹ جاتی ہیں۔ ہم اوزار بنانے کے لیے پتھر ان ہی چٹانوں سے نکالتے ہیں۔"

میں متفکر ہو گیا۔ وہ ٹھیک کہہ رہی تھی ہزاروں سال سے ہونے والی بارشوں اور سردی گرمی کے تغیر نے ان چٹانوں کو اندر سے پرتوں میں بدل دیا تھا اور بہت سخت ہونے کی وجہ سے یہ تحلیل تحلیل ہو رہی تھیں کیونکہ ان میں لچک ہوتی تو یہ اتنی آسانی سے نہ ٹوٹ جاتیں۔ ہارن نے ابھی تک ہم تک آنے کی معمولی سی کوشش کی تھی۔ اگر وہ پوری طرح جارحیت پر اتر آتا تو بقول رودبہ کے یہ چٹانیں توڑ سکتا تھا۔ جو کام انسان کر سکتا تھا وہی کام زیادہ آسانی سے کر سکتا تھا۔ مگر شاید ہارن اس بات سے بے خبر تھا کہ چٹانیں اندر سے کھوکھلی ہیں اور وہ کوشش کرے تو انہیں توڑ سکتا ہے۔ ہماری عافیت اسی میں تھی کہ وہ بے خبر رہے۔ ابتدائی ناکامی کے بعد وہ پیچھے ہٹ گیا تھا اور اب کھلی جگہ ٹہل رہا تھا۔ اس کا پتا اس کے قدموں کی چاپ سے ہو رہا تھا۔ وہ جس جگہ تھا وہ اس کے لحاظ سے بہت چھوٹی تھی۔ اس لیے کبھی کبھی ٹہلتے ہوئے وہ چٹانوں سے باہر بھی چلا جاتا تھا۔ تھوڑی دیر میں باہر اندھیرا چھا گیا۔ میں نے رودبہ سے کہا۔

"تم پیچھے آ جاؤ۔"

"نہیں میں تیر اندازی کر سکتی ہوں۔"

"اتنے فاصلے سے یہ کام میں بھی کر سکتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "مجھے ڈر ہے کہ کہیں یہ کچھ پھینک کر نہ مارے۔"

"ہارن چیزیں نہیں مارتا ہے۔" رودبہ نے کہا مگر اس نے میری بات مان لی اور اسی طرح سے مجھ پر چڑھ کر دوسری طرف اتر گئی۔ اب اس نے تیر کمان مجھے تھما دیا۔ یہاں بیٹھنے کی گنجائش نہیں تھی اور ہمیں جب تک یہاں رہنا تھا کھڑے رہنا تھا۔ ہم سرگوشی میں بات کر رہے تھے اور کم سے کم بول رہے تھے۔ میری خواہش تھی کہ ہارن جلد از جلد یہاں سے دفع ہو جائے۔ آخر اسے بھوک لگ سکتی تھی اور کوئی دوسری حاجت بھی پیش آ سکتی تھی۔ وہ گوشت نہیں کھاتا تھا اس لیے صرف ہمیں کھانے کے چکر میں یہاں رک بھی نہیں سکتا تھا۔ جب اسے بھوک لگتی تو اسے یہاں سے جانا ہی تھا۔ کیونکہ اس کی خوراک والی جھاڑیاں اور پودے شاید یہاں نہیں تھے۔ میں نے رودبہ سے پوچھا تو اس نے تصدیق کی۔ "یہ صرف مخصوص درختوں کے پتے اور بعض پودوں کی جڑیں کھاتا ہے۔ یہ کبھی ہماری فصلوں اور باغات میں کھانے پینے نہیں آتا ہے۔ میں نے یہاں وہ درخت اور پودے نہیں دیکھے جو اس کی خوراک ہیں۔"

رودبہ نے اپنے خوف پر قابو پا لیا تھا اور اب کسی قدر نارمل تھی۔ میں نے کہا۔ "یعنی ہم امید کر سکتے ہیں کہ جلد یا بدیر یہ یہاں سے چلا جائے گا۔"

مگر رودبہ کے ذہن میں کوئی اور خیال بھی تھا۔ اس نے کہا۔ "یہ یہاں ہے اور اگر اس دوران میں ہمیں تلاش کرنے والے یہاں آ گئے تو یہ ان پر حملہ کر دے گا۔"

میں بھی فکرمند ہو گیا۔ اگر ہارن تلاش کرنے والوں پر بے خبری میں حملہ کرتا تو اس کا امکان تھا کہ کئی افراد مارے جائیں گے۔ یہ بہت تیزی سے بلا مہلت کے انسانوں اور دوسرے جانوروں کو موت کے گھاٹ اتار سکتا تھا۔ میں اس کا عینی گواہ تھا اس نے معبد کے جلاد کو کیسے لمحے میں مار دیا تھا اور اسمار کا حشر بھی سامنے تھا۔ انسان سے زیادہ طاقتور اس درندے کو ہارن نے ایک چیخ مارنے جتنی مہلت دی تھی۔ رات کی تاریکی میں ہمیں تلاش کرنے والے دور سے

اسے نہ دیکھ پاتے اور بے خبری میں اس کے پاس آ جاتے تو پھر ان کا بچنا محال ہو جاتا۔ اس لیے ان کا رات کے وقت اس طرف نہ آنا ہی بہتر تھا۔ مگر یہ تو ہماری سوچ تھی۔ مقدر کو کیا منظور تھا ہم اس سے بے خبر تھے۔

اس روز موسم بہتر تھا اور جب ہم روانہ ہوئے تھے تو پانی بھی پیا تھا مگر اس بات کو اب کئی گھنٹے گزر چکے تھے۔ خوف، پریشانی اور اندیشوں نے ہمارا گلا خشک کر دیا تھا اور ہمارے پاس اسے تر کرنے کے لیے پانی نہیں تھا۔ مگر پیاس قابو میں تھی۔ البتہ جیسے جیسے وقت گزرتا تو پھر پیاس بڑھتی۔ بہر حال صبح تک کا وقت گزارنا کوئی بہت مشکل کام نہیں تھا۔ البتہ اس حال میں وقت گزارنا بہت مشکل کام تھا اور صبح تک پتا نہیں ہمارا کیا حال ہوتا۔ اندر گھستے ہوئے جہاں جہاں خراشیں اور کھرونچے آئے تھے اب وہ جگہیں دکھ رہی تھیں۔ میں دیوار سے ٹیک کر آرام کرنے لگا۔ روبیہ نے کچھ دیر بعد آہستہ سے کہا۔ ”میں تھک گئی ہوں۔“

”جسم ڈھیلا چھوڑ دو۔“ میں نے مشورہ دیا۔ ”دیواروں پر سے ٹیک لگا لو۔ اس طرح تھکن کم ہو گی۔“

اس نے ایسا ہی کیا۔ ”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں یوں آرام مل رہا ہے۔“

”کم سے کم بولو۔ جب ہم بات کرتے ہیں اور بارن سنتا ہے تو ہماری طرف متوجہ رہتا ہے اگر ہم چپ رہے تو شاید اس کا دھیان کسی اور طرف چلا جائے اور وہ خود بھی یہاں سے چلا جائے۔“

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ اس نے کہا اور خاموش ہو گئی۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ کیسی لڑکی ہے؟ اتنے دنوں سے میرے ساتھ ہے۔ اکیلی ہر جگہ میرے ساتھ گھومتی ہے مگر کبھی اس نے مجھ سے بے تکلف ہونے کی کوشش نہیں کی۔ اس وقت بھی اتنے پاس تھی کہ ہمارے جسم دو جان ایک قالب ہو رہے تھے مگر اس وقت بھی اس کے انداز میں کوئی ایسی بات نہیں آئی جسے میں محسوس کر سکتا۔ اس کا انداز قطعی نارمل تھا۔ وہ ڈر رہی تھی اور مجھ سے لپٹی جا رہی تھی۔ یہی روبیہ چند دن پہلے رات کی تاریکی میں میرے پاس آئی تھی اور اپنے جذبات کا اظہار کر رہی تھی۔ میں اسے سویرا سمجھ کر اس کا اظہارِ محبت قبول کر رہا تھا۔ پھر جب میں چونکا تو وہ پیچھے ہٹ گئی۔ اس نے مجھ سے معذرت کی حالانکہ وہ جس حد تک آگے آ چکی تھی یہاں کوئی عورت معذرت نہیں کرتی ہے۔ وہ آگے بڑھتی ہے اور مرد کو بھی مجبور کر دیتی ہے۔ وہ

خاموشی سے پیچھے ہٹ گئی اور جب میں نے اس سے پوچھا تو اس نے جواب دینے سے انکار کیا تھا۔ میں نے اس سے دوبارہ پوچھنے کا سوچا مگر پھر خیال آیا کہ میں خود اسے بولنے سے منع کر چکا ہوں۔

کچھ دیر آرام کے بعد جسم کے وہ حصے دکھنے لگے جو پتھروں سے لگے ہوئے تھے اور مجھے دوبارہ اپنے پیروں پر کھڑا ہونا پڑا۔ باہر سے وقفے وقفے سے بارن کے قدموں کی چاپ اور کبھی کبھی اس کے غرانے کے انداز میں سانس لینے کی آواز آ رہی تھی۔ مگر کچھ دیر سے اس کی طرف سے خاموشی تھی۔ میں نے آہستہ سے روبیہ سے کہا کہ میں ذرا باہر کا جائزہ لینے جا رہا ہوں۔ وہ مضطرب ہو گئی اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ”نہیں باہر خطرہ ہے۔ مجھے یقین ہے وہ موجود ہے اور خاموش رہ کر ایسا تاثر دے رہا ہے جیسے یہاں سے چلا گیا ہو۔“

”میں بالکل باہر نہیں جاؤں گا بلکہ دراز کے سرے تک جاؤں گا۔“

روبیہ میرے لہجے سے سمجھ گئی کہ میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ ”ٹھیک ہے مگر خیال سے جائیے گا۔“

میں نے تیر کمان سے لگا کر آگے کیا اور آہستہ سے بنا آواز کیے سرکنے لگا۔ بالکل خاموشی تو ناممکن تھی کیونکہ پتھروں سے رگڑ کی آواز تو پیدا ہو رہی تھی۔ جب ایسا موقع آتا تو میری کوشش ہوتی کہ میں اپنے جسم پر برداشت کر لوں مگر آواز نہ پیدا ہونے دوں۔ اس کے باوجود کچھ نہ کچھ آوازیں پیدا ہو رہی تھیں۔ میں نہیں جانتا تھا کہ بارن کے کان کتنے تیز ہوتے ہیں۔ عام طور سے گھوڑے کے کان بہت تیز ہوتے اور وہ ایسی آوازیں بھی سن لیتا ہے جو انسان نہیں سن پاتا۔ بارن گھوڑے جیسا ہی تھا۔ مگر اس کے کان گھوڑے کے کانوں سے مختلف اور چھوٹے تھے اس لیے یہ کہنا مشکل تھا کہ وہ تیز سنتا ہے یا نارمل سماعت رکھتا ہے۔ جیسے جیسے دراز کے آغاز کی طرف بڑھ رہا تھا میری کوشش تھی کہ آواز کم سے کم ہو۔ چند منٹ بعد میں اس جگہ پہنچ گیا جہاں تک بارن کے ہاتھ آئے تھے۔ یہ دراز کا تقریباً آخری حصہ تھا اور ایک گز بعد کھلی جگہ آ جاتی۔

میں نے رک کر سن گن لینا شروع کی۔ بارن اگر پاس موجود تھا تو اس کی بھاری سانسوں کی آواز آنی چاہیے تھی۔ مگر وہاں اس لحاظ سے خاموشی تھی۔ اگر بارن چٹانوں کے درمیان اس صحن میں ہوتا تو لازمی اس کی سانس کی آواز آتی۔ کیونکہ اس وقت مکمل خاموشی تھی اور اس میں سوئی

گرنے کی آواز بھی سنائی دیتی۔ ابتدائی مکمل تاریکی کے بعد اب کسی قدر روشنی تھی۔ میں نے احتیاط سے سر آگے کر کے اوپر کی طرف دیکھا تو مجھے ستارے دکھائی دیے۔ یہ ستاروں کی روشنی تھی۔ اس میں کم سے کم چٹانوں اور چیزوں کے ہیولے دکھائی دے رہے تھے۔ میرے پیروں سے چند فٹ دور اسمار کی لاش پڑی تھی اور وہ بالوں کا ایک ڈھیر لگ رہا تھا۔ چٹان سے ٹکرا کر اس کی لاش کا مزید حشر ہو چکا تھا۔ یہ اطمینان کر لینے کے بعد کہ ہارن کم سے کم صحن میں نہیں ہے میں دبے قدموں آگے آیا اور اب پورا صحن واضح تھا۔ ہارن وہاں کہیں بھی نہیں تھا۔

میں نے پلٹ کر اشارے سے روبیر کو آگے آنے کو کہا۔ وہ میری نسبت آسانی سے باہر آ گئی۔ اتنا تو وہ سمجھ گئی تھی کہ یہاں ہارن نہیں ہے ورنہ میں اتنا آگے نہ جاتا اور نہ ہی اسے یوں آگے آنے کا اشارہ کرتا۔ وہ نزدیک آئی تو میں نے سرگوشی میں کہا۔ ”میں باہر تک جا رہا ہوں تم اندر ہی رہو گی مگر بالکل اندر مت جانا۔ ہاں اگر کوئی ہنگامی صورت حال ہو تو بالکل اندر چلی جانا اور جب تک میری یا کسی اور طرف سے مدد نہ آئے باہر مت آنا۔“

”آپ کہاں جا رہے ہیں؟“

”میں دیکھ رہا ہوں کہ آس پاس ہارن ہے یا چلا گیا ہے اگر وہ چلا گیا ہے تو ہمارے پاس موقع ہے کہ یہاں سے نکل جائیں۔“

”ہاں اگر وہ چلا گیا ہو تو۔“ روبیر خوش ہو کر بولی اور دراز میں ذرا پیچھے چلی گئی۔ میں دبے قدموں چٹانوں سے باہر کی طرف بڑھا۔ تیر کمان سامنے کیا ہوا تھا۔ ایک سیکنڈ کے نوٹس پر تیر چلانے کے لیے تیار تھا۔ کھلی جگہ کے پاس آ کر میں ایک طرف چٹان سے لگ گیا اور اس کے ساتھ سرکتے ہوئے باہر جا رہا تھا۔ میری کوشش تھی کہ میرا جسم چٹان کا ایک حصہ نظر آئے۔ مجھے کھلے میں ایک طرف کا منظر صاف دکھائی دے رہا تھا اور اس جگہ ہارن موجود نہیں تھا۔ دوسری طرف اگر وہ موجود تھا تو مجھے نظر نہیں آیا تھا مگر میں بھی اسے نظر نہیں آتا۔ بالآخر میں اس پوزیشن میں آیا کہ اب دوسری طرف بھی دیکھ سکتا تھا اور ہارن مجھے فوراً ہی نظر آ گیا۔ وہ کوئی بیس پچیس گز کی دوری پر ایک درخت کے ساتھ کھڑا ہوا اس سے پتے توڑ کر کھا رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی میرے اندر اب تک جو امید جاگی تھی وہ مرجھا گئی۔ ہارن نے ہمارا پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔ اس کی پیٹ پوجا بتا رہی تھی کہ وہ یہاں مزید قیام کا ارادہ رکھتا ہے۔ تاکہ وہ ہم پر قابو پا لے یا کسی وجہ سے

یہاں سے جانے پر مجبور ہو جائے۔
ہارن بہت دیو قامت تھا۔ اس کا سر زمین سے کم سے کم بھی دس فٹ اونچا تھا۔ جسم کسی تنومند گھوڑے کے مقابلے میں بھی دوگنا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ اس کا وزن ایک ٹن سے خاصا اوپر تھا اور یہ معبد کے کنویں میں قید ہارن سے زیادہ وزنی تھا۔ شاید اس لیے کہ وہ کھلی فضا میں اور کھلی خوراک کے ساتھ رہ رہا تھا۔ جب کہ معبد والے ہارن کو بند جگہ اور بچی تلی خوراک ملتی ہوگی۔ اسے دیکھ لینے کے بعد بھی میں نے واپس جانے کی کوشش نہیں کی۔ مجھے معلوم تھا کہ ہارن اتنا پھرتیلا نہیں ہے اگر وہ مجھے دیکھ لے اور میرے پیچھے آئے تب بھی میں با آسانی دراڑ میں گھس کر محفوظ دوری تک پہنچ سکتا تھا۔ عقب سے مجھے کوئی خطرہ نہیں تھا جس خطرے نے بھی آنا تھا اسی راستے سے گزر کر آنا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ کچھ دیر رکتا ہوں اگر ہارن یہاں سے کہیں اور جاتا ہے تو میں اور رودیر نکلنے کی کوشش کرتے ہیں۔

دوسری صورت میں واپس اسی دراڑ میں گھس جائیں گے۔ وہ جگہ ہمیں ہارن اور دوسرے جانوروں سے محفوظ رکھ سکتی تھی۔ مجھے رودیر کا خیال بھی آ رہا تھا کہ میری مسلسل غیر حاضری سے پریشان ہو کر وہ باہر نہ آ جائے۔ اس صورت میں ہم مشکل میں پڑ سکتے تھے۔ یہاں ہوا ساکت تھی۔ اس وادی میں میں نے ہوا ساکت ہی دیکھی اور بہت کم ایسا ہوا کہ ہوا کا کوئی جھونکا آیا ہو۔ مگر مجھے ایسا لگا جیسے ہوا سرسرا رہی ہو۔ حالانکہ ہوا ساکن تھی۔ مگر یہ آواز ایسی تھی جیسے دور کہیں ہوا کے چلنے سے پتے اڑ رہے ہوں۔ میں نے غور سے سنا تو مجھے یہ سماعت کا وہم محسوس ہوا تھا۔ مگر کچھ دیر بعد آواز بڑھ گئی اور اس بار مجھے یہ مانوس بھی لگی تھی۔ جیسے میں نے پہلے بھی یہ آواز سنی ہو۔ آواز واضح تھی اور اس بار میں اسے اپنا وہم قرار نہیں دے سکتا تھا۔ آواز بڑھتے ہوئے واضح شور بن گئی تھی اور یہ مسلسل آ رہی تھی۔ مگر میں یہ نہیں جان سکا تھا کہ آواز کس طرف سے آ رہی ہے۔

غالباً ہارن نے بھی آواز سن لی تھی کیونکہ اس نے پتے کھانا ترک کر کے اپنا سر گھما کر آواز کی سمت کا اندازہ کرنے کی کوشش شروع کر دی تھی۔ وہ کبھی سر ایک طرف کرتا اور کبھی دوسری طرف۔ میری طرح وہ بھی اس کی سمت کا اندازہ کرنے سے قاصر تھا۔ معاً میں چونکا کیونکہ مسلسل شور میں اب ایک آواز الگ سے نمایاں تھی اور یہ چیخنے کی مکروہ آواز تھی جس سے میں اچھی طرح آشنا تھا۔ یہ ان ہی بندر نما جانوروں کی آواز تھی جو وادی کی دیواروں میں بسیرا کرتے ہیں۔ جب یہ بولتے ہیں تو ایسی آواز آتی ہے جیسے خشک ٹہنیاں چیخ رہی ہوں۔ میں واپس سرکنے لگا۔ میں ایسی پوزیشن میں تھا کہ اگر میں چٹان سے الگ ہو کر حرکت کرتا تو ہارن کی نظروں میں آ جاتا۔ وہ اب اسی سمت میں دیکھ رہا تھا۔ میں نے آوازوں کا ماخذ تلاش کر لیا تھا۔ یہ آوازیں اوپر سے آ رہی تھیں۔

تقریباً رینگنے کی رفتار سے سرکتے ہوئے میری نظر ہارن پر بھی تھی اگر وہ تاریکی اور چٹان سے چپکے ہونے کے باوجود مجھے دیکھ لیتا تو بہت تیزی سے حرکت میں آتا اور اس کے ساتھ ہی مجھے بھی حرکت میں آنا پڑتا۔ میں اب بھی پر اعتماد تھا کہ میں ہارن کی آمد سے پہلے دراڑ میں پہنچ سکتا تھا۔ اس کے باوجود میری کوشش تھی کہ ہارن یہاں میری موجودگی سے واقف نہ ہو۔ بندر نما جانوروں کا شور بڑھتا رہا تھا کہ وہ ان چٹانوں کے آس پاس پہنچ گئے تھے اور جب میں سرکتا ہوا اس حد تک اندر گیا کہ گن میں دیکھ سکوں تو یہ دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے کہ بندر نما جانوروں نے اسمار کی لاش کو گھیر لیا تھا اور وہ اس پر پلے پڑ رہے تھے۔ ان کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ یہ درجنوں نہیں سو سے اوپر تھے۔ انہوں نے دراڑ میں جانے والا راستہ روک لیا تھا۔

میں سوچ رہا تھا کہ اب کیا کروں اور اسی لمحے مجھے ہارن کے قدموں کی تاپ سنائی دی۔ وہ اس طرف آ رہا تھا۔ میں جس دیوار کے ساتھ لگا کھڑا ہوا تھا یہ اوپر سے ذرا آگے نکلی ہوئی تھی اور اس کے نیچے کچھ خلا تھا۔ میں نے پاؤں اندر کر کے دیکھا تو یہ ڈیڑھ فٹ تک کا خلا تھا۔ میں نے سوچا اور بنا آہٹ کے زمین پر لیٹ کر اس قدرتی چھجے کے نیچے سرک گیا۔ میرا جسم چٹان کی جڑ سے لگا اور میں اس سے چپک گیا۔ تیر کمان میں نے سینے سے لگا لیے تھے۔ خوش قسمتی سے بندر نما جانوروں نے اب تک مجھے نہیں دیکھا تھا ورنہ ان کی آنکھیں بہت تیز تھیں اور یہ یقیناً تاریکی میں بھی دیکھ سکتے تھے۔ مگر وہ پوری طرح اسمار کی لاش کی طرف متوجہ تھے اور یقیناً وہ اسی لاش کے لیے آئے تھے۔ ان کی کسی حس نے ان کو اطلاع دی تھی کہ یہاں ان کے کھانے پینے کے لیے کچھ موجود ہے۔ میں نے ان کو ایک برفانی آدمی کی لاش صفاچٹ کرتے دیکھا تھا۔ یہ یقیناً ہڈیوں کا گودا تک نکال کر کھا جاتے ہوں گے۔

مجھے رودیر کی فکر تھی۔ وہ ان بندر نما جانوروں سے زیادہ دور نہیں تھی اور اگر وہ اسے دیکھ لیتے تو لازمی حملہ کرتے۔ بد قسمتی سے اس کا ہتھیار یعنی تیر کمان میرے پاس

تھے اس کے پاس ترکش اور میری لاٹھی تھی۔ لاٹھی وہ صرف نزدیک آنے والے جانوروں پر ہی استعمال کر سکتی تھی۔ مگر بندر نما جانور ابھی تک اس کی موجودگی کا احساس نہیں کر پائے تھے۔ یقیناً میری طرح سدرہ بھی دم سادھے بیٹھی تھی۔ ذرا سی آواز یا آہٹ ان جانوروں کو متوجہ کر سکتی تھی۔ میں ان سے زیادہ فاصلے پر تھا۔ مجھے ان کی بجائے ہارن کی فکر تھی۔ ان کا کسی نہ کسی طرح مقابلہ کیا جا سکتا تھا مگر ہارن کا مقابلہ تقریباً ناممکن تھا۔ میرے کان اور آنکھیں چٹانوں سے باہر کی طرف لگے تھے جس طرف سے ہارن کو آنا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ آن پہنچا۔

بندر نما جانوروں کے شور کے باوجود ہارن کی ٹاپوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ نزدیک آ گیا تھا۔ پھر میں نے اس کے پاؤں چٹان کے بیرونی طرف نمودار ہوتے دیکھے۔ اس کے کھر بہت بڑے اور زمین پر پنجوں کی طرح پھیلے ہوئے تھے۔ اس کا بے پناہ وزن اٹھانے کے لیے ایسے ہی کھر ہونے چاہیے تھے۔ وہ ایک لمحے کو رکا اور ہلکے سے غرایا۔ بندر نما جانوروں نے اپنے شور اور پھر اسار کرنے کے چکر میں اس کی آواز شاید سنی ہی نہیں تھی۔ اس لیے اسے اپنی موجودگی کا احساس دلانے کے لیے بھیانک آواز میں غرانا پڑا تھا۔ اس کی غراہٹ ایسی تھی کہ پیچھے لیتے ہوئے میں کانپ گیا تھا۔ بندروں کا جھنڈ اس آواز پر یوں تتر بتر ہوا جیسے چڑیاں آواز پر اڑ جاتی ہیں۔ ظاہر ہے وہ پرندے نہیں تھے اس لیے اڑنے کی بجائے بکھر گئے اور ان میں سے کچھ دراڑ میں بھی گھسے تھے۔ مگر بیشتر چٹانوں پر چڑھ گئے اور کچھ چٹانوں کی جڑوں کے ساتھ چپک گئے۔

ہارن کچھ دیر کھڑا ہوا غرانے کے انداز میں سانس لیتا رہا۔ پھر وہ آگے آیا۔ کچھ بندر نما جانور جو ابھی پیچھے ہی تھے۔ اپنی مخصوص چیختی آواز میں چلاتے ہوئے چٹانوں پر چڑھنے لگے۔ ہارن نے ان میں سے ایک پر ہاتھ مارا اور وہ چٹان اور ہارن کے جناتی ہاتھ کے درمیان پس کر رہ گیا۔ اسے آخری آواز نکالنے کی مہلت بھی نہیں ملی تھی۔ اس خون ناحق پر بندر نما جانوروں نے حسب معمول بے پناہ شور شروع کر دیا۔ ایسا لگا جیسے آسمان سر پر اٹھا رہے ہوں۔ ہارن اس وقت مجھ سے چند گز دور کھڑا ہوا تھا اور اس کا جسم دھڑ تک دکھائی دے رہا تھا اور باقی جسم میری نظروں سے اوجھل تھا۔ وہ گہرے سانس کھینچ رہا تھا ایسا لگا جیسے وہ کچھ سونگھ رہا ہو۔ میرا دل دھڑک اٹھا کیا اسے میری بو آ رہی تھی۔ مگر بندر نما جانوروں کی موجودگی میں وہ کچھ کنفیوز تھا کہ بو کہاں سے

آ رہی ہے۔

اچانک مجھے لگا کہ میرے سر کے پاس کوئی چیز چیخی۔ دوسری چیز نے بھی مجھے محسوس کر لیا۔ اس نے بھڑک کر چیختی آواز نکالی اور پیچھے ہٹا۔ اسی لمحے ہارن غرایا اور وہ نیچے جھکا۔ اس کا سر اس حد تک نیچے نہیں آ سکتا تھا مگر اس کے ہاتھ خلا کے سامنے نمودار ہوئے۔ میں ان پنجے نما ہاتھوں سے کچھ ہی دور تھا اور وہ ہاتھ ذرا آگے کرتا تو مجھے پکڑ لیتا۔ بھڑکنے والا بندر نما جانور اب ہارن کو بالکل نزدیک پا کر دم سادھے بیٹھا تھا۔ حالانکہ اسی نے آواز نکال کر اس مصیبت کو متوجہ کیا تھا۔ پنجے نما ہاتھ میری طرف بڑھے تو اس وقت مجھے بچنے کی ایک ہی ترکیب سوجھی تھی اور میں نے اس پر فوری عمل کیا۔ میں نے سر کے اوپر ہاتھ مارا اور بندر نما جانور کو پکڑ لیا۔ اس نے آواز نکالی اور اپنے پنجوں سے میرے ہاتھ کو نوچنے کھسوٹنے لگا۔ میں نے اس کی پروا کیے بغیر اسے کھینچا اور ہارن کے ہاتھ سے لگا دیا۔

ہارن نے فوراً اس بندر نما جانور کو دبوچا اور اسے لے کر اس کے ہاتھ باہر چلے گئے۔ بندر نما جانور کی آخری چیخ بہت کرب ناک تھی۔ چند لمحے بعد اس کی کچلی مسلی ہوئی لاش میرے سامنے ہی گری تھی اور میں نے دل ہی دل میں اس سے معذرت کی کہ اس کی قربانی دے کر میں نے اپنی جان

بچائی تھی۔ مگر دیکھا جائے تو غلطی بھی اس کی تھی۔ اس نے آواز نکال کر ہارن کو جھمبے کے پیچھے کی طرف متوجہ کیا تھا۔ اس دوسرے خون پر بھی بندر نما جانوروں نے بہت واویلا مچایا تھا۔ ہارن جس طرح مجمن میں گھوم رہا تھا ایسا لگ رہا تھا کہ وہ انھیں بچنے یا مارنے کی کوشش کر رہا ہے۔ مگر اب وہ سب اس کی پہنچ سے دور تھے۔ البتہ انھوں نے یہاں سے جانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ چٹانوں پر چڑھے ہوئے تھے اور اس انتظار میں تھے کہ ہارن یہاں سے جائے تو وہ باقی ماندہ اسمار اور اپنے مارے جانے والے ساتھیوں کو کھا پی کر اوپر کا رخ کریں۔

بندر نما جانوروں کے برعکس میری جان پر بنی ہوئی تھی کیونکہ ہارن بالکل پاس موجود تھا اور اگر وہ میرے بارے میں جان جاتا تو مجھے بھاگنے کی مہلت بھی نہیں ملتی۔ ہارن کے قدموں سے اڑتی دھول مجھ تک آرہی تھی اور اس کے کچھ ذرات نے میری ناک تک رسائی حاصل کی تھی۔ اس کے ردعمل میں ناک میں سرسراہٹ ہونے لگی۔ اس وقت اگر میں چھینک مار دیتا تو میری وجہ وفات یقیناً چھینک قرار دی جاتی۔ جو نہایت غلط موقع پر ماری گئی تھی۔ اس لیے میں چھینک روکنے کی ازحد کوشش کرنے لگا۔ مگر وہ کہتے ہیں کہ عشق، مشق اور چھینک چھپائے نہیں چھپتی ہے تو ایسا ہی ہوا تھا۔ پورا زور لگانے پر چھینک کے سسٹم نے اندر سے جوابی زور لگایا اور جو آواز برآمد ہوئی اس نے صرف بندر نما جانوروں کو ہی نہیں بلکہ ہارن کو بھی اچھلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ بندر نما جانوروں کا شور تھم رہا تھا مگر اس نئی آواز پر انھوں نے آسمان ایک بار پھر سر پر اٹھا لیا۔

ہارن شاید پھر کنفیوز تھا کہ آواز کہاں سے آئی ہے۔ مگر وہ زیادہ دیر کنفیوز نہیں رہ سکتا تھا۔ اس کے پاؤں جھمبے کی طرف آئے اور پھر اس کے مہیب ہاتھ نمودار ہوئے۔ اس بار میں نے پیچ خود کو فوت شدہ محسوس کیا اور دل ہی دل میں کلمہ شریف پڑھ لیا۔ کوئی لمحہ جاتا تھا کہ ہارن مجھے تلاش کر کے باہر کھینچ لیتا اور اس کے فوراً بعد میرا کام تمام ہو جاتا۔ میں نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ مجھے پکڑتا اچانک دروازے کی طرف سے روبیر نمودار ہوئی اور اس نے چیخ کر کہا۔ ”اے.....ادھر آؤ۔“

ہارن کے ہاتھ رک گئے اور پھر غائب ہو گئے۔ اس کا رخ روبیر کی طرف ہوا تھا کہ وہ پلٹ کر بھاگی اور ہارن اس کے پیچھے لپکا تھا۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ روبیر نے حماقت کی تھی وہ دروازے سے باہر آگئی تھی۔ وہ پلٹ کر بھاگی مگر

اس کا پاؤں زمین پر پھیلے اسمار کے خون سے پھسلا اور وہ نیچے گر گئی تھی۔ اسی وجہ سے وہ ہارن کی پہلی جھپٹ سے محفوظ رہی تھی۔ اس نے ہاتھ گھمایا تھا جو اگر روبیر کو لگ جاتا تو وہیں اس کا کام ہو جاتا۔ جس دوران میں ہارن اس کی طرف لپک رہا تھا میں غیر شعوری انداز میں حرکت میں آیا اور جس وقت روبیر پھسل کر گری میں تیر کمان پر چڑھا کر اس کا رخ ہارن کی طرف کر چکا تھا۔ نیچے گری ہوئی روبیر کو اٹھانے کے لیے اسے بہت جھکنا پڑتا اور شاید اس کے لیے اتنا جھکنا ممکن نہیں تھا۔ وہ خاصا اونچا ہارن تھا۔ اس نے بھی یہ بات محسوس کر لی کہ وہ نیچے گری اور پیچھے سرکتی روبیر کو اٹھا نہیں سکتا ہے۔

اس لیے اس نے اس پر اپنے اگلے پاؤں آزمانے کا فیصلہ کیا اور اپنے دونوں اگلے پاؤں گھوڑے کی طرح بلند کیے۔ اسی لمحے میں نے تیر چھوڑا جو عقب میں اسے ایک نہایت نامعقول لیکن بالکل درست جگہ لگا۔ ہارن نے تکلیف کی شدت سے بھیانک سی آواز نکالی اور اس کی ٹانگیں آگے گرنے کی بجائے پیچھے گر گئیں۔ روبیر بال بال بچی تھی اور پھر وہ دروازے میں داخل ہو گئی۔ اب بھی وہ لیٹ کر کھسک رہی تھی کیونکہ اسے خوف تھا کہ اگر وہ ذرا بھی اوپر ہوئی تو ہارن اسے اچک لے گا۔ مگر ہارن کو اب اس کی بجائے میری فکر تھی جس نے اس کی تشریف میں تیر مارا تھا۔ وہ میری طرف گھوم رہا تھا۔ اب چھپے رہنا حماقت ہوتی۔ میرے ذہن میں چٹانوں کا باہر ایک حصہ تھا۔

میں اٹھ کر تیزی سے اس طرف دوڑا۔ ہارن نے مجھے دیکھ لیا تھا اس نے غضب ناک آواز نکالی اور میرے پیچھے لپکا۔ مگر جب تک وہ چٹانوں سے باہر آنے والے راستے پر آتا میں باہر نکل چکا تھا۔ میں چٹان ٹٹولتا ہوا اس جگہ آیا جہاں اس میں چند رخنے تھے اور تیزی سے ان میں پاؤں رکھ کر اوپر چڑھنے لگا۔ چٹان چند فٹ سے زیادہ بلند تھی اور اگر میں اس پر چڑھ جاتا تو امید تھی کہ ہارن سے بچ سکوں گا۔ جب تک ہارن باہر آیا میں دس فٹ اوپر جا چکا تھا اور ابھی اس کی پہنچ میں تھا۔ اگر وہ باہر آتے ہی مجھے دیکھ لیتا تو میں پکڑا جاتا مگر اس نے کچھ وقت ضائع کیا۔ وہ مجھے زمین پر تلاش کر رہا تھا اور میں اوپر چڑھ چکا تھا۔ جب اس نے مجھے دیکھا تو میں چٹان کے آخری حصے میں تھا۔ اس نے جھپٹتے ہوئے ہاتھ مارا اور اس کا ہاتھ میرے جوتے کو چھو گیا تھا۔ اسی لمحے میں نے خود کو اوپر کھینچ لیا۔

غضب ناک ہو کر ہارن نے ایسی آواز نکالی جو شاید

سکل دور تک گئی ہو اور اسے قریب سے سن کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں مزید پیچھے ہٹا کیونکہ ہارن چٹان پر چڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کا جسم اس کام کے لیے نہیں تھا۔ اپنے بھاری وجود اور کھروں والے پیروں کی وجہ سے معمولی سی چٹان پر بھی بہ مشکل چڑھ سکتا ہو گا بہ شرط کہ اوپر اس کے ٹھہرنے کے لیے مناسب جگہ ہو یہاں چٹانوں پر کوئی جگہ نہیں تھی۔ اس کے باوجود وہ اوپر چڑھنے کی پوری کوشش کر رہا تھا اور اس کی کوشش کے نتیجے میں چٹان لرز رہی تھی۔ اس کا جنون برحق تھا کیونکہ میں نے اسے تیر مار کر زخمی کیا تھا۔ وہ ویسے انسانوں سے نالاں رہتا تھا۔ میں محفوظ جگہ ہونے کے باوجود اس سے ممکن حد تک دور رہنے کی کوشش کر رہا تھا اور اسی کوشش میں چٹان کے دوسری طرف گرتے گرتے بچا۔

یہ چٹانیں تہہ در تہہ تھیں۔ شاید کبھی یہ ایک بڑی چٹان کا حصہ رہا ہو مگر موسمی حالات اور وقت نے اسے ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ چٹان میں خلا تھا اور میں اسی میں گرتے گرتے بچا تھا۔ میں جس طرح روانی سے یہ سب بیان کر رہا ہوں درحقیقت اس وقت میری ہوائیاں اڑی ہوئی تھیں اور مجھے آس پاس کا نہ تو کچھ دکھائی دے رہا تھا اور نہ سنائی دے رہا تھا۔ میرا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا اور بہا میرے ماتھے تک سے پسینا جاری تھا۔ خلا آیا تو میں نے سنبھل کر اس کے دوسری طرف دیکھا اور پھر چھلانگ لگا کر اس طرف آ گیا۔ تب مجھے ذرا اطمینان ہوا کہ میں ہارن کی پہنچ سے دور ہوں۔ مگر یہاں آتے ہی دوسری مصیبت نازل ہوئی۔ یہ بندر نما جانور تھے جنہوں نے میری آمد کو بالکل پسند نہیں کیا اور چیخنے کی مکروہ آوازیں نکالتے ہوئے مجھے دھمکانے لگے۔

میرے پاس سوائے کمان کے اور کچھ نہیں تھا میں اسی کی مدد سے انہیں بھگانے لگا۔ وہ میرے پاس آنے کی کوشش بھی کر رہے تھے اور مجھے ان کے ناخنوں کی تیزی کا اندازہ ہو گیا تھا میرے ایک ہاتھ پر خاصی گہری خراشیں تھیں جن سے خون رس رہا تھا مگر مجھے اس وقت اس کا احساس نہیں تھا۔ بندر نما جانوروں نے محسوس کر لیا کہ میں جسامت اور طاقت میں ان سے زیادہ ہوں اور زندہ بھی ہوں اس لیے وہ میرا کچھ بگاڑ نہیں سکتے تھے۔ وہ پسپا ہونے لگے۔ بلکہ یہ کہنا درست ہو گا کہ واپس جانے لگے۔ بعد میں مجھے پتا چلا کہ وہ اسمار کی لاش کھانے دوڑ گئے تھے کیونکہ ہارن میرے چکر میں وہاں سے ہٹ گیا تھا۔ اب ان کے لیے موقع تھا کہ وہ اپنی ضیافت وہیں سے شروع کر سکیں جہاں سے چھوڑی

بجڑا Amdarat

یہ پرندہ ابتدا میں بھارت کے صوبہ گجرات کے شہر احمد آباد سے یورپ کو برآمد کیا گیا تھا اور اس کی مناسبت سے ایمڈارٹ کہلایا۔ بیے کی قسم کے اس پرندے کی چونچ دندانہ دار ہوتی ہے۔ بیے سے چھوٹا اور رنگ میں قرمزی سا ہوتا ہے۔ لوگ اسے شوق سے پالتے ہیں۔ پاکستانی بجڑا نیلے رنگ کا ہوتا ہے۔ اسے بھی پالا جاتا ہے اور طرح طرح کے کرتب سکھائے جاتے ہیں۔ مثلاً توپ چلانا، چٹھی لے جانا، ڈھولک بجانا، قلابازیاں کھانا۔ جنگلی بجڑا نہایت خوب صورت گھونسلا بناتا ہے۔

مرسلہ: نعیم نیازی۔ شیخوپورہ

جاٹ

ہندوستان کی ایک قدیم نسل جس کے افراد زیادہ تر پنجاب میں پائے جاتے ہیں۔ ان کا پیشہ زراعت ہے۔ ان کے اصل اور نسلی ارتقا کے بارے میں اختلاف ہے۔ امریکی مورخ پروفیسر حتی کا خیال ہے کہ یہ لوگ ابتداً خانہ بدوش تھے۔ فتوح البلدان میں انہیں "زط" لکھا گیا ہے۔ ابتدائی دور اسلام میں مکہ اور مدینہ میں زط خاندان کا ذکر ملتا ہے۔ دت قبائل کا دعویٰ ہے کہ ان کے قبیلے کے کئی افراد امام حسینؓ کی نصرت میں کربلا میں شہید ہوئے۔ وہ ان کی یاد میں محرم کے مہینے میں مجلس و ماتم کرتے ہیں۔ سنیل دت اور سنجے دت کا تعلق بھی اسی یعنی جاٹ قبیلے سے ہے۔

مرسلہ: نزہت امتیاز۔ کراچی

جاثیہ

سورۂ جاثیہ قرآن حکیم کی 45 ویں سورۃ۔ مکہ معظمہ میں نازل ہوئی۔ جاثیہ کے معنی ہیں گھٹنے ٹیکنے والی۔ چونکہ اس سورۃ میں قیامت کے روز خوف و دہشت سے ہر امت کے گھٹنے ٹیکنے کا ذکر ہے اس لیے اس نام (جاثیہ) سے موسوم ہوئی۔ اس میں 37 آیات اور 4 رکوع ہیں۔

مرسلہ: زرینہ خان۔ نالہ موسیٰ

تھی۔ اسی وجہ سے میری جان بھی چھوٹی تھی۔

اب میرا سانس اور دماغ قابو میں آ رہا تھا اور ہارن کا جوش و خروش بھی یہی محسوس کر کے دھیما ہو گیا تھا کہ وہ اس چٹان پر کسی صورت نہیں چڑھ سکتا تھا۔ مگر وہ اب بھی آس پاس ہی منڈلا رہا تھا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ روبیر کہاں تھی۔ میں نے چٹانوں کے اوپر سے دیکھا کہ وہ جگہ کہاں ہو سکتی تھی جس کے نیچے دراڑ تھی اور دراڑ میں روبیر تھی۔ یہ اصل میں ایک ہی چٹان کے مختلف حصے تھے۔ میں محتاط قدموں سے آگے بڑھا۔ دو جگہ چٹانوں کو پھلانگ کر میں آگے بڑھا اور ایک جگہ تو گرتے گرتے بچا۔ بالآخر میں اس چٹان کے اوپر پہنچ گیا جس کے نیچے دراڑ تھی اور بندر نما جانور اسی کے نیچے مصروف عمل تھے۔ مگر یہاں کوئی جانور نہیں تھا سب نیچے جا چکے تھے۔ میں نے جھک کر روبیر کو پکارا۔ بندر نما جانور آوازیں نہیں نکال رہے تھے اس لیے روبیر نے میری آواز سن لی۔

"آپ ٹھیک ہیں؟"

"ہاں اور تم؟"

"میں بھی ٹھیک ہوں بس ان جانوروں نے کچھ پنجے مارے تھے۔"

میں فکر مند ہو گیا۔ "کیا وہ اندر گھسے تھے؟"

"ہاں مگر میں نے لاٹھی سے چند ایک کو ٹھکانے لگایا تو باقی بھاگ گئے۔"

"کیا تم باہر آ سکتی ہو؟"

"نہیں کیونکہ انہوں نے پورا راستہ بند کیا ہوا ہے۔ میں ان کے درمیان سے نہیں گزر سکتی۔"

"سنو اچھا موقع ہے۔ اگر تم باہر آ سکو تو چٹان کے اوپر چڑھ سکتی ہو۔ ابھی ہارن باہر ہے۔"

"کہاں سے چڑھ سکتی ہوں مجھے تو کوئی جگہ نظر نہیں آئی ہے۔"

"میں دیکھتا ہوں۔ یہ جانور زیادہ دیر یہاں نہیں رہیں گے۔" میں نے کہا اور چٹانوں کے درمیان کوئی ایسی جگہ تلاش کرنے لگا جس سے اوپر چڑھا جا سکے۔ یہاں چڑھنے کے لیے کئی جگہیں تھیں مگر ان پر آسانی اور تیزی سے نہیں چڑھا جا سکتا تھا۔ جب کہ یہاں معاملہ ہی تیزی کا تھا اگر رفتار تیز نہ ہوتی تو ہارن آ لیتا اور اس کے بعد حضرت عزرائیل آ کر اس کے پنجے سے چھڑاتے۔ مگر ساتھ ہی وہ اپنے ساتھ مجھے بھی لے جاتے۔ پھر تاریکی بھی تھی اور اندھیرے میں ذرا سی غلطی ناکامی اور موت کا سبب بن سکتی تھی۔ میں نے دراڑ پر آ کر روبیر سے کہا۔ "مجھے بھی ایسی کوئی جگہ نظر نہیں آئی ہے جہاں سے تم آسانی سے اوپر آ سکو۔ اس لیے ابھی تمہارا نیچے رہنا ٹھیک ہو گا۔"

"میں بھی یہاں ٹھیک ہوں۔" اس نے جواب دیا۔ "اب یہ بھی تنگ نہیں کر رہے ہیں۔"

بندر نما جانور بہت تیزی سے لاشوں کا صفایا کر رہے تھے۔ اسمار کے ساتھ وہ اپنے مارے جانے والے ساتھیوں کو بھی کھا رہے تھے۔ ایک بار ان کا پیٹ بھر جاتا تو وہ لازمی اپنے ٹھکانے کا رخ کرتے۔ مجھے حیرت تھی کہ وہ نہ صرف وادی کے اوپر تک چلے جاتے تھے۔ بلکہ یہاں نیچے وادی تک بھی آ جاتے تھے۔ وادی کی تہہ سے اوپر تک کا فاصلہ کوئی نو ہزار فٹ کے لگ بھگ بنتا تھا۔ اسے آپ تین کلومیٹر یا پونے دو میل سمجھ لیں اور یہ اتنا فاصلہ طے کر کے اوپر نیچے آتے جاتے تھے۔ جب کہ دیواروں پر چڑھنا بھی آسان نہیں تھا۔ مگر صدیوں سے یہ مشق کر کے اب ان کے لیے چڑھنا اور اترنا اتنا ہی آسان ہو گیا ہو گا جتنا کہ ہمارے لیے کسی ہموار اور صاف ستھری سڑک پر سفر کرنا۔

نہ جانے کیا وقت ہوا تھا۔ شاید نصف رات ہو گئی تھی کیونکہ گرما کے دن تھے اور سورج ڈوبتے ڈوبتے بھی ساڑھے سات کا وقت ہو جاتا تھا۔ فرض کریں کہ یہاں ساڑھے سات تک روشنی ختم ہو جاتی تھی تب بھی اس کو خاصی دیر گزر چکی تھی۔ تھکن کے ساتھ اب پیاس کا احساس بہت واضح تھا۔ البتہ بھوک اتنی نہیں تھی۔ بس یہ دل کر رہا تھا کہ کہیں سے ڈھیر سارا ٹھنڈا پانی مل جائے۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ حال میں بارش ہوئی تھی اور ممکن ہے چٹان کی کسی دراڑ میں پانی جمع ہو۔ میں ایسی دراڑوں کو ٹٹول کر دیکھنے لگا۔ مگر واقعی ان میں پانی نہیں تھا۔ پھر ایسا تھا کہ میں بس انگلیاں گیلی کر سکتا تھا اس پانی کو پی نہیں سکتا تھا۔ میں نے انگلیاں ہی گیلی کر کے اپنے خشک لبوں پر پھیر لیں۔ اس سے کسی قدر تسکین ہوئی تھی۔ نارمل حالت میں اگر اتنی دیر پانی نہ ملتا تو شاید مجھے محسوس بھی نہ ہوتا مگر ہنگامی حالات اور بھاگ دوڑ نے پیاس کی کیفیت کو بہت بڑھا دیا تھا۔

میں چٹانوں کو ٹٹولتے ہوئے آگے جا رہا تھا حتیٰ کہ یہ چٹانیں بہت دور تک بلکہ شاید وادی کی دیوار تک پھیلی ہوئی تھیں۔ کچھ جگہوں پر خلا تھے مگر بیشتر جگہوں پر اوپر سے ہموار چٹانیں تھیں۔ ایک جگہ مجھے پیالہ نما جگہ محسوس ہوئی۔ شاید اس جگہ پانی تھا کیونکہ گڑھے والی جگہ کچھ چمک سی محسوس ہوئی تھی۔ میں اس تک پہنچا اور ٹٹول کر دیکھا تو

واقعی گڑھے میں کچھ پانی تھا۔ میں نے ہتھیلی میں لے کر پہلے اسے سونگھا مگر اس سے سوائے مٹی اور پانی کی مہک کے کوئی تیسری بو نہیں آئی۔ میں نے احتیاط سے تھوڑا سا منہ میں لے کر چکھا اور حلق سے اتارنے کی بجائے کچھ دیر پانی کو منہ میں ہی رکھا۔ پھر اللہ کا نام لے کر اسے حلق سے اتار لیا۔ پانی بہت زیادہ نہیں تھا مگر میری پیاس بجھا سکتا تھا۔ اس کے باوجود میں کچھ دیر انتظار کرتا رہا اگر پانی میں کوئی مضر چیز شامل تھی تو ابھی اس کا اثر ہوگا۔ مگر جب خاصی دیر گزرنے کے بعد بھی کوئی اثر نہیں ہوا تو میں نے رک رک کر کئی بار پانی پیا اور ہر بار پانی پینے کے بعد تھوڑی دیر انتظار کرتا تھا۔ یہ اس لحاظ سے بھی بہتر تھا کہ میں خالی پیٹ تھا۔ آج اتفاق سے ناشتے کے بعد دوپہر میں کچھ کھانے کو موقع نہیں ملا تھا اور میں نے سوچا تھا کہ رات واپس جا کر ہی کھاؤں گا۔ مگر یہاں جانے کا موقع نہیں ملا اور بھاگ دوڑ میں پیٹ بالکل ہی خالی ہو گیا۔ پیاس بجھانے کے بعد مجھے دوسرا مسئلہ درپیش ہوا یہ بھی پانی سے ہی متعلق تھا اور میں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ میں اس وقت اس دراڑ میں قید نہیں تھا۔ اکیلا ہوتا تو کوئی بات نہیں تھی مگر روبیر کے ساتھ یہ مسئلہ بہت زیادہ ہو جاتا۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو میں ہارن کا شکر گزار تھا کہ اس کی آمد سے مجھے دراڑ سے نکلنے کا موقع ملا۔ ورنہ اسمار کے ہوتے ہوئے باہر آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مسئلہ تو خاصا پہلے سے تھا مگر حالات کے تحت میں اسے دبائے ہوئے تھا۔ اب حالات بہتر ہوئے تو میں نے اسے بھی حل کر لینا مناسب سمجھا اور یہاں مناسب جگہوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔

میں واپس دراڑ کے اوپر آیا تو نیچے بندر نما جانور بہت کم رہ گئے تھے۔ بیشتر کھا پی کر اوپر کا رخ کر چکے تھے۔ باقی رہ جانے والے بچا کچا کھانے میں مصروف تھے۔ یقیناً اسمار اور مارے جانے والے بندر نما جانوروں کی ہڈیاں باقی رہ گئی ہوں گی۔ ہارن باہر اسی چٹان کے آس پاس ٹہل رہا تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ میں اسی جگہ سے واپس اتروں گا۔ میں نے روبیر کو آہستہ سے پکارا۔ "تم کہاں ہو؟"

"یہیں ہوں۔" اس نے جواب دیا۔ "آپ کہاں چلے گئے تھے۔"

"میں اوپر ہی گھوم پھر رہا ہوں۔ یہاں کچھ پانی ملا ہے اگر تم اوپر آسکو تو تم بھی پی سکو گی۔"

"پانی۔" وہ بے تاب ہو گئی۔ "لیکن اوپر کیسے آؤں؟"

دراڑ کی چھت زمین سے کوئی تین فٹ اوپر تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اسے کیسے اوپر لاؤں۔ معاً مجھے خیال آیا۔ میں نے کہا۔ "روبیر کیا تم دراڑ کی دیواروں کا سہارا لے کر اوپر آسکتی ہو؟"

اسے بھی یہ آئیڈیا اچھا لگا۔ "میں کوشش کر سکتی ہوں۔"

"کرو، چھت کے پاس آجاؤ تو میں تمہیں اوپر کھینچ لوں گا۔"

"لیکن یہ ترکش اور لاٹھی۔"

"انہیں اوپر اچھال دو۔" میں نے کہا مگر پھر مجھے خیال آیا۔ "نہیں اگر یہ واپس نیچے گرے تو آواز ہوگی اور ہارن سن کر آجائے گا۔ تم لاٹھی چھوڑ دو اور اگر ترکش کے ساتھ خود اوپر آسکتی ہو تو آجاؤ ورنہ اسے بھی چھوڑ دو۔"

"میں کوشش کرتی ہوں۔" اس نے ترکش شانے پر لادا اور اس کی رسی اس کے سینے سے گزرتی کر کے پیچھے چلی گئی تھی۔ اس نے رسی کو بل دے کر ترکش کو کس کے باندھ لیا اور پھر دونوں ہاتھ اور پاؤں مخالف سمت میں دیواروں سے لگاتے ہوئے اوپر چڑھنے لگی۔ وہ پرفٹ تھی اور یہ کام اس کے لیے زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوا۔ وہ اس جگہ سے چڑھی جہاں چھت اس کے اوپر تھی مگر اوپر جاتے ہوئے وہ باہر کی سمت نکلی چٹان کے اوپری حصے تک تو بالکل درست جگہ تھی۔ میں نے اس کا ہاتھ تھاما اور اسے آرام سے اوپر کھینچ لیا۔ اس نے اوپر آتے ہی بے تابی سے پوچھا۔ "پانی کہاں ہے؟"

"میرے ساتھ آؤ۔" میں اسے چٹانوں پر سے لیتا ہوا اس جگہ پہنچا جہاں پیالے نما جگہ پانی تھا۔ میں نے ہاتھ روک کر پیا تھا اس لیے کچھ پانی تھا جو روبیر نے بے تابی سے پیا۔ اس نے چند گھونٹ لیے تھے کہ میں نے اسے روک دیا۔ "اب رک جاؤ، کچھ دیر بعد دوبارہ پینا۔"

وہ سمجھتی تھی اس لیے رک گئی اور وہیں بیٹھ گئی۔ میں نے کہا۔ "یہ تم نے کیا حماقت کی تھی۔"

"جب آپ کو ہارن نے گھیرا تو مجھ سے برداشت نہیں ہوا اور میں باہر نکل آئی۔"

"تم پاگل بچی ہو۔"

"ہاں مگر آپ بچ گئے میرے لیے یہ زیادہ خوشی کی بات ہے۔"

"میں پتا نہیں کیسے بچا، تقریباً تاریکی میں، میں اس چٹان پر چڑھا اور آخری وقت میں میرا پاؤں ہارن کے ہاتھ میں آتے آتے رہ گیا۔ وہ اب بھی اس چٹان کے نیچے

ہے۔"

"شکر ہے وہ یہاں نہیں آ سکتا۔" روبیر نے گہرا سانس لے کر کہا۔

میرا بھی یہی خیال تھا مگر ہارن نے کچھ دیر بعد یہ خیال غلط ثابت کر دیا۔ وقفہ دے کر روبیر نے باقی ماندہ پانی پیا اور جب پانی اتنا نہیں رہا کہ ہاتھ سے پیا جا سکے تو اس نے جھک کر ہونٹ چٹان سے لگا کر بچ جانے والا پانی چوس لیا۔ یقیناً اس کی تشنگی بھی مٹ گئی تھی۔ ہم جس جگہ تھے یہاں سے ایک قلعہ اور اس کی روشنیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ درمیان میں درختوں کے کئی جھنڈ تھے اس لیے باقی دو قلعے نظر نہیں آ رہے تھے۔ یہ مشرقی قلعہ تھا جو باقی دو کی نسبت سب سے چھوٹا تھا۔ روبیر نے کہا۔ "لگتا ہے ہماری تلاش شروع نہیں ہوئی ہے۔"

"ممکن ہے اسے روشنی ہونے تک کے لیے ملتوی کر دیا گیا ہو۔"

"اگر کوئی عام فرد ہوتا تو یہی کیا جاتا مگر آپ عام آدمی نہیں ہیں آپ کو ہر قیمت پر تلاش کیا جانا چاہیے تھا۔"

"مگر یہاں تو ایسا لگ رہا ہے حالات معمول کے مطابق ہیں اور شاید کسی نے ہماری گمشدگی کو محسوس ہی نہیں کیا ہے۔" میں نے قلعے کی طرف دیکھا۔ وہاں سوائے روشنیوں کے اور کوئی سرگرمی نظر نہیں آ رہی تھی۔

"ممکن ہے بات ابھی سامیرا اور کچھ خاص لوگوں کے علم میں ہو اور ہمیں خاموشی سے تلاش کیا جا رہا ہو۔"

"خاموشی سے کیوں؟"

"کیونکہ شاید یہ بات پھیل جائے تو دشمنوں کے حوصلے بلند ہوں اور وہ ہم پر حملہ کر سکتا ہے۔"

"انہوں نے بہر صورت حملہ کرنا ہے۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا اور میرے ذہن میں خیال آیا کہ وہ کس بات کا انتظار کر رہے تھے۔ اچانک روبیر نے میرا شانہ دبوچ لیا اور پھر دھکا دے کر نیچے گرا دیا۔ وہ خود بھی یوں لیٹ گئی تھی جیسے کسی کی نظروں سے بچنا چاہ رہی ہو۔ ساتھ ہی اس نے میرے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا تھا۔ میں نے ناک سے ہلکی سی آواز نکال کر استفسار کیا تو اس نے ایک سمت اشارہ کیا اور جب میں نے اس سمت دیکھا تو دنگ رہ گیا۔ چٹانوں کے اوپر ہارن کا انسان نما سر دکھائی دے رہا تھا اور وہ سر گھما کر ہمیں تلاش کر رہا تھا۔ نہ جانے وہ کیسے اوپر آیا۔ اس راستے سے آنا تو ناممکن تھا جس راستے سے ہم آئے تھے۔ شاید اس نے کوئی اور راستہ تلاش کر لیا تھا جس سے وہ اوپر

آ سکتا تھا۔ وہ ہم سے کوئی پچاس گز کے فاصلے پر تھا اور درمیان میں کوئی ایسی رکاوٹ نہیں تھی جو اسے ہم تک آنے سے روک سکتی۔ ہم اس چٹان کی طرف بھی نہیں جا سکتے تھے جس میں دراڑ تھی۔ اترنے کا ایک وہی راستہ تھا۔ ورنہ اب تک میں نے چٹانوں کا جو سروے کیا تھا اس میں نیچے اترنے کا کوئی اور راستہ دکھائی نہیں دیا تھا۔

میں نے آس پاس دیکھا اور پیالے نما چٹان کے پیچھے والی چٹان ذرا نیچی تھی۔ میں نے اشارے سے روبیر کو سمجھایا کہ وہ اس طرف جائے اور نیچے اترے۔ وہ سمجھ گئی اور لیٹے لیٹے سرکنے لگی۔ میں ساکت لیٹا ہوا تھا کہ وہ میری آڑ میں تھی اور ہارن اس کی حرکت نہیں دیکھ سکتا۔ پھر اس نے قدم بڑھایا اور اس کا مہیب وجود پوری طرح سامنے آ گیا۔ وہ اتنا چالاک ضرور تھا کہ ہمیں بے خبر رکھنے کے لیے دبے قدموں چل رہا تھا۔ روبیر سرکتی ہوئی اس چٹان سے نیچے اتر گئی۔ اب میری باری تھی مگر میں زیادہ خطرے میں تھا۔ ہارن اب چالیس گز کے فاصلے پر تھا اور مزید نزدیک آ رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اب اس طرح پڑے رہنا بے وقوفی ہوتی اور میں اپنے ساتھ روبیر کو بھی خطرے میں ڈال دیتا۔ میرے ذہن میں دراڑ تک پہنچنے کا خیال تھا۔

میں اچانک اٹھا اور دراڑ کی طرف بھاگا۔ اس کے لیے مجھے ہارن سے کسی قدر نزدیک سے گزرنا پڑتا اور اس میں ایک یہ خطرہ تھا کہ راستہ نہ روک لے۔ دوسرا خطرہ یہ تھا کہ تاریکی میں میرا پاؤں کسی غلط جگہ جائے اور میں گروں تو اس کے بعد اٹھنے کا موقع نہیں ملے گا۔ مگر مجھے پہلا فائدہ یہ ہوا کہ ہارن اس وقت مخالف سمت میں دیکھ رہا تھا اور جب میرے قدموں کی چاپ سے وہ چونکا تو میں تقریباً اس کے نزدیک ترین جگہ پہنچ گیا تھا۔ جب تک وہ رخ بدل کر میری طرف مڑتا تب تک میں اس جگہ سے گزر کر دراڑ کی طرف جا چکا تھا۔ ہارن غراتا ہوا میرے پیچھے لپکا اور میں نے دوڑتے ہوئے کہا۔ "روبیر اپنی جگہ رہنا وہاں سے نکلنا مت۔"

مجھے خدشہ تھا کہ ہارن کو میرا پیچھا کرتے دیکھ کر کہیں وہ چھپنے کی جگہ سے نکل آئے۔ اس لیے میں نے اسے خبردار کر دیا تھا۔ میرے مقابلے میں ہارن کی رفتار تیز تھی۔ میں دراڑ کے قریب پہنچا تھا کہ وہ میرے سر پر پہنچ گیا۔ میرے پاس موقع نہیں تھا کہ میں رکتا اور دراڑ میں اترتا۔ اس لیے میں نے بے دھڑک دراڑ میں چھلانگ لگا دی۔ میں سیدھا گیا تھا اور میرا جسم دونوں طرف چٹانوں سے ٹکرایا مگر میں نے خود کو روکنے کی کوشش نہیں کی۔ اب بھی میں ہارن کی

حد میں تھا اور وہ جھک کر مجھے پکڑ سکتا تھا۔ چٹانوں سے ٹکرانے اور رگڑ کھانے سے میری رفتار از خود کم ہوئی تھی پھر میں نے محسوس کیا کہ میں خطرے کی حد سے نیچے آ گیا ہوں تو میں نے پاؤں مار کر اپنی رفتار گھٹانے کی کوشش کی اور فرش تک پہنچتے پہنچتے رفتار اتنی کم ہوئی تھی کہ میں آرام سے گرا تھا۔ البتہ ہاتھوں اور پیروں کا کیا حال ہوا تھا یہ تو اس کے بعد میں پتا چلا۔

مجھے ہاتھ سے نکلتے دیکھ کر ہارن اتنا دیوانہ ہوا کہ بے دھڑک صحن میں کود گیا۔ وہ تقریباً بائیس فٹ کی بلندی سے کودا تھا اور یہ بلندی خاص نہیں تھی مگر اس کے بے پناہ وزن نے اسے مروا دیا۔ وہ اگلے پیروں کے بل نیچے گرا اور مجھے بہت سخت لکڑی چٹخنے جیسی آواز آئی تھی۔ ہارن کے حلق سے کربناک غراہٹ نکلی اور اس نے کھڑے ہونے کی کوشش کی تو پچھلے پیروں پر کھڑا ہوا مگر جیسے ہی اس نے اگلے پیروں پر زور دینا چاہا وہ پھر نیچے گرا تھا اور اس بار اس کی غراہٹیں بہت بلند تھیں۔ اس کے گرتے ہی میں تیزی سے دراڑ میں ہو گیا تھا۔ تاکہ اس کی دست برد سے نکل جاؤں مگر جب اس کا حال دیکھا اور محسوس کیا تو میں آگے آیا۔ ہارن بار بار اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا اور ہر بار گر رہا تھا۔ اس کے دونوں اگلے پاؤں ٹوٹ گئے تھے۔ وہ ناکارہ ہو گیا تھا اور اب خطرناک نہیں رہا تھا۔

مگر اس حد تک کہ اب وہ میرا پیچھا نہیں کر سکتا تھا اگر میں یہاں سے نکل جاتا۔ مسئلہ یہاں سے نکلنے کا تھا۔ دراڑ کے عین سامنے وہ موجود تھا اور ہرگز مجھے یہاں سے زندہ سلامت جانے کی اجازت نہ دیتا۔ نیچے گرتے ہوئے مجھے خاصی چوٹیں آئی تھیں۔ رگڑنے اور ٹکرانے سے جسم کوئی نصف درجن مقامات سے بری طرح دکھ رہا تھا۔ کنپٹی پر گرم گرم احساس ہوا تو میں نے ہاتھ لگا کر دیکھا۔ کنپٹی سے خون بہہ رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے گرتے ہوئے میرا سر بھی کہیں ٹکرایا تھا اگرچہ اس وقت مجھے احساس نہیں ہوا۔ روبیر میرے منع کرنے کے باوجود اپنی پناہ گاہ سے جھانک کر دیکھ رہی تھی اور جب اس نے ہارن کو بھی نیچے کودتے دیکھا تو بھاگی آئی تھی اس نے دراڑ کے اوپر سے نیچے جھانکا۔

"شہباز آپ کہاں ہیں؟... آپ ٹھیک ہیں نا؟"

"ہاں میں ٹھیک ہوں کچھ چوٹیں آئی ہیں مگر کوئی زیادہ نقصان نہیں ہوا ہے۔"

روبیر نے ہارن کو دیکھ لیا تھا جو بار بار اٹھنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ "اسے کیا ہوا ہے؟"

"میرا خیال ہے اس کے اگلے دونوں پاؤں ٹوٹ گئے ہیں۔" میں نے کہا۔ "یہ ناکارہ ہو گیا ہے۔"

"مگر آپ اس کے پاس نہیں جائیں گے۔" روبیر جلدی سے بولی۔ "یہ اس حالت میں بھی بہت خطرناک ہے۔"

"میں سمجھتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "مجھے چوٹیں آئی ہیں اور میں دیکھتا ہوں کیا اوپر آ سکتا ہوں یا نہیں۔"

روبیر سے بات کرنے کے دوران میں اپنی جسمانی حالت کا جائزہ لے رہا تھا۔ میرے دائیں گھٹنے پر آنے والی چوٹ شدید تھی اور میں اس پر زور دیتا تو درد کی لہری اٹھتی تھی۔ ہارن اب بیٹھ گیا تھا۔ شاید اس نے جان لیا تھا کہ اس حالت میں وہ کھڑا نہیں ہو سکے گا اور اگر سچ اس کے پاؤں کی ہڈیاں ٹوٹ چکی تھیں تو وہ پھر بھی کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے کھڑے ہونے کی کوشش میں جو دھاچوکڑی مچائی تھی اس میں اسمار کی باقی رہ جانے والی ہڈیاں چکنا چور ہو گئی تھیں۔ مجھے لگ رہا تھا کہ صبح قریب ہے کیونکہ آسمان پر نظر آنے والے ستارے غائب ہونا شروع ہو گئے تھے۔ ماحول ایک بار پھر مکمل تاریک ہو رہا تھا۔ اچانک چٹانوں نے پھر سے غرانے کی آواز آئی اور ہارن جو اب خاموش تھا یک دم چوکنا ہو گیا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی اور ناکامی پر پھر غرایا تھا۔ پہلی غراہٹ واضح نہیں تھی مگر جب دوبارہ غراہٹ اور سنائی قریب سے آئی تو میں مضطرب ہو گیا۔ میں نے روبیر سے کہا۔ "اسمار آ گئے ہیں۔ تم چوکنا رہو وہ اوپر بھی چڑھ سکتے ہیں۔"

"اسمار۔" روبیر نے سہم کر کہا۔

"پیچھے ہو جاؤ اور کوئی آواز مت نکالنا۔" میں نے کہا۔ میں بھی خطرے کی حد سے پیچھے آ گیا تھا۔ اسمار اندر آ رہے تھے اور ان کی غرانے کی آوازیں بتا رہی تھیں کہ وہ کئی تھے۔ شاید ان کی حیوانی حس نے انہیں بتا دیا تھا کہ یہاں ایک لاچار ہو جانے والا ہارن موجود ہے اور وہ ان کے لیے بڑی خوراک بن سکتا ہے۔ مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا مگر ہارن اور اسمار یقیناً ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے اور آنے والے آدھے گھنٹے میں وہاں شدید قسم کی جنگ ہوئی۔ جس میں شور تھا، غراہٹیں تھیں اور موت کا کرب بھی تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اسمار بار بار ہارن پر حملے کر رہے ہوں اور وہ اپنی مدافعت کر رہا تھا۔ اس حالت میں بھی وہ کم خطرناک نہیں تھا۔ کچھ دیر میں روشنی نمودار ہونے لگی اور منظر سامنے آیا۔ سر سے پاؤں تک خون میں ڈوبے ہارن کے آس پاس کم سے

کم تین مردہ اسمار پڑے تھے۔

مگر ان کی تعداد یقیناً اس سے زیادہ تھی۔ زخموں سے نڈھال ہارن اپنی مزاحمت جاری رکھے ہوئے تھا۔ مگر اسماروں نے تین قربانیاں دے کر اسے مرنے کی حد تک زخمی کر دیا تھا۔ خاص طور سے اس کے سینے پر گہرے زخم نظر آ رہے تھے جن سے بہت تیزی سے خون بہہ رہا تھا اور یہ خون زمین پر پھیلتا جا رہا تھا۔ اسمار پیچھے ہٹ گئے تھے اور انتظار کر رہے تھے کہ وہ مرے یا پھر اتنا بے دم ہو جائے کہ مزاحمت نہ کر سکے تو وہ پھر حملہ کریں۔ میں نے محسوس کیا کہ یہی وقت تھا میں دوبارہ چٹان پر جانے کی کوشش کروں۔

اسمار ابھی کسی قدر باہر تھے اور میں ان کی نظروں میں نہیں آیا تھا۔ جسمانی تکالیف بھی بہتر تھیں۔ میں خاموشی سے اوپر چڑھنے لگا۔ احتیاطاً میں نے روبیر کو بھی آواز نہیں دی تھی کہ اسمار ہماری موجودگی سے واقف ہو جاتے۔ انسانوں سے ان کو بھی کم دشمنی نہیں تھی۔ جب میں وادی میں آیا اور پہلی بار اسمار دیکھے تو وہ ایک مردہ ہارن کھا رہے تھے اور کھانے کے لحاظ سے کوئی کمی نہیں تھی۔ اس کے باوجود وہ ہم پر حملہ کرنے کے لیے دوڑے آئے تھے۔ اپنے خیال کے برعکس میں آسانی سے واپس اوپر پہنچ گیا۔ جہاں روبیر ہوشیار بیٹھی تھی مجھے دیکھ کر اس کے منہ سے چیخ نکلنے والی تھی مگر اس نے بروقت اپنی چیخ پر قابو پا لیا اور لپک کر میرے پاس آئی۔ اس نے میرا ہاتھ تھام کر مجھے اوپر کھینچا اور سرگوشی میں بولی۔ "آپ ٹھیک وقت پر اوپر آ گئے۔ روشنی ہو گئی ہے اور اسمار بھی اندر آنے والے ہیں۔"

وہ اوپر سے سب دیکھ رہی تھی۔ نیچے سے غرّاہٹیں بلند ہونے لگی تھیں۔ اسمار فیصلہ کن حملے کے لیے اندر آ رہے تھے۔ میں نے احتیاط سے جھانک کر دیکھا تو چار عدد اسمار صحن میں موجود تھے اور وہ ہارن کو گھیر رہے تھے۔ ان میں جو سب سے تنومند تھا وہ ہارن کے سامنے آیا۔ ہارن مدافعت کے لیے تیار تھا مگر اسمار کا حملہ اتنا تیز تھا کہ وہ اسے روک نہیں سکا اور اسمار نے ہوا میں اڑتے ہوئے چہرے سے نیچے اس کا گلا اپنے بھیانک جبڑے میں دبوچ لیا اور اس کے گلے سے ہی لٹک گیا تھا۔ ہارن نے ہاتھوں سے زور لگا کر اسے الگ کرنا چاہا تو وہ اس کا نرخرہ ادھیڑتا ہوا الگ ہوا تھا۔ ہارن نے اسمار کو چھوڑ کر اپنا گلا تھام لیا جس سے خون فواروں کی صورت میں نکل رہا تھا۔ اس کا آخری وقت آ گیا تھا دیکھتے ہی دیکھتے وہ دھماکے سے زمین پر گرا اور نزع کے عالم میں لرزنے لگا۔

اسمار نے اس کے مرنے کا انتظار نہیں کیا تھا وہ اس پر ایسے ہی ٹوٹ پڑے تھے۔ ان کی غرّاہٹیں کانوں کا امتحان لے رہی تھیں۔ روبیر نے میرے کان میں کہا۔

"بس اب چلیں، یہی موقع ہے یہاں سے نکلنے کا۔"

ہم پیچھے ہٹے اور پھر اس جگہ تک آئے جہاں سے میں ہارن سے بچنے کے لیے اوپر چڑھا تھا۔ روشنی خاصی ہو چکی تھی اور آس پاس کے مناظر صاف دکھائی دے رہے تھے۔ ان مناظر میں کہیں بھی کوئی اسمار نہیں تھا۔ وہ سب چٹانوں میں ضیافت اڑانے میں مصروف تھے۔ ہم اترے اور پودوں اور درختوں کی آڑ لیتے ہوئے اس جگہ سے دور جانے لگے۔ ہمیں خوف تھا کہ اگر اسمار ہماری موجودگی سے واقف ہو گئے تو وہ ہارن کو چھوڑ کر ہمارے پیچھے لگ جائیں گے۔ شکر ہے ایسا ہوا نہیں اور ہم کسی قدر گھوم کر قلعوں کے پاس پہنچ گئے تھے۔ محفوظ مقام تک پہنچ کر روبیر نے کہا۔ "مجھے یقین نہیں آ رہا کہ ہم بچ کر آ گئے ہیں۔"

اس وقت قلعوں کی آبادی گھروں میں تھی یا محو خواب تھی۔ صرف پہرے دار تھے۔ جو فصیلوں پر موجود تھے۔ ہم شرقی قلعے کے پاس سے ہوتے ہوئے مرکزی قلعے تک آئے۔ ہمیں دیکھتے ہی پہرے داروں نے دروازے کھول دیے تھے۔ ہم نے سابیرا کے مکان کا رخ کیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ ہمیں دیکھ کر سپاہیوں میں کچھ کھلبلی سی مچ گئی تھی مگر کسی نے سوال نہیں کیا اور نہ ہی ہمیں روکا تھا۔ سابیرا اپنے مکان کے صحن میں تھی اور پریشانی سے ٹہل رہی تھی ہمیں دیکھتے ہی وہ ہماری طرف لپکی۔ اس نے میرے ہاتھ تھام لیے۔ "شہباز کہاں تھے تم؟"

"میں اور روبیر عقب میں موجود چٹانوں میں پھنس گئے تھے وہاں ہمیں پہلے اسمار اور پھر ہارن نے گھیر لیا تھا۔ بہت مشکل سے بچ کر واپس آئے ہیں۔"

"بہت برا ہوا..... بہت برا ہوا۔" وہ اضطرابی لہجے میں کہہ رہی تھی۔ "کاش تم دونوں صبح ہونے سے پہلے آ جاتے.....اب نہ جانے کیا ہوگا؟"

میں نے غور سے اسے دیکھا۔ "کیا برا ہوا ہے...... آپ کیا کہنا چاہ رہی ہیں؟"

اسی لمحے دروازہ کھلا اور سومرو چند سپاہیوں کے ہمراہ اندر آیا۔ اس کا انداز جارحانہ تھا اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا آنے والے سپاہیوں نے مجھے جکڑ لیا تھا اور سومرو نے سرد لہجے میں ان سے کہا۔ "اسے لے جا کر قید کر دو۔ اس کا فیصلہ بعد میں کریں گے۔"

(جاری ہے)

(سیف اللہ ملک وال کا جواب)

حمایت علی خان......... کراچی

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
کہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

زریون جدون......... ہری پور

یوں تو ہر سمت ترے شہر میں ہنگامہ ہے
اور پھر بھی ہر اک شخص اکیلا جیسے

(احمد جاوید کراچی کا جواب)

احمد توحید......... چنیوٹ

ہائے وہ معنی لطیف کہ جو
قصہ لفظ و بیاں میں ڈوب گیا

عائشہ ہنو......... لاڑکانہ

ہو گیا جسم اگر خاک تو کیا
روشنی ہے مری زندہ مجھ میں

ارم توقیر......... منڈی بہاؤالدین

ہر ایک بات زبان پر ہے گفتگی کے سوا
اس اختیار پہ یہ جبر خامشی کیا ہے

احمد کمال فریدی......... حیدرآباد

ہماری جان تجھے دہرا عذاب ہے محسن
کہ دیکھنا ہی نہیں ہم کو سوچنا بھی ہے

(امجد علی مظفرہ کا جواب)

عاصمہ اکبر......... کراچی

یوں کی سا بتا دیتا ہے احساس قیام
جیسے گھر سے کہیں ہمسائے چلے جاتے ہیں

نوازش علی سید......... مظفرگڑھ

یاد ماضی عذاب ہے یارب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

(فتی عزیز ے لندن کا جواب)

بادیہ ایمان، ماہا ایمان......... کہاٹی

ایسے ٹوٹ گئی آرزو اجاڑ ہوئی
نہ کوئی پتہ بچا ہے نہ کوئی شاخ نہ پھول

(علی اکبر کراچی کا جواب)

محمد یوسف ساتول لنگریال......... نور پور تھل

اب کے برس بہار کی صورت بدل گئی
دھنوں میں آگ لگ گئی گلزار فس بچے

(عرفان مروت حب بلوچستان کا جواب)

ناعمہ تحریم......... ملیر کراچی

غریبوں کے جہاں میں وقت بھی رک رک کے چلتا ہے
کبھی صبحیں نہیں ہوتیں کبھی راتیں نہیں ہوتیں

(عباس اختر فیصل آباد کا جواب)

حکیم سید محمد رضا شاہ نقوی......... نورنگ

یاد آئے گی بیماری اس وقت تجھے دل سے
جب دل والوں کی محفل میں کوئی دل سے نہیں لے گا

(بیا مشتاق کا جواب)

یاسر نفیسہ بانی......... ملتان

یہ اور بات کہ تعبیر نہ ہونے پائے
ورنہ ہر ذہن میں تاج محل ہوتے ہیں

(ارشاد رشد ہری پور کا جواب)

ارم حارث......... کراچی

وہ گھڑی آنکھ لگائی ہے کہیں لگ جائے
جشن خوشبو ہو بپا تم جو اچانک آؤ

نورین طلعت......... کراچی

دنیا نے بہت طنز کے پتھر تھے اچھالے
یہ اپنی ہی ہمت تھی رہے خود کو سنبھالے

نادیہ اصفہانی......... اسلام آباد

دیار غیر میں یہ پوچھنا ہی پڑ گیا آخر
بتا کر بے وطن کو رہنے دیتے ہیں یہاں کب تک

امجد علی......... مظفرہ

دل والو یہی آن ہے آبادی دل کی
یہ شہر جو اجڑا تو بسایا نہیں جاتا

(رمیش دیو، ہے سکھر کا جواب)

آنند جیٹھ ملانی......... سکھر

توہین ہنر بھی ہے یہ رسوائی فن بھی
ہوری میں اگر شعر جواں ہو نہیں سکتا

اشرف علی شیروانی......... کراچی

ملتا نہ ملتا ہے کبھی پہ مجھ پر
کام میرا ہے تیرے رستے میں چلتا جاؤں

محمد کلیم سرفراز......... جہلم

تھا جو ایقان کا مدعی وہ بھی
خود سراب گماں میں ڈوب گیا

نوشین ملک......... گجرات

تیرے چاہنے والوں ہی نے دونوں بوجھ اٹھائے ہیں
یوں تو بار الم بھی ہے بھاری بار نشاط بھی بھاری ہے

(بادیہ ایمان، ماہا ایمان کا جواب)

سلطان خان......... ڈی آئی خان

نہ سرانیہ تھکتے ہی نکلے
دل کے تاروں سے بنچے جاتے ہیں

(حمید احمد جامی ملتان کا جواب)

سنز احمد......... ملتان

مسائل تصوف یہ تیرا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

بشیر احمد تو حیدی......... مظفر گڑھ

یوں لٹا خانہ دل یاس کے ہاتھوں ہمدم
کوئی حسرت نہ رہی کوئی بھی ارمان نہ رہا

ذیشان اختر......... لاہور

یاد کی روشنی نے، لمحۂ سرخوشی نے
کونے کتاں کی آرزو، شہر نگار تک گئی

(محمد افسر خان کراچی کا جواب)

ظفر احمد......... لاہور

اشتی مقصد تہذیب ہے لیکن اس میں
جنگ جویان جہاں گھول رہے ہیں زہر آب

(ناصر تحریم کراچی کا جواب)

ارم سلطان......... سکھر

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

محمد تو حید اسلم......... لاہور

یہ خاموشی سلاسل یہ سکوت شام زنداں
جو چمک رہی ہے پلکوں پہ وہ موج خون دل ہے

شکیل احمد ضیائی......... سرگودھا

یہ زمین یہ خلا کی رقاصہ
آدم نو نے انتظار میں ہے

سرفراز شفیق......... ٹوبہ ٹیک سنگھ

یہ ذلیل کیوں ہے تمنائے خودکشی کیسی
تو یہ نسخ ہے قلب عوام کی دھڑکن

(محمد احمد رضا انصاری کوٹ ادو کا جواب)

اسنم انصاری......... حیدرآباد

نہ جانے کیوں مجھے رکھتا ہے فاصلوں پہ سلیم
مری وفا جو اپنے سرہانے رکھتا ہے

فاکہہ بتول......... کوئٹہ

نیند میں اٹھ کے جیسے کوئی چلے
جا رہا ہوں مگر خدا معلوم

(زبیر کاشف لاہور کا جواب)

نوشین اختر......... پشاور

تو ہے بادل میں جہنم کا ہوں سلگتا صحرا
بھر کے آیا ہے تو پھر کھل کے برس جا مجھ پر

انیس احمد......... کراچی

اک اجڑے نگر میں دوستے، بجھ تھک جاتے ہیں خواب
اشک بن کر میری آنکھوں سے ٹپ جاتے ہیں

(مظہر علی خان لاہور کا جواب)

ہانی احمد......... حیدرآباد

اٹھا تیرے مدرسے و خانقاہ سے نمناک
نہ زندگی نہ محبت نہ معرفت نہ نگاہ

سیما اکبر کاکڑ......... کوئٹہ

اگرچہ یاد سبھی عشق ہیں جوانی کے
یہ کچھ ہیں ماند پڑے رنگ ہر کہانی کے

راحت حسین......... سرگودھا

ایک چہرہ بھی بہت ہے تشنگی کے واسطے
وہ تو پیاسا ہی رہے گا جس کو دریا چاہیے

بیت بازی کا اصول ہے جس حرف پر شعر ختم ہو رہا ہے اسی لفظ سے شروع ہونے والا شعر ارسال کریں۔ اکثر قارئین اس اصول کو نظرانداز کر رہے ہیں۔ نتیجتاً ان کے شعر کلف کر دیے جاتے ہیں۔ اس اصول کو مدنظر رکھ کر ہی شعر ارسال کریں۔

میرے خیال سے اس مرجبہ دریافت کی گئی شخصیت کا نام .... ہے۔

نام:

پتا:

انعام یافتہ ہونے کی صورت میں مجھے جاسوسی ☐ سسپنس ☐ پاکیزہ ☐ سرگزشت ☐ بھجوایا جائے
کسی ایک پر ☑ کیجیے۔

کوپن سے ہمراہ اپنے جوابات مورخہ 30 اگست 2015ء تک علمی آزمائش 116 پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200 پر ارسال کریں۔

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ،
ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ،
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

کے حصول میں دقت پیش آرہی ہے یا آپ کو اپنے علاقے کے بک اسٹال سے کوئی شکایت ہے اور آپ کے علاقے میں بروقت پرچہ نہیں پہنچ رہا تو

"شکایت فیکس کریں"

مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کرسکتے ہیں
شرجیل 0301-2454188
سرکولیشن منیجر 35802552-35386783-35804200
فیکس نمبر 35802551

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
63-C II [illegible]
فون 35895313 فیکس 35802551

قارئین کے مسلسل اصرار پر ادبی ذوق کی تسکین کے لیے اک نیا سلسلہ "بیت بازی" شروع کیا گیا ہے۔ آپ اپنے پسندیدہ شعر کے آخری حرف سے شروع ہونے والا شعر ارسال کرسکتے ہیں۔

نام

پتا

محترم / محترمہ .... نے شعر کے جواب میں شعر ارسال کررہا ہوں اسے شاملِ اشاعت کرلیں
(شعر الگ کاغذ پر ہے)

77

مقابلہ بیت بازی
پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

علمی آزمائش۔ 117

ادارہ

ماہنامہ سرگزشت کا منفرد انعامی سلسلہ

علمی آزمائش کے اس منفرد سلسلے کے ذریعے آپ کو اپنی معلومات میں اضافے کے ساتھ انعام جیتنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ ہر ماہ اس آزمائش میں دیے گئے سوال کا جواب تلاش کر کے ہمیں بھجوائیے۔ درست جواب بھیجنے والے پانچ قارئین کو ماہنامہ سرگزشت، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ اور ماہنامہ پاکیزہ میں سے ان کی پسند کا کوئی ایک رسالہ ایک سال کے لیے جاری کیا جائے گا۔

ماہنامہ سرگزشت کے قاری "یک سطری سرگزشت" کے عنوان تلے منفرد انداز میں زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں مقام رکھنے والی کسی معروف شخصیت کا تعارف پڑھتے رہے ہیں۔ اسی طرز پر مرتب کی گئی اس آزمائش میں دریافت کردہ فرد کی شخصیت اور اس کی زندگی کا خاکہ لکھ دیا گیا ہے۔ اس کی مدد سے آپ اس شخصیت کو بوجھنے کی کوشش کریں۔ پڑھیے اور پھر سوچیے کہ اس خاکے کے پیچھے کون چھپا ہوا ہے۔ اس کے بعد جو شخصیت آپ کے ذہن میں ابھرے اسے اس آزمائش کے آخر میں دیے گئے کوپن پر درج کر کے اس طرح سپردِ ڈاک کیجیے کہ آپ کا جواب ہمیں 30 اگست 2015ء تک موصول ہو جائے۔ درست جواب دینے والے قارئین انعام کے مستحق قرار پائیں گے۔ تاہم پانچ سے زائد افراد کے جواب درست ہونے کی صورت میں بذریعہ قرعہ اندازی انعام یافتگان کا فیصلہ کیا جائے گا۔

اب پڑھیے اس ماہ کی شخصیت کا مختصر خاکہ

1298 ہجری بمطابق 1875ء کو پیدا ہوئے اور 13 مئی 1951ء میں وفات پا گئے۔ اردو کے بڑے شعرا میں شمار ہوتا ہے۔ انگریز حکومت سے انتہا درجے کی نفرت کرتے تھے۔ زندگی کا بڑا حصہ جدوجہد آزادی میں بسر کیا۔ جیل کی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔ ایام اسیری میں بھی مشقِ سخن جاری رکھا مگر پاکستان نہ آئے اور بھارت میں ہی انتقال فرما گئے۔

علمی آزمائش 115 کا جواب

سرسید احمد خان 17 اکتوبر 1817ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ دادا مغل فرماں روا شاہ عالم کے عہد میں منصب تھے اور نانا ایسٹ انڈیا کمپنی میں ملازم۔ والد ایک مشہور نقشبندی بزرگ کے مرید تھے۔ انھوں نے ہی سرسید کا نام تجویز کیا۔ بڑے ہونے پر سرسید نے برصغیر میں تعلیمی انقلاب پیدا کر دیا۔ آج بھی لوگ ان کا نام بہ ادب سے لیتے ہیں۔

انعام یافتگان

1۔ نوید اقبال، لاہور　2۔ زید حسن زیدی، ملتان　3۔ جابر سلیم، سرگودھا
4۔ فہم الدین، میرپور خاص　5۔ ضیاء تسلیم

ان قارئین کے علاوہ جن لوگوں کے جوابات درست تھے۔

کراچی سے ذوہیب احمد، انوار الدین، وحید الدین، فضل حسن، خادم حسین، نادر نیازی، محمد ریحان، صلیحہ نورین، ناصرہ تحریم، ناصر حسین ناصر، فرحت فاطمہ، نعمان قریشی، نیاز احسن، شاہین ربانی، غیاث احمد، ارشد علی، ندیم افضل، ایوب آغا، کلیم اللہ، حسن زکی، کمال حسن، نورین نیازی، فرحت اللہ خان، فرحت ندیم، مرزا اختر بیگ، احمد علی، ارشاد حسین، انیس

بھٹانی، عطا محمد، کاشان قریشی، یاسین جوکھیو، محمد سلیم، قیام احمد۔ جام شورو سے منصور احمد (کوٹری)۔ کھانان سے سلیم
کامریڈ۔ ٹنڈو خان محمد سے بھری اولکہ، کالا باغ میانوالی سے عبدالخالق۔ لاہور سے ساحل خان (ملتان روڈ)، عباس
چودھری، فیصل گل، نجیب اللہ خان، ریاض بٹ، اشرف علی خان، ملک نوروز، زاہد علی، ملک فیروز دین، شبیر باجوہ، ارشاد
کاظمی، عنایت علی، سیف الاسلام، نورین بٹ، قاسم مظہر، اختر حسن، خاقان خان، منصور حسین رضوی، محمد علی بخاری،
طارق بن سعد، فہیم الدین، ارباز خان، شاہین بٹ۔ ملتان سے محمد نیب چشتی، مجید احمد جائی، یاسر نیب ربانی، محمد افتخار،
یسریٰ لودھی، احمد جاوید سرکانی، ذوہیب بٹ، محمد طارق (نواں شہر)، راحیل اختر، نوشین بنت احمد، منصور علی، قاسم جان، ہنی
خان گل۔ اسلام آباد سے انور یوسف زئی۔ ماہ رخ، انیس احمد، فیصل انصاری، واجد علی واحد، اقرار الحسن۔ پاک پتن
شریف سے علی محمد (حسن پورہ)۔ راولپنڈی سے ڈاکٹر سعادت علی خان، اشفاق قریشی، ملک نوروز علی، انعام حسن، زاہد
طباطبائی، انوار علی صدیقی، عیسیٰ خان، زید علی، فرقان حسن۔ پشاور سے سردار سوہن سنگھ کاشف محمود، وردانہ جان، حسن
اچکزئی، عنایت علی حسن زئی، اشرف عباسی، نعمت خان، کاظم بخش، اشفاق صدیقی۔ زید علی طوری۔ پاراچنار سے اشرف
عباس۔ اٹک سے نورالنہار۔ میرپور خاص سے عبیدہ نورین، مرزا طاہر الدین بیگ، نوشین ملک، افتخار حسین، عباس قائم
خانی، فرقان محمد، سلیم خاکیانی، فرمان اللہ ساقی۔ لنڈن وہاڑی سے منشی محمد عزیز ۔ شکار پور سے فرحت عباسی۔ ڈی جی
خان سے فرح ایوب شیخ، زلوبیہ اختر، خادم حسین، نعمان بٹ، برہان الدین شاکر۔ سکھر سے شاد حسن، کاشف انوار، منور
سلیم، فہمیدہ سرور، ناصرہ ممتاز۔ واہ کینٹ سے کلیم الدین۔ شگفتہ اکبر، نثار الدین۔ حیدرآباد سے ماہ رخ، زاہد علی، سید شاہ
اللہ، توقیر حسن زیدی، نوشین فاطمہ، فرحت اقبال، عباس علی، نعمان جشیر، وہاب الدین، حیات فاطمہ، پرویز سید، ولیر جان،
عباس فتح علی، فصیح الحق نیازی، احمد عباس، نرگس علی، مریم کاشف، عنایت انصاری، علی سید، تحریم فاطمہ، نصرت عباسی، ایاز
جوکھیو، فرزانہ رحمن۔ مظفر گڑھ سے رانا محمد سجاد (نواں شہر)۔ منڈی بہاؤ الدین سے عطا محمد بٹ، فہد مصطفیٰ، کوثر تسنیم،
عنایت خان، کاشان قریشی۔ ڈیرہ اسماعیل خان سے نادرہ نیازی، ارباز خان، رخسانہ نیازی۔ ہری پور ہزارہ سے کاشان
محمد خان، اصغر علی سید، وحید الزمان، محبوب رند، حسن کمال۔ بھکر سے غیاث محمد، اشفاق حسن، بتول انصاری، ذوہیب محمد۔
جھنگ سے عاصم سہیل، ارشد علی، نادر انصاری، انیس اقبال، کائنات فاطمہ، حسن ضیائی، کامل اختر۔ شادی پور سے عاصم
سہیل، مشتاق احمد۔ تلہ گنگ سے اختر عباس، شعیب احمد۔ چکوال سے منظور حسین اعوان۔ عارف بٹ، زاہد ترمذی، نیاز سری،
عارف باللہ، حسن علی سید، عارف امام۔ میرپور اے کے سے احسن عظیم، کاظم علی، اشرف حجاب علی، شگفتہ بھٹی۔ خان بیلہ
سے یاسین سرفراز، شگفتہ ایاز، نارووال سے انعام احسن کمالی۔ میانوالی سے ایاز علی رند، خاقان مجاہد، تحریم فاطمہ، خیر
الدین کھر۔ ٹنڈو آدم سے نیاز عباس۔ کمالیہ سے ذیشان حسن۔ لیہ سے شجاعت خان، اکبر خان۔ سکھر سے محمد اسلام بھٹی،
حافظ محمد تقی اسماعیل رند، احسان اسلام کھوکھر۔ ڈی آئی خان سے اشفاق بخاری، نازش سلطان۔ جھنگ سے فصاحت حسن،
انیس احمد جاوید۔ فیصل آباد سے دلاور حسن، زرین بخش، عابدہ احمد، ذیشان اصغر۔ خیر پور سے: گل باز خان' خالد آفریدی'
ذکیہ ممتاز' عامر جمیل قریشی' محمد علی' صنوبر جوکھیو' صفدر بلوچ' ملک سرفراز۔ راولپنڈی سے: جویریہ حلیم' محمد سلیم' حافظ محمد اقبال' مرزا
الطاف حسین' نفیسہ جمال' صغراں بیگم' نوازش علی' مہوش خان' اطہر احمد قریشی۔ بدین سے عباس علی سانند، احمد خان۔ شیخوپورہ سے
فصاحت علی، فہیم الدین، نبیل احمد، سید امتیاز حسین، صدیق الاسلام، حکیم اللہ خان، محمد سعید، فریال حسن۔ راجن پور سے
ملک محمد ظفر اللہ۔ کوٹ ادو سے محمد احمد رضا انصاری۔ مظفر گڑھ سے محمد عثمان بزدی۔ سلمیٰ ممتاز' صادق امیر' نعمان شجاع' سلمان
اشرف' کنیز زینب' اشرف عباس۔ شارجہ سے: سلمان فردوس' نبیل احمد صدیقی' زولی۔ کویت سے: تاثیر محمد۔ دمام سے: ساجد علی
ملتانی۔ بیڈفورڈ انگلینڈ سے: کائنات علی۔ ٹورنٹو سے: سید ساحل' نبیل وجاہت۔ ٹوکیو جاپان سے: جمیلہ وقار۔ ہمبرگ
سے: سعادت علی خان۔ اوہاما سے: سلمان منگریو۔ مظفر گڑھ نواں شہر سے: محمد سجاد راجپوت۔ وزیر آباد سے: توقیر اشرف۔ فیصل
آباد سے: طیب محمود' محمد طارق' اقبال نگار۔ حیدرآباد سے: زریاب فرحان' اقرا افتخار۔

بیرون ملک سے زاہد تبسم، صنم اشرف، نعمان اشرف (دبئی، یو اے ای)، زاہد خان (جرمنی) اشفاق میمن
(عمان، سعودیہ)

بن باس

مکرمی مدیر
السلام علیکم!
میں لڑکپن سے سنتی آئی ہوں کہ فلموں، ناولوں، قصے کہانیوں کا مرکزی خیال انسان کی زندگی سے اخذ کیا جاتا ہے لیکن جب میرے ساتھ ایسا ہی کچھ ہوا جس پر ایک اچھی فلم بن سکتی ہے تو یقین کرنا پڑا۔ میری زندگی نے ایسے کئی موڑ لیے ہیں کہ اس پر کسی افسانے کا گمان ہوتا ہے۔

سائرہ
(کراچی)

میں بچپن سے ہی شوخ، شریر اور آزاد خیال واقع ہوئی تھی۔ اسکول اور کالج کے زمانے میں نت نئی شرارتیں کرنا، دوستوں سے ہنسی مذاق اور چھیڑ چھاڑ کرنا میرا دلچسپ مشغلہ تھا لیکن سب سے زیادہ مزہ مجھے لوگوں کو بے وقوف بنانے میں آتا تھا۔ میں آئے دن کوئی نہ کوئی ایسی حرکت ضرور کرتی جس سے دوسرے لوگ پریشانی میں مبتلا ہو جاتے۔ میرا تعلق ایک خوش حال متوسط گھرانے سے ہے۔ گھر میں روپے پیسے کی کوئی کمی نہیں تھی اور مجھے ہر مہینے جیب خرچ کے نام پر ایک معقول رقم مل جایا کرتی تھی۔ اس کے باوجود مجھے دوسروں کے پیسے خرچ کروانے میں مزہ آتا تھا۔ شکل و صورت کی اچھی ہوں۔ اس لیے لوگ جلد ہی میری طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ اتفاق سے میٹرک کرنے کے بعد داخلہ بھی ایسے کالج میں ملا جہاں مخلوط تعلیم تھی۔ اس لیے پہلے روز ہی لڑکوں کی توجہ کا مرکز بن گئی۔ ہر کوئی مجھ سے دوستی کرنے کا خواہش مند نظر آنے لگا اور میں نے بھی کسی کا دل توڑنا مناسب نہ سمجھا اور فراخ دلانہ پالیسی اختیار کرتے ہوئے ہر ایک سے ہنسنے بولنے لگی۔ چند ہی روز میں یہ صورت حال ہو گئی کہ کالج کا ہر لڑکا مجھے اپنا دوست سمجھنے لگا۔ سب کی یہی کوشش ہوتی کہ وہ زیادہ سے زیادہ وقت میرے ساتھ گزارے، جو بھی کوئی خاص پیریڈ ہوتا کوئی نہ کوئی مجھے کینٹین چلنے کی دعوت دیتا اور میں بھی اس کی پیشکش شکریے کے ساتھ قبول کر لیتی۔ البتہ اتنی احتیاط ہمیشہ کی کہ کبھی کسی لڑکے کے ساتھ کینٹین نہیں گئی بلکہ گروپ کی ایک دو لڑکیاں بھی میرے ہمراہ ہوتیں۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ کالج میں کوئی اسکینڈل بنے۔

چار سال اسی طرح ہنستے کھیلتے گزر گئے۔ میں نے گریجویشن کر لیا۔ یونیورسٹی میں داخلہ لینا چاہ رہی تھی لیکن گھر سے اجازت نہیں ملی۔ امی ابو کا خیال تھا کہ لڑکیوں کے لیے بس اتنی تعلیم ہی کافی ہے۔ اب گھر میں رہ کر گھرداری سیکھو، آگے چل کر یہی کام آئے گی۔ جب میں نے بہت ضد کی تو

ابو نے کہا کہ اگر آگے پڑھنا ہے تو کسی پروفیشنل کالج میں داخلہ لو تاکہ تمہارا کوئی کیریئر بن سکے۔ یہ ایسی کڑی شرط تھی جو میں کبھی پوری نہیں کر سکتی تھی۔ میں نے آرٹس میں گریجویشن کیا تھا۔ مجھے بی بی اے میں کمپیوٹر سائنس میں داخلہ کیسے ملتا۔ ویسے بھی میں نے کبھی کیریئر کے بارے میں سنجیدگی سے نہیں سوچا تھا اور محض تفریح کی غرض سے یونیورسٹی جانا چاہ رہی تھی لیکن ابو کی اس شرط کے بعد میرا یہ خواب چکنا چور ہو گیا اور میں خاموش ہو کر گھر بیٹھ گئی۔

وہ گرمیوں کی ایک چلچلاتی دوپہر تھی۔ میں گھر میں بیٹھی بور ہو رہی تھی۔ اس لیے سوچا کہ شاپنگ کر لی جائے۔ خاندان میں ایک دو شادیاں ہونے والی تھیں اور مجھے ان میں شرکت کرنے کے لیے کپڑوں کی ضرورت تھی۔ امی نے منع بھی کیا کہ شام کو چلی جانا، بہت گرمی ہے لیکن میں نے ان کی بات نہیں مانی اور پروگرام کے مطابق شاپنگ کے لیے نکل کھڑی ہوئی۔ ویسے بھی شام کو مجھے کرن کے پاس جانا تھا۔ وہ میرے بچپن کی سہیلی ہے گو کہ کالج کے بعد ہمارے راستے جدا ہو گئے تھے۔ اس کے باوجود ہماری دوستی برقرار تھی اور ہفتے میں ایک بار ہماری ملاقات ضرور ہو جاتی۔ کرن مجھے اکثر سمجھاتی رہتی ہے کہ یہ حرکتیں چھوڑ دو لیکن میں اس کی یہ بات ہنسی میں اڑا دیتی ہوں۔

شاپنگ سے واپس آ رہی تھی کہ گھر سے کچھ فاصلے پر رکشا خراب ہو گیا۔ میں نے رکشے والے کو کرایہ دیا اور سامان اٹھا کر پیدل ہی گھر کی جانب چل دی۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد ہمت جواب دے گئی اور میں اپنا سامان زمین پر رکھ کر ستانے کے لیے کھڑی ہو گئی۔ ابھی میں ٹشو پیپر سے اپنا پسینہ خشک کر رہی تھی کہ منصور کا وہاں سے گزر ہوا۔ وہ مجھے دیکھ کر رک گیا اور بولا۔ "کہاں سے آ رہی ہو اور یہاں کیوں کھڑی ہو؟"

"رکشا خراب ہو گیا تھا۔" میں منہ بناتے ہوئے بولی۔ "اتنا سارا سامان اٹھا کر چلنا مشکل ہو رہا تھا اس لیے ستانے کھڑی ہو گئی۔"

"اوہو، اتنی سی بات ہے۔ لاؤ یہ سامان مجھے دو۔ میں پہنچا دیتا ہوں۔"

میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ گلی میں سناٹا تھا اور دور دور تک کوئی فرد نظر نہیں آ رہا تھا۔ میری رگ شرارت پھڑکی اور میں نے تھوڑا سا رومانٹک ہوتے ہوئے کہا۔ "رہنے دو تمہیں تکلیف ہو گی۔ ویسے بھی میں اپنا بوجھ خود اٹھانے کی عادی ہوں۔ تمہیں دیکھ لیا میرے لیے یہی کافی ہے۔"

میرے لہجے پر وہ چونک گیا اور لگاوٹ بھرے لہجے میں بولا۔ "گرمی بہت ہے اور تمہارے لیے اتنا سامان اٹھا کر چلنا مشکل ہو جائے گا۔"

"ٹھیک ہے، اگر تم اصرار کر رہے ہو تو میں منع نہیں کروں گی۔" میں نے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔

گھر کے دروازے پر پہنچ کر میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور رسماً بولی۔ "اندر آ جاؤ، میں تمہارے لیے شربت بناتی ہوں۔"

"نہیں رہنے دو۔ اس وقت میں جلدی میں ہوں۔ امی انتظار کر رہی ہوں گی۔"

منصور، خالہ صفیہ کا اکلوتا لڑکا تھا اور ہمارے محلے میں دو گلیاں چھوڑ کر اس کا گھر تھا۔ خالہ صفیہ کے بارے میں ہم لوگ صرف اتنا ہی جانتے تھے کہ وہ لوگوں کے کپڑے سی کر

اپنا گزارہ کررہی تھیں۔ اس کے علاوہ فارغ وقت میں محلے کے بچوں کو قرآن شریف بھی پڑھاتیں۔ تقریباً ہر گھر میں ان کی کوئی نہ کوئی شاگرد موجود تھی اور اسی وجہ سے محلے کے لوگ ان کی بے حد عزت کیا کرتے تھے۔ اس کے باوجود بہت سی عورتیں خالہ صفیہ کی مدد کی خاطر ان سے کپڑے سلواتیں۔ اب ان کی مصیبت کے دن ختم ہونے والے تھے کیوں کہ منصور کی تعلیم مکمل ہوچکی تھی اور وہ بڑے زور و شور سے نوکری تلاش کررہا تھا۔

اس دن کے بعد میرا منصور سے سامنا نہیں ہوا۔ سارا دن گھر میں پڑی بور ہوتی رہتی۔ بہت زیادہ دل گھبراتا تو کبھی کبھی اپنی پرانی سہیلی کرن کے گھر چلی جاتی۔ وہ کالج میں میری بہت اچھی دوست ہوا کرتی تھی جب اس نے یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا تو ہماری ملاقاتیں کم ہوگئیں۔ وہ اپنے ایک کلاس فیلو جلیل کو پسند کرنے لگی تھی لیکن وہ ایک انتہائی غریب خاندان سے تعلق رکھتا تھا اور جانتا تھا کہ کرن کے والدین کبھی بھی اسے اپنا داماد بنانا پسند نہیں کریں گے اور وہ خود بھی کرن کو خوش نہیں رکھ سکے گا۔ اسی لیے وہ پیش قدمی کرنے سے گھبرا رہا تھا بلکہ اس نے کرن سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ ان دونوں کا ملاپ تقریباً ناممکن ہے۔ ماسٹرز کرنے کے بعد بھی اس کے حالات میں کوئی بڑی تبدیلی واقع نہیں ہوئی اور اگر قسمت نے ساتھ دیا تو وہ کوئی چھوٹی موٹی ملازمت ہی حاصل کرسکے گا۔ اسے اپنے بوڑھے والدین کا خیال رکھنے کے ساتھ ساتھ چھوٹے بہن بھائیوں کی ذمے داریاں بھی نبھانا ہیں۔ وہ تو کرن کے لیے اپنے چھوٹے سے گھر میں ایک کمرا بھی نہیں بنوا سکتا۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ وہ اس کا خیال دل سے نکال کر کسی معقول اور ہم پلہ شخص سے شادی کرلے۔ اس کے باوجود کرن نے ہمت نہیں ہاری اور وہ مسلسل جلیل کا حوصلہ بڑھاتی رہتی۔ اس نے جلیل کو مشورہ دیا کہ وہ سی ایس ایس کی تیاری کرے۔ ایک بار اس نے مقابلے کا امتحان پاس کرلیا تو اس کے لیے ترقی کے دروازے کھل جائیں گے لیکن جلیل نے اس کا یہ مشورہ بھی رد کردیا۔ وہ دراصل انقلابی نظریات رکھنے والا شخص تھا اور اس کی شاعری میں عام آدمی کے دکھوں کی عکاسی ہوا کرتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ سرکاری ملازمت کے لیے بالکل ناموزوں ہے۔

کرن یہ سب باتیں مجھے بتاتی رہتی تھی۔ جلیل کے علاوہ اس کے گروپ میں فراز اور شاکر بھی تھے۔ ان دونوں کا تعلق بھی کھاتے پیتے گھرانوں سے تھا لیکن وہ جلیل کی شخصیت اور اس کے خیالات سے بہت متاثر تھے۔ فراز کی دلی خواہش تھی کہ جلیل اور کرن ایک ہوجائیں۔ وہ اپنے دوست کی مدد کرنا چاہ رہا تھا۔ اس نے جلیل سے کہا کہ اگر وہ مناسب سمجھے تو وہ اپنے ڈیڈی کے دفتر میں اس کے لیے ملازمت کا بندوبست کرسکتا ہے لیکن جلیل نے اس کی پیشکش بھی قبول نہیں کی اور کہا کہ وہ کسی کا احسان لینا پسند نہیں کرتا اور اپنے بل بوتے پر آگے بڑھنا چاہتا ہے۔

جب مجھے کرن کی زبانی معلوم ہوا کہ فراز کے والد ایک بڑی فرم کے مالک ہیں تو میں نے اس سے کہا کہ وہ فراز سے میری ملازمت کے لیے بات کرے۔ میں سارا دن گھر میں پڑی بور ہوتی رہتی ہوں۔ جاب کرلوں گی تو وقت اچھا گزرے گا اور کچھ پیسے بھی ہاتھ میں آئیں گے کیوں کہ اس وقت جو جیب خرچ مل رہا ہے۔ وہ میری ضروریات کے لیے ناکافی ہے اور اپنی پسند کی کوئی چیز خریدنا ہو تو بار بار ابو کے آگے ہاتھ پھیلانا پڑتے ہیں۔

میری بات سن کر وہ سوچ میں پڑ گئی اور بولی۔ ''مجھے یقین ہے کہ فراز کبھی میری بات نہیں ٹالے گا لیکن امتحانات سر پر ہیں اور سب لوگوں کو پڑھائی کے علاوہ کسی بات کا ہوش نہیں ہے۔ اس لیے میرے خیال میں یہ مناسب وقت نہیں کہ فراز سے ایسی کوئی بات کی جائے۔ ممکن ہے کہ وہ پڑھائی کی مصروفیت کی وجہ سے اس پر سنجیدگی سے توجہ نہ دے یا اپنے ڈیڈی سے سرسری انداز میں تذکرہ کردے۔ امتحان ختم ہوجائیں تو اس سے بات کروں گی۔ ویسے بھی یونیورسٹی سے فارغ ہونے کے بعد وہ اپنے ڈیڈی کے دفتر میں ہی بیٹھے گا اور اس وقت اسے تمہاری مدد کرنے میں آسانی رہے گی۔ میرا مشورہ ہے کہ اس دوران میں تم کمپیوٹر کا کوئی کورس کرلو۔ خالی بی اے کو کوئی نہیں پوچھتا آج کل کمپیوٹر کی بڑی مانگ ہے کورس کرلوگی تو تمہیں اچھی جاب مل جائے گی۔''

''تمہارا مشورہ مناسب ہے میں آج ہی ابو سے بات کرتی ہوں۔ اگر انہوں نے اجازت دے دی تو کسی کمپیوٹر انسٹی ٹیوٹ میں داخلہ لے لوں گی۔''

جب میں نے کرن کو منصور کے بارے میں بتایا تو وہ حیران رہ گئی اور بولی۔ ''حیرت ہے کہ اس نے تم سے کیسے بات کرلی۔ وہ تو کسی لڑکی کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا۔ شاید تمہیں معلوم نہیں کہ محلے کی سب لڑکیاں اسے سنٹر ہاف اسٹون کہتی ہیں۔''

"ارے! تم کیا جانتیں ان لڑکوں کو۔" میں چہکتے ہوئے بولی۔ "اوپر سے بڑے پارسا بنتے ہیں لیکن ان سب کے دل میں چور ہوتا ہے۔ جہاں کوئی خوب صورت لڑکی دیکھی وہیں پھسل گئے۔"

"ضرور تم نے کوئی ایسی حرکت کی ہوگی کہ وہ بے چارہ تمہارے جھانسے میں آگیا۔" کرن مجھے گھورتے ہوئے بولی۔ "اچھی طرح جانتی ہوں لڑکوں کو بے وقوف بنانے میں تو تم ماہر ہو۔"

"مجھ سے جیسی چاہو قسم لے لو۔" میں نے معصوم صورت بناتے ہوئے کہا۔ "میں نے کچھ نہیں کیا بلکہ مجھے تو یوں لگا جیسے وہ خود ہی مجھ سے بات کرنے کا بہانہ ڈھونڈ رہا تھا۔"

"خیر جو ہوا سو ہوا۔" کرن سمجھانے کے انداز میں بولی۔ "اب اسے منہ لگانے کی ضرورت نہیں۔ وہ اپنی ماں کا اکلوتا سہارا ہے۔ ابھی سے عشق و محبت کے چکر میں پڑ گیا تو کہیں کا نہ رہے گا۔"

"دیکھو بھئی! میں نے پہلے کچھ کیا تھا اور نہ آئندہ کروں گی۔ اب اگر کوئی خود ہی بے وقوف بننا چاہے تو میں کچھ نہیں کر سکتی۔" میں نے بات ختم کرنے کے انداز میں کہا۔

جب میں نے امی سے کمپیوٹر انسٹی ٹیوٹ میں داخلہ لینے کی بات کی تو پہلے انہوں نے انکار کر دیا لیکن میری ضد کے آگے انہوں نے ہتھیار ڈال دیے اور میں انسٹی ٹیوٹ جانے لگی جو میرے گھر سے تھوڑے ہی فاصلے پر تھا۔ صبح نو سے بارہ کلاس ہوتی تھی۔ مجھے انسٹی ٹیوٹ جاتے ہوئے تین چار روز ہی ہوئے تھے کہ منصور مجھے نظر آ گیا اس کے پاس ایک نئی موٹر سائیکل تھی اور اس نے لباس بھی ڈھنگ کا پہن رکھا تھا۔ ابھی میں انسٹی ٹیوٹ سے نکل کر چند قدم ہی گئی تھی کہ اس نے میرے پاس آ کر موٹر سائیکل روکی اور بولا۔ "بیٹھ جاؤ، میں تمہیں گھر چھوڑ دیتا ہوں۔"

مجھے اس کی یہ بے تکلفی بالکل نہ بھائی اور میں نے تقریباً جھڑکتے ہوئے کہا۔ "جی نہیں شکریہ میں پیدل ہی چلی جاؤں گی۔"

"دیکھو ضد نہ کرو۔ بیٹھ جاؤ۔ گرمی بہت ہے۔ خواہ مخواہ پریشان ہونے سے کیا فائدہ؟"

اتنی دیر میں چند لڑکے ہماری طرف آتے دکھائی دیے۔ میں اپنا تماشا نہیں بنوانا چاہتی تھی۔ اس لیے اس کے ساتھ بائیک کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی اور احتیاطاً چادر کے پلو کو نقاب کی طرح چہرے کے گرد لپیٹ لیا تاکہ کوئی پہچان نہ سکے۔ تھوڑی دور جانے کے بعد اس نے بائیک ایک اسٹال کے پاس روک دی اور بولا۔ "پیاس سے حلق خشک ہو رہا ہے کیوں نہ ایک ایک کولڈ ڈرنک پی لی جائے۔"

میں نے انکار نہیں کیا۔ ہم نے وہیں کھڑے کھڑے کولڈ ڈرنک پی۔ باتوں باتوں میں منصور نے بتایا کہ اسے ایک کمپنی میں سیلز مین کی جاب مل گئی ہے اور یہ موٹر سائیکل بھی کمپنی سے ہی ملی ہے کیوں کہ اس کی ڈیوٹی آؤٹ ڈور ہوتی ہے۔

مجھے اس کی بات سن کر بہت حیرت ہوئی اور میں نے کہا۔ "کمال ہے تم بی کام کر کے سیلز مین کی جاب کر رہے ہو۔ تمہیں تو کم از کم اسسٹنٹ منیجر کی پوسٹ پر ہونا چاہیے تھا۔"

"کہتی تو تم ٹھیک ہو لیکن اس زمانے میں اپنے مطلب کی جاب حاصل کرنا بہت مشکل ہے۔ اس لیے میں نے فی الحال اسی ملازمت کو غنیمت جانا کیوں کہ اب میرے پاس مزید انتظار کی گنجائش نہیں ہے۔ امی کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی اور میں نہیں چاہتا کہ اس حالت میں وہ اتنی محنت کریں۔"

"واقعی! اب انہیں آرام کی ضرورت ہے۔" میں نے منصور کی باتوں سے متاثر ہوتے ہوئے کہا۔ "تم نے اچھا کیا جو یہ جاب کر لی۔ کوشش جاری رکھو۔ اللہ نے چاہا تو بہتر ملازمت بھی مل جائے گی۔"

گھر آ کر میں کافی دیر تک منصور کے بارے میں سوچتی رہی۔ مجھے اس کے ساتھ موٹر سائیکل پر نہیں بیٹھنا چاہیے تھا۔ نہ جانے وہ میری اس بے تکلفی کو کیا سمجھے کیوں کہ میں اس کی آنکھوں میں چھپا ہوا پیغام پڑھ چکی تھی۔ اس نے کولڈ ڈرنک پینے کی دعوت یونہی نہیں دی تھی۔ اس طرح وہ مجھ سے قریب ہونے اور راہ و رسم بڑھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ کیا مجھے اس کی حوصلہ افزائی کرنا چاہیے اگر اس نے اگلی بار مجھے اپنے ساتھ چلنے کے لیے کہا تو اس کی پیشکش قبول کر لوں۔ منصور کے انداز سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ میرے بارے میں کوئی فیصلہ کر چکا ہے اور اگر میں اس سے یونہی ملتی رہی تو شاید وہ چار ملاقاتوں کے بعد وہ اپنے دل کی بات بھی کہہ دے۔ ایسی صورت میں میرا ردعمل کیا ہوگا؟ کیا میں اسے اپنا جیون ساتھی بنانے کے بارے میں سوچ سکتی ہوں؟

"ہرگز نہیں۔" میرے اندر سے ایک آواز آئی۔ ہم دونوں کی حیثیت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ جتنی تنخواہ اسے ملتی ہے اس سے زیادہ تو میں جیب خرچ کے نام پر لے لیتی ہوں۔ اگر اسے ڈھنگ کی ملازمت مل گئی تب بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ میں نے جس ناز و نعم میں زندگی گزاری ہے وہ مجھے اس کا عشرِ عشیر بھی نہیں دے سکتا۔ میں اس کے ساتھ کبھی خوش نہیں رہ سکوں گی۔ مانا کہ وہ بہت اچھا لڑکا ہے۔ اس میں بہت سی خوبیاں ہیں لیکن ایک اچھی زندگی گزارنے کے لیے اس کے علاوہ بھی بہت کچھ چاہیے جو منصور کے پاس نہیں اور نہ ہی مستقبل قریب میں اس کا کوئی امکان نظر آتا ہے۔ وہ میری منزل نہیں۔ بہتر ہے کہ اس بات کو یہیں ختم کر دیا جائے۔

یہ فیصلہ کر کے میں مطمئن ہو گئی۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ اب اگر منصور نے مجھے اپنے ساتھ بیٹھنے کے لیے کہا تو اسے کسی بہانے ٹال دوں گی۔ صرف اتنا کہہ دینا ہی کافی ہو گا کہ اگر کسی نے مجھے اس کے ساتھ موٹر سائیکل پر بیٹھے دیکھ لیا تو بات کا بتنگڑ بن جائے گا۔ وہ شریف آدمی ہے۔ اس لیے میری بات آسانی سے اس کی سمجھ میں آ جائے گی۔ اس کے باوجود اگر اس نے اصرار کیا تو میں سختی سے اسے جھڑک دوں گی۔

یہ محض اتفاق تھا کہ آئندہ چند روز تک منصور مجھے نظر نہیں آیا پھر ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ لمحوں میں میرا یہ فیصلہ ریت کی دیوار کی طرح زمین بوس ہو گیا۔ انہی دنوں کرن کی منگنی کی تقریب ہوئی۔ وہ تو جلیل کے لیے مری جا رہی تھی لیکن اس کی طرف سے مایوس ہونے کے بعد والدین کے فیصلے کے آگے سر جھکا دیا۔ آصف انجینئر تھا اور ایک فرم چلا رہا تھا۔ اچھے کھاتے پیتے لوگ تھے۔ سسرال وغیرہ کا بھی کوئی بکھیڑا نہیں تھا۔ آصف کے والدین فوت ہو چکے تھے۔ صرف ایک بڑی بہن تھی جو کافی عرصے سے انگلینڈ میں رہائش پذیر تھی۔

منگنی کافی دھوم دھام سے ہوئی اور اس میں محلے کے چیدہ چیدہ لوگوں کو بھی مدعو کیا گیا جن میں خالہ صفیہ اور منصور بھی شامل تھا۔ میں نے اس تقریب میں شرکت کے لیے ایک بہت خوب صورت سوٹ سلوایا تھا لیکن جب بن ٹھن کر تیار ہوئی اور چوڑیوں کا باکس کھولا تو اس میں میچنگ کی چوڑیاں نہیں تھیں۔ میری ساری خوشی خاک میں مل گئی اور میں نے باقاعدہ رونا شروع کر دیا۔ تب امی نے سمجھایا کہ خوشی کے موقع پر رونا بدشگونی ہے۔ اگر ہم رنگ چوڑیاں نہیں ہیں تو کیا ہوا۔ اس سے ملتی جلتی پہن لو۔ وہاں کوئی دوربین لگائے بیٹھا ہے جو تمہاری چوڑیوں کو غور سے دیکھے گا۔

امی کے سمجھانے پر میں خاموش ہو گئی لیکن میرا دل چوڑیوں میں ہی اٹکا ہوا تھا۔ کرن کے گھر پہنچی تو منصور کو لان میں بیٹھے ہوئے دیکھا۔ اس کو دیکھتے ہی میرے دماغ میں ایک خیال آیا۔ میں امی کے ساتھ اندر گئی اور تھوڑی دیر بعد آنکھ بچا کر واپس باہر آ گئی۔ وہاں کچھ بچے کھیل رہے تھے۔ میں نے ایک بچے کو بھیج کر منصور کو بلایا۔ جب وہ آیا تو میں منہ بسورتے ہوئے بولی۔ "منصور ایک مسئلہ ہو گیا ہے۔ دیکھو میں نے کتنا خوب صورت سوٹ سلوایا ہے لیکن میرے پاس میچنگ کی چوڑیاں نہیں ہیں۔"

"ان چوڑیوں میں کیا برائی ہے جو تم نے پہن رکھی ہیں۔" وہ کچھ حیران ہوتے ہوئے بولا۔

"ان کا رنگ سوٹ سے میچ نہیں کر رہا، بڑی بوریت ہو رہی ہے۔"

"پھر میں کیا کروں؟"

"کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم اپنی بائیک پر بازار چلے جاؤ اور مجھے میچنگ کی چوڑیوں کا ایک سیٹ لا دو۔"

"آٹھ بج رہے ہیں۔" وہ گھڑی دیکھتے ہوئے بولا۔

"اس وقت چوڑیاں کہاں ملیں گی۔ دوسری بات یہ کہ مجھے چوڑیوں کی پہچان نہیں ہے۔ غلط سلط آ گئیں تو تم شور مچاؤ گی۔"

"آج کل دکانیں دس گیارہ بجے تک کھلی رہتی ہیں اگر تمہیں نہیں جانا تو صاف کہہ دو۔ بہانے کیوں بنا رہے ہو۔" میں خفگی سے بولی۔

"اچھا بابا، جا رہا ہوں۔ ناراض کیوں ہوتی ہو۔ رنگ بتاؤ؟"

"لائٹ گرین جسے انگوری بھی کہتے ہیں۔ میں نے جو سوٹ پہن رکھا ہے اسی رنگ کی ہوں۔"

یہ کہہ کر میں اندر آ گئی۔ ابھی مہمان آنا شروع نہیں ہوئے تھے پھر بھی مجھے بے چینی ہو رہی تھی اور میں چاہ رہی تھی کہ لڑکے والوں کے آنے سے پہلے میری چوڑیاں آ جائیں۔ اسی انتظار میں ایک گھنٹا گزر گیا پھر ایک بچہ اندر آیا اور اس نے بڑی رازداری سے ایک پیکٹ مجھے تھما دیا۔ میں نے کھول کر دیکھا اس میں میری مطلوبہ چوڑیاں موجود تھیں۔ میں خوشی سے نہال ہو گئی۔ فوراً پرانی چوڑیاں اتار کر

پرس میں رکھیں اور نئی پہن لیں۔ بہت خوب صورت چوڑیاں تھیں۔ دل چاہا کہ باہر جا کر منصور کو دکھاؤں لیکن اس وقت لڑکے والوں کی آمد کا شور ہوا اور میں اس جانب متوجہ ہو گئی۔

اگلے روز انسٹی ٹیوٹ سے واپس آ رہی تھی کہ منصور گیٹ کے باہر ہی مل گیا۔ اس نے مجھے بائیک پر بیٹھنے کا اشارہ کیا تو انکار نہ کر سکی۔ اس نے ایک آئس کریم پارلر کے باہر بائیک روکی اور بولا۔ "یہاں کی آئس کریم بہت اچھی ہوتی ہے۔ آج تم بھی چکھ کر دیکھو۔"

"ٹھیک ہے۔ ہم زیادہ دیر نہیں بیٹھیں گے۔ امی انتظار کر رہی ہوں گی۔"

"جیسے تمہاری مرضی۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "چوڑیاں پسند آئیں؟"

"ہاں بہت خوب صورت ہیں۔" میں نے اپنا پرس کھولتے ہوئے کہا۔ "کتنے کی تھیں؟"

"شرمندہ مت کرو۔ میرے اطمینان کے لیے یہی بہت ہے کہ چوڑیاں تمہیں پسند آ گئیں۔"

"ٹھیک ہے جیسے تمہاری مرضی۔" میں نے پرس بند کرتے ہوئے کہا۔ "اگر تم مائنڈ نہ کرو تو ایک بات کہوں۔"

"ہاں ہاں کہو میں تمہاری کسی بات کا برا نہیں مان سکتا۔"

"دیکھو منصور، تمہارے ساتھ بائیک پر بیٹھنا یا ہوٹلوں میں آنا جانا ٹھیک نہیں ہے۔ اگر کسی جاننے والے نے دیکھ لیا تو میری مصیبت آ جائے گی۔ بہتر ہوگا کہ آئندہ مجھے بائیک پر بیٹھنے کے لیے مت کہنا۔"

"اگر تمہیں یہ پسند نہیں تو اس کے لیے مجبور نہیں کروں گا۔" وہ نظریں جھکاتے ہوئے بولا۔ "لیکن میری بھی ایک شرط ہے۔"

"وہ کیا؟" میں چونکتے ہوئے بولی۔

"تم امی سے ملنے ہفتے میں ایک آدھ مرتبہ ہمارے گھر آیا کرو گی۔"

"وہ کیوں؟"

"اسی بہانے تم سے ملاقات ہو جائے گی۔" اس کے لہجے میں ایک خاص پیغام تھا جسے محسوس کیے بغیر نہ رہ سکی۔

"دیکھو بھئی، وعدہ نہیں کرتی۔ البتہ جب بھی موقع ملا تو خالہ سے ملنے ضرور آؤں گی۔"

شام کو میں کرن کے گھر گئی اور اسے یہ واقعہ مرے نے کر سنایا۔ پہلے تو وہ ناراض ہوئی کہ میں نے منصور سے چوڑیاں کیوں منگوائیں اور اس کے ساتھ بائیک پر بیٹھ کر آئس کریم کھانے بازار کیوں گئی لیکن جب اسے بتایا کہ میں نے آئندہ کے لیے اس کے ساتھ بائیک پر بیٹھنے سے منع کر دیا ہے تو وہ مطمئن ہو گئی تاہم اس نے منع کیا کہ مجھے خالہ صفیہ کے یہاں جانے کی بھی ضرورت نہیں کیوں کہ اس کی باتوں سے لگ رہا ہے کہ وہ پسند کرنے لگا ہے۔

"لیکن میں اس سے وعدہ کر چکی ہوں۔ ایک آدھ مرتبہ تو جانا ہی ہوگا ورنہ وہ پھر میرا راستہ روک کر کھڑا ہو جائے گا۔"

"ٹھیک ہے چلی جاؤ لیکن اس سے زیادہ بے تکلف ہونے یا اس کی حوصلہ افزائی کی ضرورت نہیں۔ میں جانتی ہوں کہ تمہارے لیے یہ ایک کھیل ہے لیکن وہ اگر سنجیدہ ہو گیا تو اس کی جان پر بن جائے گی۔"

میں نے کرن کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور بولی۔ "میرے کام کا کیا ہوا۔ تم نے فراز سے بات کی تھی۔"

"ہاں۔" کرن نے کہا۔ "اس نے بھی یہی کہا ہے کہ پہلے تم اپنا کورس مکمل کر لو اس کے بعد وہ تمہارے لیے کوئی جگہ نکالے گا۔"

میرا کورس ختم ہونے میں دو ماہ باقی رہ گئے تھے۔ اس لیے میں نے اس موضوع پر مزید کوئی بات نہیں کی اور گھر چلی آئی لیکن میرا ذہن کرن کی باتوں میں الجھا ہوا تھا۔ اس نے یہ کیوں کہا کہ اگر منصور سنجیدہ ہو گیا تو اس کی جان پر بن جائے گی۔ کیا واقعی وہ میرے لیے سنجیدہ ہو سکتا ہے۔ اب میرے لیے یہ جاننا بہت ضروری ہو گیا تھا اگر واقعی ایسا ہے تو منصور کی پیش قدمی کو روکنا ضروری ہو جائے گا۔ میں اسے ایک دوست کا درجہ تو دے سکتی تھی لیکن شوہر کے روپ میں قبول کرنا ممکن نہیں تھا۔

اس کے باوجود مجھے اس کھیل میں مزہ آ رہا تھا اور میں جاننا چاہ رہی تھی کہ منصور کتنے پانی میں ہے۔ اسی لیے ایک روز کپڑے سلوانے کے بہانے خالہ صفیہ کے پاس چلی گئی۔ میں نے جان بوجھ کر شام کے وقت کا انتخاب کیا تھا کہ منصور بھی گھر پر ہو۔ خالہ صفیہ مجھے دیکھ کر خوش ہو گئیں اور بولیں۔ "آج تم کیسے رستہ بھول گئیں۔"

میں نے تھیلے میں سے سوٹ نکال کر ان کے سامنے رکھا اور بولی۔ "خالہ ایک سوٹ سلوانا تھا اسی لیے آئی ہوں۔ میں نے سوچا کہ اسی بہانے آپ سے ملاقات بھی ہو

جائے گی۔"

اسی وقت منصور بھی کمرے سے باہر آگیا اور بولا۔ "امی نے لوگوں کے کپڑے سینا بند کر دیے ہیں۔ اب یہ آرام کریں گی۔"

خالہ نے منصور کو گھورا اور بولیں۔ "تم بیچ میں مت بولو۔ سائرہ میری بیٹی ہے اور میں اسے کبھی بھی انکار نہیں کر سکتی۔ پھر مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگیں۔ "بیٹی! تم بیٹھو میں تمہارے لیے چائے بنا کر لاتی ہوں۔"

"خالہ رہنے دیں۔ میں گھر سے چائے پی کر آئی ہوں۔"

"نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے چائے تو تمہیں پینا ہی ہو گی۔ منصور جلدی سے سائرہ کے لیے گرم گرم سموسے لے آؤ۔"

"ٹھیک ہے۔ آپ چائے بنائیں میں سموسے لے کر آتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ تیزی سے باہر چلا گیا۔ خالہ بھی کچن میں مصروف ہو گئیں۔ میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے گھر کا جائزہ لیا۔ چھوٹا سا دو کمروں کا مکان تھا۔ برآمدے میں تخت بچھا ہوا تھا جس پر مشین رکھی ہوئی تھی۔ گھر چھوٹا ضرور تھا لیکن صاف ستھرا اور سلیقے سے سجا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر بعد منصور بھی سموسے لے کر آگیا اور ہم سب نے اکٹھے بیٹھ کر چائے پی۔ میں چلنے لگی تو خالہ نے کہا۔ "بیٹی منصور کی بات کا برا مت ماننا۔ اس کو تو مذاق کرنے کی عادت ہے۔ تمہیں جب بھی کپڑے سلوانے ہوں تو بلا تکلف آجانا۔ مجھے تمہارا کام کر کے خوشی ہو گی۔"

میں واپس آنے لگی تو منصور مجھے دروازے تک چھوڑنے آیا۔ اس نے ایک نظر ادھر اُدھر دیکھا اور آہستہ سے بولا۔ "سائرہ میں کل انسٹی ٹیوٹ کے باہر تمہارا انتظار کروں گا۔ تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔"

اس نے کچھ ایسے عجیب لہجے میں بات کی کہ میں چونک گئی اور بولی۔ "منصور وہ کون سی ضروری بات ہے جو تم یہاں نہیں کر سکتے۔"

"نہیں یہاں ممکن نہیں ہے، تم پریشان مت ہو، میں تمہارا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ بس زیادہ سے زیادہ پانچ منٹ۔"

میری حیرانی مزید بڑھ گئی۔ آخر وہ ایسی کون سی ضروری بات تھی جو صرف پانچ منٹ میں ختم ہو جاتی۔

بہرحال میں نے کچھ پوچھنا مناسب نہیں سمجھا اور گھر چلی گئی۔ میرے لیے زیادہ اطمینان بخش بات یہ تھی کہ اس نے مجھ سے کہیں چلنے کے لیے نہیں کہا۔ شاید وہ جانتا تھا کہ ایسی صورت میں اسے میری جانب سے انکار ہی سننے کو ملے گا۔

دوسرے روز میں وقت مقررہ پر انسٹی ٹیوٹ سے باہر نکلی تو وہ میرے انتظار میں سڑک کے کنارے بائیک سے ٹیک لگائے کھڑا ہوا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ تیزی سے میری جانب بڑھا اور ایک پیکٹ دیتے ہوئے بولا۔ "مجھے پہلی تنخواہ ملی ہے۔ اس میں سے تمہارے لیے یہ تحفہ خریدا ہے امید ہے کہ تمہیں پسند آئے گا۔"

میں نے فوراً ہی اپنا ہاتھ پیچھے کر لیا اور بولی۔ "نہیں منصور میں یہ تحفہ نہیں لے سکتی۔"

"کیوں؟ اس میں کیا قباحت ہے؟" اس نے تیکھے انداز میں پوچھا۔

"میرا تم سے ایسا کوئی رشتہ یا تعلق نہیں کہ یہ تحفہ قبول کروں۔"

"دیکھو یہ جگہ ایسی نہیں ہے کہ میں تمہارے ساتھ اپنے رشتے یا تعلق کی وضاحت کروں۔ فی الحال تم یہ پیکٹ رکھ لو۔ باقی باتیں ہم بعد میں کر لیں گے۔"

میں نے بھی سرعام اس سے الجھنا مناسب نہیں سمجھا البتہ حجت تمام کرنے کے لیے اتنا ضرور کہا۔ "ٹھیک ہے میں ایک شرط پر یہ تحفہ رکھ لیتی ہوں اور وہ یہ کہ تم آئندہ میرے لیے کوئی چیز نہیں لے کر آؤ گے۔ ورنہ میں سڑک پر تمہارا تماشا بنا دوں گی۔"

"ٹھیک ہے، مجھے منظور ہے۔" وہ بائیک پر بیٹھا اور میری طرف جھکتے ہوئے آہستہ سے بولا۔ "اب مجھے اس دن کا شدت سے انتظار رہے گا جب تم خود فرمائش کر کے مجھ سے چیزیں منگوایا کرو گی۔"

یوں لگا جیسے کسی نے میرے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ انڈیل دیا ہو۔ اس نے فارسی نہیں بولی تھی۔ آسان اور سلیس اردو میں اپنے عزائم واضح کر دیے تھے۔ وہ مجھ سے شادی کرنے کا خواب دیکھ رہا تھا اور اس دن کے انتظار میں ہے جب میں دلہن بن کر اس کے آنگن میں اتروں اور بیوی بن کر اس سے نئی نئی چیزوں کی فرمائش کروں۔ اف میرے خدا یہ کیا ہو گیا۔ میں نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ میرا ایک چھوٹا سا مذاق اتنی بھیانک شکل اختیار کر لے گا۔ میرے لیے گھر تک کا فاصلہ طے کرنا دشوار ہو گیا۔ جیسے تیسے گھر پہنچی

اور کمرا بند کر کے اوندھے منہ بستر پر لیٹ گئی۔ تھوڑی دیر بعد امی کھانے کا پوچھنے آئیں تو میں نے طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر کے انہیں ٹال دیا۔

میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس مشکل سے کیسے چھٹکارا حاصل کروں اگر منصور کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی ہے تو وہ خالہ صفیہ کو ضرور رشتے کے لیے ہمارے یہاں بھیجے گا۔ امی ابو تو جو بھی فیصلہ کریں لیکن میرے لیے بہت مشکل ہو جائے گا کہ اس رشتے سے انکار کر کے خالہ صفیہ جیسی شفیق و مہربان ہستی کا دل توڑ دوں۔ مجھے جلد از جلد کوئی ایسا بندوبست کرنا تھا کہ اس کی نوبت ہی نہ آئے۔

میری بے چینی بڑھتی جا رہی تھی لہٰذا شام کو مشورہ کرنے کے لیے کرن کے پاس چلی گئی۔ اس نے پوری بات غور سے سنی اور غصہ سے بولی۔ ''میں نے پہلے ہی تمہیں منع کیا تھا کہ لڑکوں سے اس طرح کا مذاق کرنا ٹھیک نہیں ہوتا۔ میں منصور کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ وہ بہت حساس لڑکا ہے۔ تم نے جو بات مجھے بتائی۔ اس سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے دل میں تمہاری تصویر سجائے بیٹھا ہے اور اگر وہ تمہارے بارے میں سنجیدہ ہے تو تمہیں حاصل کرنے کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہے۔''

''لیکن یہ تو یک طرفہ ٹریفک ہے۔'' میں نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر منصور کو کوئی خوش فہمی ہو گئی ہے تو اس میں میرا کیا قصور۔ میں نے تو کبھی اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ صرف ایک چھوٹا سا مذاق ہی کیا تھا لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ وہ میرے گلے کا ہار بن جائے۔''

''بہرحال جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔'' کرن ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بولی۔ ''اب تم کیا چاہتی ہو؟''

''یہی مشورہ کرنے تمہارے پاس آئی ہوں کہ منصور کو اس کے ارادے سے باز رکھنے کے لیے کیا قدم اٹھایا جائے۔''

''فی الحال یہ مناسب نہیں ہوگا۔ جب تک منصور خود تم سے کچھ نہیں کہتا۔ تمہیں بھی کوئی بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ تو آ بیل مجھے مار والا معاملہ ہو جائے گا۔ یقیناً وہ اپنی ماں سے بات کرنے سے پہلے تمہاری رائے ضرور جاننا چاہے گا۔''

ابھی کرن کی بات پوری نہ ہونے پائی تھی کہ اس کے ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے فون اٹھایا اور بات ختم کرنے کے بعد مجھ سے بولی۔ ''لو بھئی تمہارا کام تو ہو گیا۔ فراز کا فون تھا۔ اس نے تمہارے لیے جاب کا بندوبست کر لیا ہے۔ تم کل صبح دس بجے اس کے دفتر میں چلی جانا میں تمہیں اس کا ایڈریس اور فون نمبر دے دیتی ہوں۔''

میں وقتی طور پر منصور کو بھول کر فراز کے بارے میں سوچنے لگی۔ ابھی تک اس کا نام ہی سنا تھا۔ کبھی ملنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ نہ جانے وہ عادات و اطوار اور مزاج کا کیسا ہو گا۔ عام طور پر امیر لڑکے مغرور، بد دماغ اور بد مزاج ہوتے ہیں اگر فراز بھی ایسا ہی ہوا تو میرا گزارہ مشکل ہو جائے گا کیوں کہ میں بھی اپنے آپ کو کسی مہارانی سے کم نہیں سمجھتی تھی۔ ہونہہ دیکھا جائے گا، میں نے سر کو جھٹکتے ہوئے سوچا۔ یہ سب بعد کی باتیں ہیں۔ پہلے ملازمت تو مل جائے۔ پھر دیکھا جائے گا مجھے کون سا ساری عمر جاب کرنی تھی۔

مجھ سے غلطی یہ ہوئی کہ کرن سے بات کرنے سے پہلے میں نے امی ابو کو اعتماد میں نہیں لیا۔ اب میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ان سے کیسے بات کروں۔ دوسرے دن فراز سے ملنے جانا تھا اور اس سے پہلے گھر والوں کی اجازت ضروری تھی گھر آنے کے بعد امی سے اس بات کا ذکر کیا تو انہوں نے صاف انکار کر دیا اور بولیں۔ ''کوئی ضرورت نہیں ملازمت کرنے کی۔ تمہاری سب ضرورتیں پوری ہو رہی ہیں پھر بلاوجہ اپنے آپ کو ہلکان کرنے سے کیا فائدہ آرام سے گھر میں بیٹھو اور آنے والے وقت کے لیے اپنے آپ کو تیار کرو۔''

عام حالات میں شاید امی کا انکار سننے کے بعد میں خاموش ہو جاتی لیکن نہ جانے کیوں مجھے بھی ضد سی چڑھ گئی اور میں نے ابو سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ شاید یہ میری قسمت میں لکھا تھا کہ میں جاب کروں اور اس کے نتیجے میں میری زندگی میں ایک خوشگوار تبدیلی آئے۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب ابو نے صرف ایک مرتبہ کہنے پر ہی مجھے ملازمت کی اجازت دے دی۔ وہ فراز کے والد فریدالدین کو جانتے تھے اور ان کے کاروبار سے بھی واقف تھے۔ امی نے ایک بار پھر مخالفت کی تو ابو نے یہ کہہ کر انہیں خاموش کر دیا کہ موجودہ دور میں لڑکیوں کا عملی زندگی میں قدم رکھنا بہت ضروری ہے۔ اس طرح انہیں زمانے کی اونچ نیچ کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

فراز کا دفتر ڈھونڈنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ وہ مین گلشن روڈ پر ایک کثیر المنزلہ عمارت کے دوسرے فلور پر

واقع تھا۔ میں نے ریسپشن پر بیٹھی لڑکی کو اپنی آمد کے مقصد سے آگاہ کیا تو اس کے چہرے پر بجلی سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اس نے مجھے سامنے والے صوفے پر بیٹھی لڑکی کو اپنی آمد کے مقصد سے آگاہ کیا تو اس کے چہرے پر بھی بجلی سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اس نے مجھے سامنے والے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور انٹرکام پر سرفراز کو میری آمد کی اطلاع دی اور مجھے فوراً ہی اندر بلا لیا گیا۔ فراز کو دیکھ کر میں حیران رہ گئی۔ وہ میرے تصور سے کہیں زیادہ ہینڈسم، خوب صورت اور اسمارٹ تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرایا اور اپنے سامنے والی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"کرن نے مجھے بتایا ہے کہ آپ جاب کرنا چاہتی ہیں۔ یہ بہت اچھی بات ہے۔ لڑکیوں کو کوئی نہ کوئی کام ضرور کرنا چاہیے۔ اس سے خود اعتمادی میں اضافہ ہوتا ہے۔ ویسے تو اس وقت ہمارے پاس کوئی جگہ نہیں ہے لیکن کرن کی بات کو ٹالنا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ اس وجہ سے آپ کے لیے گنجائش نکالنا پڑی۔ دراصل میری سیکریٹری اگلے ماہ کی پہلی تاریخ سے چھٹیوں پر جارہی ہے۔ اس کی غیر موجودگی میں آپ ہی اس سیٹ پر کام کریں گی۔ یہ بتائیں کہ آپ کب سے جوائن کرسکتی ہیں؟"

میں نے جلدی سے کہا۔ "میں تو کل سے ہی آنے کے لیے تیار ہوں۔"

"ویری گڈ۔" فراز نے کہا پھر اس نے انٹرکام پر کسی سے بات کی اور چند لمحوں بعد ہی ایک اسمارٹ سی لڑکی کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کی ظاہری حالت دیکھ کر ہی میں سمجھ گئی کہ وہ چھٹیوں پر کیوں جارہی ہے۔

"رفعت۔" فراز نے اسے میرے برابر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ مس سائرہ ہیں۔ آپ کی غیر موجودگی میں میری سیکریٹری کے فرائض انجام دیں گی۔ آپ انہیں کام کے بارے میں سمجھا دیں۔ اور انہیں اچھی سی چائے پلوائیں۔ تب تک میں صدیقی صاحب سے کہہ کر ان کا لیٹر بنواتا ہوں۔ یہ کل سے آفس جوائن کریں گی۔"

میں نے فراز کا شکریہ ادا کیا اور رفعت کے ساتھ اس کے کیبن میں چلی آئی۔ وہ بہت خوش اخلاق لڑکی تھی اس نے مجھے چائے پلائی اور تھوڑا بہت کام کے بارے میں سمجھایا پھر کہنے لگی۔ "سائرہ فی الحال تو میں تین مہینے کی چھٹی پر جارہی ہوں لیکن یقین سے نہیں کہہ سکتی کہ چھٹیاں ختم ہونے کے بعد واپس آسکوں گی یا نہیں۔ میرے شوہر تو ابھی کہہ رہے ہیں کہ بچے کی پیدائش کے بعد میرے لیے جاب کرنا مشکل ہو جائے گا اور تم تو جانتی ہو کہ اس معاشرے میں مرد ہی بالا دست ہے اگر انہوں نے زیادہ مجبور کیا تو مجھے ملازمت چھوڑنا پڑے گی۔ اس لیے بہتر ہے کہ تم اچھی طرح کام کو سمجھ لو۔ ویسے فراز صاحب بہت اچھے آدمی ہیں۔ ان سے تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ البتہ ایک بات یاد رکھنا۔ انہیں جھوٹ سے بہت نفرت ہے اور جھوٹے آدمی کو یہ بالکل برداشت نہیں کرتے۔ اس لیے میرا مشورہ ہے کہ ان سے کبھی جھوٹ نہ بولنا اور نہ ہی کوئی بات چھپانا۔ اگر سچ بتا دو گی تو یہ تمہاری مدد ہی کریں گے۔"

رفعت کی یہ بات میں نے گرہ میں باندھ لی۔ ویسے تو میں خود بھی جھوٹ نہیں بولتی تھی لیکن اب مجھے مزید محتاط رہنا تھا۔ تھوڑی دیر بعد فراز نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا اور ایک لفافہ مجھے دیتے ہوئے بولا۔ "مس سائرہ یہ آپ کا اپائنٹمنٹ لیٹر ہے۔ فی الحال آپ کی تنخواہ کچھ زیادہ نہیں ہے لیکن امید ہے کہ اس میں جلد ہی اضافہ ہو جائے گا۔ اس کا انحصار آپ کی کارکردگی پر ہے اور میں توقع کرتا ہوں کہ آپ ہمیں مایوس نہیں کریں گی۔ اس کے علاوہ آپ کو پک اینڈ ڈراپ کی سہولت بھی ہوگی۔ اب آپ جاسکتی ہیں انشاء اللہ کل ملاقات ہوگی۔"

میں نے گھر آکر لیٹر دیکھا تو میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ بیس ہزار روپے تنخواہ، سال میں ایک بونس، ایک ماہ کی چھٹی اور بیمار ہونے کی صورت میں علاج معالجہ کمپنی کے ذمے۔ ایک ناتجربہ کار لڑکی کو اس سے زیادہ اور کیا مل سکتا ہے۔ میں نے ابو کو وہ لیٹر دکھایا تو بہت خوش ہوئے اور نصیحت کرتے ہوئے بولے۔ "بس ایک بات کا خیال رکھنا تم بہت بے پروا اور منہ پھٹ واقع ہوئی ہو۔ اب تمہیں اس عادت کو کنٹرول کرنا ہوگا۔ دفتروں کا ماحول بہت سازشی ہوتا ہے اور لوگ بات کا بتنگڑ بنا دیتے ہیں۔ اس لیے میرا مشورہ ہے کہ اپنی زبان بند اور آنکھیں کان کھلے رکھو۔ تمہیں بہت زیادہ ریزرو اور محتاط رہنا ہوگا۔ کسی سے گھلنے ملنے یا زیادہ باتیں کرنے کی ضرورت نہیں۔"

اس دفتر میں بیس پچیس لوگ کام کرتے تھے۔ پہلے دن ہی کئی ایک نے مجھ سے بے تکلف ہونے کی کوشش کی لیکن میں نے کسی کو لفٹ نہ کرائی۔ بس رسماً ایک آدھ بات کرنے پر اکتفا کیا۔ رفعت نے مجھے چند لوگوں کا نام لے کر بتایا کہ یہ لگائی بجھائی کے ماہر ہیں۔ اس لیے ان سے محتاط

رہنے کی ضرورت ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ دوسرے لوگوں کی طرح فراز اپنی سیکریٹری کو کمرے میں بلا کر ڈکٹیشن نہیں دیتا بلکہ اپنے خط خود ہی لکھتا ہے۔ سیکریٹری کا کام صرف اتنا ہے کہ ان خطوط کو ٹائپ کروائے اور فراز کے دستخط کروانے کے بعد متعلقہ لوگوں کو بھیج دے۔ اس کے علاوہ سیکریٹری کو فراز کے نام آنے والی تمام ڈاک کا اندراج ایک رجسٹر میں کرتا ہوگا اور ان تمام کاغذات کو ایک فولڈر میں رکھ کر فراز کی میز پر رکھنا ہوگا اور جب ڈاک دیکھ لے تو ان کاغذات کو متعلقہ لوگوں تک بھیجنے کی ذمہ داری بھی سیکریٹری کی ہے۔

میں نے پہلے روز سے کام سنبھال لیا اور رفعت کی نگرانی میں اپنے فرائض انجام دینے لگی۔ میری میز پر ایک کمپیوٹر رکھا ہوا تھا اور انٹرنیٹ کی سہولت بھی موجود تھی۔ رفعت نے مجھے مشورہ دیا کہ فارغ وقت میں ٹائپنگ کی پریکٹس بھی کرتی رہوں۔ میرے پاس وقت کی کمی نہ تھی چنانچہ میں نے رفعت کے مشورے پر عمل کرنا شروع کردیا اور چند ہی روز میں میری اچھی خاصی اسپیڈ ہوگئی۔ کچھ دنوں بعد رفعت چھٹی پر چلی گئی اور میں نے اس کی جگہ مکمل طور پر سنبھال لی۔

اس دوران فراز سے میری دو چار ملاقاتیں ہی ہوئیں۔ اس کے کیبن کا راستہ میرے کمرے سے گزرتا تھا۔ اس لیے آتے جاتے وہ ہائے ہیلو کرلیتا۔ وہ اپنے کام سے کام رکھنے والا شخص تھا اور دفتر کے کسی فرد سے غیر ضروری بات نہیں کیا کرتا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ پورا دفتر ایک خودکار نظام کے تحت چل رہا ہے اور ہر شخص اپنے فرائض سے اچھی طرح واقف ہے۔ رفعت کے جانے کے ایک ہفتہ بعد فراز نے کچھ خطوط ٹائپنگ کے لیے بھیجے۔ اتفاق سے اس روز ٹائپسٹ چھٹی پر تھا اور دفتر میں کسی دوسرے شخص کو ٹائپنگ نہیں آتی تھی۔ میں نے وہ خطوط اپنے کمپیوٹر پر ٹائپ کیے اور فراز کی میز پر لے جاکر رکھ دیے۔ اسے معلوم تھا کہ ٹائپسٹ نہیں آیا چنانچہ وہ ٹائپ شدہ خطوط دیکھ کر حیران رہ گیا اور بولا۔ ”مس سائرہ! ارشد تو آج چھٹی پر ہے۔ پھر یہ خط کس نے ٹائپ کیے؟“

”جی، میں نے۔“

”آپ کو ٹائپنگ آتی ہے؟“ وہ خطوط پر ایک نظر ڈالتے ہوئے بولا۔

”جی ہاں۔“ میں نے اعتماد سے کہا۔ ”آپ کو بتایا تھا ناں میں نے کمپیوٹر کا شارٹ کورس کر رکھا ہے۔ البتہ آج پہلی بار ٹائپنگ کی ہے اس لیے اگر کوئی غلطی ہوگئی ہو تو نظر انداز کردیں گے۔“

”ویری گڈ۔“ وہ تحسین آمیز لہجے میں بولا۔ ”یہ بہت اہم خطوط ہیں اور آج ان کا جانا بہت ضروری ہے۔ ایک دن کی تاخیر بھی ہمارے لیے نقصان دہ ہوسکتی ہے۔ آپ کی فرض شناسی نے مجھے بہت متاثر کیا اور اس کے لیے خاص طور پر آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گا۔“

”آپ شرمندہ کر رہے ہیں۔ میں نے تو بس یونہی ایک کوشش کی تھی۔ آپ چیک کرلیں کہیں کوئی غلطی نہ ہو۔“

”اس کی آپ فکر نہ کریں۔ کام کرنے والوں سے ہی غلطی ہوتی ہے۔ بہرحال میں دیکھ لیتا ہوں۔“

اس نے وہ چاروں خط بڑے غور سے پڑھے اور مسکراتے ہوئے بولا۔ ”یقین نہیں آرہا کہ آپ نے پہلی بار ٹائپنگ کی ہے۔ مجھے اس میں کوئی غلطی نظر نہیں آرہی۔ ارشد کے کام میں تو بہت غلطیاں ہوتی ہیں۔ ایک لیٹر کو دو تین مرتبہ ٹائپ کروانا پڑتا ہے۔ بس میں نے سوچ لیا ہے کہ اب میرے خطوط آپ ہی ٹائپ کریں گی اور اس کے عوض آپ کی تنخواہ میں معقول اضافہ کردیا جائے گا۔“

یہ نئی ذمے داری ملنے کے بعد فراز سے میری ملاقاتیں بڑھنے لگیں۔ اب میں دو تین مرتبہ اس کے کمرے میں جاتی۔ انگلش میڈیم اسکول میں پڑھنے کی وجہ سے میری انگریزی اچھی ہوتی تھی۔ میں نے ٹائپنگ کے دوران محسوس کیا کہ فراز کے لکھے ہوئے خطوط میں گرامر کی ایک دو غلطیاں ضرور ہوتی تھیں چنانچہ میں انہیں بھی ٹھیک کردیتی۔ اس وجہ سے وہ میری اور زیادہ قدر کرنے لگا۔ مہینا ختم ہوا تو میری تنخواہ میں دس ہزار کا اضافہ ہوگیا۔ مجھے لگا کہ وہ کچھ زیادہ ہی مہربان ہوگیا ہے۔ چنانچہ میں نے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔ ”سر! کیا مس رفعت کو بھی اتنی ہی تنخواہ ملتی تھی؟“

”اس سے بھی زیادہ اور وہ تو ٹائپنگ بھی نہیں کرتی تھیں لیکن آپ کیوں پوچھ رہی ہیں؟“

”بس یونہی مجھے خیال آیا تھا کہ آپ جو تنخواہ دے رہے ہیں کیا میں اس کی اہل ہوں؟“

”فضول باتوں کو اپنے ذہن سے نکال دیں۔ میں نے آپ پر کوئی احسان نہیں کیا۔ یہ مارکیٹ کا اصول ہے کہ اہلیت کے مطابق معاوضہ دیا جائے۔“

اس دن کے بعد فراز کے خطوط ٹائپ کرنے کی ذمہ

داری مجھے مل گئی۔ اس سلسلے میں مجھے دن میں تین چار مرتبہ اس کے کمرے میں جانا پڑتا۔ آہستہ آہستہ ہمارے درمیان تکلف کے پردے ہٹتے گئے اور اب ہم کام کے علاوہ دوسری باتیں بھی کرنے لگے تھے۔ اس نے باتوں باتوں میں میرے حالات معلوم کر لیے اور میں بھی اس کے بارے میں بہت کچھ جان گئی۔ فراز کے والد فریدالدین صاحب دفتر بہت کم آتے تھے۔ انہوں نے فیکٹری کا کام سنبھالا ہوا تھا۔ ابھی تک ان سے صرف ایک مرتبہ سامنا ہوا تھا۔ انہوں نے مجھ سے سرسری انداز میں ایک دو جملے کہے اور گڈ گرل کہہ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔

مجھے اپنے لیے کچھ نئے جوڑے سلوانے تھے چنانچہ ایک روز دفتر سے واپسی پر بازار چلی گئی اور چار سوٹوں کا کپڑا خرید لیا۔ دوسرے دن اتوار تھا۔ میں وہ کپڑا لے کر خالہ صفیہ کے پاس چلی گئی۔ اتفاق سے وہ کہیں گئی ہوئی تھیں۔ منصور نے دروازہ کھولا اور بولا۔ "اندر آ جاؤ۔ وہ بس آنے والی ہی ہوں گی۔"

میں ایک لمحے کے لیے جھجکی پھر یہ سوچ کر اندر چلی گئی کہ نہ جانے دوبارہ آسکوں یا نہیں۔ تب تک یہ کپڑے یونہی پڑے رہیں گے۔ منصور نے فریج سے کولڈ ڈرنک کی بوتل نکالی اور میرے لیے گلاس میں انڈیلتے ہوئے بولا۔ "سنا ہے تم نے جاب کر لی ہے؟"

"ہاں۔"

"اچھا ہوا تم آ گئیں۔ ورنہ میں تو تمہارے انسٹی ٹیوٹ کے چکر لگاتے لگاتے تھک گیا تھا۔ میری سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ تم سے ملاقات کی کیا صورت نکالی جائے۔"

"کیوں ایسی کیا خاص بات ہے جو تم مجھ سے ملنے کے لیے اتنے بے تاب ہو رہے تھے۔"

"بات یہ ہے سائرہ کہ تم سے ملنا اور باتیں کرنا اچھا لگتا ہے۔ اتنے دن سے تمہیں نہیں دیکھا۔ اس لیے بے چینی ہو رہی تھی اور ویسے بھی مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنا تھی۔"

"کیسی بات؟" میں نے چونکتے ہوئے کہا۔

"دراصل امی میری شادی کرنا چاہ رہی ہیں۔" منصور نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "آج کل وہ میرے لیے لڑکی ڈھونڈ رہی ہیں انہوں نے مجھ سے بھی پوچھا ہے کہ اگر میری کوئی پسند ہے تو انہیں بتا دوں لیکن تم سے پوچھے بغیر انہیں کوئی جواب نہیں دے سکتا تھا۔ بولو کیا مجھ سے شادی کرنے کے لیے تیار ہو؟"

میں ایک دم ہی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور حیران ہوتے ہوئے بولی۔ "یہ کیا کہہ رہے ہو منصور؟ میں نے کبھی تمہیں اس نظر سے نہیں دیکھا۔"

"پھر وہ سب کیا تھا۔ میرے ساتھ گھومنا پھرنا، ہوٹلوں میں جانا، مجھ سے لگاوٹ بھرے انداز میں باتیں کرنا، کیا تم مجھے بے وقوف بنا رہی تھیں؟"

"معاف کرنا، میں نے کبھی تمہیں بے وقوف نہیں بنایا اور نہ ہی تمہارے ساتھ کہیں جانے یا بائیک پر بیٹھنے کی فرمائش کی، تم ہی میرا پیچھا کرتے رہے۔ میں نے کبھی تمہاری حوصلہ افزائی نہیں کی۔"

"تم اتنی آسانی سے دامن نہیں چھڑا سکتیں۔" وہ تیز لہجے میں بولا۔ "تمہارے رویے نے ہی مجھے غلط فہمی میں مبتلا کیا کہ تم مجھے پسند کرنے لگی ہو۔ ورنہ کوئی بھی لڑکی کسی غیر لڑکے کے ساتھ تنہا بائیک پر بیٹھتی ہے اور نہ آئس کریم کھانے جاتی ہے۔ اگر تمہیں کوئی انٹرسٹ نہیں تھا تو پہلے روز ہی مجھے روک دیتیں۔"

"چلو مان لیا کہ یہ میری غلطی تھی۔ مجھے واقعی تم سے اتنا بے تکلف نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اب اس بات کو یہیں ختم کر دو اور کسی اچھی سی لڑکی سے شادی کر لو۔ کچھ دنوں بعد تمہیں یاد بھی نہیں رہے گا کہ کوئی سائرہ نامی لڑکی تمہاری زندگی میں آئی تھی۔"

اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا اور وہ مرجھائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "تمہارے لیے یہ ایک کھیل ہو سکتا ہے لیکن میں سنجیدہ ہوں۔ تم نہیں جانتیں کہ میرے لیے کتنی اہمیت اختیار کر چکی ہو۔ تمہیں بھلانا اتنا آسان نہ ہوگا۔"

اس کی بات ختم ہی ہوئی تھی کہ خالہ صفیہ بھی آ گئیں۔ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔ ملازمت کی مبارک باد دی اور دعائیں دینے لگیں۔ میں نے وہ کپڑے انہیں دیے اور کچھ دیر بیٹھ کر واپس چلی آئی۔ منصور کی باتوں نے مجھے پریشان کر دیا تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ میرا ایک چھوٹا سا مذاق اس کے لیے زندگی بھر کا روگ بن جائے گا۔ اس کی تلافی صرف اسی طرح ہو سکتی تھی کہ اس سے شادی کر لوں لیکن میں نے اپنے ذہن میں جس جیون ساتھی کا خاکہ بنا رکھا تھا۔ منصور اس میں فٹ نہیں بیٹھتا تھا پھر میں اس سے کیسے شادی کر سکتی تھی۔ میرا آئیڈیل ایک خوب صورت، ہینڈسم اور مالی طور پر مستحکم شخص تھا۔ جس کے ہمراہ ایک خوش

حال زندگی گزار سکوں اور مجھے ایسے ہی بندے کا انتظار تھا پھر اچانک ہی میرے ذہن کی اسکرین پر ایک نام ابھرا "فراز"۔ اس میں وہ تمام خوبیاں موجود تھیں جو میں اپنے آئیڈیل میں دیکھ رہی تھی۔

"کیا یہ ممکن ہے؟" میں نے دل میں سوچا۔ میرے اندر سے ایک آواز آئی۔ "اس دنیا میں کچھ بھی ناممکن نہیں ہے۔" اور میں زیرِ لب مسکرا دی۔

میں نے دوسرے دن سے ہی اپنے منصوبے پر کام شروع کر دیا۔ عام طور پر سادہ لباس اور میک اپ کے بغیر ہی دفتر جایا کرتی تھی اور اسی وجہ سے کچھ لوگوں نے مجھے تیک پروین کہنا شروع کر دیا لیکن اس روز میں نے خصوصی اہتمام کیا۔ اپنے لیے ایک جھلملاتی رنگ کا سوٹ نکالا۔ اسی رنگ کی لپ اسٹک لگائی۔ گالوں پر ہلکی سی بلشنگ کی اور پرفیوم لگا کر دفتر کے لیے روانہ ہو گئی۔ آدھے گھنٹے بعد ہی فراز کا بلاوا آ گیا۔ میں اس کے کمرے میں داخل ہوئی تو وہ مجھے دیکھ کر چونک گیا اور پھر اپنے مخصوص انداز میں مسکراتے ہوئے بولا۔ "میرا خیال ہے کہ آپ کہیں اور جانے کے لیے تیار ہوئی تھیں لیکن غلطی سے دفتر چلی آئیں۔"

"اوہ نو۔" میں نے ایک ادا سے سر کو جھٹکتے ہوئے کہا۔ "دراصل مجھے شام کو ایک فرینڈ کی برتھ ڈے پارٹی میں جانا ہے۔ اتنا وقت نہیں ہے کہ گھر جا کر تیار ہوتی اس لیے......" میں نے جان بوجھ کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"اچھی لگ رہی ہیں۔" وہ پرستائش نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "کبھی ایسی ہی ڈریسنگ کیا کریں۔"

فراز نے مجھے کچھ خطوط دیے اور بولا۔ "مس سائرہ یہ بہت ارجنٹ ہیں انہیں آج ہی ڈسپیچ کرنا ہے۔"

"او کے سر۔" میں نے کہا اور اٹھنے لگی تو وہ بولا۔

"آپ جلدی سے یہ لیٹرز ٹائپ کر لیں پھر ہم ایک ساتھ چائے پئیں گے۔"

میں دھیرے سے مسکرا دی۔ مرد خواہ کتنا ہی نیک اور پارسا کیوں نہ ہو۔ تریا چلتر سے نہیں بچ سکتا۔ فراز کے بارے میں جو معلومات میرے پاس تھیں ان کے مطابق وہ انتہائی مضبوط کیریکٹر کا شخص تھا اور کرن کی زبانی معلوم ہو چکا تھا کہ یونیورسٹی میں انتہائی مقبول ہونے کے باوجود اس کا کسی لڑکی سے کوئی افیئر نہیں تھا اور مس رفعت بھی اس کی تعریف کرتے نہیں تھکتی تھیں۔ پھر پل بھر میں یہ کیا ماجرا ہو گیا۔ میں ذرا سا بن سنور کر آ گئی تو موصوف اپنے ہوش گنوا

جارج George

یونان کے دو بادشاہوں کے نام جارج اوّل (1845ء۔ 1913ء) عہد حکومت 1863۔1913ء وہ ڈنمارک کے کرسچین نہم کا بیٹا تھا۔ اس نے کامیاب آئینی بادشاہت کی اسے ایک یونانی باشندے نے سالونیکا کے مقام پر قتل کر دیا۔ جارج دوم (1890ء۔ 1947ء) عہد حکومت 1922ء۔ 1923ء اور 1935ء .1947ء 1922ء میں اپنے باپ کی دستبرداری کے بعد بادشاہ بنا۔ 1923ء میں اس نے خود کو معزول کر دیا لیکن 1935ء میں فوج نے اس کی بادشاہت پھر سے بحال کر دی۔

مرسلہ: عظمیٰ محسن کاظمی۔ جدہ (سعودیہ)

سینٹ جارج
Saint George

انگلستان کے مربی اور سرپرست۔ عام خیال یہ ہے کہ ملک آرمینیا میں پیدا ہوئے اور فلسطین میں عیسائیوں کے قتل عام کے دوران مارے گئے۔ سینٹ جارج کو نقشوں میں ایک سفید گھوڑے پر سوار اور ایک اژدہے کو مارتے ہوئے دکھایا جاتا ہے۔ عام عقیدے کے مطابق اژدھا دراصل شیطان ہے جو انسان کو گمراہ کرتا ہے۔ 23 اپریل کو برطانیہ میں ہر سال سینٹ جارج کی برسی منائی جاتی ہے۔

مرسلہ: مائکل جاوید۔ کراچی

جارج ٹاؤن
George Town

گیانا کا دارالحکومت۔ دریائے ڈیمرارا کے دہانے پر آباد ہے۔ اس شہر کا سنگِ بنیاد برطانیہ نے 1781ء میں رکھا۔ 1784ء میں اس پر ولندیزوں نے قبضہ کر لیا۔ 1814ء میں برطانیہ نے اس پر قبضہ کر لیا۔ بعض عمارات نہایت خوب صورت ہیں۔ سگار، صابن، جوتے اور چاکلیٹ یہاں کی خاص مصنوعات ہیں۔

مرسلہ: مائکل جاوید۔ کراچی

بیٹھے اور مجھے چائے کی دعوت دے ڈالی لیکن یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اس سے پہلے بھی کئی بار ہم اکٹھے چائے پی چکے تھے لیکن آج اس کا انداز بالکل مختلف تھا۔

چائے کے دوران کوئی خاص بات نہیں ہوئی پھر اچانک ہی اس نے میرے ہاتھوں کی طرف دیکھا اور بولا۔

''آپ کوئی جیولری نہیں پہنتیں؟''

''مثلاً؟'' میں نے چونکتے ہوئے کہا۔

''مثلاً کوئی انگوٹھی وغیرہ۔'' وہ معنی خیز انداز میں بولا۔

میں اس کا اشارہ سمجھ گئی اور شرماتے ہوئے بولی۔

''ابھی میری منگنی نہیں ہوئی۔''

''اوہ آئی سی۔'' اس کے چہرے پر اطمینان اتر آیا اور وہ بولا۔ ''معاف کیجیے۔ مس سائرہ یہ میرے فرائض میں شامل ہے کہ اپنے اسٹاف کی ذاتی زندگی کے بارے میں تھوڑی بہت معلومات حاصل کروں۔ اس طرح بہت سے مسائل حل کرنے میں آسانی رہتی ہے۔''

اس نے بڑی ہوشیاری سے میری منگنی کے بارے میں معلوم کرلیا تھا لیکن مجھے بالکل برا نہیں لگا بلکہ خوشی ہوئی میں نے آہستہ سے کہا۔ ''کوئی بات نہیں سر، یہ آپ کا حق ہے آپ جو چاہیں مجھ سے سوال کر سکتے ہیں۔''

اس دن کے بعد میں اور فراز تیزی سے قریب آنے لگے گو کہ وہ بہت محتاط تھا اور صرف ضرورت کے تحت ہی مجھے اپنے کمرے میں بلاتا تھا لیکن وہ چند لمحے ہی بہت خوشگوار ہوتے تھے۔ مجھے بھی اندازہ ہوگیا تھا کہ فراز مجھے پسند کرنے لگا ہے لیکن اپنی شرافت اور بردباری کی وجہ سے کچھ کہنے سے کترا رہا ہے۔ میں شدت سے اس دن کا انتظار کررہی تھی جب وہ حرف مدعا زبان پر لائے لیکن میں منصور والی غلطی نہیں دہرانا چاہ رہی تھی۔ اس لیے اپنی جانب سے کوئی ایسی حرکت نہیں کی جس سے فراز کسی غلط فہمی کا شکار ہوجائے۔

ایک دن اس کی طبیعت خراب تھی۔ وہ دفتر نہیں آیا۔ میں نے کچھ خطوط ٹائپ کرکے رکھے تھے جن پر اس کے دستخط درکار تھے اور میں یہ بھی جانتی تھی کہ ان خطوط کو ایک دن کے لیے بھی نہیں روکا جاسکتا چنانچہ میں نے بہت سوچنے کے بعد اسے فون کیا اور ان خطوط کے بارے میں پوچھا۔ اس نے کہا کہ وہ اپنی گاڑی بھیج رہا ہے، میں وہ خطوط لے کر اس کے گھر آجاؤں۔ وہ دستخط کردے گا۔

آدھے گھنٹے بعد میں اس کی عالیشان کوٹھی میں موجود تھی۔ اس کا گھر دیکھ کر میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ میں نے خواب میں بھی اتنا شاندار گھر نہیں دیکھا تھا جس میں صرف تین افراد یعنی فراز، اس کی امی اور ڈیڈی رہا کرتے تھے۔ ملازم نے مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھادیا اور چند لمحوں بعد میرے لیے جوس کا گلاس لے کر آگیا۔ وہاں کی ایک ایک چیز بے حد نفیس اور قیمتی تھی۔ میں نے اچھی طرح ڈرائنگ روم کا جائزہ لیا اور سوچنے لگی کہ اگر فراز سے میری شادی ہوجائے تو اس عالی شان گھر کی مالکن بن سکتی ہوں پھر مجھے اپنے آپ پر ہنسی آگئی۔ میں جاگتی آنکھوں سے دن میں خواب دیکھ رہی تھی اور میں سوچنے لگی کہ سپنوں کو حقیقت کا روپ دھارتے کتنی دیر لگتی ہے۔

تھوڑی دیر بعد فراز کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے آف وائٹ کلر کا شلوار قمیص پہن رکھا تھا اور اس ڈریس میں وہ بہت اسمارٹ لگ رہا تھا۔ بخار کی وجہ سے اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ اس نے خطوط پر دستخط کیے اور معذرت آمیز لہجے میں بولا۔ ''میرے نہ آنے سے آپ کو بہت زحمت اٹھانا پڑی۔ اگر یہ خطوط اتنے اہم نہ ہوتے تو آپ کو بھی تکلیف نہ دیتا۔''

''اس میں تکلیف کی کیا بات ہے۔ میں تو بڑے آرام سے آپ کی گاڑی میں بیٹھ کر آئی ہوں۔ تکلیف تو اس وقت ہوتی جب بس یا رکشا میں آتی۔''

''بہرحال اب آپ کھانا کھا کر ہی جائیں گی۔ کھانے کی میز پر آپ کی ملاقات ممی اور ڈیڈی سے بھی ہو جائے گی۔''

میں گھبرا گئی اور سوچنے لگی کہ نہ جانے فراز کے والدین کس مزاج کے ہوں اور مجھ سے کس طرح پیش آئیں لیکن میرے لیے فرار کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ فراز نے جس خلوص اور اپنائیت سے کھانے کی دعوت دی تھی اسے کیسے انکار کرسکتی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ملازم نے کھانا لگنے کی اطلاع دی تو میں فراز کے ساتھ ڈائننگ ہال میں آگئی۔ جہاں فراز کے ممی ڈیڈی پہلے سے موجود تھے۔ ان سے مل کر میرے سارے خدشات غلط ثابت ہوئے۔ وہ دونوں بے حد شفیق اور مہربان تھے۔ خاص طور پر فراز کی امی تو بڑی محبت سے پیش آئیں۔ انہوں نے مجھ سے بہت سی باتیں کیں جس سے لگتا تھا کہ وہ میرے بارے میں بہت کچھ جاننے کی خواہش مند تھیں۔

ایک دن میں خالہ صفیہ کے گھر اپنے کپڑے لینے گئی تو

وہ کافی پریشان نظر آ رہی تھیں۔ میرے پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ وہ منصور کی طرف سے فکرمند ہیں۔ اسے نہ جانے کیا ہو گیا ہے ہر وقت اکھڑا اکھڑا سا رہتا ہے۔ نہ ڈھنگ سے کھاتا ہے اور نہ ہی سیدھے منہ بات کرتا ہے۔ لگتا ہے جیسے اسے کوئی روگ لگ گیا ہو۔ خالہ صفیہ نے خاص طور پر کہا کہ میں منصور سے اس کی پریشانی کی وجہ جاننے کی کوشش کروں۔ میں خاموش ہو گئی۔ ان سے کیا کہتی کہ منصور کی پریشانی کی اصل وجہ میں ہوں!

دوسرے دن اتوار تھا۔ میں دیر سے سو کر اٹھی۔ ناشتے سے فارغ ہوئی تھی کہ کرن کا فون آ گیا۔ وہ ناراض ہو رہی تھی کہ میں نے اتنے دن سے اس کی خبر نہیں لی۔ اس کی شادی کی تاریخ طے ہو گئی تھی اور وہ چاہ رہی تھی کہ میں اس کے ساتھ بازار جا کر شادی کی شاپنگ کرواؤں۔ پھر اچانک ہی اس نے موضوع بدل دیا اور بولی۔ ”تم تھوڑی دیر کے لیے میرے پاس آ جاؤ۔ مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنا ہے۔“

میں نے شام کو آنے کا وعدہ کیا اور امی سے اجازت لے کر اس کے گھر پہنچ گئی۔ وہ میرا ہی انتظار کر رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں ایک چمک ابھری اور وہ میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے کمرے میں لے گئی۔ اس نے میری کمر پر ہلکا سا ہاتھ رسید کیا اور چہکتے ہوئے بولی۔ ”سائرہ تم تو چھپی رستم نکلیں۔ بڑا اونچا ہاتھ مارا ہے تم نے۔“

”یہ کیا کہہ رہی ہو۔ میں نے ایسا کیا کر دیا؟“ میں حیران ہوتے ہوئے بولی۔

”اتنی بھولی اور انجان نہ بنو۔ مجھے سب معلوم ہو گیا ہے۔ بلکہ اس معاملے کو آگے بڑھانے کی ذمے داری بھی مجھے سونپ دی گئی ہے۔“

”میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا کہ تم کیا کہہ رہی ہو کھل کر بات کرو۔“

”اچھا تو پھر سنو۔“ وہ بستر پر بیٹھ کر آلتی پالتی مارتے ہوئے بولی۔ ”فراز صاحب تم پر بری طرح فریفتہ ہو چکے ہیں اور تم سے شادی کرنا چاہتے ہیں اور تمہاری مرضی معلوم کرنے کی ذمہ داری مجھے سونپی ہے۔“

”یہ..... یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“ میں نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

”سب کچھ ہو سکتا ہے بلکہ ہو گیا ہے۔ اس کے ممی ڈیڈی نے بھی تمہیں پسند کر لیا ہے۔ اس روز فراز نے لیموز پر بھتا کرنے کے بہانے تمہیں اسی لیے بلایا تھا کہ اس کے والدین بھی تمہیں دیکھ لیں۔ اب صرف تمہاری مرضی معلوم کرنا ہے اگر تم تیار ہو تو میں تمہاری امی سے بات کرتی ہوں۔ اس کے بعد ہی فراز کے گھر والے تمہارے یہاں رشتہ لے کر آئیں گے۔“

مجھے اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ میرے گمان میں بھی نہیں تھا کہ جاگتی آنکھوں سے دیکھا ہوا سپنا اتنی جلدی حقیقت کا روپ دھار لے گا۔ اس وقت میں اپنے آپ کو دنیا کی خوش قسمت ترین لڑکی سمجھ رہی تھی۔ جسے فراز جیسا جیون ساتھی مل رہا تھا۔ انکار کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ میں نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔ ”جب سب لوگوں کی یہی مرضی ہے تو میں کیا کہہ سکتی ہوں۔“

اس کے بعد سب معاملات بڑی تیزی سے طے پا گئے۔ کرن دوسرے روز ہی امی سے ملنے آئی اور انہیں فراز کے بارے میں تمام تفصیلات سے آگاہ کر دیا۔ امی کے اطمینان کے لیے یہی کافی تھا کہ کرن اسے اچھی طرح جانتی ہے اور وہ دونوں چار سال تک یونیورسٹی میں کلاس فیلو رہ چکے ہیں۔ اب تو میں بھی فراز کے دفتر میں کام کر رہی تھی اور اس کی عادات و اطوار سے اچھی طرح واقف ہو چکی تھی چنانچہ امی نے ابو سے مشورہ کرنے کے بعد رضامندی ظاہر کر دی۔ اس کے بعد فراز کی امی کا فون آیا۔ وہ ہمارے گھر آنا چاہ رہی تھیں۔ امی نے انہیں آنے والے اتوار کو بلا لیا اور کہا کہ فراز کو بھی ساتھ لے کر آئیں۔

وہ لوگ وقت مقررہ پر آ گئے۔ اس شہر میں ہمارا کوئی قریبی عزیز نہیں تھا۔ اس لیے امی نے خالہ صفیہ کو اپنی مدد کے لیے بلا لیا تھا۔ لیکن وہ اس وقت تک نہیں آئی تھیں۔ ادھر ادھر کی رسمی باتوں کے بعد فراز کی امی نے اپنے آنے کا مدعا بیان کیا اور کہا کہ وہ مجھے اپنی بہو بنانا چاہتی ہیں اور فراز کی بھی یہی خواہش ہے۔ امی کی خوشی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی لیکن انہوں نے فوری طور پر رشتہ قبول کرنے کی بجائے کہا۔ ”بہن! فراز ہمیں بھی پسند ہے اور مجھے خوشی ہے کہ آپ نے ہمیں اس قابل سمجھا لیکن اتنا ضرور کہوں گی کہ بات کو آگے بڑھانے سے پہلے اپنی اور ہماری حیثیت کا فرق بھی ذہن میں رکھیں۔“

”میں اسے نہیں مانتی۔“ فراز کی امی نے کہا۔ ”رشتے انسانوں کے درمیان ہوتے ہیں۔ ہمیں آپ کی لڑکی سے غرض ہے۔ حیثیت سے نہیں۔“ یہ کہہ کر انہوں نے اپنے

پرس سے ایک انگوٹھی نکالی اور بولیں۔ "اگر اجازت ہو تو یہ رسم بھی ادا کر دی جائے۔"

امی نے ابو کی طرف دیکھا اور انھوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ فراز کی امی نے بسم اللہ پڑھ کر انگوٹھی پہنائی اور بولیں۔ "آج سے سائرہ ہماری ہوئی۔ میں زیادہ انتظار نہیں کروں گی۔ آپ تیاری شروع کر دیں۔ انشاء اللہ عید کے فوراً بعد شادی کر دیں گے۔"

چائے پینے کے بعد وہ لوگ روانہ ہو رہے تھے کہ خالہ صفیہ آ گئیں اور براہ راست امی سے مخاطب ہوتے ہوئے بولیں۔ "معاف کرنا رضیہ، عین وقت پر مہمان آ گئے اس لیے مجھے آنے میں دیر ہو گئی۔"

"کوئی بات نہیں۔" امی نے خوش دلی سے کہا۔ "چلو! میں تمھیں مہمانوں سے ملواتی ہوں۔ یہ فراز ہیں ان کی امی اور ڈیڈی اور یہ صفیہ ہیں ان سے میرا رشتہ بہنوں جیسا ہے۔"

خالہ صفیہ کی نظر جونہی فراز کے ڈیڈی پر گئی وہ پتھر کے بت کی طرح اپنی جگہ ساکت ہو گئیں۔ فراز کے ڈیڈی بھی حیران و ششدر کھڑے ہوئے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کیا ماجرا ہے اور یہ ایک دوسرے کو دیکھ کر پریشان کیوں ہو گئے۔ پھر خالہ صفیہ کو ہوش آیا۔ انھوں نے اپنے چہرے پر چادر کا پلو ڈالا اور تیزی سے باہر چلی گئیں۔ ان کے جانے کے بعد فراز کے ڈیڈی بھی اپنی کیفیت سے باہر آ گئے۔ انھوں نے ابو سے الوداعی مصافحہ کیا اور رخصت ہو گئے۔

یہاں سے کہانی میں ایک نیا موڑ آیا اور ایک ایسا انکشاف ہوا جس نے مجھے سر سے پاؤں تک ہلا کر رکھ دیا۔ یہ باتیں مجھے بعد میں معلوم ہوئیں لیکن کہانی کا تسلسل برقرار رکھنے کے لیے بیان کر رہی ہوں۔ دراصل خالہ صفیہ، فراز کے والد فرید الدین کی پہلی بیوی تھیں۔ جب شادی ہوئی تو فرید الدین لاہور میں رہتے تھے اور ایک پرائیویٹ فرم میں اچھی پوسٹ پر کام کر رہے تھے۔ شروع کے چند سال بہت اچھے گزرے لیکن منصور کی پیدائش کے کچھ عرصہ بعد فرید الدین کے حالات بگڑنے لگے۔ ان کی ملازمت ختم ہو گئی اور وہ کافی عرصہ بے روزگار رہے۔ اس دوران ساری جمع پونجی ختم ہو گئی۔ مجبوراً انھوں نے پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لیے ایک ٹرانسپورٹ کمپنی میں کلرک کی جاب کر لی لیکن اس قلیل تنخواہ میں گزارہ ہونا مشکل تھا۔ صفیہ بیگم اس زندگی کی عادی نہیں تھیں۔ انھوں نے ناز و نعم میں پرورش پائی تھی اور

ہمیشہ عیش و عشرت کی زندگی گزاری تھی۔ وہ بدلے ہوئے حالات سے سمجھوتا نہ کر سکیں اور منصور کو لے کر میکے چلی گئیں۔ فرید الدین کو بھی غصہ آ گیا اور انھوں نے تہیہ کر لیا کہ جب تک ان کے حالات بہتر نہیں ہو جاتے۔ وہ صفیہ بیگم کو واپس نے کر نہیں آئیں گے۔

کچھ دنوں بعد فرید الدین کو دبئی میں جاب مل گئی۔ جانے سے پہلے وہ صفیہ سے ملنے گئے لیکن صفیہ کے بھائی ان سے بڑی بدتمیزی سے پیش آئے اور انھوں نے فرید الدین کو صفیہ سے نہیں ملنے دیا جس پر فرید الدین کا غصہ اور بڑھ گیا وہ صفیہ سے ملے بغیر ہی دبئی چلے گئے اور سوچ لیا کہ وہ اسی وقت وطن واپس آئیں گے جب ان کے پاس ڈھیر ساری دولت جمع ہو جائے گی۔

صفیہ کے بھائیوں نے کچھ دن تو اس کے بہت لاڈ پیار کیے پھر ان کے رویے میں تبدیلی آنے لگی۔ خاص طور پر صفیہ کی بھابی بہت ہی بری عورت تھی۔ وہ ہمیشہ صفیہ اور منصور کے پیچھے پڑی رہتی۔ خاص طور پر منصور سے اسے خدا واسطے کا بیر تھا۔ ایک دن گھر میں بہت زور کا جھگڑا ہوا۔ صفیہ کی بھابی کی زبان کچھ زیادہ ہی کھل گئی تھی اس نے نہ صرف صفیہ ہی کو طعنے نہیں دیے بلکہ منصور کو بھی منحوس کہہ ڈالا۔ صفیہ کے لیے یہ ناقابل برداشت معاملہ تھا اس نے اسی وقت اپنا مختصر سامان سمیٹا اور منصور کو ساتھ لے کر اسٹیشن کے لیے روانہ ہو گئی۔ اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ بھائی کا گھر ہی نہیں بلکہ یہ شہر بھی چھوڑ دے گی۔

کراچی پہنچ کر خالہ صفیہ نے ہمارے محلے میں مکان کرائے پر لیا اور لوگوں کے کپڑے سی کر گزارہ کرنے لگیں۔ اب انھیں شدت کے ساتھ فرید الدین کی یاد ستانے لگی تھی اور وہ جان گئی تھیں کہ عورت کو صرف شوہر کے گھر ہی میں پناہ مل سکتی ہے۔ شادی کے بعد باقی سب رشتے اجنبی ہو جاتے ہیں۔ انھیں فرید الدین سے شکوہ تھا کہ انھوں نے ایک دفعہ بھی پلٹ کر ان کی خبر نہ لی جب کہ وہ دو سال بعد دبئی سے واپس آئے تو سب سے پہلے اپنی بیوی اور بچے سے ملنے گئے لیکن صفیہ کے بھائی نے انھیں بتایا کہ وہ لڑ جھگڑ کر کہیں چلی گئی ہے اور انھیں اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ فرید الدین نے اپنے طور پر صفیہ کو تلاش کرنے کی بہت کوشش کی لیکن اتنے بڑے شہر میں اسے ڈھونڈنا آسان نہیں تھا۔ انھوں نے ریڈیو پر اعلان کروایا، اخبار میں اشتہار دیا اور ہر ملنے جلنے والے سے اس کے بارے میں پوچھتے رہے لیکن

کوئی کامیابی نہیں ہوئی اگر صفیہ اس شہر میں ہوتی تو شاید کچھ پتا چل جاتا لیکن وہ تو کراچی شفٹ ہو چکی تھی۔

فریدالدین نے تھک ہار کر صفیہ کی تلاش ترک کر دی اور دبئی سے جو کچھ کما کر لائے تھے۔ اس سے ایک چھوٹا سا کاروبار شروع کر دیا اور کچھ عرصہ بعد اپنے رشتے داروں میں دوسری شادی کر لی۔ فراز کے بعد ان کا کاروبار دن دونی رات چوگنی ترقی کرنے لگا۔ انہی دنوں وہ اپنے کام کے سلسلے میں کراچی آئے تو کسی دوست نے انہیں اس ٹیکسٹائل مل کے بارے میں بتایا جس کا مالک بیرون ملک منتقل ہو رہا تھا۔ فریدالدین نے دوست کے مشورے پر وہ مل خریدی اور بیوی بچے سمیت کراچی منتقل ہو گئے۔ اب وہ ایک خوش حال زندگی بسر کر رہے تھے لیکن صفیہ اور منصور کی یاد نے انہیں بے چین کر رکھا تھا۔

اتنے عرصہ بعد صفیہ کو اپنے سامنے دیکھ کر وہ اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکے اور دوسرے روز ہی پتا معلوم کر کے ان کے گھر پہنچ گئے۔ اس وقت منصور اپنے کام پر جا چکا تھا اور خالہ صفیہ گھر پر اکیلی تھیں۔ دروازہ انہوں نے ہی کھولا اور فریدالدین کو اپنے سامنے دیکھ کر چونک گئیں۔

فریدالدین کچھ دیر خاموش کھڑے رہے پھر آہستہ سے بولے۔ "اندر آنے کے لیے نہیں کہو گی؟"

خالہ صفیہ نے انہیں راستہ دے دیا اور وہ اطمینان سے چلتے ہوئے برآمدے میں پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئے۔

خالہ صفیہ نے بڑے رسان سے کہا۔ "اتنے عرصے بعد ہماری یاد کیسے آ گئی؟"

"پرانی باتیں دہرانے سے کوئی فائدہ نہیں صفیہ لیکن اپنی صفائی میں اتنا ضرور کہوں گا کہ میں نے تمہیں نہیں چھوڑا بلکہ تم مجھے چھوڑ کر چلی گئی تھیں۔ میں نے بھی سوچ لیا تھا کہ جب تک حالات بہتر نہیں ہوتے۔ تمہیں لینے نہیں جاؤں گا۔ مجھے دبئی میں جاب مل گئی۔ جانے سے پہلے تم سے ملنے گیا تو تمہارے بھائیوں نے مجھے ٹال دیا۔ دو سال بعد واپس آیا تو معلوم ہوا کہ تم وہاں سے بھی جا چکی ہو۔ میں نے حتی المقدور تمہیں تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن کامیابی نہیں ہوئی مجبوراً دوسری شادی کر لی اور کراچی آ گیا۔ یہ محض اتفاق ہی ہے کہ فراز کے رشتے کی بات کرنے کے لیے سائرہ کے گھر آئے تو تم سے سامنا ہو گیا۔ یہ سب کچھ جاننے کے بعد بھی تم مجھے ہی قصور وار ٹھہراؤ گی۔"

"نہیں۔" خالہ صفیہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"سارا قصور میرا ہے۔ اگر میں گھر چھوڑ کر نہ جاتی تو یوں دربدر نہ ہوتی۔ کاش میں جان سکتی کہ عورت کی واحد جائے پناہ اس کے شوہر کا گھر ہوتا ہے۔"

"خیر جو ہوا سو ہوا ہم دونوں نے اپنے اپنے حصے کی سزا بھگت لی لیکن اب میں تمہارے سارے دکھوں کی تلافی کر دوں گا۔ اپنا سامان پیک کر لو۔ میں کل ہی تمہیں اور منصور کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔"

"اب یہ ممکن نہیں۔ میں نے اپنی زندگی جیسے تیسے گزار لی۔ باقی بھی گزر جائے گی۔ البتہ منصور تمہاری اولاد ہے۔ اگر وہ تمہارے ساتھ جانے پر تیار ہو جائے تو میں اسے نہیں روکوں گی۔"

"تم اپنی ہی بات کی نفی کر رہی ہو۔ ابھی تم نے کہا تھا کہ عورت کی واحد جائے پناہ اس کے شوہر کا گھر ہے پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے تم اس چھوٹے سے مکان میں رہو۔"

"میری بات سمجھنے کی کوشش کرو فریدالدین۔ ہمارے وہاں جانے سے بہت پیچیدگیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ میرے لیے یہی بہت ہے کہ مجھے میرا شوہر اور منصور کو اس کا باپ مل گیا۔"

"اگر تمہارا اشارہ فراز اور اس کی ماں کی طرف ہے تو تم غلط سوچ رہی ہو۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ انہیں اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

"ٹھیک ہے۔" خالہ صفیہ ہار مانتے ہوئے بولیں۔ "میں منصور سے بات کرتی ہوں اگر وہ مان گیا تو میں تمہارے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہوں۔"

شام کو جب منصور گھر آیا تو خالہ صفیہ نے اسے فریدالدین کے بارے میں بتایا۔ یہ سنتے ہی وہ آپے سے باہر ہو گیا اور اس نے فریدالدین کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ جب خالہ صفیہ نے اسے پوری بات سمجھائی تو اس کا غصہ کچھ کم ہوا لیکن پھر بھی وہ فریدالدین کے یہاں جانے کے لیے تیار نہیں تھا البتہ اس نے خالہ صفیہ سے کہہ دیا کہ اگر وہ اپنے شوہر کے ساتھ رہنا چاہتی ہیں تو اسے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ اس پر خالہ صفیہ نے بھی کہہ دیا کہ وہ اسے چھوڑ کر کہیں نہیں جائیں گی۔

دونوں ماں بیٹے کسی فیصلے پر نہیں پہنچ سکے تھے کہ فریدالدین اپنی بیگم اور فراز کے ساتھ آ گئے اور زبردستی انہیں اپنے ساتھ لے گئے۔ خالہ صفیہ اور منصور کے لیے

پہلے سے کمرے تیار کروا دیے گئے تھے۔ فریدالدین نے منصور سے کہہ دیا کہ وہ فوری طور پر سیلز مین کی جاب چھوڑ دے اور فراز کے ساتھ اپنے دفتر میں بیٹھ کر اس کا ہاتھ بٹائے۔ منصور اس کے لیے تیار نہیں تھا لیکن اسے ایک عرصہ بعد باپ کی شفقت نصیب ہوئی تھی۔ اس لیے انکار نہ کرسکا۔

اس روز میں دفتر گئی تو فراز کے کمرے میں منصور کو بیٹھا دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اس وقت تک مجھے ان باتوں کا علم نہیں ہوا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی منصور کمرے سے باہر چلا گیا۔ میں نے اپنی حیرانی پر قابو پاتے ہوئے فراز سے کہا۔ "یہ تو منصور ہے خالہ صفیہ کا بیٹا۔ یہ یہاں کیوں آیا ہے؟"

"سائرہ، تم ہمارے لیے بہت بھاگوان ثابت ہوئی ہو۔ اگر میں ڈیڈی اس روز تمہارے گھر رشتہ لے کر نہ جاتے تو صفیہ امی ہمیں کبھی نہ ملتیں۔"

اس کے بعد فراز نے مجھے تمام واقعات تفصیل سے سنائے تو میرا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ دو مہینے بعد میری شادی تھی اور مجھے یہ فکر لاحق ہو رہی تھی کہ ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے منصور کا سامنا کس طرح کر پاؤں گی اور شاید وہ بھی مجھے بھابی کے طور پر قبول نہ کرے۔ یہ ایک بہت ہی مشکل صورت حال تھی اور اس کا کوئی حل میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اور اب تو اس نے دفتر بھی آنا شروع کر دیا تھا۔ یہاں بھی وہ ہر وقت میرے سر پر سوار رہتا۔ ایک ہفتے بعد مس رفعت کی چھٹیاں ختم ہو رہی تھیں اور میں نے سوچ لیا تھا کہ ان کے آتے ہی ملازمت چھوڑ دوں گی۔ اس طرح کم از کم دفتر میں تو منصور کا سامنا کرنے سے بچ جاؤں گی۔

جیسے جیسے شادی کے دن قریب آ رہے تھے میری گھبراہٹ میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا اور میں یہ سوچ سوچ کر ہلکان ہو رہی تھی کہ میں اور منصور کس طرح ایک چھت کے نیچے رہ پائیں گے۔ ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے یہ ممکن نہیں تھا کہ میں اسے مکمل طور پر نظرانداز کردوں یا وہ مجھ سے فاصلے پر رہے۔ حالانکہ میرے دل میں کوئی چور نہیں تھا اگر اس نے خود ہی مجھ سے کوئی امید وابستہ کرلی تو میں کیا کرسکتی تھی۔ کسی کی سوچ پر تو پہرہ نہیں لگایا جا سکتا تھا لیکن وہ مجھ سے شادی کرنے کا خواہش مند تھا اور شاید یہ اس کے لیے اتنا آسان نہ ہو کہ وہ مجھے اپنی بھاوج کے روپ میں قبول کرسکے۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ ایک چھوٹے سے مذاق کی اتنی بڑی قیمت ادا کرنا ہوگی۔

وہ دفتر میں میرا آخری دن تھا۔ میں اپنی چیزیں سمیٹ رہی تھی کہ منصور نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا جو کہ میرے لیے ایک غیر معمولی بات تھی۔ فراز اس وقت کہیں باہر گیا ہوا تھا۔ میں جھجکتی ہوئی اس کے کمرے میں گئی تو اس نے مجھے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور گمبھیر لہجے میں بولا۔ "میں جانتا ہوں کہ ہم دونوں ایک مشکل صورت حال سے گزر رہے ہیں اور تمہارے شادی کے بعد یہ صورت حال مزید پیچیدہ ہو جائے گی۔ میں نے اس بارے میں بہت سوچا اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ مجھے منظر سے ہٹ جانا چاہیے۔ اب تم میرے بھائی کی امانت ہو اور میں تمہارے بارے میں کوئی غلط بات نہیں سوچ سکتا لیکن اس دل کا کیا کروں جہاں آج بھی تمہاری تصویر سجی ہوئی ہے۔ ڈرتا ہوں کہ یہاں رہا تو کسی بھی وقت مجھ سے کوئی ایسی حرکت سرزد ہو جائے گی جس کی وجہ سے میں خود ہی اپنی نظروں میں گر جاؤں گا لہٰذا میں نے فیصلہ کیا ہے کہ تمہاری شادی کے فوراً بعد خلیج کے کسی ملک میں بغرض ملازمت چلا جاؤں۔ میرے جانے کے بعد تم سکون سے زندگی بسر کرسکو گی اور تمہارے ذہن پر کوئی خوف نہیں ہوگا۔ گو کہ مجھے ایک عرصے کے بعد باپ کی شفقت نصیب ہوئی ہے لیکن میرے لیے اس خوشی سے بڑھ کر تمہارا سکون [illegible] ہے۔ [illegible] لیے میں نے بن باس لینے کا فیصلہ کیا ہے۔ شاید امی اور ابو اتنی آسانی سے مجھے باہر جانے کی اجازت نہ دیں لیکن میں انہیں کسی طرح راضی کرلوں گا۔ میری دعا ہے کہ ہمیشہ خوش اور آباد رہو۔ تمہاری خوشی اور سکون کی خاطر یہی قربانی دے سکتا ہوں کہ برسوں بعد ملنے والی خوشی کو ادھورا چھوڑ کر پرائے دیس چلا جاؤں اگر مجھ سے کوئی گستاخی ہوگئی ہو تو معاف کر دینا۔"

یہ کہہ کر وہ خاموش ہوگیا۔ میں چند لمحے دم بخود بیٹھی رہی۔ میرے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ اپنی سیٹ پر آنے کے بعد میں یہی سوچتی رہی کہ کاش میں نے منصور سے وہ مذاق نہ کیا ہوتا لیکن اب پچھتانے سے کیا حاصل۔ اب میں اسی احساس کے ساتھ زندگی بسر کروں گی کہ میری وجہ سے ایک معصوم شخص بن باس لینے پر مجبور ہوگیا۔ کاش ایسا نہ ہوا ہوتا۔

مسائل وطن

محترم و مکرم معراج رسول
السلام علیکم!
عرض یہ ہے کہ نہ میں کہانی کار ہوں اور نہ کہانیاں پڑھنے کا شوقین۔ سرگزشت بھی صرف اس لیے پڑھتا ہوں کہ یہ انفارمیٹو رسالہ ہے۔ معلومات میں اضافہ کرتا ہے۔ اس کے دوسرے حصے میں سچ بیانیاں ہوا کرتی ہیں اسی کے لیے خود اپنا واقعہ ارسال کررہا ہوں۔ میں پاکستان سے کیوں بھاگ کر یہاں آیا وہی کچھ بتا رہا ہوں
فیضان اختر
(دبئی یو اے ای)

عام طور سے گھر یا وطن لوٹ کر آنے والوں کو اس لقب سے نوازا جاتا ہے جب وہ ناکام لوٹ کر آتے ہیں۔ لیکن ہمارے معاملے میں یہ محاورہ الٹ گیا تھا۔ میں نے گاڑی پارکنگ میں اپنی ریزرو جگہ روکی مگر یہاں نہ تو کوئی زنجیر تھی اور نہ ہی کوئی اور چیز جس کی وجہ سے یہ جگہ میرے لیے مخصوص ہوتی۔ یہاں صرف میرے اپارٹمنٹ کا نمبر لکھا ہوا تھا اور کوئی میری جگہ پر گاڑی پارک نہیں کرسکتا تھا ورنہ نہ صرف اسے جرمانہ ہوتا بلکہ اس کی گاڑی کے ساتھ وہیل

لاک بھی لگا دیا جاتا۔ اس لیے میں جب پارکنگ میں داخل ہوتا تو مجھے یقین ہوتا تھا کہ میری پارکنگ خالی ہوگی۔ اے سی کار سے باہر آیا تو کچھ دیر گرمی لگی مگر جب لفٹ میں داخل ہوا تو وہ بھی اے سی تھی۔ لفٹ سے نکلا تو راہداری میں پھر تھوڑی گرمی برداشت کرنی پڑی اور جیسے ہی اپنے گھر میں داخل ہوا تیز خنکی نے میرا استقبال کیا تھا۔ پورا گھر سینٹرلی اے سی تھا۔ بڑے سے لاؤنج میں ایک طرف کشادہ کچن تھا اور دوسری طرف لیونگ ایریا تھا جس میں ٹی وی تھا۔ یہاں ڈائننگ ٹیبل تھی مگر صوفوں کے درمیان قالین پر کھانا کھاتے تھے۔ میرے اپارٹمنٹ میں تین بیڈ روم اور ایک بڑی نشست گاہ تھی۔

دبئی کے ایک اچھے رہائشی علاقے میں واقع اس اپارٹمنٹ کا کرایہ صرف آٹھ ہزار درہم تھا۔ پاکستانی روپے میں یہ رقم دو لاکھ سولہ ہزار بنتی ہے۔ لیکن یہاں میری تنخواہ باون ہزار درہم تھی اور یہ پاکستانی روپے میں چودہ لاکھ بنتی تھی۔ اس لحاظ سے کرایہ مناسب تھا۔ بلز اور دوسرے اخراجات ملا کر مجھے دس ہزار درہم ماہانہ ادا کرنے پڑتے تھے۔ میرے پاس تقریباً پچاس لاکھ روپے مالیت کی لگژری کار تھی۔ اس کے علاوہ ایک وین تھی جو آمنہ کے استعمال میں رہتی تھی۔ یہ بھی لگژری گاڑی تھی۔ میرا بڑا بیٹا ریحان چودہ سال کا ہو رہا تھا اور کچھ عرصے بعد وہ بھی ڈرائیونگ کے قابل ہو جاتا۔ ڈرائیونگ اسے آتی تھی مگر ابھی اس کے پاس لائسنس نہیں تھا اور یہاں بغیر لائسنس کے کوئی گاڑی نہیں چلا سکتا ہے۔ اگر پولیس کو شبہ ہو جائے کہ گاڑی چلانے والا کم عمر ہے تو وہ اسے روک کر لائسنس چیک کرتے ہیں۔

سترہ سال پہلے میں دبئی آیا تو اس وقت یہ اتنا ترقی یافتہ شہر نہیں تھا مگر اس کی اٹھان شروع ہو گئی تھی۔ تعمیراتی کام زور و شور سے جاری تھا۔ میں پیٹرولیم انجینئر تھا اور ڈگری لینے کے مشکل سے ایک سال بعد مجھے یہاں ملازمت مل گئی تھی۔ تنخواہ شروع سے بہت اچھی تھی مگر اس وقت میں نے دیکھے بہت کمائے۔ کام بہت زیادہ ہوتا تھا۔ ایک چھوٹی کمپنی میں گیا تھا تین سال بعد یہاں سے ایک بڑی کمپنی میں چلا گیا۔ پھر کمپنی کی طرف سے ایک سال یورپ میں لگا کر آیا اور اس کے بعد میری زندگی اور ملازمت دونوں سیٹل ہو گئیں۔ چودہ سال سے اسی کمپنی میں تھا۔ آمنہ سے شادی تو دبئی آنے کے ایک سال بعد ہی ہو گئی تھی مگر وہ اس وقت یہاں آئی جب میں نے دوسری کمپنی میں ملازمت کی اور یورپ بھی وہ میرے ساتھ ہی گئی تھی۔ ریحان کراچی میں ہی پیدا ہوا تھا اور میں نے اسے اس وقت دیکھا جب وہ چھ مہینے کا ہو چکا تھا۔ اسی وقت میں نے سوچ لیا تھا کہ اب میں اپنی بیوی بچوں سے زیادہ دیر دور نہیں رہوں گا۔

مگر جب آمنہ میرے پاس آئی تو عدنان بھی ہو چکا تھا۔ اس کے بعد میری دونوں بیٹیاں سارا اور زارا یہیں پیدا ہوئی تھیں۔ آمنہ اور بچوں کے آنے سے پہلے میں ایک کمرے کے اپارٹمنٹ میں رہ رہا تھا۔ ان کے آنے کے بعد میں نے دو کمروں کا اپارٹمنٹ لیا۔ پھر پہلی بیٹی ہوئی تو دو بیڈز کا اپارٹمنٹ لے لیا۔ دس سال پہلے ہم تین بیڈز کے اس اپارٹمنٹ میں اٹھ آئے تھے کیونکہ اب بچے بڑے ہو گئے تھے اور ان کو الگ کمرے چاہیے تھے۔ ایک بیڈ روم میرا اور آمنہ کا تھا۔ دوسرا ریحان اور عدنان کا اور تیسرا سارا اور زارا کا تھا۔ زارا کے بعد ہم نے سوچ لیا کہ اب مزید اولاد کی ضرورت نہیں ہے ماشاءاللہ ہمارا گھر مکمل ہو گیا ہے۔ اگرچہ آمنہ کی مزید بچوں کی خواہش تھی مگر میں نے اسے سمجھایا کہ یہاں اتنے بچے ہی پال لیے تو بڑی بات ہے۔

ان دنوں یہاں بھی مہنگائی ہونا شروع ہو گئی تھی۔ اگرچہ خلیج کی جنگ کے بعد تمام ہی مڈل ایسٹ کے حالات پہلے جیسے نہیں رہے تھے اور ٹیکس فری ہونے کے باوجود یوٹیلٹی بلز میں تواتر سے اضافہ ہوتا گیا۔ پھر مکانوں کے کرائے بڑھنے لگے۔ رہی سہی کسر مہنگائی نے پوری کر دی۔ میں جو پہلے خاصی بچت کر لیا کرتا تھا اب بچت بہت کم ہو گئی تھی۔ مجھے یاد ہے جب میں یہاں آیا تو میری شادی سے پہلے میری چچا زاد بہن کی شادی ہوئی تو اس کا سارا خرچ میں نے اٹھایا تھا۔ حیرت کی بات ہے کہ چچا کماتے پیتے آدمی ہیں اور ان کے دو بیٹے بھی کما رہے تھے۔ مگر چچا زاد بچپن سے میری بہن تھی اور کوئی سگی بہن نہ ہونے کی وجہ سے میں اسے ہی بہن سمجھتا تھا اور میں نے اسی وجہ سے اس کی شادی کا سارا خرچ برداشت کیا تھا۔ میرا ذاتی خاندان محدود ہے یعنی ہم صرف دو ہی بھائی ہیں۔ مگر باقی ننھیال اور ددھیال دونوں طرف سے خاصا بڑا خاندان ہے۔

اس کے بعد بھی کسی کی شادی ہوتی تو میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا۔ بیماری اور دوسری مشکلات میں بھی کبھی پیچھے نہیں رہا تھا۔ خاندان میں جب کسی کو مدد کی ضرورت ہوتی فوراً کال آ جاتی اور میں یہاں سے رقم بھیج دیتا تھا۔ پہلے دو تین سال تک تو میری ساری ہی بچت ان کاموں میں خرچ

ہو جاتی تھی اس وقت ایسا لگتا تھا کہ میں یہاں خاندان
والوں کے لیے کمانے آیا تھا۔ جبکہ مجھے اپنی شادی کے وقت
قرض لینا پڑا تھا۔ پھر شادی کے بعد دوسرے اخراجات
بڑھتے چلے گئے۔ اس لیے مجھے ہاتھ روکنا پڑا تھا اور اس پر
خاندان والوں سے باتیں سننا پڑی تھیں۔ شروع میں، میں
شرمندہ ہوتا تھا مگر پھر آمنہ نے میری کیفیت محسوس کر لی اور
اس نے ایک دن مجھ سے کہا۔ ''فیضان آپ کس خوشی
میں ان لوگوں کی باتوں پر شرمندہ ہوتے ہیں۔ کیا یہ بھوکے
ننگے ہیں جو آپ سے آس لگائے بیٹھے رہتے ہیں۔ سب اپنا
کما کھا رہے ہیں۔ بعض تو ہم سے زیادہ اچھی حیثیت ہیں۔''

''وہ سمجھتے ہیں کہ میں دبئی میں ہوں تو یہاں بہت
زیادہ کما رہا ہوں۔ میں ان کی لامحدود مدد کر سکتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے آپ زیادہ کما رہے ہیں مگر یہ لامحدود
نہیں ہے اور پھر یہاں پاکستان کے مقابلے میں کہیں زیادہ
مہنگائی ہے۔''

میں نے سوچا تو واقعی آمنہ ٹھیک کہہ رہی تھی میرے
خاندان والے غریب نہیں تھے تقریباً سب کھاتے پیتے اور
اپنے گھروں کے مالک تھے۔ بلکہ میرے ایک ماموں کی تو
ڈیفنس میں کوٹھی تھی اور ان کا الیکٹرونکس کا شوروم تھا۔ ان کی
کمائی یقیناً بہت اچھی تھی مگر انہوں نے آج تک خاندان میں
کسی کی ایک روپے سے مدد نہیں کی تھی اور شادی بیاہ میں بھی
بس نارمل لینا دینا رکھا تھا۔ اس کے باوجود انہیں کوئی کچھ نہیں
کہتا تھا کیونکہ وہ ہر وقت اپنی مالی مشکلات کا رونا روتے
رہتے تھے۔ میرے منجھلے چچا ایک ایسے محکمے میں افسر تھے
جہاں اوپر سے آمدنی چھپر پھاڑ کر برستی ہے اور وہ بھی اس
گنگا میں خوب نہاتے تھے۔ گلشن میں دو سو چالیس گز کا اپنا دو
منزلہ مکان تھا۔ دو گاڑیاں تھیں اس کے باوجود انہوں نے
اپنی چھوٹی بیٹی کی شادی پر خاص طور سے مجھے کال کی تھی اور
امید ظاہر کی تھی جیسے میں نے بڑے چچا کی بیٹی کی شادی میں
بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا اسی طرح ان کی بیٹی کی شادی میں بھی
بڑھ چڑھ کر حصہ لوں مگر اس وقت تک میرے حالات پہلے
جیسے نہیں رہے تھے اور مجھے عقل بھی آ گئی تھی اس لیے میں
نے انہیں ٹال دیا۔

''دیکھوں گا چچا جان ابھی تو یہ بھی نہیں معلوم کہ میں
خود بھی شادی میں آ سکوں گا یا نہیں۔ اپنی شادی پر جو قرض لیا
تھا وہ اب تک ادا کر رہا ہوں۔''

چچا اشارہ سمجھ گئے تھے۔ میں نے ہاتھ روکا تو خاندان
والوں کی زبان کھل گئی۔ پہلے تو میں یوں شرمندہ ہوتا تھا جیسے
ان سے قرض لیا ہوا ہے اور چکا نہیں پا رہا ہوں۔ مگر رفتہ رفتہ
مجھے سمجھ آ گئی کہ بھلائی کرنے کا زمانہ نہیں ہے۔ ایک حد سے
بھلائی کرو تو لوگ اسے اپنا حق سمجھ لیتے ہیں اور نہ ملے تو دشمنی
پر اتر آتے ہیں۔ میرے ساتھ بے چاری آمنہ کو بھی رگڑا گیا
کہ اس نے مجھے بہکایا ہے۔ حالانکہ اس نے مجھے لوگوں کی
مدد کرنے سے کبھی نہیں روکا تھا۔ مگر بے وقوف بننے سے
ضرور بچا لیا تھا۔ چند سال بعد میرے چار بچے ہو گئے تو میں
ان کا ہی پورا کرنے لگا۔ دبئی میں اسکولنگ بہت مہنگی ہے۔
جب ریحان اور عدنان نے پڑھا تب اتنی فیس نہیں تھی مگر
جب سارا اور زارا اسکول جانے لگیں تو صرف فیس ہی دو
ڈھائی ہزار درہم ہو گئی تھی۔ دوسرے اخراجات اس کے
علاوہ تھے۔

شروع میں روزمرہ کی چیزوں کے اخراجات کم تھے
کیونکہ فری پورٹ ہونے کی وجہ سے دنیا جہان کی سستی اشیا
یہاں آتی تھیں۔ جو اب بھی آتی ہیں مگر رفتہ رفتہ حکومت
نے کاروبار کے لیے اتنی فیسیں لگا دیں کہ کاروبار کرنا
آسان نہیں رہا۔ نتیجے میں خود بہ خود چیزوں کی قیمتیں بڑھ
گئیں۔ لوگ کماتے تھے مگر اس کا بہت کم حصہ بچا پاتے
تھے۔ اسی طرح نوکری کرنے والے اگر یہاں فیملی کے
ساتھ رہتے تو اپنا خرچ ہی پورا ہوتا تھا اور بچت کا تناسب
پہلے جیسا نہیں رہا تھا۔ اس کے باوجود تمام چیزیں پوری ہوتی
تھیں اور بیوی بچوں کی خواہشات بھی پوری ہو جاتی
تھیں۔ مگر انسان کی فطرت میں ناشکری ہے اور وہ کسی حال
میں مطمئن نہیں ہوتا۔ اسے جو نعمتیں اور سہولتیں میسر ہوتی ہیں
وہ اس کی نظر میں بے وقعت ہو جاتی ہیں اور وہ دوسری
چیزوں کی طرف حسرت سے دیکھتا ہے۔ ایسا ہی ہمارے
ساتھ ہوا تھا۔

مجھ سے چھوٹا ارمان ایم بی اے کے بعد جاب کر رہا
تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ دبئی آ جائے۔ ایک بار اسے
وزٹ ویزا بھیج کر بلایا کہ وہاں جاب تلاش کرے مگر اس کا دل
نہیں لگا اور وہ واپس چلا گیا۔ پھر خوش قسمتی سے اسے ایک ملٹی
نیشنل کمپنی میں اچھی ملازمت مل گئی اور وہ سیٹ ہو
گیا۔ میرے دبئی آنے تک والدہ زندہ تھیں انہوں نے ہی
پہلے میری اور پھر ارمان کی شادی کی۔ اس کی شادی کے دو
سال بعد وہ دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ ارمان کے بیوی بچے
ہوئے تو وہ ان میں مگن ہو گیا۔ میں نے مکان کا نچلا پورشن

مکمل طور پر اس کے حوالے کر دیا اور خود اپنے نیچے اوپر مکمل پورشن بنوالیا اور اسے فرنش کر لیا۔ آمنہ اور بچے سال میں دو بار پاکستان کا چکر لگاتے تھے۔ جب اسکول کی چھٹیاں ہوتیں تو میں انہیں بھیج دیتا تھا۔ خود میں سال میں ایک ہی بار جاتا تھا۔ اور جب آمنہ اور بچے کراچی جاتے تو وہیں رکتے تھے۔ ارمان اور اس کی بیوی ایک حد تک کرتے تھے مگر اپنا کھانا پینا آمنہ خود ہی کرتی تھی۔ اسے کسی پر لیے عرصے کے لیے بوجھ بننا پسند نہیں تھا۔ وہ ارمان سے چیزیں منگوا لیتی تھی اور پھر زیادہ تر باہر سے یا دعوتوں میں کھانا پینا ہوتا تھا۔

ارمان کے بھی چار بچے تھے اور کیونکہ ہم دونوں کی شادی آگے پیچھے ہوئی تھی اس لیے ہمارے بچے بھی تقریباً ہم عمر تھے۔ ارمان کے تین بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ ہمارے بچوں سے ان کی بہت اچھی انڈر اسٹینڈنگ تھی۔ پھر ہمارے بچے اپنے ننھیالی کزنز سے بھی بے تکلف تھے۔ اس لیے وہ چھٹیوں میں کراچی جانے کے لیے بے تاب رہا کرتے تھے۔ خود آمنہ بھی وہاں جانا پسند کرتی تھی۔ اس کا ذاتی خاندان خاصا بڑا تھا وہ پانچ بہنیں اور چار بھائی تھے۔ آپس میں بہت اچھے تعلقات تھے اور آمنہ ان سے ملنے کے لیے بے تاب ہوتی تھی۔ جب وہ اور بچے واپس آتے تو کئی دن تک اداس رہتے اور گفتگو میں بس وہیں کی باتیں ہوتی تھیں۔ سچی بات ہے مجھے خود بھی وہاں کی باتیں اور وہاں جانا اچھا لگتا تھا مگر نوکری کی مجبوری تھی۔ سال میں ایک بار پندرہ دن کے لیے چھٹی ملتی تھی۔ ایمرجنسی میں جانے کی صورت میں یہ چھٹیاں اور بھی کم ہو جاتی تھیں۔ جب سے یہاں آیا تھا سال میں ایک بار یا زیادہ سے زیادہ دو بار پاکستان جانا ہوتا تھا۔

جب بیوی بچے جاتے تو میں دل مار کر رہ جاتا تھا اس وقت سوتا گھر کاٹ کھانے کو دوڑتا تھا۔ میں دن گن گن کر ان کی واپسی کا انتظار کرتا اور یہ لوگ وہاں جا کر مجھے بھول ہی جاتے تھے۔ میں فون کرتا یا اسکائپ پر کال کرتا تو بہ مشکل ہی مجھ سے بات کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ وہاں جا کر وقت اتنا تیز ہو جاتا تھا کہ انہیں پتا ہی نہیں چلتا تھا۔ انہیں تو لگتا تھا کہ ابھی آئے اور اب واپس جا رہے ہیں۔ سارا اور زارا تو راستے بھر روتی آتی تھیں۔ دبئی میں ہمارے جاننے والے تھے اس طرح بچوں کے بھی اسکول اور یہاں ملنے والے پاکستانی یا مسلم گھروں کے دوست اور سہیلیاں تھیں۔ ہم ہفتے میں ایک دو بار لازمی باہر جاتے تھے۔ دوسری تفریحات کی یہاں کوئی کمی نہیں تھی اس کے باوجود بچوں اور آمنہ کا دل بس تھوڑا سا لگتا تھا۔ شاید اس لیے کہ ہمارا وطن تو پاکستان ہی ہے۔ ہمیں جب بھی جانا ہے واپس وہیں جانا ہے۔

کبھی کبھی وہ حسرت سے کہتے کہ کاش ہم بھی پاکستان میں رہتے۔ اگرچہ انہوں نے مجھ سے کبھی نہیں کہا کہ ہم پاکستان جا کر رہیں گے۔ کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ میری یہاں بہت اچھی جاب ہے اور پاکستان میں مجھے ایسی جاب نہیں ملے گی۔ اگر مجھے بھی پاکستان جانے کا خیال آتا تو یہی سوچ کر رہ جاتا کہ وہاں مجھے مشکل سے جاب ملے گی اور اگر مل بھی گئی تو اتنی تنخواہ تو ہرگز نہیں ملے گی۔ میں بیوی بچوں کے بغیر رہ نہیں سکتا تھا ورنہ شاید انہیں بھیج دیتا۔ کیونکہ کئی بار بچوں اور آمنہ نے ڈھکے چھپے انداز میں کہا کہ اگر میں اکیلے رہ سکوں تو وہ لوگ پاکستان شفٹ ہو جائیں مگر میں نے ہمیشہ بہت سختی سے انکار کیا۔ میں نے بچوں سے تو نہیں لیکن آمنہ سے کہا۔ "میں تم لوگوں کے بغیر نہیں رہ سکتا اور وہاں مجھے کوئی اچھی جاب نہیں ملے گی اس لیے وہاں جانے کے بارے میں مت کہنا۔"

"میں بھی سمجھتی ہوں۔" آمنہ نے ٹھنڈی سانس لی۔ "بس کبھی کبھی منہ سے نکل جاتا ہے۔"

مگر گزشتہ چند سالوں میں جب کہ سارے ہی بچے اسکول پڑھ رہے تھے ان کی تعلیم کے اخراجات بہت زیادہ ہو گئے تھے۔ مجموعی طور پر ان کا تعلیمی خرچ کوئی بارہ ہزار درہم ماہانہ بنتا تھا۔ وہ بھی اس صورت میں کہ اسکول میں دفتر جانے سے پہلے ڈراپ کرتا تھا اور آمنہ چھٹی میں ان کو لے کر آتی تھی۔ اگر اسکول وین لگائی جاتی تو فی بچہ پندرہ سو درہم کا خرچ مزید آتا۔ یہاں تک بھی برداشت تھا کیونکہ اللہ کے کرم سے میری تنخواہ اچھی تھی۔ ملٹی نیشنل کمپنی تھی جو سال میں دو بونس الگ سے دیتی تھی اور یہ عام طور سے پوری تنخواہ سے زیادہ ہی ہوتے تھے۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ مہینے کے آخر میں کوئی تنگی ہوئی ہو۔ سارے ہی خرچے پورے ہوتے تھے۔ مگر میں نے کہا نا کہ انسان ناشکرا ہے۔ وہ شکوے کا پہلو تلاش کر ہی لیتا ہے۔ اب بہت زیادہ اخراجات مجھے اور آمنہ دونوں کو ہی کھلنے لگے تھے۔ جب وہ اور بچے سردیوں کی چھٹی سے واپس آتے تو ان کے منہ پر پاکستان میں سستائی کا ذکر ہوتا۔ اس بار آنے پر آمنہ نے مجھ سے کہا۔ "فیضان ہم نے ہمیشہ تو یہاں نہیں رہنا ہے۔"

"ظاہر ہے بے شک یہاں آدمی ساری عمر گزار لے مگر اسے واپس اپنے ملک جانا پڑتا ہے۔"

"تو ہی آپ ساری عمر جاب کریں گے۔ ایک وقت آئے گا جب آپ ریٹائر ہو جائیں گے۔ تب ہماری آمدنی کا ذریعہ کیا ہوگا۔"

"تب بھی کچھ نہ کچھ ہوگا۔ ابھی وہ وقت دور ہے میری عمر اکتالیس برس ہے اور میں کم سے کم مزید انیس سال جاب کر سکتا ہوں اس دوران میں ہمارے سارے ہی بچے پڑھ کر اپنے اپنے گھروں کے ہو جائیں گے۔"

"تب ہمارا کیا ہوگا؟"

آمنہ کی بات نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ واقعی بچوں کا کیریئر بن جائے گا۔ وہ سب اپنے اپنے گھروں کے ہو جائیں گے تب ہمارا کیا ہوگا۔ اب وہ دور نہیں رہا کہ بچے ماں باپ کی دیکھ بھال کریں یا کر دیکھ بھال کریں تو ان کا سارا خرچ بھی خود اٹھائیں۔ میرے پاس کچھ نہ کچھ ہوتا تو چاہیے تھا مگر یہاں یہ حال تھا کہ جمع پونجی معمولی سی تھی۔ میں نے آبائی مکان کا اوپری حصہ بنوا لیا تھا اور ایک اچھی جگہ دو پلاٹ لیے ہوئے تھے۔ بچت بس یہی تھی جو کمایا تھا وہ پہلے خاندان والوں پر لگا دیا اور اب اپنے خاندان پر لگا رہا تھا۔ کیش میں بچت بیس بائیس لاکھ سے زیادہ نہیں تھی۔ جو ہمارے طرز رہائش کے لحاظ سے بہت زیادہ رقم نہیں تھی۔ آمنہ نے مزید کہا۔ "حالات کا کچھ پتا نہیں ہے اگر یہاں حالات میں کوئی تبدیلی آتی ہے اور ہمیں پاکستان جانا پڑتا ہے تو ہمارے ہاتھ میں کیا ہے؟"

اس بات نے تو مجھے دہلا دیا تھا۔ واقعی ہمارے ہاتھ میں تو کچھ نہیں تھا اور اگر پاکستان میں چھ مہینے بھی بیٹھ کر کھانا پڑا تو میری ساری جمع پونجی ختم ہو جائے گی۔ "تم ٹھیک کہہ رہی ہو لیکن ہم کیا کر سکتے ہیں۔"

"لیکن میں نے سوچا ہے اور سارا حساب بھی کیا ہے۔ پاکستان میں ہم ڈھائی لاکھ روپے ماہانہ میں اچھی بلکہ اس سے بھی اچھی زندگی گزار سکتے ہیں۔ اس میں بچوں کی اسکولنگ اور دوسرے تمام اخراجات شامل ہیں۔ گھر ہمارا اپنا ہے۔ وہاں بھی گاڑی ہے دوسری بھی لے سکتے ہیں۔"

میں نے گہری سانس لی۔ "مگر یہ ڈھائی لاکھ روپے وہاں مجھے دے گا کون؟ وہاں انجینئر کو اتنی تنخواہ نہیں ملتی ہے۔"

آمنہ نے مجھ سے نظریں چرائیں۔ "لیکن میں آپ کی نہیں، اپنی اور بچوں کی بات کر رہی ہوں۔ آپ یہیں جاب کریں گے۔"

"میں تم لوگوں کے بغیر نہیں رہ سکتا۔" میں نے فوراً انکار کر دیا۔

"پلیز فیل سمجھنے کی کوشش کریں۔" وہ عاجزی سے بولی۔ "ابھی کا نہیں آنے والے وقت کا حساب کریں۔ ریحان کے اسکول کا یہ آخری سال ہے اور اب وہ کالج جائے گا۔ کالج کی تعلیم کا آپ کو پتا ہے۔ دوگنی سے بھی زیادہ فیسیں لے رہے ہیں کالج والے۔ دو سال بعد عدنان بھی کالج میں آ جائے گا۔ چلیں رو پیٹ کر کالج کی فیسیں بھی دے دیں تو اس کے بعد ان کی پروفیشنل ڈگری کی فیس کہاں سے دیں گے؟"

یہ میں نے سوچا تھا مگر اس طرح نہیں جس طرح آمنہ سوچ رہی تھی۔ پھر بات صرف بچوں کی تعلیم کی نہیں تھی بلکہ ہماری بچت کی بھی تھی۔ یہ تو میں بھی دیکھتا تھا کہ یہاں رہنے والے بہت اچھا کماتے ہوئے بھی اپنے بچوں کو پروفیشنل ڈگری کے لیے پاکستان بھیجتے تھے کیونکہ وہاں پوری ڈگری جتنے میں ختم ہوتی اتنا خرچ یہاں صرف ایک سمسٹر کا تھا۔ جب کہ یہاں کا تعلیمی معیار پاکستان کے مقابلے میں بہت اچھا نہیں تھا کم سے کم پروفیشنل تعلیم اتنی بہتر نہیں تھی۔ میں نے آمنہ کو دیکھا۔ "تمہارا مطلب ہے کہ تم لوگ پاکستان چلے جاؤ اور میں یہاں اکیلا رہوں۔ کم پیسوں میں گزارہ کر لوں اور تم لوگ بھی ظاہر ہے کم خرچ میں رہو گے تو باقی تنخواہ جو ہو گی وہ بچت ہو گی؟"

آمنہ خوش ہو گئی۔ "یہی میں کہہ رہی ہوں۔ ابھی بچے چھوٹے ہیں میرے بغیر نہیں رہ سکتے لیکن چند سال بعد جب یہ بڑے ہو جائیں گے تو میں آپ کے پاس رہنے بھی آ سکوں گی۔"

ریحان سترہ سال کا تھا اور عدنان اس سے ڈیڑھ سال چھوٹا تھا۔ سارا گیارہ سال کی ہونے والی تھی اور زارا ابھی نو سال کی تھی۔ آمنہ ٹھیک کہہ رہی تھی کہ چار پانچ سال بعد بچے اتنے بڑے ہو جاتے کہ آمنہ اگر چند مہینے کے لیے میرے پاس آ کر رہنا چاہتی تو یہ ممکن تھا یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ ہر دو تین مہینے بعد کچھ عرصے کے لیے میرے پاس آ جائے۔ مگر مسئلہ ابھی کا تھا۔ وہ سب چلے جاتے اور میں اکیلا رہ جاتا اور پھر میں سال میں ایک بار پندرہ دن کے لیے ان کے پاس جا سکتا تھا اور سال کے باقی ساڑھے تین سو دن تنہا

رہتا۔ یہ سوچ کر ہی میرا دل حلق میں آ گیا تھا۔ میں نے گھبرا کر آمنہ سے کہا۔ ”تم جو کہہ رہی ہو وہ سب ٹھیک ہے لیکن بڑی بات یہ ہے کہ میں تمہارے اور بچوں کے بغیر نہیں رہ سکتا۔“

”میں کون سا آپ کے بغیر رہ سکتی ہوں۔“ آمنہ روہانسی ہوگئی۔ ”آپ کیا سمجھتے ہیں میں جو کہہ رہی ہوں خوشی خوشی کہہ رہی ہوں۔ کون بیوی ہوگی جو جوانی میں اپنے شوہر سے دور رہنا چاہے۔ میں نے صرف بچوں کے اور اپنے مستقبل کا سوچ کر یہ تجویز دی ہے۔ ڈھائی لاکھ میں ہم گزارہ کر سکتے ہیں اور آپ یہاں ڈیڑھ پونے دو لاکھ میں رہ سکتے ہیں تو ہر مہینے ہماری بچت دس لاکھ ہوگی۔ لیکن چند سال میں جو ہم ایک دوسرے سے دور گزاریں گے ہمیں بہت اچھا صلہ ملے گا اور ہم مستقبل کے لیے بہت کچھ بچا لیں گے۔“

آمنہ ٹھیک کہہ رہی تھی پھر بچے وہاں زیادہ بہتر تعلیم اور تجربہ حاصل کر سکتے تھے۔ جو آگے ان کے کام آتا۔ ریحان بھی پیٹرولیم انجینئر بننا چاہتا تھا اور اس کی تعلیم یہاں بہت زیادہ مہنگی تھی۔ میں جیسے جیسے غور کرتا گیا آمنہ کی تجویز مجھے مناسب ترین لگی تھی۔ مگر مسئلہ وہی تھا کہ میں اکیلے نہیں رہ سکتا تھا۔ میں نے آمنہ سے کہا کہ میں غور کروں گا مگر میں کوئی وعدہ نہیں کرتا۔ اس وقت میں بھول گیا تھا کہ وہ بیوی ہی کیا جو شوہر سے اپنی بات نہ منوا سکے۔ وہ جانتی تھی کہ مجھ سے بات کیسے منوانی ہے۔ ایک بار بات کر کے وہ چپ ہوگئی۔ چند دن بعد اس نے پھر بات کی اور کسی قدر اصرار کیا۔ چند دن بعد پھر یہی مشق دہرائی۔ رفتہ رفتہ اس نے مجھے قائل کر لیا کہ مجھے اس کی تجویز پر عمل کرنا چاہیے۔ اب تک معاملہ میرے اور آمنہ کے درمیان تھا۔ بچوں کو اس کا علم نہیں تھا۔ اس لیے جب انہیں پتا چلا کہ وہ اور آمنہ مستقل پاکستان جا رہے ہیں تو وہ خوشی سے پاگل ہو گئے تھے اور انہوں نے شور شرابا کیا۔ نعرے لگائے تھے۔

میں بچوں کی خوشی میں خوش تھا۔ لیکن کس دل سے راضی ہوا تھا یہ میں ہی جانتا تھا۔ طے پایا کہ جیسے ہی بچوں کے امتحانات ہوں گے اور ان کے رزلٹ ملیں گے۔ آمنہ اور بچے پاکستان روانہ ہو جائیں گے۔ ریحان کا بورڈ کا امتحان تھا اس کا نتیجہ دیر سے آتا لیکن باقی تین بچوں کے رزلٹ ہاتھ کے ہاتھ مل جاتے۔ البتہ امتحان سب کے پاس پاس ہوئے تھے اور تقریباً ایک ساتھ ختم ہو گئے۔ اس دوران میں، میں اور آمنہ تیاری کر رہے تھے۔ میں نے ارمان سے کہہ کر پورا پورشن کلر کرایا۔ جو ضروری مرمتیں تھیں وہ کرائیں۔ کچن میں نیا سامان اور گیزر لگوایا۔ بچے اے سی کے عادی تھے۔ پورا پورشن تو اے سی نہیں ہو سکتا تھا مگر میں نے تینوں بیڈ رومز میں اے سی لگوایا۔ وہاں ایک کورے کار رکھی ہوئی تھی جو ارمان استعمال کرتا تھا اور جب ہم جاتے تو ہم استعمال کرتے تھے۔ اس کی دیکھ بھال ارمان نے اپنے ذمے لی ہوئی تھی۔

کیونکہ پورے سال اسی کے استعمال میں رہتی تھی اور ہم تو بس چند دن استعمال کرتے تھے۔ مگر اسے خریدا میں نے ہی تھا اور یہ میرے نام پر تھی۔ ارمان نے اسے بہت اچھا رکھا ہوا تھا۔ چھ سال پرانا ماڈل ہونے کے باوجود نئی جیسی لگتی تھی۔ مگر میں نے فیصلہ کیا کہ آمنہ اور بچوں کے لیے دوسری کار لوں گا۔ ساتھ ہی ریحان کو بائیک دلوا دوں گا تا کہ اسے کالج آنے جانے میں آسانی رہے۔ اپنے طور پر میں پوری پلاننگ کر رہا تھا کہ بچوں اور آمنہ کو کوئی تکلیف نہ ہو۔ اتفاق کی بات تھی کہ اس سال عید کی چھٹیاں یوں آ رہی تھیں کہ ہمیں بھی ان ہی دنوں پاکستان جانا تھا تو میں نے سالانہ چھٹیاں اس طرح لیں کہ عید کی ملا کر وہ تقریباً ایک مہینے سے زیادہ کی ہوگئی تھیں۔ فیصلے کے بعد ہم نے جانے کی تیاری شروع کر دی۔

ہمارا بھرا پرا اپارٹمنٹ تھا۔ آمنہ نے بہت چاؤ سے اسے سجایا تھا۔ ایک ایک کمرے کا فرنیچر اور سامان وہ اپنی اور بچوں کی پسند کا لائی تھی۔ گھر میں ضرورت کی ہر چیز اعلیٰ ترین تھی۔ شوپیس ایسے تھے کہ آنے والے ہمارے گھر کو میوزیم بتاتے تھے۔ بہترین اور مہنگے پردے اور قالین تھے جو ہر کمرے میں ڈلوائے تھے۔ کام کو آسان کرنے والی مشینریاں تھیں۔ ہماری واشنگ مشین میں صرف کپڑے ڈالنے پڑتے تھے اور وہ پانی، سرف اور خوشبو خود ملاتی تھی اور آخر میں کپڑے سوکھے ہوئے نکلتے تھے۔ ان کو بس استری کر کے استعمال کرنا ہوتا تھا۔ ویکیوم کلینر سے پورا اپارٹمنٹ آدھے گھنٹے میں صاف ہو جاتا تھا ویسے بھی فل اے سی ہونے کی وجہ سے دھول مٹی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ تفریح کے لیے انٹرنیٹ اور ٹی وی کیبل تھا۔ بہت تیز انٹرنیٹ تھا۔ وائی فائی کی مدد سے سب اپنے اپنے ٹیب اور موبائل سے انٹرنیٹ استعمال کرتے تھے۔ میں لیپ ٹاپ استعمال کرتا تھا۔ ڈھائی سو چینل کا ٹی وی کیبل تھا جس میں

ڈی وی ڈی کو اٹی کے ہوتے تو آتے تھے۔ ہمارے پاس دو بڑے ایل ای ڈی ٹی وی تھے۔ ایک چالیس انچ کا جو لاؤنج میں رکھا ہوا تھا جہاں سب ٹی وی دیکھتے تھے اور دوسرا تیس انچ کا میرے بیڈ روم میں تھا۔

آمنہ ان تفریحات کے معاملے میں بچوں پر چیک رکھتی تھی۔ کیونکہ ان کے پاس سب تھا اور اگر چیک نہیں رکھی جاتی تو بچے تو بچے ہوتے ہیں آسانی سے بھٹک جاتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ بچے سیدھے رہتے تھے انہیں معلوم تھا کہ کسی بھی غلطی کی صورت میں نہ صرف انہیں سزا ملے گی بلکہ ان سے سہولت اور تفریح واپس لے لی جائے گی۔ گروسری کی شاپنگ آمنہ کرتی تھی۔ یہاں بہت سہولت تھی۔ آس پاس بے شمار سپر اسٹور تھے آمنہ بچوں کے ساتھ جاتی اور آرام سے شاپنگ کر کے آجاتی تھی۔ یہاں قیمت فکس اور چیز ایک نمبر ہوتی تھی۔ دو نمبر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ دبئی میں دو نمبر اور مضر صحت اشیا بیچنا سخت قابل سزا جرم ہے۔ آدمی کاروبار سے بھی جاتا ہے اور جیل کی ہوا کھاتا ہے۔ جیل سے فارغ ہوتے ہی اسے ہمیشہ کے لیے امارات سے رخصت کر دیا جاتا ہے اور اس کے بعد وہ مڈل ایسٹ کے تمام ممالک میں بین ہو جاتا ہے۔ اس لیے یہاں کاروبار کرنے والے قانون کی سب سے زیادہ پابندی کرتے ہیں۔

ہوم ڈیلیوری کی سہولت بھی ہے۔ اگر کوئی چیز فوری چاہیے ہوتی تھی تو بس ایک کال یا ایس ایم ایس یا پھر ای میل کر کے بھی چیز منگوائی جا سکتی ہے جو گھر پہنچا دی جاتی تھی۔ گروسری کی طرح باہر سے ملنے والے فوڈ آئٹم بھی اعلیٰ معیار کے اور حفظان صحت کے اصولوں کے عین مطابق ہوتے ہیں۔ یہ بھی کال کر کے منگوائے جا سکتے ہیں اور ہفتے میں دو بار سب اپنی اپنی پسند کی چیزیں منگوا کر کھاتے تھے۔ کہنے کا مقصد ہے کہ یہاں زندگی مہنگی اور تیز ہے لیکن کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ لائٹ سال میں ایک دو بار از خود مرمت کے لیے بند کرتے ہیں۔ گیس کا مسئلہ نہیں ہوتا ہے۔ انٹرنیٹ اور ٹی وی کیبل میں ذرا بھی خلل نہیں آتا اور اگر آئے تو کال کرنے پر ایک گھنٹے سے بھی پہلے سب ٹھیک ہو جاتا ہے۔ پانی اور سیوریج کا مسئلہ بھی دیکھا ہی نہیں۔ ایک زمانے میں ہائی ویز پر ٹریفک جام ہوتا تھا خاص طور سے صبح اور شام کے اوقات میں مگر اس وقت بھی کوئی سڑک ٹوٹی پھوٹی نہیں دیکھی تھی۔ اب تو ٹریفک جام کا مسئلہ بھی حل ہو گیا۔ میں دفتر صرف چند منٹ میں آتا اور جاتا تھا۔

میں نے آمنہ اور بچوں سے کہا کہ پاکستان میں انہیں یہ سب تو نہیں ملے گا یا پھر اس معیار کا نہیں ہوگا۔ مگر وہ پھر بھی خوش تھے۔ آمنہ ہونے والی بچت کا سوچ کر خوش تھی اور بچے کزنز اور دوسرے رشتے داروں سے ملنے کا سوچ کر خوش تھے۔ انہیں وہاں کی پر رونق زندگی بھاتی تھی۔ جب وہ جاتے تو روز ہی کسی نہ کسی کے ہاں جانا ہوتا تھا۔ پھر پکنک کے پروگرام بنتے اور لڑکے میدانوں میں جا کر کھیلتے تھے انہیں یہاں یہ موقع نہیں ملتا تھا۔ یہاں کھیل کے میدان تھے مگر یہاں کرکٹ نہیں ہوتی ہے اور دونوں برخورداروں کی اصل دلچسپی کرکٹ سے تھی۔ یہاں فٹ بال سب سے مقبول ہے اور انہیں اس کھیل سے چڑ تھی۔ ہاتی آؤٹ ڈور کھیلوں سے بھی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ سوچ کر پرجوش ہو رہے تھے کہ وہاں انہیں دل کھول کر اپنی پسند کی سرگرمیوں کا موقع ملے گا۔ میں نے ریحان اور عدنان کو خبردار کیا۔ ”آپ وہاں کھیلنے اور تفریح کرنے نہیں جا رہے ہیں بلکہ اصل مقصد وہاں پڑھنا ہے۔“

”پاپا آپ بے فکر رہیں۔“ ریحان نے کہا۔ ”آپ کو کبھی شرمندگی نہیں ہوگی۔“

عدنان سی اے کرنا چاہتا تھا اور اس نے بھی یقین دلایا کہ وہ پوری دلجمعی سے پڑھے گا۔ پڑھنے میں ماشاءاللہ سارے بچے تیز تھے اور ہر سال اپنی کلاس میں کوئی نہ کوئی پوزیشن حاصل کرتے تھے۔ خاص طور سے عدنان ہمیشہ فرسٹ آتا تھا اب وہ نائن کلاس میں جاتا۔ جیسے ہی بچوں کے رزلٹ ہاتھ میں آئے۔ ہم نے پیکنگ کر لی۔ سامان میں سے کچھ نہیں لے جا سکتے تھے۔ سب یہیں رہ جاتا جسے میں بعد میں ٹھکانے لگاتا کیونکہ واپس آ کر مجھے بھی کوئی چھوٹی جگہ دیکھنی تھی۔ ابھی یہ اپارٹمنٹ دو مہینے اور ہمارے پاس تھا کیونکہ اس کا سالانہ کرایہ ادا کیا ہوا تھا اگر میں واپس آ کر فوراً بھی چھوڑتا تو مجھے ایک مہینے کا کرایہ واپس ملتا مگر مجھے دوسری جگہ تلاش کرنی تھی اور سامان بھی فروخت کرنا تھا اس کے لیے وقت درکار تھا۔ میں نے سوچا کہ مدت پوری کر کے ہی جاؤں گا۔

جانے کے خیال سے آمنہ اور بچے خوش تھے مگر جب جانے کا وقت آیا تو سب ہی اداس ہو گئے۔ سب کو خیال آیا کہ وہ کتنے عرصے سے یہاں رہ رہے تھے۔ یہ اپارٹمنٹ دس سال سے ہمارے پاس تھا اور اس کے مالک سے گھر والے

تعلقات ہو گئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے نہ تو ہم سے خالی کرایا تھا اور نہ ہی کرایہ بہت زیادہ بڑھایا تھا۔ ورنہ اس عمارت میں اتنے بڑے اپارٹمنٹ کا کرایہ دس گیارہ ہزار درہم تھا۔ بچے اپنی چیزوں، دوستوں اور اسکول چھوٹنے پر اداس تھے۔ آمنہ اپنا بھرا پرا گھر چھوڑ کر جاتے ہوئے رو رہی تھی جسے اس نے بہت محنت اور توجہ سے سجایا تھا۔ میرا یہ سوچ کر دل بیٹھا جا رہا تھا کہ جب میں ایک مہینے بعد واپس آؤں گا تو اکیلا کسی ایک کمرے کے اپارٹمنٹ میں رہوں گا۔ صبح سے شام تک دفتر کی رونق تو برقرار رہے گی مگر جب شام کو گھر آؤں گا تو اگلی صبح تک میرے پاس کوئی بھی نہیں ہوگا۔

ان ہی احساسات کے ساتھ ہم پاکستان روانہ ہوئے۔ طیارے نے دو گھنٹے سے بھی پہلے ہمیں کراچی پہنچا دیا تھا مگر اس سے زیادہ وقت دبئی اور کراچی ائرپورٹ پر امیگریشن اور کسٹم میں لگا تھا۔ خاص طور سے کراچی میں تو ایسا لگ رہا تھا کہ ہم کوئی مجرم یا سمگلر ہیں اس طرح سے ہمارے کاغذات اور سامان کی جانچ پڑتال کی گئی۔ بہت سا سامان جو ہمارا ذاتی تھا اسے پرسنل بیگیج کے تحت منگوانا پڑا تھا ورنہ کسٹم والے اس پر ڈیوٹی لگانے پر مصر تھے۔ بہ مشکل ائرپورٹ سے نکلے۔ شکر ہے ارمان ہمیں لینے آیا تھا وہ اپنے ایک دوست کو گاڑی سمیت لے آیا تھا یوں ہم اور ہمارا سامان گھر تک پہنچا۔ ارمان کی بیوی حنا نے ہم سے کہا تھا کہ تین دن تک وہ کھانا بنا کر دے گی اور ہم اس کی فکر نہ کریں۔ اس پر آمنہ نے سکون کا سانس لیا تھا کہ اسے آتے ہی ہانڈی چولہا نہیں کرنا پڑا تھا۔ مگر جب ہم پہنچے تو لائٹ نہیں جنریٹر چل رہا تھا مگر وہ صرف پنکھے اور انرجی سیور ہی چلا سکتا تھا۔ بہر حال یہ بھی غنیمت تھا۔ طویل سفر سے زیادہ ائرپورٹ کے طویل مراحل نے سب کو تھکا دیا تھا اس لیے کھانا کھاتے سب ہی سو گئے۔ خوش قسمتی سے اس روز موسم اچھا تھا اس لیے اے سی کی کمی زیادہ محسوس نہیں ہوئی۔ پہلے دن ہم نے سفر کی وجہ سے روزہ نہیں رکھا تھا۔ مگر اگلے دن کا روزہ رکھنا تھا۔ اگرچہ سحری حنا نے بنانی تھی مگر آمنہ جلد اٹھ گئی اور اس نے مجھے بھی اٹھایا۔

"فیضی اٹھیں۔"

"کیا وقت ہوا ہے؟" میں نے آنکھیں ملتے ہوئے کہا۔

"سحری بند ہونے میں ایک گھنٹا ہے مگر چولہوں میں گیس تو آ ہی نہیں رہی۔"

"شاید مین سے بند ہے میں دیکھتا ہوں۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا اور نیچے آیا مگر میٹر کا وال کھلا ہوا تھا۔ میرے ذہن میں تھا کہ خالی گھر کی وجہ سے ارمان یا کسی نے احتیاطاً وال بند کر دیا ہوگا کہ کوئی حادثہ نہ ہو۔ مگر یہاں تو وال کھلا ہوا تھا۔ میں اوپر آیا کہ کہیں اوپر کوئی وال نہ بند ہو مگر اوپر ایسا کوئی وال تھا ہی نہیں۔ میں نے آمنہ کو بتایا۔ "ابھی تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے ارمان سے پوچھتا ہوں۔"

"اس سے پہلے ہم جتنی بار آئے کبھی گیس بند نہیں ملی۔" آمنہ بولی۔ "آپ جانتے ہیں صبح مجھے سحری سے پہلے چائے نہ ملے تو میرے سر میں درد ہونے لگتا ہے۔"

"اب میں کیا کر سکتا ہوں اگر کل دیکھ لیتیں تو شاید اسی وقت ٹھیک بھی کر دیتا۔" میں نے واش روم جاتے ہوئے کہا۔ "بچوں کو اٹھا دو۔"

میں واش روم سے آیا تو بچے اٹھ گئے تھے اور آمنہ لاؤنج میں بیٹھی چائے پی رہی تھی۔ میں خوش ہو گیا۔

"گیس آ گئی؟"

"جی نہیں۔" اس نے برا سا منہ بنا کر کہا۔ "گیس سرے سے غائب ہے۔ وال سارے کھلے ہوئے تھے۔ جب گیس ہی نہیں ہوگی تو آئے گی کہاں سے؟"

میں حیران ہوا۔ "یہ تو سنا تھا کہ گیس کا بحران ہوا ہے مگر گھروں میں بھی گیس نہیں آ رہی اس کا علم نہیں تھا۔ وہ بھی رمضان میں عین سحری کے وقت۔"

"حنا بتا رہی ہے کہ یہاں ہفتے میں دو تین دن ایسا ہی ہوتا ہے گیس غائب ہو جاتی ہے۔ بعض اوقات سارا دن نہیں ہوتی صبح سے لے کر رات تک۔ اس بے چاری نے کل ہمارے لیے کھانا گیس سلنڈر پر بنایا تھا اور روٹیاں تندور سے منگوائی تھیں۔ چائے بھی اسی نے گیس سلنڈر پر بنا کر دی ہے۔"

میں فکر مند ہو گیا۔ "یہ تو بڑا مسئلہ ہے تم لوگ گیس کے بغیر کیسے رہو گے۔"

"ہم بھی گیس سلنڈر لے لیتے ہیں۔" آمنہ نے تجویز دی۔

"نہیں بھئی میں نے سنا ہے یہ رسکی ہوتے ہیں اور بعض اوقات پھٹ جاتے ہیں۔" میں نے انکار کیا۔ "میں اپنے گھر میں اتنی خطرناک چیز نہیں رکھ سکتا۔"

"حنا اور ارمان بھی تو رکھے ہوئے ہیں اور میں نے بھی حنا سے یہی کہا تھا تو اس نے بتایا کہ جو پھٹتے ہیں وہ ناقص

سلینڈر ہوتے ہیں ارمان بہت اچھی کوالٹی کا سلینڈر لایا ہے۔ ایک بار بھروا لیتا ہے تو مہینے بھر آرام سے چلتا ہے۔"

"اچھا دیکھیں یہ بتاؤ کہ سحری کا کیا ہوگا؟"

"کچھ نہیں، حنا کہہ رہی تھی کہ ارمان جا کر باہر سے لائے گا۔ میں نے اسے بتا دیا ہے کہ ہم کیا کیا کھاتے ہیں وہ اسی لحاظ سے لے آئے گا۔"

ارمان سحری لینے گیا۔ بچے اٹھ گئے تھے۔ زارا منہ بسورتے ہوئے آئی۔ "پاپا اے سی کب چلے گا؟"

میں چونکا۔ "رات کو چلایا نہیں تھا؟"

"لائٹ کہاں تھی؟" آمنہ بولی۔ "اس وقت بھی نہیں ہے۔ گیس بھی نہیں ہے بے چارے ارمان نے ہماری وجہ سے پیٹرول پر جنریٹر چلایا ہوا ہے۔"

"کیا مطلب ابھی تک لائٹ آئی ہی نہیں ہے؟"

"ارمان نے معلوم کیا تھا کوئی بڑا فالٹ ہو گیا ہے اس وجہ سے آدھے شہر کی بجلی غائب ہے۔"

حنا اور بچے اوپر آ گئے تھے کہ سحری ساتھ ہی کرتے۔ مگر ابھی تک ارمان نہیں آیا تھا۔ حنا نے کہا۔ "یہ آئے دن کا معمول ہے مہینے میں ایک دو بار ایسے بریک ڈاؤن ہوتے ہیں اور بعض اوقات چھ میں گھنٹے بجلی نہیں آتی۔ گیس نے الگ تنگ کر رکھا ہے۔"

میں فکر مند ہو گیا یہ تو سر منڈاتے ہی اولے پڑنے والی بات تھی۔ اے سی کے بغیر رات گزار کر بچوں کے منہ بھی اترے ہوئے تھے۔ مگر پھر وہ گزرنز میں بہل گئے۔ ارمان سحری لے کر آیا تو کم وقت رہ گیا تھا۔ اس نے بتایا کہ گیس کی وجہ سے ہوٹلوں پر بہت لمبی قطار ہے۔ اس لیے اسے بھی دیر ہوئی۔ سب نے جلدی جلدی سحری کی۔ ہم مرد اور لڑکے نماز پڑھنے چلے گئے۔ جب کہ خواتین اور بچیاں گھر میں پڑھنے میں لگ گئیں۔ پھر سب ہی سو گئے۔ دوپہر تک اٹھے خواتین نے اپنا الگ ڈیرہ جما لیا تھا۔ میں اور ارمان لاؤنج میں بیٹھے تھے۔ اچانک ارمان نے کہا۔ "فیضان بھائی آپ بھابی اور بچوں کو کہاں لے آئے ہیں۔ انہیں یہاں بہت مشکل ہو گی۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے لیکن یار یہ خود ضد کر کے آئے ہیں۔ دوسرے ہمیں بچت بھی کرنی ہے اور وہاں انسان اچھے طریقے سے رہ کر بچت نہیں کر سکتا ہے۔"

"یہ بھی ٹھیک ہے اس کے باوجود یہاں ایڈجسٹ کرنا بہت مشکل ہے۔ یہاں تو جو سہولت آج سے تیس سال پہلے تھی اب وہ بھی نہیں رہی ہے۔ پانی، بجلی، گیس سب غائب ہے۔ باہر نکلیں تو سی این جی کی لائنیں لگی ہوتی ہیں۔"

"میں سب جانتا ہوں یار یہاں سے دور ہوں مگر بے خبر نہیں ہوں۔ بات وہی ہے ہمیں یار تو بچت کرنی ہے آنے والے کل کے لیے یا پھر سہولتیں دیکھتی ہیں۔ وہاں زندگی بہت مہنگی ہو گئی ہے۔ پہلے جو بچت ہو جاتی تھی اب وہ ممکن نہیں ہے۔"

"تب اچھی بات ہے کہ آپ اور بھابی سوچ سمجھ کر آئے ہیں اب انہیں دھچکا نہیں لگے گا۔"

"گیس کا مسئلہ کب سے ہے؟"

"پہلے نہیں تھا مگر اب اس علاقے میں بھی ہونے لگا ہے۔ لوڈ شیڈنگ سردیوں میں ختم ہو جاتی ہے مگر گرمیوں میں ہوتی ہے اور بریک ڈاؤن بھی ہوتے ہیں۔ اب بھی شاید شام تک لائٹ آئے۔ میں سوچ رہا ہوں جنریٹر بند کر دوں تاکہ اسے آرام مل جائے دوپہر میں چلائیں گے تب گرمی زیادہ ہو جاتی ہے۔"

یہ اچھا والا جنریٹر تھا مگر یہ بھی ایک وقت میں چھ گھنٹے سے زیادہ نہیں چل سکتا تھا اس کا انجن گرم ہو جاتا تھا۔ جنریٹر بند ہوا اور پھر پنکھے بھی بند ہوئے تب ہمیں پتا چلا کہ یہاں بھی گرمی ہے اور ذرا سی دیر میں پسینے پسینے ہو گئے تھے۔ میں اٹھ کر نہایا تھا اور کچھ ہی دیر میں میرا نہانا دھونا سب برابر ہو گیا تھا۔ دبئی میں چوبیس گھنٹے اے سی میں رہتے تھے وہاں نہ تو پسینا آتا تھا اور نہ ہی جسم و کپڑوں سے بو آتی تھی۔ صبح کے وقت عادتاً غسل کر لیتا تھا ورنہ دو دن بھی نہ غسل کرو تو پتا نہیں چلتا تھا۔ پہلی بار مجھے یہ سوچ کر اچھا لگا کہ میں واپس جاؤں گا۔ وہاں کم سے کم لائٹ کا مسئلہ نہیں ہوگا۔ پانی اور گیس ہر وقت میسر ہوگی۔ وہاں سی این جی کا مسئلہ بھی نہیں تھا۔ پیٹرول نہایت سستا تھا۔ پھر مجھے آمنہ اور بچوں کا خیال آیا کہ وہ یہاں کیسے گزارہ کریں گے۔ آمنہ بھی یہی سوچ رہی تھی۔ وہ نیچے حنا کے ساتھ تھی اور ابھی سے افطاری کی تیاری کر رہے تھے۔ کچھ دیر بعد وہ نیچے سے پسینا پونچھتی اوپر آئی اور بولی۔

"میرے خدا گرمی سے برا حال ہے۔"

"حالانکہ گرمی وہ ہوتی ہے جو دبئی میں ہو رہی ہے یہ تو اس کے مقابلے میں خوشگوار موسم ہے مگر وہاں اس گرمی کا پتا نہیں چلتا ہے۔"

"سچ کہہ رہے ہیں وہاں پچاس درجے میں بھی پتا

نہیں چلتا ہے اور یہاں اُف حبس میں دم نکل رہا ہے۔"

"کیونکہ وہاں اے سی ہوتا ہے اور یہاں پنکھا بھی نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "تم دیکھ رہی ہو کہ کتنی مشکلات ہیں کیا تم اور بچے رہ لو گے؟"

"اس کی آپ فکر نہ کریں بہرحال یہ ہمارا ملک ہے اور ہمیں یہیں رہنا ہے، چاہے حالات کیسے ہی کیوں نہ ہوں۔" وہ حوصلے سے بولی۔ "ہمارے بچوں کا مستقبل بھی یہیں ہے۔"

"میں تمہارا حوصلہ نہیں توڑ رہا۔ مگر یہاں حالات اچھے نظر نہیں آ رہے ہیں۔"

"آپ فکر نہ کریں ہم ایڈجسٹ کرلیں گے۔" آمنہ نے کہا۔ "آپ بھی بچوں کو حوصلہ دیں۔ ابھی وہ بہت خوش ہیں۔"

ان کی خوشی کی وجہ واضح تھی ابھی وہ ایک طرح سے چھٹی اور پکنک پر تھے اور پکنک پر انسان مشکل میں بھی خوش رہتا ہے۔ پکنک اسی کا نام ہے کہ انسان معمول کی آسائشوں اور آسانیوں سے ہٹ کر کچھ وقت گزارے۔ مگر جب انہیں باقاعدہ معمول کی زندگی گزارنی پڑتی تو یہی چیزیں جس کی انہیں پروا نہیں تھی وہ ان کے لیے بہت اہم ہو جاتیں۔ میں دیکھ رہا تھا کہ لڑکے روزے میں بھی ذرا شام ہوتے ہی کھیلنے نکل گئے تھے اسی طرح بچیاں بغیر لائٹ کے آپس میں مگن تھیں۔ آمنہ بھی گرمی کی شکایت کر رہی تھی مگر خوش وہ بھی بہت تھی۔ وہ اور حنا پروگرام بنا رہی تھیں کہ انہیں کہاں کہاں جانا ہے۔ مگر ابھی تین دن تو آرام ہی کرنا تھا۔ شام تک لڑکے کھیل کر آئے تو بہت خوش تھے۔ البتہ لائٹ کا سن کر ان کا موڈ آف ہو گیا تھا کہ نہ تو لائٹ ہے اور نہ ہی ابھی جنریٹر چل رہا ہے۔ روزے کے بعد جنریٹر چلا اور پنکھے چلے تو سب کی جان میں جان آئی تھی پھر لائٹ شام تک آئی اور گرمی کی شدت بھی کم ہوئی تو سب کے موڈ خود بہ خود خوشگوار ہو گئے تھے۔ حنا نے افطاری چھت پر لگائی تھی اور اس نے خاصا اہتمام کر لیا تھا۔ افطاری کے بعد آمنہ کا اچانک شاپنگ کا موڈ ہو گیا اور اس نے مجھ سے کہا۔ "طارق روڈ چلتے ہیں میں اپنے اور بچوں کے لیے کچھ کپڑے لینا چاہتی ہوں۔"

"ابھی تو آنے سے پہلے تم نے ڈھیروں کپڑے لیے ہیں۔"

"وہ تو وہاں سے لیے تھے کچھ یہاں سے لے لوں تو کیا ہے وہاں کے مقابلے میں تو بہت سستے پڑیں گے۔"

"تب یہیں سے آ کر لے لیتیں۔" میں نے کہا۔ بچوں نے ساتھ چلنے سے انکار کر دیا اور حنا کو اب رات کا کچن دیکھنا تھا اس لیے وہ بھی نہیں گئی۔ میں اور آمنہ نکلے۔ ہمارا آبائی مکان گلشن اقبال میں ہے۔ یہ اچھا خاصا پوش اور صاف ستھرا علاقہ تھا۔ مگر اب اس کا حال دیکھ کر لگ ہی نہیں رہا تھا کہ یہ گلشن کا پوش علاقہ ہے۔ سڑکیں ٹوٹ رہی تھیں اور جگہ جگہ سیوریج کے پانی سے گندے تالاب بنے ہوئے تھے۔ اکثر مقامات پر یہ تالاب اتنے بڑے تھے کہ گاڑیاں تو چھوڑیں پیدل افراد بھی ان سے بچ کر نہیں گزر سکتے تھے۔ آمنہ بھی حیران تھی۔ اس نے کہا۔

"یہ کیا ہے؟"

"حکومت اور اس سے زیادہ لوگوں کی بے حسی۔ یہ محلے کا مسئلہ ہے سب مل کر صفائی کرنے والے بلوائیں اور مہینے میں نہ سہی مہینے میں ایک بار یہاں لائنیں صاف کروائیں تو مسئلہ کبھی نہ ہو مگر آدمی بس اپنے گھر تک کی صفائی رکھتا ہے اس سے باہر اس کی بلا سے گٹر ابل رہے ہوں یا کچرے کے ڈھیر پڑے ہوں۔" میں نے کہا۔ "چند سال پہلے یہ ساری نئی سڑکیں بنی تھیں اور اب ان کا حشر دیکھو۔"

مرکزی شاہراہوں پر گٹر تو نہیں ابل رہے تھے کیونکہ ان کے نیچے سرے سے سیوریج لائنیں ہوتی ہی نہیں ہیں۔ مگر جگہ جگہ سے ٹوٹی سڑکیں ٹریفک کی روانی میں خلل ڈال رہی تھیں۔ اوپر سے ٹریفک اتنا شتر بے مہار ہو رہا تھا کہ بیان سے باہر ہے۔ میں نے کراچی کے جو آخری دو چکر لگائے تھے اس میں مجھے ایک عجیب الخلقت سواری نظر آئی جو بہ ظاہر موٹر سائیکل اور رکشے کی ناجائز اولاد لگ رہی تھی۔ اسے یہاں چنگ چی کہتے ہیں۔ پہلے یہ کم تھیں مگر اب ان کی بھرمار ہو گئی تھی۔ ہر دوسری گاڑی چنگ چی تھی اور حیرت کی بات ہے بارہ تیرہ سال کے لڑکے بھی اسے چلا رہے تھے۔ وہ ٹریفک قوانین تو چھوڑیں عام حفاظتی اصولوں کو بھی بالائے طاق رکھ کر یہ سواری چلا رہے تھے اور نہ صرف ٹریفک کی روانی میں رکاوٹ بنے ہوئے تھے بلکہ اپنی اور سواریوں کی زندگی بھی خطرے میں ڈال رہے تھے۔ کئی بار وہ میری گاڑی کے سامنے آئے اور میں نے بہ مشکل تصادم سے بچایا۔ آمنہ کی چیخ نکل جاتی تھی۔ اب کہیں چنگ چی نظر آتا تو وہ پہلے ہی مجھے خبردار کرنے لگتی تھی۔

رمضان کا دوسرا عشرہ شروع ہو گیا تھا اور لگ رہا تھا کہ پورا شہر شاپنگ کرنے نکلا ہے۔ بہ مشکل ہم طارق روڈ پہنچے تو

وہاں پارکنگ نہیں مل رہی تھی۔ آدھے گھنٹے تک گھومنے اور فاروق روڈ کا پورا چکر لگانے کے بعد ہمیں دو گلی پیچھے بہ مشکل ایک جگہ پارکنگ ملی۔ یہاں گاڑیاں بمپر سے بمپر ملا کر کھڑی کر دی گئی تھیں اور کسی نے یہ سوچنے کی زحمت بھی نہیں کی تھی کہ اب گاڑی نکلے گی کیسے؟ میں نے ایسے گاڑی کھڑی کی کہ کوئی دوسری گاڑی اسے بلاک نہیں کر سکتی تھی۔ تقریباً نصف کلومیٹر چل کر ہم مرکزی سڑک پر آئے اور یہاں سے شاپنگ سینٹروں کی خاک چھاننا شروع کی۔ ہر خاتون کی طرح آمنہ کی بھی عادت تھی کہ وہ ایک چیز کے لیے دس دکانوں کے چکر لگاتی تھی اور مجھے بھی اس کا ساتھ دینا پڑتا تھا مگر یہاں میرے لیے یہ ممکن نہیں تھا کیونکہ یہاں اصل خریدار ایک تھا اور باقی تماش بین یا ونڈو شاپنگ کرنے والے تھے۔ ان کی وجہ سے رش کا ایسا تاثر ابھر رہا تھا کہ مجھے اندر جانے کے خیال سے گھبراہٹ ہونے لگی۔ میں نے آمنہ سے کہا۔ ”تم چلی جاؤ میں باہر ہی انتظار کروں گا۔“

”ان سب میں شمار ہوں گے۔“ آمنہ نے وہاں موجود بہت سے اکیلے لڑکوں اور مردوں کی طرف اشارہ کیا جو آتی جاتی خواتین اور لڑکیوں کو تاڑ رہے تھے اور جو ذرا ماڈرن حلیے میں تھیں ان کا تو پیچھا بھی کیا جا رہا تھا۔ شکر ہے آمنہ حجاب اور نقاب میں تھی۔ آمنہ کی بات نے مجھے مجبور کر دیا تھا کہ میں اس کے ساتھ ہی رہوں۔ ابھی ہم پہلے شاپنگ سینٹر میں گھسے تھے کہ لائٹ چلی گئی اور دکانوں کے جنریٹرز اسٹارٹ ہو گئے۔ کچھ ہی دیر میں گرمی اور دھوئیں سے دم گھٹنے لگا تھا۔ دکانوں کے اندر تو سکون تھا کیونکہ وہ مکمل اے سی تھے مگر باہر راہداریوں میں برا حال تھا۔ بہ مشکل میں نے آمنہ کو وہاں سے نکلنے پر راضی کیا۔ دوسرے شاپنگ سینٹر میں آئے تو وہاں بھی یہی حال تھا۔ خود آمنہ بھی پریشان تھی۔ اس نے بس چند ایک چیزیں لیں اور ہم وہاں سے نکل آئے۔ پیاس لگ رہی تھی، ہم نے ایک کولڈ ڈرنک سپاٹ سے کولڈ ڈرنک لے کر پی اور آمنہ نے کہا۔

”میرے خدا یہاں تو شاپنگ کرنا عذاب ہے۔“

”تم پہلے بھی تو کرتی رہی ہو۔“

”اصل میں حنا اور دوسروں کے ساتھ آئی ہوں اور ہم رکشے یا ٹیکسی میں آتے ہیں۔ پھر صبح یا دوپہر میں چکر لگاتے ہیں اس وقت یہاں اتنا رش نہیں ہوتا ہے۔ پھر پہلے اتنا برا حال بھی نہیں تھا۔ شاید عید کی وجہ سے اتنا رش ہے۔ میں تو سوچ رہی ہوں کہ اب کلفٹن سے شاپنگ کر لیا کروں گی۔“

”اس کا حال کون سا اچھا ہوگا وہ بھی تو اسی شہر کا حصہ ہے۔“ میں نے کہا اور ہم اس جگہ پہنچے جہاں کار کھڑی کی تھی تو تین گلی کے درمیان میں دو گاڑیاں میری گاڑی کے پیچھے یوں کھڑی تھیں کہ دونوں کو ہٹائے بغیر میری گاڑی نکل ہی نہیں سکتی تھی۔ میں نے سر پر ہاتھ مارا۔ ”بس اسی کی کسر رہ گئی تھی۔“

آمنہ بھی پریشان ہو گئی۔ ”اب کیا کریں؟“

میں نے آس پاس والوں سے معلوم کیا مگر کسی کو علم نہیں تھا کہ یوں گاڑی کھڑی کرنے والے کون تھے اور وہ کہاں گئے تھے اگر وہ یہاں کے رہائشی تھے تو کل تک گاڑی پھنسی ہی رہتی۔ آدھے گھنٹے انتظار کے بعد میں نے ایک ٹیکسی لی اور گھر روانہ ہو گیا۔ بلاوجہ انتظار کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ نو بجے میں موٹر سائیکل پر ارمان کے ساتھ آیا اور ہم گلیوں سے ہوتے ہوئے آئے کیونکہ ان دنوں کسی وجہ سے ڈبل سواری پر پابندی تھی۔ شکر ہے جب ہم وہاں پہنچے تو دونوں گاڑیاں ہٹ چکی تھیں اور میں اپنی گاڑی نکال سکتا تھا۔ گھر پہنچے تو لائٹ پھر غائب تھی اور جنریٹر چل رہا تھا۔ آمنہ نے بتایا کہ زارا روتے روتے سوئی ہے کیا سے اے سی کی عادت تھی۔ میں نے اسے دیکھا تو اس کے رخساروں پر آنسوؤں کے نشانات تھے۔ شکر ہے کچھ دیر بعد لائٹ آ گئی اور ہم نے اے سی چلائے تھے۔ مگر صرف ہم ہی نہیں اوروں نے بھی چلائے تھے اور اکثر نے کنڈے پر لگائے ہوئے تھے اس لیے کچھ دیر بعد ٹرپنگ ہوئی اور لائٹ چلی گئی۔

صبح سحری تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ جب لائٹ جاتی تو جنریٹر آٹو چیک آن ہو جاتا تھا۔ مگر اے سی بند ہو جاتا۔ سحری کر کے سب سوئے تو پھر دیر سے اٹھے تھے۔ اتفاق سے اس رات گرمی بھی زیادہ تھی اور حبس ہو رہا تھا۔ صبح اٹھے تو سب کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں کیونکہ کسی کی نیند ٹھیک سے پوری نہیں ہوئی تھی۔ زارا اپنی پشت کھجا رہی تھی۔ آمنہ نے اسے کمرے میں لے جا کر دیکھا تو اس کی پشت گرمی دانوں سے بھر گئی تھی۔ وہ گرمی سے حساس تھی۔ آمنہ نے مجھے اطلاع دی۔ ”اسے ڈاکٹر کو دکھانا ہوگا بہ ظاہر تو گرمی دانے لگ رہے ہیں مگر الرجی نہ ہو۔“

مجھے بھی اپنے گردے میں کچھ دباؤ محسوس ہو رہا تھا۔ کچھ عرصے پہلے مجھے گردوں میں مسئلہ ہوا تھا۔ مہینے میں ایک بار مجھے سائٹ اور دیگر سنٹرز جانا پڑتا تھا اور وہاں بہت زیادہ

گرمی ہوتی ہے اس کا اثر گردوں پر پڑا تھا۔ اگرچہ پتھری کا چکر نہیں تھا مگر انفیکشن ہو گیا تھا اور ڈاکٹر نے مجھے دواؤں کا کورس کرایا تھا۔ اس کے بعد میں سیٹ ہو گیا تھا مگر اب پھر مجھے ویسا ہی درد محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے مناسب سمجھا کہ ڈاکٹر کو دکھا دوں۔ ارمان نے ایک اچھے اسپتال کا بتایا جہاں ڈاکٹرز اور سہولیات اچھی تھیں اور فیس بھی مناسب تھی وہ کھال نہیں اتارتے تھے۔ میں اور آمنہ زارا کو لے کر اس اسپتال پہنچے تو وہاں باہر سے ایسا رش تھا کہ بیان سے باہر تھا۔ میں نے ریسپشن پر اپنا اور زارا کا مسئلہ بتا کر ڈاکٹر سے ملنے کو کہا تو وہاں موجود شخص نے بتایا کہ زارا کے لیے جلد کا ماہر تو آج شام سات بجے تک دستیاب ہو گا لیکن جہاں تک گردوں کے ڈاکٹر کا تعلق تھا تو اس کا اپائنٹ منٹ تین دن بعد تھا اس سے پہلے وقت نہیں تھا۔ میں حیران ہوا۔

"تو کیا میں تب تک تکلیف برداشت کرتا رہوں اور اگر اس دوران میں کوئی اور مسئلہ ہو گیا تو؟"

"تب آپ کہیں اور دکھا لیں۔"

روزے کی حالت میں دھکے کھانا ممکن نہیں تھا۔ زارا کا اپائنٹ منٹ بھی رات کا تھا اس لیے ہم بے نیل و مرام واپس لوٹ آئے۔ دبئی میں اگر ہمیں سال میں چند ایک بار اسپتال جانا پڑتا تھا تو وہاں دنوں یا گھنٹوں میں نہیں ایک گھنٹے سے پہلے سب ہو جاتا تھا اور آدمی گھر چلا جاتا۔ واپسی پر حنا نے ایک نزدیکی کلینک کا بتایا جہاں مختلف ماہرین بیٹھتے تھے اور وہاں دکھانے کو کہا۔ زارا کے دانے بڑھ گئے تھے اور میں بھی اب زیادہ تکلیف محسوس کر رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اچانک مجھے یہ تکلیف پھر کیوں ہوئی۔ ٹھیک ہے موسم گرم تھا مگر میں نے سحری میں اچھا خاصا پانی پیا تھا۔ کلینک پر خوش قسمتی سے جلد اپائنٹ منٹ مل گیا اور صرف دو گھنٹے کے انتظار کے بعد زارا کا اور تین گھنٹے بعد میرا نمبر آ گیا۔ ڈاکٹر نے کچھ سوالات کیے اور پھر مجھ سے خوراک کا پوچھا۔ میں نے گزشتہ دو دن میں جو کھایا تھا وہ اسے بتایا۔

"آپ نے باہر سے کچھ کھایا تھا؟"

"نہیں۔" میں نے کہا پھر مجھے یاد آیا۔ "بس ایک کولڈ ڈرنک پی تھی۔ کل شام۔"

ڈاکٹر نے گہری سانس لی۔ "آپ کے گردے میں مسئلے کی وجہ یہی کولڈ ڈرنک ہے۔"

"کولڈ ڈرنک تو میں پیتا رہتا ہوں۔"

"شاید آپ نہیں جانتے آج کل ایسی جعلی کولڈ ڈرنک آ رہی ہیں جن کے ذائقے کو تیز کرنے کے لیے ان میں کیمیکل ملائے جاتے ہیں اور یہ کیمیکل گردوں اور آنکھوں کے لیے بہت مضر ہیں۔ کولڈ ڈرنک اسٹالز پر عام طور سے یہی جعلی کولڈ ڈرنک بکتی ہے۔ میں آپ کو گردے واش کرنے والی دوا دے رہا ہوں اگر اس سے آرام نہیں آیا تو پھر ٹیسٹ ہوں گے۔"

میں نے گھر آ کر بتایا تو ارمان نے کہا۔ "بھائی جان آدمی کس کس چیز کو روئے۔ یہاں سب دو نمبر اور جعلی آ رہا ہے۔ سبزیوں اور پھلوں پر کیمیکل اسپرے ہوتا ہے جس سے وہ قبل از وقت پک جاتی ہیں۔ ان کو جلدی بڑا کرنے کے لیے خطرناک کیمیائی کھاد دی جاتی ہے۔ یہاں تو ادرک اور لہسن تک ایسے کیمیکل میں ڈال کر رکھے جاتے ہیں جو ان کو بہت صاف کر کے ان کے وزن کو بڑھا دیتا ہے۔ کھانے پینے کی دکانوں پر اکثر ایسی مضر صحت اشیا استعمال کی جاتی ہیں۔ جانوروں کی ہڈیوں اور مرغی کاٹنے کے بعد اس کی چربی اور دوسری باقیات سے آئل بنتا ہے جو تلنے والے دکانوں پر استعمال ہوتا ہے۔ گوشت والی چیزوں میں کتے، بلی گدھے اور حتیٰ کہ چوہے تک کا گوشت استعمال کیا جاتا ہے۔" ارمان کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ "ٹی وی کے پروگرام دیکھیں تو یہ سارے کام کھلے عام ہو رہے ہیں اور کوئی روکنے والا نہیں ہے۔ قانون نافذ کرنے والے اداروں پر ان کا ذرا بھی اثر نہیں ہوتا ہے۔"

"کیونکہ ہم لوگ ہی بے حس ہو گئے ہیں۔" حنا نے کہا۔ "کچھ عرصے پہلے چینی کی قیمت بہت بڑھ گئی۔ ایک سو پچاس روپے کلو تک چلی گئی تھی۔ میں نے کہا کہ ہم چینی کا بائیکاٹ کریں گے۔ جب تک چینی کی قیمت نارمل نہیں ہو جائے گی ہم چینی استعمال نہیں کریں گے۔ اللہ کا شکر ہے ہم لے سکتے ہیں اور میرے پاس تو ہمیشہ دس بارہ کلو چینی اضافی موجود رہتی ہے مگر میں نے رضا کارانہ ایسا کرنے کا سوچا تھا۔"

"پھر کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"تو پھر بچوں نے ایسا واویلا مچایا جیسے چینی نہیں ان کی سانس بند کر دی ہو۔ یہ جو ابھی معاشرے کی خرابیوں پر لیکچر دے رہے ہیں اس بات پر غصے میں ناشتا کیے بغیر چلے گئے کہ چائے میں چینی نہیں تھی۔ پھر جو ملنے والا آتا اور میں اسے پھیکی چائے پیش کرتی تو وہ بھی منہ بنا کر جاتا تھا۔ دو دن میں مجھے اپنا فیصلہ واپس لینا پڑا۔"

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو اصل خرابی ہم میں ہے۔"

میں نے کہا۔ "ہم اپنی اور اپنے گھر والوں کی ذات پر ذرا سی کمی یا سختی برداشت نہیں کر سکتے فوراً ان لوگوں کے آگے ہتھیار ڈال دیتے ہیں جو اصل میں ہماری نفسیات سے کھیلتے ہیں۔"

افطاری کے بعد دوائی لینے کے بعد مجھے آرام آیا تھا۔ زارا کو گرمی دانے تھے اور ان کا علاج گرمی سے بچاؤ تھا۔ آج دوسرا دن تھا اور پرسوں سے ہمیں اپنا سحری و افطاری کا بندوبست خود کرنا تھا اس لیے میں ارمان کے ساتھ جا کر ایک سپر اسٹور سے گروسری کا سامان لے آیا۔ اس میں ہر چیز تھی کیونکہ آمنہ نے پوری لسٹ بنا دی تھی۔ میں سب لے آیا۔ ابھی گیس سلینڈر نہیں لایا تھا لیکن اس شام گیس آ گئی اور لائٹ بھی بہتر ہو گئی تھی۔ شاید اس لیے کہ موسم کسی قدر بہتر ہوا تھا۔ اے سی چلنے لگے تو زارا کے دانے خود بخود کم ہو گئے تھے۔ دوا نے اثر کیا اور میرے گردے کی تکلیف کم ہو گئی تھی مگر میں نے آمنہ اور بچوں پر پابندی لگا دی کہ وہ عام جگہوں سے کولڈ ڈرنک نہیں لیں گے۔ بچے کولڈ ڈرنک کے شوقین نہیں تھے۔ دبئی میں وہ پانی کی جگہ یہی پیتے تھے۔ جب میں گروسری لینے گیا تو ان کے لیے کولڈ ڈرنک کے بڑے پیک لے آیا تھا۔ میں نے آمنہ سے کہا کہ وہ دوسری چیزوں میں احتیاط کرے اور صرف ان جگہوں سے لے جہاں سے یقین ہو کہ اچھی اور ایک نمبر چیز ملتی ہے۔

اس کے بعد بچوں کے داخلے کی مہم شروع کی۔ آمنہ اور میں نے چند اچھے اسکولوں کی لسٹ بنائی تھی جہاں بچوں کو داخل کرانا تھا۔ اسکولوں میں چھٹیاں تھیں مگر ایڈمنسٹریشن آفس اوپن تھے۔ ریحان کو رزلٹ آنے تک انتظار کرنا تھا۔ ہم روز اسکول کے لیے نکلتے تھے مگر جہاں جاتے وہاں پتا چلتا کہ داخلے کلوز ہو چکے ہیں۔ پھر ان کی شرائط اور دوسرے معاملات اتنے تھے کہ ہم سن کر ہی پریشان ہو گئے تھے۔ فیسیں اور دوسرے اخراجات یہاں بھی اچھے خاصے تھے مگر دبئی کے مقابلے میں پھر بھی کم تھے۔ بالآخر ایک اسکول میں بات بن گئی۔ یہ چین اسکول تھا اور کراچی میں اس کی خاصی شاخیں تھیں۔ اس کا معیار تعلیم بہت اعلیٰ تھا۔ میں اور آمنہ اسکول اور اس کی سہولیات دیکھ کر آئے۔ سب سے اچھی بات ہم کو یہ لگی کہ اسکول کی اپنی وینز تھیں جو بہت اچھے معیار کی تھیں۔ اسکول برٹش اسکول سسٹم کے تحت تھا۔ داخلہ چھٹیوں کے بعد ہونا تھا۔

جارج George

برطانیہ کے چھ بادشاہوں کے نام۔ ان میں سے پہلے چار بادشاہوں کا تعلق خاندان ہینوور سے اور بعد کے دو بادشاہوں کا تعلق خاندان ونڈسر سے ہے۔ جارج اوّل (1714ء۔1727ء) اور جارج دوم (1727ء۔1760ء) نسلاً جرمن تھے۔ جارج سوم (1760ء۔1820ء) جارج چہارم (1820ء۔1910ء) جارج پنجم (1910ء۔1936ء) ایڈورڈ ہفتم کا دوسرا بیٹا جو 1910ء میں برطانیہ کے تخت پر بیٹھا اور 1935ء میں سلور جوبلی منائی۔ جارج پنجم کے بعد اس کا سب سے بڑا بیٹا ایڈورڈ ہشتم تخت پر بیٹھا۔ لیکن چند ماہ بعد تخت سے دستبردار ہو گیا۔ جارج ششم (1936ء۔1952ء) جارج پنجم کا دوسرا بیٹا اپنے بڑے بھائی ایڈورڈ ہشتم کے دستبردار ہونے پر دسمبر 1936ء میں تخت پر بیٹھا۔ 1932ء میں لیڈی الزبتھ سے شادی کی جس کے بطن سے دو لڑکیاں الزبتھ (موجودہ ملکہ) اور مارگریٹ پیدا ہوئیں۔ جارج ششم کی وفات پر الزبتھ ثانی تخت پر بیٹھی۔

جارج ٹاؤن

جزیرۂ پینانگ (ملائیشیا) کا دارالحکومت۔ شمال مغربی ملائیشیا کی اہم ترین بندرگاہ ہے۔ یہاں کپڑا بننے اور کھلونے تیار کرنے کے کارخانے ہیں۔ یہاں سے شکر، ربڑ اور چاول کثیر مقدار میں برآمد ہوتے ہیں۔ آبادی (2000ء) میں 400,000۔ برطانیہ کے شاہ جارج سوم کے نام پر اس کا نام رکھا گیا۔

جارج ٹاؤن

(کے مین جزائر) مغربی کیریبین میں کے مین جزائر کا دارالحکومت۔ آبادی (2000ء) میں 15000 نفوس پر مشتمل ہے۔ اس کے قریب ہی ہوائی اڈہ بھی ہے۔

جارج کراس و میڈل

یہ برطانیہ کا سب سے بڑا سول ایوارڈ ہے اور انتہائی جرأت اور بہادری کا کارنامہ انجام دینے پر دیا جاتا ہے۔ اس کا اجرا 1940ء میں ہوا۔

مرسلہ: ندیم افضل بٹ۔ فیصل آباد

ایک ہفتے میں یہ مراحل طے ہو گئے۔ اب گھر ایک طرح سے سیٹ ہو گیا تھا۔ اب مجھے آمنہ کے لیے کار لینی تھی۔ یہاں کے ٹریفک اور محدود کار پارکنگ کو دیکھتے ہوئے میں نے سوچا کہ چھوٹی کار لوں گا۔ آمنہ کے پاس انٹرنیشنل ڈرائیونگ لائسنس تھا۔ بچے جو شروع میں گرمی اور لائٹ کی وجہ سے کسی قدر پریشان تھے اب وہ عادی ہو رہے تھے۔ مگر اب میں اور آمنہ پریشان تھے کیونکہ مجھے بہت سے کام نمٹانے تھے اور روز ہی کوئی نہ کوئی ملنے کے لیے پوری فیملی کے ساتھ چلا آتا تھا۔ اس سے پہلے ہم یہاں آتے تھے تو مہمان ہوتے تھے اس لیے ہم لوگوں سے ملنے جاتے تھے مگر اب ہم یہاں آ گئے تھے اس لیے لوگ مہمان بن کر ہم سے ملنے آ رہے تھے۔ رشتے دار رمضان کا خیال بھی نہیں کر رہے تھے۔ اس وجہ سے جو کام نمٹانے تھے وہ تاخیر کا شکار ہو رہے تھے۔ رمضان کے تیسرے ہفتے خوش قسمتی سے ایک دن خالی مل گیا اور میں نے آمنہ سے کہا۔ ”چلو گاڑی لے لیتے ہیں۔“

اس نے کہا۔ ”میں نے جو یہاں حال دیکھا ہے میرا خیال ہے گاڑی لینے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”میں اس ٹریفک میں گاڑی نہیں چلا سکتی اور نہ ہی ریحان کو چلانے کی اجازت دے سکتی ہوں سچی بات ہے کہ میرا تو یہ سوچ کر دل دہل رہا ہے کہ وہ یہاں بائیک چلائے گا۔“

”بائیک نہیں چلائے گا تو کیا چنگ چی پر آئے جائے گا۔ بائیک سے زیادہ خطرناک سواری تو یہ ہے۔“

”تب ایسا کریں کچھ عرصے رک جائیں۔ ریحان ڈرائیونگ سیکھ لے گا تب آپ گاڑی لیجیے گا۔ میرے لیے لینا بیکار ہے۔“

”جیسی تمہاری مرضی مگر کہیں آنا جانا ہوا تو؟“

”یہاں رکشے اور ٹیکسیاں بہت آسانی سے مل جاتی ہیں۔ حنا کال کر کے بلا لیتی ہے۔ میں بھی ایسا ہی کر لوں گی۔“

”ٹھیک ہے لیکن ایسا نہ ہو کہ میں یہاں سے جاؤں تب تم کو گاڑی یاد آئے۔“

”نہیں میں نے سوچ لیا ہے۔“

میں نے یہ کیا کہ اس دن جا کر گیس سلنڈر لے آیا۔ یہ بہت اچھی کوالٹی کا مضبوط سلنڈر تھا اور یہ عام گیس کے چولہے کے ساتھ بھی استعمال ہو سکتا تھا۔ جس سے لیا تھا وہ دوسرا سلنڈر گھر بھی پہنچاتے تھے۔ میں نے دو سلنڈر لیے تھے ایک اضافی تھا جب ایک ختم ہو جاتا تو دوسرا لگا لیتے اور خالی ہونے والا وہ لے کر بھرا ہوا دے جاتے۔ مجھے خیال آیا کہ جو جنریٹر پورے گھر کو چلا رہا تھا اس کی اتنی استعداد نہیں تھی۔ اوپر نیچے کے چھ سات پنکھے اور انرجی سیور چلتے تھے۔ میں نے دوسرا اور طاقتور جنریٹر لینے کا فیصلہ کیا تاکہ اوپر کا پورشن ٹھیک سے چلے۔ ایک جاپانی کمپنی کا بنا ہوا بہترین جنریٹر لیا اور اسے چھت پر لگوا لیا تھا۔ یہ بھی آٹومیٹک تھا اور یہ اتنا طاقتور تھا کہ بجلی جانے پر دوسری چیزوں کے ساتھ ایک اے سی بھی چلا سکتا تھا۔ میں نے آمنہ سے کہا۔ ”جب تک لائٹ کا مسئلہ ہے تم اور بچے ایک ہی کمرے میں سونا تاکہ اے سی کسی وقت بھی بند نہ ہو۔“

آمنہ مان گئی مگر بچے ماننے کو تیار نہیں تھے ان کو اپنے کمرے میں ہی نیند آتی۔ بڑی مشکل سے انہیں منایا کہ یہ کچھ عرصے کی بات ہے بجلی کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ مگر اب بچوں کو دوسرے مسائل بھی شروع ہو گئے تھے۔ یہاں کی گندگی، ہر چیز دو نمبر ہوتا (وہ باہر سے کچھ لے کر کھا نہیں سکتے تھے) گھر سے باہر کوئی سہولت نہ ہونا اور سب سے بڑھ کر انسانوں کا رویہ۔ وہ جس معاشرے میں رہے اور پلے بڑھے تھے وہاں انسانوں کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ کوئی کسی کو ذرا بھی کچھ نہیں کہہ سکتا کہ ایک ذرا سی شکایت پر قانون فوراً حرکت میں آ جاتا ہے۔ کسی کے ساتھ ناانصافی نہیں ہوتی۔ لوگ ایک دوسرے سے مسکرا کر اور خوش اخلاقی سے پیش آتے ہیں۔ وہاں جھوٹ بولنے اور دھوکا دینے کا رواج نہیں تھا۔ بچیوں تو گھر میں ہوتی تھیں مگر ریحان اور عدنان باہر جاتے تھے اور جب انہیں یہاں لوگوں کے رویے اور اخلاق سے واسطہ پڑتا تو وہ بہت دل برداشتہ ہوتے تھے۔ ہمارے ہاں اگر کوئی صاف گو ہو تو لوگ اسے بے وقوف سمجھتے ہیں اور اسے استعمال کرتے ہیں۔

میں نے سوچا کہ اپنا بے فارم بنوا لوں تا کہ مستقبل میں میرے بچوں کو شناختی کارڈ اور دوسری دستاویزات بنانے میں آسانی ہو۔ مگر جب میں نادرا گیا جو ایک زمانے میں بہت اچھی ساکھ کا حامل ادارہ تھا مگر اب مجھے صرف بے فارم بنوانے کے لیے روزے میں جو چکر لگانے پڑے اور لمبی قطاروں میں لگنا پڑا میرے ہوش ٹھکانے آ گئے تھے۔ اب اس کا حال بھی سرکاری دفتروں جیسا ہو گیا تھا۔ جس دن میں

فارم سے حاصل کرکے واپس آیا۔ تھکن اور پسینے میں شرابور تھا۔ نہانے کے لیے واش روم میں آیا تو پانی غائب۔ پتا چلا کہ پورے علاقے میں تین دن سے پانی نہیں آرہا تھا۔ بچے ٹینک میں جو بچ تھا وہ بھی ختم ہوگیا اور ارمان نے ٹینکر کا کہہ دیا تھا مگر ہمارا نمبر ابھی تک نہیں آیا تھا۔ بہ مشکل میں ٹب میں موجود پانی سے نہایا۔ ٹینکر شام کے وقت آیا اور جب تک ہم پانی کے بغیر بیٹھے رہے تھے۔

دو دن بعد میں سحری کے وقت واش روم میں منہ ہاتھ دھو رہا تھا کہ کچن سے آمنہ کی چیخ سنائی دی اور میں گرتا پڑتا بھاگا ہوا وہاں پہنچا تو آمنہ کچن کیبنٹ میں لگنے والی آگ بجھانے کی کوشش کررہی تھی۔ میں نے اسے پیچھے کھینچا اور پھر ایک صوفہ کشن لے کر اس سے آگ بجھائی۔ اس وقت تک بچے بھی وہاں آگئے تھے اور خوفزدہ حالت سے یہ ساری کارروائی دیکھ رہے تھے۔ وہ سہمی ہوئی آمنہ سے پوچھ رہے تھے۔ میں نے پہلے اسے پانی پلایا اور اس کے حواس بحال ہوئے تو پوچھا۔ "کیا ہوا تھا آگ کیسے لگی؟"

"پتا نہیں میں نے تو چولہا جلا کر تیلی نیچے پھینکی تھی کہ آگ لگ گئی۔"

میں نے اس جگہ کا معائنہ کیا اور معاملہ فوراً میری سمجھ میں آگیا۔ جس کیبنٹ میں آگ لگی تھی گیس سلینڈر اس کے اندر رکھا ہوا تھا۔ اس سے گیس لیک ہورہی تھی اور ایل پی جی ہوا سے بھاری ہوتی ہے اس لیے وہ فرش پر جمع ہوگئی اور جب آمنہ نے تیلی جلا کر نیچے پھینکی تو گیس نے آگ پکڑ لی۔ شکر ہے کہ آمنہ اس جگہ سے دور تھی۔ اس لیے آگ براہ راست اس تک نہیں آئی مگر کیبنٹ میں لگی آگ بجھانے کی کوشش میں اس کے ہاتھ کچھ جگہوں سے معمولی جھلس گئے تھے۔ میں گھر میں دوائیں رکھتا ہوں۔ یہاں بھی آنے کے بعد میں فوری ضرورت کی دوائیں اور مرہم پٹی والی چیزیں لے آیا تھا۔ میں نے مرہم کی نئی ٹیوب نکالی۔ اس کا رنگ پیلا ہوتا ہے مگر جب وہ زخموں پر لگایا تو اس کا رنگ سفید سا ہو رہا تھا۔ لگاتے ہی آمنہ نے کہا۔ "بہت تکلیف ہو رہی ہے اتنی تو جلنے سے نہیں ہوئی تھی۔ ایسا لگ رہا ہے آپ نے مرچ لگا دیا ہے۔"

مجھے لگا کہ دوا ٹھیک نہیں تھی اور میں نے فوری اس کے ہاتھ پانی سے دھو کر پھر ٹشو سے صاف کیے۔ ٹیوب کے ڈبے پر ایکسپائری ڈیٹ دو سال بعد کی تھی اور یہ ابھی ایک مہینے پہلے بنی تھی۔ ہاتھ دھونے اور مرچ لگنے سے آمنہ کی تکلیف میں کمی آئی مگر اسے دوا کی ضرورت تو تھی۔ ریحان نے کہا۔ "میں صبح دوسری ٹیوب لے آؤں گا اور ڈاکٹر سے بھی پوچھ کر بھی آتا ہوں۔"

آمنہ کی تکلیف بڑھ گئی تھی۔ اس لیے صبح اٹھ کر ریحان ٹیوب لے کر چلا گیا۔ میڈیکل اسٹور نزدیک ہی تھا۔ بچے آمنہ کے پاس تھے۔ وہ ماں کے معاملے میں بہت حساس تھے۔ سارا اور زارا اس سے چپک کر بیٹھی ہوئی تھیں۔ ورنہ عام طور سے اس وقت سب سو رہے ہوتے تھے۔ میں اس دوران میں گیس سلینڈر کا معائنہ کررہا تھا اور جلد میں نے اس کے نچلے حصے میں ایک چھوٹا سا سوراخ دریافت کرلیا۔ گیس یہیں سے خارج ہورہی تھی۔ میں دوسرا سلینڈر چیک کررہا تھا کہ کہیں اس میں بھی تو کوئی مسئلہ نہیں ہے؟ میں نے دکان دار سے سب سے مضبوط سلینڈر دینے کو کہا تھا اور اس کا یہ حال تھا۔ ابھی میں اس پر کڑھ ہی رہا تھا کہ ریحان اس حال میں اندر آیا کہ اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا اور وہ حواس باختہ تھا۔ میں اس کی طرف لپکا۔ "یہ کیا ہوا؟"

ریحان نے مجھے دیکھا اور میرے ہاتھوں میں جھول گیا۔ وہ نیم بے ہوش ہو رہا تھا میں اسے لاؤنج میں لایا تو آمنہ نے چیخ ماری تھی اور اپنی تکلیف بھول کر اس کی طرف لپکی۔ "کیا ہوا میرے بچے کو؟"

ہم نے ریحان کو صوفے پر لٹایا۔ آمنہ نے دوپٹے سے اس کا سر صاف کیا۔ سارا پانی لائی۔ ریحان کا بھی روزہ تھا میں اسے پانی پلا تو نہیں سکتا تھا۔ اس لیے پانی اس کے منہ پر چھڑکا تو اس کے حواس بحال ہوئے تھے۔ "کیا ہوا تھا؟"

ریحان اٹھ بیٹھا۔ "پاپا وہ میں دوا لے کر آرہا تھا کہ ایک بائیک پر دو لڑکوں نے روک لیا اور میرا موبائل مانگا۔ میں نے انکار کیا تو ایک نے پستول میرے سر پر مارا۔"

"تو نے موبائل کیوں نہیں دیا؟" آمنہ تڑپ کر بولی۔ "اگر وہ گولی مار دیتے؟"

"اللہ نہ کرے۔" میں نے دہل کر کہا اور ریحان کو سینے سے لگا لیا۔ اللہ نے اسے بچا لیا تھا۔ ریحان نے آنے سے پہلے نیا آئی فون لیا تھا اور یہ پاکستانی روپے میں ستر ہزار کا پڑا تھا مگر موبائل کی خیر تھی اللہ نے زندگی محفوظ رکھی۔

ریحان کی حالت ٹھیک ہوئی تھی اس کے باوجود میں اسے اور آمنہ کو نزدیکی کلینک لے گیا۔ جہاں ڈاکٹر نے اسے دیکھ کر

تسلی دی کہ معمولی زخم ہے اور چوٹ کا اثر اندر نہیں گیا۔ ریحان نے میڈیکل اسٹور سے یہ پوچھنے کے لیے فون کال کی کہ کچھ اور منگوانا ہے تو وہ لیتا آئے اور اسی دوران میں لوٹنے والوں نے تاڑ لیا کہ اس کے پاس قیمتی موبائل ہے۔ وہ میڈیکل اسٹور سے ہی اس کے پیچھے لگ گئے تھے اور ایک جگہ موقع دیکھ کر روک لیا۔ مرہم پٹی کے بعد واپس آتے ہوئے میں نے گاڑی اسی میڈیکل اسٹور پر روکی اور دکان والے سے پوچھا۔

”تم ایکسپائرڈ دوائیں بیچتے ہو۔“

”صاحب ہمیں کیا پتا کمپنی سے آتی ہیں۔“ وہ بے نیازی سے بولا۔

”جھوٹ مت بولو تم لوگوں کو اچھی طرح پتا ہوتا ہے کہ کون سی چیز دو نمبر ہے۔ لوگوں کی صحت سے کھیلتے ہو نہ جانے کتنے لوگ جعلی اور ایکسپائرڈ دوائیں استعمال کرنے سے مر جاتے ہیں۔“

”صاحب جس کی موت لکھی ہو وہ تو آ کر رہتی ہے۔“

”کاش کہ تمہارا کوئی پیارا بھی ایسی موت کا شکار ہو تب تم کو پتا چلے۔“ میں نے جل کر کہا اور دکان سے نکل آیا۔ بحث کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میں تو اسے سنانے گیا تھا مگر الٹا اپنے دل پر بوجھ لے کر آیا۔ میرے وطن میں کیا ہو رہا تھا۔ سترہ سال پہلے جب میں یہاں سے نکلا تو اتنی افراتفری اور بے حسی نہیں تھی۔ لوگ خیال کرتے تھے اور جرم یوں کھلے عام نہیں ہوتے تھے۔ ہر شخص کا دین ایمان صرف پیسا نہیں تھا۔ دو نمبری ہمارا طرہ امتیاز نہیں تھا۔ مگر اس بار میں آیا اور یہاں کے لوگوں سے واسطہ پڑا تو مجھے اندازہ ہوا کہ بگاڑ کس حد تک ہمارے معاشرے میں سرایت کر چکا ہے۔ اب تک میں مہمان بن کر آتا تھا اور معمولی شاپنگ کے علاوہ کچھ نہیں کرتا تھا۔ واپس آ کر میں نے سلینڈر اٹھا کر گاڑی میں رکھا اور اس دکان پر پہنچ گیا جہاں سے میں نے یہ سلینڈر لیا تھا اور جب دکان والے کو بتایا تو وہ معذرت کرنے کی بجائے کہنے لگا کہ لے جاتے ہوئے کہیں ٹکرایا ہوگا اس سے سوراخ ہوا ہے۔ میں نے اسے دکھایا کہ سوراخ کسی چیز کے ٹکرانے سے نہیں بلکہ ناقص کوالٹی سے ہوا ہے۔ مگر وہ ماننے کو تیار نہیں تھا۔ میں نے اس سے کمپنی کا پوچھا۔ ”تم مجھے کمپنی کا بتاؤ میں اس سے بات کرتا ہوں۔ وہ کس معیار کی چیز بنا رہے ہیں۔“ پہلے وہ آئیں بائیں شائیں کرنے لگا اور پھر اس نے تسلیم کیا کہ یہ سلینڈر وہ خود بناتے ہیں۔ ان کے پاس کوئی لائسنس اور سرٹیفکیٹ نہیں تھا کہ جس سے سلینڈروں کا معیار طے ہوتا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ اپنے سلینڈر لے اور میرے پیسے واپس کرے۔ اس نے فروخت کیا ہوا مال واپس لینے سے انکار کر دیا۔ میں نے بھی یہ سوچ کر اصرار نہیں کیا کہ وہ یہ ناقص سلینڈر معمولی مرمت کر کے پھر آگے فروخت کر دے گا اور کسی کی جان سے کھیلے گا۔ اس وقت بھی وہ یہی کر رہا تھا مگر میں اس کے ساتھ شریک نہیں ہونا چاہتا تھا۔ میرا دماغ گھوم رہا تھا۔ لوگ تقریباً قتل کے برابر جرم کر رہے تھے اور ذرا بھی پشیمان نہیں تھے۔ گھر آ کر میں نے دوسرا سلینڈر بھی نکال دیا۔ بلکہ ان کی گیس خارج کر کے انہیں اسٹور میں ڈال دیا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ بے شک سحری اور افطاری باہر سے منگوانا پڑے لیکن اب سلینڈر استعمال نہیں ہوگا۔

آمنہ اور بچے سب ہی آج پیش آنے والے واقعات سے آزردہ اور سہمے ہوئے تھے۔ ان کا موڈ اچھا کرنے کے لیے میں نے افطاری کے بعد کہا کہ باہر چلتے ہیں۔ آج ڈنر باہر کریں گے۔ سب خوشی خوشی تیار ہو گئے۔ ہم گھر سے نکلے، پہلے سی ویو گئے۔ کچھ دیر ہم وہاں کالے پانی کے ساتھ کھیلتے رہے۔ پھر ایک معروف باربی کیو ریستوران سے ڈنر کیا۔ رمضان میں بھی وہاں بلا کا رش تھا۔ زارا کو باربی کیو پسند نہیں تھا۔ اس نے برائے نام کھایا اس لیے وہاں سے آتے ہوئے میں نے اسے ایک معروف فاسٹ فوڈ چین سے برگر لے کر دیا کہ وہ پیٹ تو بھر لے۔ اس نے راستے میں برگر کھایا تھا۔ ہم گھر واپس آئے اور میں کپڑے بدل رہا تھا کہ آمنہ نے آواز دی۔ ”فیضی دیکھیں زارا کو کیا ہو رہا ہے۔“

میں باہر آیا تو زارا لاؤنج میں صوفے پر نڈھال پڑی تھی اور اس کے پیلے چہرے سے پسینہ پانی کی طرح بہہ رہا تھا۔ ”کیا ہوا ہے اسے؟“

”ابھی اس نے واش روم میں الٹی کی اور وہیں لیٹ گئی میں اسے اٹھا کر لائی ہوں۔“

ابھی آمنہ بتا رہی تھی کہ زارا بے ہوش ہو گئی۔ ہم نے پہلے اسے ہوش میں لانے کی کوشش کی اور جب ناکام رہے تو لے کر ایک نزدیکی اسپتال بھاگے۔ وہاں ڈاکٹر نے ایمرجنسی میں چیک کیا اور کہا۔ ”فوڈ پوائزننگ کا کیس ہے آپ اسے بڑے اسپتال لے جائیں۔“

ہم زارا کو ایک نامور اسپتال لے گئے جس کے

بارے میں مشہور ہے کہ وہاں علاج بہت اچھا مگر بہت ہی زیادہ مہنگا ہوتا ہے اور ہمیں اس کا تجربہ بھی ہو گیا۔ جب ایمرجنسی میں جاتے ہی مجھ سے پچاس ہزار جمع کرانے کو کہا گیا۔ خوش قسمتی سے میرے پاس اتنی رقم تھی۔ رقم جمع کراتے ہی زارا کو فوری طبی امداد دی گئی اور صبح تک اس کی حالت سنبھل گئی۔ مگر ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ فوڈ پوائزنگ اتنی خطرناک تھی کہ اگر آپ صرف دس منٹ کی تاخیر کرتے تو بچی کا لیور جواب دے جاتا اور اس کی جان خطرے میں پڑ جاتی۔ فوڈ پوائزنگ لازمی برگر سے ہوئی تھی کیونکہ باربی کیو سب نے کھایا تھا اور اسی میں سے زارا نے بھی چکھا تھا۔ اگر اس میں کوئی مسئلہ ہوتا تو سب کو ہوتا۔ برگر صرف زارا نے کھایا تھا۔ اس کا اثر ہوا تھا۔

شکر ہے کہ ہم بروقت اسے لے کر پہنچ گئے تھے۔ زارا دو دن اسپتال میں رہی اور اس دوران میں اس کے علاج کا بل ساڑھے تین لاکھ بن گیا تھا۔ مگر اولاد کیا ہوتی ہے اور آدمی اس کے لیے کیا کر سکتا ہے یہ اس روز میں نے جانا۔ اگر اپنی بچی کے علاج کے لیے مجھے تن کے کپڑے بیچنا پڑتے تو میں اس سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ اپنا ایک ایک پیسا اس کے علاج پر لگا دیتا۔ جب تک ڈاکٹروں نے اسے خطرے سے باہر قرار نہیں دیا میں اور آمنہ اس کے بستر کے دائیں بائیں بیٹھے رہے تھے۔ اس کا ایک ہاتھ آمنہ کے ہاتھ میں تھا اور دوسرا میرے ہاتھ میں۔ ہمیں کھانے پینے کا ہوش نہیں رہا تھا طویل روزے کے بعد بھی ریحان اور عدنان کچھ لا کر دیتے تو ہم کھاتے تھے۔ ہم صرف نمازوں اور بہت ضرورت کے وقت ہی اس کے پاس سے اٹھتے تھے۔ سوتے بھی تو بستر کے کنارے سر ٹکا کر۔ ہمیں لگ رہا تھا کہ ہم مر چکے ہیں اور جب ڈاکٹروں نے زارا کو خطرے سے باہر قرار دیا تو ہمیں لگا جیسے وہ نہیں ہم پھر سے جی اٹھے ہوں۔

میں اسپتال سے نکل کر سیدھا اس فاسٹ فوڈ بکن پہنچا اور میں نے وہاں ہنگامہ کیا۔ وہ معذرتیں کرتے رہے کہ ایسا غلطی سے ہوا ہے۔ میں بھی بس سنا سکتا تھا۔ میں نے نہیں بتایا لیکن ٹی وی چینلوں کو اس کی بھنک پڑ گئی اور انہوں نے خبر چلا دی۔ ایک چینل نے غیر ذمے داری کی حد کرتے ہوئے بچی کی موت کی خبر بھی دے دی۔ اصل میں کوئی اور بچی وفات پا گئی تھی اور رپورٹر نے سن کر سمجھا کہ خبر زارا سے متعلق ہے۔ یہ ایک الگ کہانی بنی اور کئی دن تک لوگوں کے فون آتے رہے۔ پے در پے واقعات اور مشکلات نے ہم سب کو سن کر دیا۔ آمنہ اور بچے شاید اب پچھتا رہے تھے مگر شرم کی وجہ سے کہہ نہیں پا رہے تھے کہ انہوں نے یہاں آنے کا فیصلہ غلط کیا تھا۔ ان کی صورتوں سے واضح تھا کہ وہ واپس جانا چاہتے تھے۔ ان کی مشکل میں نے آسان کی اور زارا کے گھر آتے ہی میں نے آمنہ سے کہا۔

"سامان پیک کرنا شروع کر دو ہم عید کے بعد واپس جا رہے ہیں۔"

"سچ۔" آمنہ خوش ہو گئی پھر اسے خیال آیا۔ "آپ مجھ سے ناراض تو نہیں ہیں کہ میں نے زور ڈال کر آپ سے یہ فیصلہ کرایا۔"

"اللہ نے کرم کیا کہ میرے بچوں کو کچھ نہیں ہوا ورنہ

Tower

مخروطی شکل کا بلند ستون یا عمارت۔ عام طور پر مسجدوں کے چاروں گوشوں پر بنائے جاتے ہیں تاکہ مؤذن اس کے اوپر سے اذان دے سکے۔ ابتدا میں مسجد کے ساتھ کوئی ایسی بلند جگہ نہیں تھی۔ حضرت بلالؓ مسجد نبوی کے قریب سب سے اونچے مکان پر چڑھ کر اذان دیا کرتے تھے۔ فتح مکہ کے دن انہوں نے خانہ کعبہ کی چھت سے اذان دی۔ پہلے ان کی تعداد ایک یا دو یا تین ہوتی تھی لیکن بعد میں چاروں میناروں کا بنانا اسلامی شعار بن گیا۔ زینہ شروع میں باہر کی طرف ہوتا تھا لیکن بعد میں مینار کے اندر بننے لگا۔ سمندر میں چٹانوں کے اوپر روشنی کے مینار بنائے جاتے ہیں تاکہ جہاز ان سے ٹکرا نہ جائیں۔ منوڑہ پاکستان اور سکندریہ (مصر) روشنی کا مینار اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔ دہلی کا قطب مینار سلطان قطب الدین نے بنوایا تھا۔ شیخوپورہ کے قریب ہرن مینار جہانگیر نے شکار کے لیے تعمیر کروایا تھا۔ مینار پر سلسلہ قرارداد پاکستان (اقبال پارک لاہور) اور سمٹ مینار فیصل چوک لاہور (جو اسلامی سربراہی کانفرنس منعقدہ 22 فروری 1974ء کی یادگار ہے) بھی تاریخی اہمیت کے حامل ہیں۔ دنیا کا بلند ترین مینار ٹورنٹو کینیڈا میں ہے اس کی بلندی 1815 فٹ 5 انچ ہے۔ اس کا افتتاح 12 اپریل 1976ء کو ہوا۔

مرسلہ: حدیقہ انصاری۔ فیصل آباد

شاید میں تمہیں ساری عمر معاف نہ کرتا۔"

"ہاں اللہ کا کرم ہے۔" آمنہ نے کہا اور رو دی تھی۔

بچے اب تک سہمے ہوئے تھے اور جب ان کو پتا چلا کہ ہم سب عید کے بعد واپس جا رہے ہیں تو ان کی خوشی کا بھی ٹھکانہ نہیں رہا تھا۔ اتنا خوش تو وہ آتے وقت بھی نہیں تھے۔ اب وہ جانے کے لیے بھی زیادہ بیتاب تھے۔ گھر کے باہر کے ماحول اور واقعات سے سب اتنا ڈر گئے تھے کہ کسی نے شاپنگ کے لیے بھی باہر جانے کا نام نہیں لیا۔ ریحان اور عدنان نے کھیلنے کے لیے جانا چھوڑ دیا تھا۔ بڑی مشکل سے وہ میرے اور آمنہ کے مجبور کرنے پر عید کی خریداری کے لیے نکلے تھے اور اس خریداری نے ہمیں مزید دکھی کر دیا تھا۔ جب ہم دکانوں پر جاتے تو ہر شخص یوں منہ پھاڑ کر وہ گنی قیمت مانگتا جیسے وہ آخری بار کما رہا ہو اور پھر اسے موقع نہیں ملے گا۔ ان اشیا کے دام تو آسمان سے بات کر رہے تھے جو براہ راست عید اور روزوں سے متعلق ہوتی ہیں۔ وہ اشیا بھی بہت مہنگی ہو رہی تھیں جن کا براہ راست ان مذہبی تہواروں سے واسطہ نہیں تھا۔ ریحان نے گھر آ کر کہا۔

"پاپا یہ لوگ خود کو مسلمان کہتے ہیں ان سے اچھے تو یہودی اور عیسائی ہیں جو اپنے تہواروں پر قیمتیں کم کر دیتے ہیں کہ ان کے غریب بھی ٹھیک سے خوشیاں منا سکیں۔"

"بس بیٹا ہم نام کے مسلمان رہ گئے ہیں۔" میں نے سرد آہ بھر کر کہا۔ عید تک کا وقت ہم نے یوں گزارا جیسے جیل میں قیدی چھوٹنے کا وقت گزارتے ہیں۔ ٹکٹ میں نے پہلے ہی کنفرم کرا لیے تھے۔ عید کے پانچویں دن ہم پرواز کر گئے تھے۔ جب دبئی ائرپورٹ پر اترے تو زندگی میں پہلی بار امیگریشن کے خراب رویے کے باوجود مجھے لگا جیسے میں اب تک وطن سے باہر تھا اور اب وطن آ گیا ہوں۔ صرف میں ہی نہیں آمنہ اور بچوں کا بھی یہی حال تھا۔ جب ہم گھر پہنچے تو دو دن تک سوتے ہی رہے تھے۔ ایسا آرام اور سکون ملا تھا کہ بیان سے باہر ہے۔ میں نے شکر ادا کیا کہ میں نے اپارٹمنٹ کے مالک سے خالی کرنے کو نہیں کہا تھا۔ مگر آمنہ نے تیسرے دن مجھ سے کہا۔

"ٹھیک ہم یہیں رہیں گے لیکن میں نے سوچ لیا ہے ہم بچت بھی کریں گے۔"

"وہ کیسے؟"

"ہم سستے علاقے میں اپارٹمنٹ لیں گے میرا اندازہ ہے تین ہزار درہم تو اس میں بچ جائیں گے۔ اس طرح ہم بہت کھلا کھاتے پیتے ہیں اسے کنٹرول کریں گے۔ باہر آنا جانا کم کریں گے۔ شاپنگ کم کریں گے تو مجھے یقین ہے ہم خاصی بچت کر لیں گے۔"

ریحان نے کہا۔ "پاپا میں نے سوچ لیا ہے کہ میں او لیول کے بعد اسکالرشپ کا امتحان دوں گا اور مجھے یقین ہے میں کامیاب رہوں گا تب میں یہیں پڑھ سکوں گا۔"

"اور اگر پاس نہ ہو سکے تو؟"

"تب میں پاکستان جا کر پڑھ لوں گا۔ میں ہاسٹل میں رہوں گا تو بہت سے مسئلے فیس نہیں کرنا پڑیں گے۔ میں لاہور، اسلام آباد کی کسی یونیورسٹی میں داخلہ لے لوں گا۔"

"پاپا میں بھی ایسا ہی کروں گا۔" عدنان نے کہا۔

مجھے بہت اچھا لگا کہ میرے بیوی بچے اس طرح سے از خود تعاون کر رہے تھے۔ میں نے شارجہ میں ایک اپارٹمنٹ تلاش کر لیا۔ اس میں تین بیڈ کے ساتھ بڑا سا لاؤنج تھا۔ بلڈنگ اور اس کا ماحول اچھا تھا اور کرایہ ساڑھے چار ہزار درہم ماہانہ تھا۔ یعنی ساڑھے تین ہزار درہم کی تو براہ راست بچت تھی۔ کچھ دوسرے اخراجات میں کمی کر کے یہ بچت ساڑھے چار ہزار درہم تک پہنچ گئی۔ ریحان کا رزلٹ آیا تو اسے ایک اچھے کالج میں داخل کرا دیا جہاں اگرچہ فیس بہت زیادہ ہے مگر میں اب افورڈ کر سکتا ہوں۔ آمنہ نے حسب وعدہ دوسری چیزوں میں بھی کنٹرول کرنا شروع کر دیا اور اب ہم مہینے کے اچھے خاصے بچا لیتے ہیں۔ وطن میں گزارے چند مشکل دنوں نے یہ فیصلے ہمارے لیے آسان کر دیے ہیں۔

اس آپ بیتی سے یہ مطلب نہ لیا جائے کہ ہمارے ملک میں مشکلات ہی مشکلات ہیں۔ یہاں بیس کروڑ لوگ بستے ہیں اور وہ حالات اور مشکلات کا سامنا کر رہے ہیں۔ ہماری حب الوطنی کو بھی کمزور نہ لیا جائے۔ ہاں ہم مشکلات کا سامنا نہ کر سکے اور واپس چلے گئے۔ مگر خدا گواہ ہے دل آج بھی پاکستان کے لیے ہی دھڑکتا ہے پہلے علم نہیں تھا اب پتا چلا ہے تو ہر نماز میں یہ دعا مانگتے ہیں کہ اللہ میرے وطن اور اس کے لوگوں کی مشکلات میں آسانی کرے اور ہمیں سیدھے راستے پر چلنے اور راست بازی کی توفیق دے۔ سب سے بڑھ کر ہمیں ایک ایسا لیڈر دے جو قائداعظم کی طرح ہمیں پھر سے ایک قوم بنا دے۔

میں برہن

محترمہ عذرا رسول
سلام تہنیت!
میں سرگزشت کی مستقل قاری ہوں اس لیے کہ اس میں زندگی کی تلخیوں بھری داستان شامل اشاعت ہوتی رہتی ہے۔ میری زندگی بھی تلخیوں سے لبریز ہے اور اس شعر کی مثل ہے۔ "میں برہن ایسی جلی کہ کوئلہ بھی نہ راکھ"۔ اُمید ہے میری یہ آپ بیتی آپ کو پسند آئے گی

کنول چنّا
(فیصل آباد)

میں کھلی ہوئی کھڑکی کے سامنے افق پر نظریں جمائے کھڑی تھی اور ذہن کہیں اور تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے قسمت نے جو تھپڑ مارا تھا میں اسی کو سہلا رہی تھی۔ اب تک میں نے جو کچھ سہا تھا وہی کافی تھا کہ قسمت نے ایک اور زخم لگا دیا۔ بچپن سے اب تک صرف دکھ ہی تو جھیلے ہیں۔ گو کہ اس وقت میرے پاس کروڑوں کی جائیداد ہے مگر خوشی کوسوں دور ہے۔ اسی لیے میں زیادہ تر ماضی میں کھوئی رہتی ہوں۔ آج سے پچیس سال پہلے میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ میں اس

طرح دولت میں کھیلوں گی۔

میرا تعلق اندرون سندھ کے ایک معروف گوٹھ سے ہے جس کا نام بتاتے ہوئے ہچکچا رہی ہوں۔ میری والدہ کا انتقال اس وقت ہو گیا تھا جب میں صرف سات سال کی تھی۔ مجھے میرے ابو اور بھائی نے ہاتھ کا چھالا بنائے رکھا۔ جب چودہ سال کی ہوئی تو ابو نے بھی قبرستان کی راہ ڈھونڈ لی۔ پھر میری ذمے داری بھیا نے اپنے سر لے لی۔ ابو پڑھے لکھے نہیں تھے مگر تعلیم کی اہمیت سے واقف تھے اس لیے انہوں نے بھائی کو میٹرک کرا دیا تھا۔ مجھے بھی پڑھانا چاہتے تھے مگر زندگی نے وفا نہ کی۔ بھائی نے صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا کہ تمہیں پڑھنا ہے۔ بہت آگے بڑھنا ہے۔ اسی لیے میٹرک کرتے ہی انہوں نے مجھے کراچی بھیج دیا۔ یہاں کوئی ایسا گھرانا نہیں تھا جس کے یہاں رہ کر تعلیم حاصل کرتی اس لیے مجھے ہاسٹل میں داخل کرا دیا تھا۔ ہاسٹل کا ماحول کچھ ایسا تھا کہ میں وہاں جلد ضم ہو گئی۔ ابتدا میں اردو بہت خراب تھی مگر وہاں کی سہیلیوں نے بھرپور مدد کی اور میں بھی کسی اہل زبان کی طرح اردو بولنے لگی تھی۔ زیادہ تر لڑکیاں اردو داں تھیں اس لیے ان کے ساتھ وقت اچھا گزر جاتا۔ پھر وہاں کی ہر لڑکی زندگی کو کھیل بنانا جانتی تھی۔ ہر وقت ہنسی مذاق کا ماحول بنا رہتا۔ اس دن بھی ہم ہنسی مذاق میں مشغول تھے۔ عائشہ کو چھیڑ رہے تھے۔

"تو آؤ سب مل کر عائشہ کو چھینکیں ماریں۔" میرے جملے پر سب کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ چھینکیں مارنا کوڈ ورڈ کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ کسی لڑکی کو چھیڑنے کے لیے ہی یہ لفظ استعمال کرتے۔ عین اسی وقت چچا جان آ کر بولی۔ "اے لو تم لوگ یہاں جمع ہو اور وہاں ڈھونڈ رہی ہوں۔ اے بی تم سے ایک گھڑی تو ٹک کر بیٹھ جایا کرو۔ ہائے میں بوڑھی قبر کا کونا تھامے کھڑی ہوں۔ مجھ بوڑھی کو اتنا تو نہ ستایا کرو۔ سیڑھیاں چڑھ چڑھ کر جان نکل گئی۔"

"اے بوا! کس نے کہا تھا اوپر آنے کو وہیں نیچے کھڑے ہو کر آواز لگا لیتی۔" میں نے کہا۔

"اے لو کیسی بے شرم ہو رہی ہے۔ بھئی شریف گھرانوں کی بہو بیٹیوں کے نام اونچی آواز میں لیتے ہیں۔ کوئی سن نہ لے؟"

"یہ تو اور بھی اچھا ہوتا کہ سب کو پتا چل جائے کہ آج میں جوان ہو گئی کل سے گلستان ہو گئی۔" میں نے شرم سے کہا۔ تو سب کھلکھلا اٹھیں۔

"اے خدا کی مار بی بی کیا دیدے کا پانی مر گیا ہے۔ لالہ ہو والے نے یہاں پڑھنے بھیجا ہے گندی باتیں کرنے نہیں۔"

"اے لو اس میں گندی باتیں کہاں سے آ گئیں۔ ارے بھئی کیا میں جوان نہیں ہوں؟ بچی ہوں۔ بولو۔" میرا انداز مصنوعی جارحانہ تھا جیسے میں جواب نہیں دے رہی لڑ رہی ہوں۔

عائشہ منہ بنا کر بیٹھے جا رہی تھی۔ بوا کو چھیڑنے میں مزہ آتا تھا۔ سنا تھا کہ ان کا تعلق لکھنؤ کے کسی نواب گھرانے سے تھا۔ حالات نے انہیں یہاں چچا جان بنا دیا تھا۔ بولتی بہت تھیں۔ ہم بھی مزہ لیتے۔ اس وقت بھی ان کو چھیڑ رہی تھی اور وہ اپنے مخصوص انداز میں پیشانی پر ہاتھ مار کر بولی "یہ سب قرب قیامت کی نشانی ہے۔ اللہ بس اب موت دے دے۔ یہ سب ہم سے نہیں دیکھا جا رہا ہے۔"

"واہ بوا خوب کہی۔ میں نے کل ہی پتنگ ڈوری وہ بھی ریشمی خریدی ہے کہو تو نکال دوں؟"

"ریشمی ڈوری کا کیا کرنا ہے؟"

"پھانسی لگا کر مر جانا ہے۔"

"مریں میرے دشمن میں کیوں حرام موت مروں۔ ہائے اللہ کیسا زمانہ آ گیا ہے۔ سب قرب قیامت کی نشانی ہے۔"

"قیامت تو جب آئے گی تب آئے گی مگر یہ تو بولو تم کیسے آئیں؟"

"ہائے اللہ میں تو بتانا ہی بھول گئی ہائے کیسے بتاؤں۔"

"اب بتا بھی چکو بولو کیا کہنا ہے؟" عائشہ جل کر بولی۔

"بڑی منحوس خبر ہے۔"

"آں منحوس خبر؟ کون سی خبر؟"

"ارے وہی وہ تار والا آیا بیٹھا ہے جا کے لے لو۔" اس نے عائشہ کی طرف جھک کر کہا۔

"تار!" وہ بھی چونک گئی۔ اس لیے کہ اس دور میں ٹیلی گرام کسی بڑی بات پر ہی کیا جاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ سیدھی سادی عورتیں ٹیلی گرام کا مطلب موت کی خبر سمجھتی تھیں۔ عائشہ بھی گھبرا اٹھی تھی اور تقریباً بھاگتی ہوئی نیچے پہنچی تھی۔ کچھ دیر بعد لوٹی تو اس کے ہاتھ میں ٹیلی گرام تھا اور چہرے پر مسکراہٹ۔ چہرے کی رونق دیکھ کر ہماری جان میں جان آئی کہ اچھی خبر ہے۔

"کیوں بھئی کیا خبر ہے؟" میں نے پوچھا۔
"سنو گی تو تم بھی پھڑک اٹھو گی۔" عائشہ نے واہنی آنکھ دبا کر کہا پھر ٹیلی گرام میری طرف بڑھا دیا۔
میں نے ایک نظر کاغذ پر ڈالی پھر پوچھا۔ "ارے... یہ کون صاحب ہیں؟ تمہارے وہی تو نہیں ہیں۔"
"ہاں، وہی ہیں، میرے تایا زاد۔ ڈاکٹر ہیں اور سنتے ہیں ناک پر مکھی تک بیٹھنے نہیں دیتے۔"
"تمہاری سیٹ جو کنفرم رکھتا تھی اسی لیے اب تم شوق سے بیٹھنا۔" میں نے جملہ چست کیا۔
"گھر والوں سے یہ تو پوچھو اتنی جلدی بھی کیا ہے۔" میں نے کہا۔
"گزشتہ بار جب گھر گئی تھی تو سننے میں آیا تھا کہ محترم امریکا جانے والے ہیں۔ مزید کوئی ڈگری وگری لینی ہے۔"
"تو کیا تو بھی جائے گی... ہائے تمی بنی بنی۔" میں ردھم میں بولی۔
"ولایت جاتی ہیں ولایت والی۔ میں تو ان کے گھر میں بیٹھ کر ان کی اماں کی جوتیاں نکالوں گی۔ چولہا پھونکوں گی، ڈگری جلا کر کھانا پکاؤں گی فی زمانہ ماشاءاللہ۔" عائشہ نے ناک پھلا کر جواب دیا۔
"ہائے ہائے گزاری کو دیکھو کیسے پٹر پٹر بولے جا رہی ہے۔ سید شریف گھرانے کی لڑکیاں ایسے نہیں بولتیں۔" میں نے اس کی پیٹھ پر دھپ مار کر بوا کے لہجے کی نقل اتاری۔
"پھر کیسے بولتی ہیں ذرا بول کر سناؤ ناں!" عائشہ جو پیچھے رہنے والی تھی اس نے میری تھوڑی کو دو انگلیوں سے اٹھا کر کہا۔
"چٹھی ذرا سیاں جی کے نام لکھ دو حال میرے دل کا تمام لکھ دو۔" میں نے اس دور کا مشہور گانا تھپک تھپک کر گانا شروع کر دیا۔
"دور ڈر کر بیٹھی آواز کا جادو دیکھتا ہے۔ تم تو بنگال جاؤ یہاں بھی آج کل وہاں قحط پڑا ہوا ہے۔" میں بولی۔
"ارے بے بنگال جاؤں، بنگال جیسوں کی عورتیں... مردوں کو بھیڑ بنا کر رکھ لیتی ہیں۔" عائشہ نے بڑی بوڑھیوں کی طرح ناک پر انگلی رکھ کر کہا۔
"تو کیا ہوا تم بھی کسی کو بھیڑ بنا کر لے آنا۔" رخسانہ نے لقمہ دیا۔
"نہیں نہیں میں ہوتی تو بھیڑ بنا کر لاتی نہیں وہیں...

جاتی تاکہ شکار آتا رہے۔" دروازے کے سامنے سے گزرتی ہوئی ثریا نے ریب کر کہا۔ شاید وہ گیارے میں کھڑی کن سوئیاں لے رہی تھی۔
"ہائے توبہ!" رخسانہ اپنی تھوڑی پر انگلی رکھ کر بولی۔ "یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ شکار کیا یہاں نہیں ملتے۔"
"بہت اچھے بھئی بہت اچھے!" عائشہ اور میں نے کورس کی شکل میں کہا۔
"ٹھیک کہا بی بی یہاں بھی الوؤں کی کمی نہیں ہے۔ چلتے چلتے ذرا سا نقاب الٹ دو پھر دیکھو اپنے قدموں کی طرف ایک دو نہیں درجن بھر دل پڑے ہوئے ہوں گے۔ بس تمہیں اتنی زحمت کرنا پڑے گی کہ جھک کر کوئی ایک دل اٹھا لو باقی سب کو ٹھوکروں میں اڑا دو۔ ایک خوش ہو کر باقی سب غم و الم میں ڈوب کر تمہارے نام کی مالا جپیں گے۔" ثریا نے پھر جملہ جڑ دیا۔
"اللہ کی مار... کم بختو تم سب کے واسطے جلیں۔ ایسی بے شرمی ہوتی ہو تم سب کے دیدے کا پانی مر گیا ہے۔ توبہ توبہ استغفار توبہ۔" میں نے پھر چچی اماں کی نقل اتاری۔
"ارے بے بچیو! اتنی بے شرمی! یہ کیا پٹر پٹر بولے جا رہی ہو۔ اماں باوا نے یہی سکھایا تھا۔" عائشہ نے بھی چچی اماں بوا کی نقل اتاری۔
دوسرے دن بھی یہی باتیں ہو رہی تھیں۔ چچی اماں کی نقلیں اتاری جا رہی تھیں کہ اتفاق کی بات اسی وقت چچی اماں بوا آ گئیں۔ انہوں نے جو اپنی درگت بنتے دیکھی تو عادت کے مطابق پیشانی پر ہاتھ مار کر بولیں۔ "اے ہے اس پنچم پر چھنکتی گز بھر کی زبانیں نکل رہی ہیں۔ مجھ بڑھیا کا مذاق اڑاتی ہو۔ منہ نہیں ٹیڑھا ہوتا۔"
"ارے بوا وہی میں سوچ رہی ہوں عائشہ کا منہ ٹیڑھا کیوں ہو گیا۔" میں نے واہنی آنکھ دبا کر عائشہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔
عائشہ کھڑے کھڑے دھڑ سے زمین پر گر گئی۔
چچی اماں بوا گھبرا کر دوڑیں۔ "اے بچی تجھے ہوا کیا۔ اے میرے مولا اسے شفا دے۔ کیسی ہے بچی تو بھی کیسی خوب صورت۔ اے مولا اپنے صدقے میں...." پھر وہ مڑ کر ہم سے بولیں۔ "اے کمینو جلدی جلدی دعا کرو کسی کی نظر لگی ہے۔" ساتھ ہی ساتھ وہ اپنے دوپٹے کو جھٹکتی بھی جا رہی تھیں۔
"بوا اس کا منہ!" میں نے کہا۔

عائشہ نے منہ ٹیڑھا کر رکھا تھا۔ اتنی شاندار اداکاری تھی کہ ہم سے ہنسی روکی نہیں جا رہی تھی۔

"ارے ڈھونڈو کچھ کرو بچی پر کسی آسیب کا سایہ ہے۔ لگتا ہے شاہ جنات آئے ہیں۔" پھوپا کہہ رہی تھیں۔

"نہ بوا ناں۔ تمہاری نقل کرنے کا خمیازہ ہے۔ منہ ٹیڑھا ہو گیا۔"

"اللہ میری بچی!" بوا نے اس کے گال تھپتھپائے۔

"میں نے معاف کیا' میرے اللہ معاف کرے۔ ارے لڑکیو کہیں سے سوکھی مرچ لاؤ اس کی نظر اتارنا ہے۔"

سوکھی مرچ جلا کر اس کا دھواں دیا جائے گا یہ سنتے ہی عائشہ نے کراہ کر آنکھیں کھول دیں پھر نقاہت بھری آواز میں بولی۔ "میں کہاں ہوں۔"

"ہائے میری بچی تجھے ہوش آ گیا۔ ہوا کیا تھا؟" بوا بولیں۔

"پتا نہیں بوا! مجھے تو بس اتنا یاد ہے کہ ایک خوبرو جوان رحنا میرے کمرے میں گھس آیا تھا۔"

"اس کے سر پر تاج تھا؟"

"ہاں بوا ہیرے جڑے تاج سے مرصع تھا۔ اس نے......"

"ضرور وہ شاہ جنات ہوگا۔" بوا نے کہا۔

"ہاں اس نے اپنا نام "توسجوتوس شاہ توس" بتایا تھا۔ کہہ رہا تھا تو نے پھر کبھی میری بوا کی نقل کی تو میں تجھے اٹھا کر لے جاؤں گا۔"

"ہائے اللہ اس نے یہ کہا تھا؟"

"ہاں بوا وہ بولا تھا کہ میں بہت جلد برات لے کر آ رہا ہوں۔"

"ہائے اللہ کس سے شادی کرے گا؟"

"تم سے اور کس سے۔"

"اللہ نبی محافظ ایسا تو نہ کہو۔" بوا نے شرما کر کہا۔ توقف کے بعد پیشانی پر ہاتھ مار کر بولیں۔ "ارے ہاں میں تو بھول گئی۔ عائشہ کو لینے اس کے گھر والے آئے ہیں۔"

اس خبر نے ہماری چوکڑی ہلا دی۔ عائشہ اپنا حلیہ درست کر کے نیچے چلی گئی۔ ہم سے بھی اوپر ٹھہرا نہ گیا اور ہم بھی نیچے اتر آئے۔

میٹرن کے دفتر میں عائشہ کے ابو اور ایک نوجوان بیٹھا تھا۔ وہ لوگ اجازت نامہ بنوا رہے تھے اور میٹرن امتحانوں کی وجہ سے کچھ مہینے مزید چھوڑ دینے کو کہہ رہی تھی مگر وہ لوگ ماننے پر تیار نہ تھے۔ ہمارا دل بھر آیا۔ خود عائشہ بھی نمناک نگاہوں سے رخصت ہوئی۔

عائشہ چلی گئی۔ امتحان سے پہلے ہی اسے اٹھا لیا گیا تھا۔ پھر کچھ دنوں کے بعد شادی کارڈ بھی آ گیا۔ لاہور اتنی دور تھا کہ ہم سب چاہ کر بھی شادی میں جا نہ سکیں۔

"اب ہماری چنڈال چوکڑی میں رخسانہ اور ثریا رہ گئی تھیں۔ زندگی اسی روٹین سے چلنے لگی تھی۔ کالج اور ہاسٹل اسی کے گرد زندگی گزر رہی تھی کہ ایک دن میری زندگی میں طوفان دبے قدموں آ گیا۔ ہوا یوں تھا کہ میں نے محسوس کیا کہ کوئی میرا پیچھا کر رہا ہے۔ دوسرے اور پھر تیسرے دن بھی اسی گاڑی کو اپنے پیچھے آتے دیکھ کر میں کچھ خوفزدہ ہو گئی تھی۔ ہاسٹل اور کالج کے درمیان بہت کم فاصلہ تھا مگر مجھے ایسا لگتا جیسے راستہ بہت طویل ہو گیا ہے۔ میں خوفزدہ رہنے لگی تھی۔ ثریا اور رخسانہ کے ڈپارٹمنٹ الگ تھے اس لیے ان کی کلاسز بھی الگ تھیں۔ وہ میرے بعد آف ہوتی تھیں اس لیے میں اکیلی آتی پھر میرے لیے یہ بات نئی بھی نہیں تھی۔ واپسی پر اکثر ایسا ہوتا تھا۔ کالج کے گیٹ پر کھڑا کوئی نہ کوئی منچلا مختلف اشاروں کنایوں کے ذریعے اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرتا' بعض اوقات تو وہ پیچھے پیچھے ہاسٹل تک بھی آ جاتا تھا مگر میں نے کبھی ایسے لوگوں پر توجہ نہیں دی تھی۔ جانتی تھی کہ کالج کے باہر اکثر بڑے گھرانوں کے بگڑے ہوئے نوجوان اپنی بڑی بڑی گاڑیوں میں آتے ہیں۔ لڑکیوں کو بیوقوف بنا کر اپنا وقت حسین کرتے ہیں۔ اکثریت محض دل بہلانے اور وقت گزاری کے لیے لڑکیوں سے دوستی کرتے ہیں مگر یہ لڑکا صرف اور صرف مجھے گھورتا تھا۔ یہ بات میں نے ثریا کو بتائی تو اس نے کہا۔ "اتنے دن ہو گئے مگر تمہارے اندر کی چینٹو ڈر نہیں پائی ہے۔ حالات کا مقابلہ کرنا سیکھو۔ وہ ایک بار دیکھے تو تم اسے گھور کر دیکھو۔ لڑکے اس وقت شیر ہوتے ہیں جب لڑکی کو کمزور جانتے ہیں۔ تم خود کو مضبوط ثابت کرو وہ خود ڈر کر بھاگ جائے گا۔"

اگلے دن جب میں نے دیکھا کہ وہ گاڑی میرے پیچھے آ رہی ہے تو میں نے خود کو مطمئن ظاہر کرنے کے لیے شانِ بے نیازی سے گردن کو جھٹکا دے کر ایک ادا سے گاڑی والے کو دیکھا اور اپنے ہاسٹل کے گیٹ میں داخل ہو گئی۔

اگلے دن وہ ٹویوٹا پھر پیچھے آ رہی تھی۔ میں نے اب تک غور سے اس لڑکے کی شکل تک نہیں دیکھی تھی۔ اس دن ہاسٹل میں داخل ہوتے وقت میں نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے

لڑکے کو بغور دیکھا۔ وہ لڑکا پرشوق نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا جائزہ لیا۔ وہ مردانہ وجاہت کا مکمل نمونہ تھا۔ سفید رنگت پر گھنی مونچھیں، کشادہ پیشانی، براؤن بال سیاہی مائل بھوری آنکھوں میں مجھے عجیب سی کشش محسوس ہو رہی تھی۔ پتا نہیں کیوں وہ لڑکا مجھے اچھا لگا اور میرے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اس مسکراہٹ سے حوصلہ پا کر لڑکا بھی بے اختیار مسکرا دیا اور میں سر جھٹک کر گیٹ میں داخل ہو گئی۔

رات کو بھی نہ جانے کیسے وہ خوب رو نوجوان میرے خیالوں میں در آیا۔ میں دیر تک اسی کے بارے میں سوچتی رہی اور کروٹیں بدلتی رہی۔ پھر نہ جانے کب نیند آ گئی۔

دوسرے دن کالج میں بھی بار بار اس لڑکے کا خیال آتا رہا مگر میں نے اس کا تذکرہ کسی سے نہ کیا۔ میں جانتی تھی، وہ سب اتنا میرا مذاق اڑاتیں کہ تم تو ہمیشہ اس قسم کے لڑکوں کو چھچھورا اور لفنگا کہتی تھیں، آج خود ہی اس لڑکے کی تعریف کر رہی ہو۔

چھٹی کے وقت حسب معمول وہ کالج کے گیٹ پر موجود تھا۔ میں اسے دیکھ کر بے اختیار مسکرانے لگی۔ پھر جلدی سے مڑی اور اپنے ہاسٹل کی طرف روانہ ہو گئی۔ مجھے احساس تھا کہ وہ نوجوان بہت سست روی سے پیچھے آ رہی ہے۔

قدرے سنسان علاقے میں گاڑی اچانک نزدیک آ کر رک گئی اور نوجوان نے بہت شائستہ انداز میں مجھے مخاطب کیا۔ ”سنیے!“

میں ٹھٹک گئی۔ دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ ”جی فرمایئے؟“

جواب میں نوجوان نے ایک معروف مارکیٹ کا پتا پوچھا تو میں بے اختیار مسکرانے لگی۔ وہ اتنی معروف مارکیٹ تھی کہ دوسرے شہر کے لوگ بھی اس کے محل وقوع سے واقف تھے۔

”آپ کو کوئی معقول بہانا نہیں ملا بات کرنے کا؟“ میں ہنس کر بولی۔

اس انداز گفتگو پر نوجوان بھی مسکرایا اور مسکین سی شکل بنا کر بولا۔ ”آپ کو دیکھ کر میں سب کچھ بھول جاتا ہوں۔ کوئی معقول بہانا سوجھا ہی نہیں۔“ پھر وہ مسکرا کر شائستہ لہجے میں بولا۔ ”ویسے مجھے احسن کہتے ہیں اور آپ......“

”سوری!“ میں نے کہا۔ ”میں پہلی ملاقات میں اجنبیوں سے بے تکلف نہیں ہوتی۔“

”اب ہم اجنبی کہاں رہے۔“ نوجوان مسکرا دیا۔ پھر جیب سے اپنا وزیٹنگ کارڈ نکال کر میری طرف بڑھایا۔ ”یہ میرا وزیٹنگ کارڈ ہے۔ اس میں میرے گھر اور آفس کے ٹیلی فون نمبرز موجود ہیں۔“

نہ جانے کس جذبے کے تحت میں نے کارڈ اس سے لے لیا۔ احسن نے مسکرا کر گاڑی آگے بڑھا دی۔

ہاسٹل کے کمرے میں آنے کے بعد میں نے غور سے کارڈ کا جائزہ لیا۔ ”احسن علی، منیجنگ ڈائریکٹر گرین لینڈ بلڈرز۔ کارڈ کے ایک کونے میں فون نمبرز، فیکس نمبرز اور ای میل ایڈریس تھا۔ ہیڈ آفس کے فونز کی تین لائنیں تھیں، کارڈ کے دائیں طرف گھر کے تین ٹیلی فون نمبرز لکھے تھے۔ ان میں سے ایک کے آگے پین سے ”پرسنل“ لکھا ہوا تھا۔

میں نے چاہا کہ کارڈ ہوا میں اچھال دوں یا اس کے ٹکڑے کر دوں مگر ایسا نہ کر سکی۔ رات کو پڑھنے بیٹھی تو نہ جانے کیسے مجھے احسن کا خیال آ گیا۔ ”اونہہ!“ میں نے منہ بنا کر کہا۔ ”اپنا کارڈ دے کر سمجھ رہا ہے کہ میں اس کی دولت سے مرعوب ہو جاؤں گی۔“ پھر مجھے ایسا لگا...... ایسا لگا جیسے اس کی خوب صورت براؤن آنکھیں اس وقت بھی مجھ پر مرکوز ہیں۔ میں نے سر جھٹک کر اس کے خیال سے پیچھا چھڑانا چاہا مگر وہ تو جیسے ذہن پر چھا گیا تھا۔

”مائی فٹ!“ میں نے جھنجلا کر کتاب بند کر دی اور لائٹ آف کر کے سونے کی کوشش کرنے لگی۔

دوسرے دن کالج میں ثریا اپنے منگیتر کی باتیں کرتی رہی۔ وہ اس کا فرسٹ کزن اور آرمی میں کیپٹن تھا۔ ایک دن پہلے ہی وہ چھٹی پر آیا تھا۔

”تو کس سوچ میں گم ہے؟“ ثریا نے مجھے مخاطب کیا۔

میں چونک کر بولی۔ ”نہیں تو...... میں تو...... تمہاری باتیں سن رہی ہوں۔“

”بکواس!“ ثریا نے کہا۔ ”تو نے ایک لفظ بھی نہیں سنا ہے۔“ پھر وہ سنجیدہ ہو کر بولی۔ ”کوئی پرابلم ہے؟“

”نہیں...... پرابلم تو...... نہیں ہے... مگر......“ کہتے کہتے رک گئی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے احسن کے بارے میں کیسے بتاؤں۔

”مگر کیا؟“ ثریا نے پوچھا۔ ”بتا نا آخر کیا پرابلم ہے۔ شیئر کرنے سے پرابلم کم ہی ہوتے ہیں، بڑھتے نہیں ہیں۔“

میں نے طویل سانس لیا اور اسے احسن کے بارے

میں سب کچھ بتا دیا۔

"اس کا وزیٹنگ کارڈ کہاں ہے؟" ثریا نے کہا۔ "اگر واقعی وہ اتنے بڑے بزنس کا مالک ہے تو ابھی معلوم ہو جائے گا۔ لڑکے عموماً اپنے کسی دوست کی گاڑی مانگ لاتے ہیں اور کارڈ تو کوئی بھی چھپوا سکتا ہے۔"

"مگر وہ ایسا نہیں ہے۔" میں نے بے ساختہ کہا۔

"اوہو... " ثریا ہنس کر بولی۔ "گویا آگ دونوں طرف لگی ہوئی ہے۔ ابھی معلوم کر لیتے ہیں کہ موصوف واقعی ایم ڈی ہیں یا جھوٹ بول کر تجھے پھنسا رہے ہیں۔" یہ کہہ کر ثریا نے میرا ہاتھ پکڑا اور کینٹین کے فون کو استعمال کرنے کے لیے کاؤنٹر پر پہنچ گئی پھر کارڈ سے دیکھ کر اس کے ہیڈ آفس کا نمبر ملانے لگی۔ اس دور میں موبائل فون کا تصور بھی نہیں تھا اس لیے ہر کوئی کینٹین کا فون استعمال کرتا تھا۔ ایک دو بار کی کوشش میں وہ کامیاب ہو گئی۔

دوسری طرف سے ایک مترنم آواز سنائی دی۔ "زرین لینڈ ہولڈرز!"

"کڈ یو پلیز پٹ می آن ٹو مسٹر احسن علی۔"

"ہولڈ آن پلیز!" آپریٹر نے کہا۔ پھر فون پر موسیقی کی آواز ابھرنے لگی۔ چند لمحوں بعد ایک بارعب آواز سنائی دی۔ "ہیلو احسن ہیئر اسپیکنگ!"

"مسٹر احسن! میں ندا ہوں۔" ثریا نے ڈھٹائی سے جھوٹ بولا۔ "حال ہی میں بی اے کیا ہے۔ کیا مجھے آپ کی کمپنی میں جاب مل سکتی ہے؟"

"مس ندا!" احسن نے شائستگی سے کہا۔ "جاب کے سلسلے میں جی ایم صاحب کو علم ہوگا۔ میں ان سے پوچھ کر ہی کوئی جواب دے سکتا ہوں۔ آپ اپنی ایپلی کیشن دے دیں۔ ویکنسی ہوئی اور آپ اس کی اہل بھی ثابت ہوئیں تو آپ کو جاب مل جائے گی۔"

"تھینک یو سر!" ثریا نے کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا پھر وہ بولی۔ "وہ واقعی زرین لینڈ ہولڈرز کا مالک ہے۔ ان کی یہ بات جھوٹ نہیں ہے۔" پھر وہ مسکرا کر بولی۔ "اگر وہ تجھ میں دلچسپی لے رہا ہے تو تجھے بھی یہ موقع ضائع نہیں کرنا چاہیے۔"

میں ہاسٹل پہنچی تو کھوئی کھوئی سی تھی۔ اس دن بھی احسن مجھے ہاسٹل تک چھوڑ کر گیا تھا۔

رات کو پڑھنے بیٹھی تو اچانک بوا آ گئی۔ انہوں نے آتے ہی اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ "اے ہے اس عمر میں اب اور سیڑھیاں نہیں چڑھا جاتا، پیر جواب دینے لگے ہیں۔"

"فکر نہ کریں۔ بس دو چار دن کی بات ہے پھر تو چھٹیاں ہی چھٹیاں ہوں گی اور تب آپ ہمیں بھول سے بھی یاد نہیں کریں گی۔"

"اے لو میں کیوں یاد نہیں کروں گی۔ تم ہی لوگوں میں وقت گزرا ہے۔ جتنی لڑکیاں چلی گئیں کیا میں ان کو یاد نہیں کرتی؟"

"مگر جانے والیاں یاد نہیں کرتی ہوں گی۔"

"وہ ان کا ظرف ہے میں اتنی کم ظرف نہیں ہوں۔ سب کو یاد رکھتی ہوں۔ اللہ جنت نصیب کرے للن کے ابا کو وہ کہتے تھے اچھے لوگ وہ ہوتے ہیں جو برے دن کو یاد رکھتے ہیں برے دن کے ساتھیوں کو یاد رکھتے ہیں لیکن تم نے یہ بات کیوں کہی؟"

"ارے بوا تم بھی ... یاد نہیں ہے ایک بار عائشہ نے کہا نہیں تھا۔ اس دن جب اس کا منہ ٹیڑھا ہو گیا تھا کہ اس کو شاہ جنات نظر آئے تھے؟"

"ہاں ہاں یاد آ گیا۔" بوا نے مخصوص انداز میں سر پر ہاتھ مار کر کہا۔

"شاہ جنات نے بھی تو کہا تھا کہ وہ بارات لے کر آ رہے ہیں۔" میں نے ہنسی دباتے ہوئے کہا۔

"ارے ہٹو!" بوا نے شرماتے ہوئے کہا۔ "اب بھری عمر ہے ان چونچلوں کی۔"

"ارے بوا جنات بھی کیا چھوٹی عمر کے ہوتے ہیں۔ پانچ پانچ سو سال کے ہوتے ہیں۔"

"اب اور بناؤ۔ تمہیں ... ارے ہاں یاد آیا میں یہ کہنے آئی تھی کہ آفس میں ٹیلی فون آ رہا ہے۔"

میں بھاگتی ہوئی گئی کہ بھائی کا فون ہوگا مگر دوسری طرف کی آواز سنتے ہی ایک جھٹکا سا لگا۔

دوسری طرف احسن تھا۔ "میں احسن ہوں، دیکھو فون بند مت کرنا۔" اس نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔

"مگر آپ کو میرا فون نمبر کہاں سے مل گیا؟" میں نے حیرت آمیز خفگی سے پوچھا۔

"ڈھونڈنے سے تو خدا بھی مل جاتا ہے۔ ہاسٹل تو دیکھا ہوا ہے۔" وہ ہنس کر بولا۔

"آپ آخر مجھ سے چاہتے کیا ہیں؟" میں الجھ کر بولی۔

"میں تمہیں چاہتا ہوں۔ میں تم سے شادی کرنا

چاہتا ہوں۔ بچپن سے جس جیون ساتھی کا خواب دیکھتا تھا وہ اچانک ہی نظر آ گئی۔ اب میں تمہیں کھونا نہیں چاہتا۔" اس نے اچانک ہی کہہ دیا۔ "بولو کیا تم میرا ساتھ دو گی؟"

میرے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ دل گویا اچھل کر حلق میں دھڑکنے لگا۔ چند لمحے تک تو میں کوئی جواب ہی نہ دے سکی۔

"کیا ہوا؟" احسن نے پرتشویش لہجے میں پوچھا۔ "کیا تمہیں میری بات اتنی بری لگی ہے کہ تم اس کا جواب بھی نہیں دینا چاہتیں۔ میں کسی زور زبردستی کا قائل نہیں ہوں۔ تمہارا جواب اگر نفی میں ہے تو یہ بھی مجھے گوارا ہے۔ آئندہ تم مجھے کبھی نہیں دیکھو گی۔"

"یہ...... بات نہیں ہے احسن صاحب.... دراصل...... مجھے...... زمانے سے... خوف آتا ہے..... آپ کا کیا ہے...... آپ تو......"

"پلیز!" اس نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔ "تم ایک دفعہ مجھ پر اعتبار کر کے دیکھو۔"

پھر احسن کی باتوں سے آہستہ آہستہ میری جھجک دور ہو گئی اور میں بھی کھل کر بات کرنے لگی۔

اب احسن نے پیچھا کرنا چھوڑ دیا تھا بس روزانہ فون پر بات ہو جاتی تھی بعض اوقات میں بھی اسے فون کر لیتی تھی۔ اب مجھے احسن کی عادت سی پڑ گئی تھی۔

"اسی دوران میں احسن نے مجھ سے ملنے کی خواہش کا اظہار کر دیا۔ میں پہلے تو کچھ جھجکی پھر راضی ہو گئی۔ وہ سارا دن ہم نے سمندر کے کنارے ایک الگ تھلگ گوشے میں گزارا۔ اس دن وہ کھلا کہ میری شکل اس کے کسی عزیز سے بہت زیادہ ملتی ہے۔ اسی مماثلت نے اسے ایسی احمقانہ جیسی حرکت پر اکسا دیا اس نے صاف صاف کہا کہ ہمارے تمہارے درمیان... کا بہت بڑا فرق ہے پھر بھی میں تمہیں اپناؤں گا۔"

اس سچ بیانی نے میری نظروں میں اس کا وقار بڑھا دیا اور پھر تو ہم اکثر ملنے لگے۔ میں احسن کی شرافت کی قائل ہو گئی۔ کسی بھی ملاقات میں اس نے کوئی چھچھوری حرکت نہیں کی تھی۔

اب تو میں خود کو احسن کی ملکیت سمجھنے لگی تھی۔ حتیٰ کہ اگر وہ اپنی امی یا بہنوں کی تعریف بھی کرتا تھا تو مجھے بہت ناگوار گزرتا۔

اس دن موسم ابر آلود ہو رہا تھا۔ احسن شہر سے دور اپنے ایک کاٹیج میں مجھے لے گیا۔ وہاں ہم لوگ اکثر آتے رہتے تھے۔

اچانک سیاہ بادل چھا گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ پھر زوردار انداز میں بجلی کڑکی تو میں سہم کر احسن سے لپٹ گئی۔ میں بچپن ہی سے بجلی کی کڑک سے خوف زدہ ہو جایا کرتی تھی۔ عین اس وقت لائٹ بھی چلی گئی۔ میرے لباس سے اٹھتی ہوئی مسحور کن مہک اور اس کی قربت نے احسن کو گویا پاگل کر دیا۔ پھر وہ کچھ ہو گیا جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔

جذبات کا طوفان تھما تو میں بے اختیار سسکنے لگی۔ احسن بھی شرمندہ شرمندہ سا سر جھکائے بیٹھا تھا۔ پھر اس نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "پلیز! مجھے غلط مت سمجھنا ورنہ میں خود کو معاف نہیں کر پاؤں گا اور اپنی جان دے دوں گا۔ مجھے اس تصور ہی سے وحشت ہو رہی ہے کہ۔"

"قصوروار تو میں بھی ہوں!" میں اس کے جنونی انداز سے ڈر گئی۔ "بس تم مجھے کبھی خود سے جدا مت کرنا۔"

"ایسا کبھی نہیں ہوگا۔" احسن نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ اسی دن اس نے ایک اور اہم کام انجام دے دیا۔ واپسی میں مجھے بینک میں لے کر گیا اور میرا اکاؤنٹ کھلوا دیا۔ میں نے وجہ پوچھی تھی تو وہ بولا تھا کہ یہ میری غلطی کا خمیازہ ہے۔ جب میں نے چڑ کر کہا تھا کہ کیا یہ بڑا سا پیسہ میری قیمت ہے تو وہ ہنس کر چپ ہو گیا تھا۔

اسی دوران ایک اور اہم واقعہ رونما ہو گیا۔ بھائی بغیر اطلاع کے شہر آ گئے۔ ان کے ساتھ ان کے بچپن کی منگ شاشا بھی تھی۔ اس نے بتایا کہ وہ دونوں شادی کے بندھن میں بندھ چکے ہیں۔

اس اطلاع پر میں حیران رہ گئی تھی۔ کیوں کہ مجھے معلوم تھا کہ بھائی ابھی شادی پر آمادہ نہیں تھے ان کا کہنا تھا کہ پہلے وہ میری شادی کرائیں گے پھر اپنی کریں گے۔ جب میں گوٹھ میں تھی اسی وقت شاشا کے والد نے ان سے کہا تھا کہ اب وہ بیٹی کو زیادہ دن بٹھا نہیں سکتے۔ بھائی نے انہیں کورا جواب دے دیا تھا کہ میں ابو امی کی روح کو تکلیف نہیں پہنچانا چاہتا ہوں، پہلے بہن کو رخصت کروں گا پھر اپنی شادی کروں گا پھر ایسا کیوں کیا؟ یہ الجھن ستانے لگی تھی کہ شاشا نے بتایا۔ "دراصل میں خطرے میں گھر گئی تھی۔ اسی لیے تمہارے بھائی نے جلد بازی کی ہے۔"

"کیسا خطرہ؟" میں نے پوچھا تھا۔

"قسمت کی خرابی! عید کے دن میں سائیں بھلاول کے یہاں سویوں کی نذر دے کر چلی گئی تھی۔ بس سائیں نے مجھے دیکھا اور بابا کے پاس دھاڑیل بھیج دیے کہ میں اس کی حویلی کے کام کر دیا کروں۔ یہ خبر تمہارے بھائی کو ملی تو وہ راتوں رات مجھے ساتھ لے کر شہر آگیا۔ کورٹ میں شادی رجسٹر کرائی گویا وہ مجھے کام کرنے کو یہاں آیا ہے۔"

شاشا خوش تھی مگر میں سمجھ گئی تھی کہ اب بھائی کا گاؤں میں رہنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔

تین چار دن بعد بھائی گوٹھ چلے گئے۔ جب تک بھائی شہر میں تھے میں نے احسن سے رابطہ نہیں رکھا تھا۔ جیسے ہی وہ گئے میں نے پہلا کام کیا کہ اسے خبر دے دی کہ وہ گلشن آکر مجھ سے ملے۔

وہ خبر ملتے ہی آگیا۔ کچھ دیر تو ہم اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے پھر اس نے بڑے پیار سے کہا "اب زیادہ انتظار اور دوری مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔"

"تو پھر اپنی امی اور بہنوں کو ہمارے گوٹھ بھیج دو ہر کام ترو بہ بار جلدی ہونا چاہیے۔"

"اور اگر تمہارے بھائی نے انکار کر دیا تو؟" احسن نے خدشے کا اظہار کیا۔

"ایسا کبھی نہیں ہوگا؟" میں نے اعتماد سے کہا۔ "وہ میری پسند کو کبھی نہیں ٹھکرائیں گے۔"

"تو پھر ٹھیک ہے اگلے سنڈے کو میں امی کو تمہارے ہاسٹل بھیجوں گا تاکہ وہ بھی میری پسند کو دیکھ لیں۔" اس نے والہانہ انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

ابھی اتوار میں چار دن باقی تھے۔ میں نے سوچا تھا کہ کوئی مناسب موقع دیکھ کر گوٹھ کے پوسٹ آفس فون کروں گی اور شاشا کو بلوا کر اس سلسلے میں اس سے بات کرلوں گی۔

کالج میں چھٹی تھی۔ میں شام کے چار بجے تک بور ہوتی رہی۔ اسی دوران میں ثریا نے پروگرام پیش کیا۔ "یار! اتنا خوب صورت اور سہانا موسم ہے اور تم اپنے کمرے میں گھسی ہوئی ہو چلو تیار ہو جاؤ۔ مجھے کچھ شاپنگ کرنا ہے اور آج کھانا بھی باہر ہی کھائیں گے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ آج گھر سے پیسے آگئے ہیں؟" میں نے ہنس کر پوچھا۔

"تمہارا اندازہ سو فیصد صحیح ہے۔"

میں نے سوچا، کچھ اچھا ہے ہی کر لیا جائے۔ میں گزشتہ کئی روز سے بازار نہیں گئی تھی۔

ہم دونوں شاپنگ کے لیے طارق روڈ پہنچے۔ ثریا کے ساتھ ساتھ میں نے بھی تھوڑی بہت شاپنگ کرلی۔ وہ شاپنگ سے فارغ ہوئی تو سامنے ہی آئس کریم پارلر تھا۔ ثریا مجھے لے کر آئس کریم پارلر میں چلی گئی۔

ابھی میں نے آئس کریم کھانا شروع کیا ہی تھا کہ میری نظر اپنی دائیں جانب اٹھ گئی۔

وہاں کا منظر دیکھ کر میری آنکھیں پتھرا گئیں۔ میں سکتے کی حالت میں اس طرف دیکھتی رہ گئی۔

ثریا نے بھی میری کیفیت کو محسوس کرلیا اور میری نظروں کے تعاقب میں گھوم کر دیکھا۔ احسن ایک خوب صورت سی لڑکی کے ساتھ وہاں بیٹھا تھا۔ وہ اسے بہت محبت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے کوئی بات کہی تھی اور لڑکی کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔ وہ لڑکی بلاشبہ بلا کی حسین تھی۔ چہرے پر معصومیت تھی اور انداز میں عجیب سا بانکپن تھا۔

میں چند لمحے گم صم سی ان دونوں کو دیکھتی رہی پھر ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ارے بیٹھ! اپنی آئس کریم تو ختم کرلو۔" ناہید نے اسے بہلانا چاہا۔ وہ جانتی تھی کہ اب میں عالم جنون میں کچھ بھی کر گزروں گی۔ میری فطرت سے واقف جو تھی۔ میں تیزی سے آئس کریم پارلر کے داخلی دروازے کی طرف بڑھی تو وہ بھی میرے پیچھے لپکی۔

"کہاں جا رہی ہو پتا؟" ثریا نے پوچھا۔

"میں ہاسٹل جانا چاہتی ہوں، تم آرام سے آنا۔ میں ٹیکسی میں چلی جاؤں گی!" میں تیز لہجے میں بولی۔

"چھوڑو چھوڑو گاڑی میں مگر یوں چیخ پکار کر کے اپنا تماشا تو مت بناؤ۔"

ہاسٹل آنے کے بعد میں اپنے کمرے میں بند ہوگئی اور یوں بلک بلک کر روئی جیسے کسی قریبی عزیز کی موت ہوگئی ہو۔ موت تو ہوئی تھی میرے اعتماد کی، میرے غرور اور پندار کی۔ روتے روتے مجھے خیال آیا کہ میں اتنی گئی گزری اور گری پڑی تو نہیں ہوں کہ ایک بے وفا شخص کے لیے آنسو بہاتی رہوں۔ یہ سوچ کر میرا دل کچھ سنبھل گیا اور میرا دل اس سے انتقام لینے کے لیے اکسانے لگا۔ میں ایک عزم سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

شام میں احسن کا ٹیلی فون آیا مگر میں نے چپراسن سے کہلوا دیا کہ میں سو رہی ہوں۔ میں ایسے بے وفا شخص سے بات کرنا بھی اپنی توہین سمجھتی تھی۔ دوسرے دن بھی یہی ہوا۔

اتوار کو احسن کے ابو مسٹر خان اور ان کی بیگم ہاسٹل پہنچ گئے۔ میٹرن، بیگم خان کی شناسا تھیں۔ انہوں نے پُرتپاک انداز میں ان کا خیر مقدم کیا۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد جلد ہی وہ حرفِ مدعا زبان پر لے آئیں۔ میں دروازے کے پاس کھڑی ان کی باتیں سن رہی تھی۔ مجھ سے ضبط نہ ہوسکا اور میں پردہ اٹھا کر آفس روم میں داخل ہوگئی۔

پھر میں انتہائی ناشائستہ انداز میں بولی۔ ”میں آپ کے بیٹے سے شادی نہیں کرسکتی۔ اس میں ایسی کوئی خوبی نہیں ہے کہ مجھ جیسی لڑکی اس کے ساتھ شادی کرے۔“

وہ بے چاری اپنا سا منہ لے کر رہ گئیں۔ میٹرن نے میرے لہجے پر سرزنش کی کہ مہمانوں سے اس انداز میں بات کی جاتی ہے؟

مگر میں پیر پٹختی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

رات کو احسن کا فون آگیا۔ اس دفعہ میں نے اس سے بات کرنے کا فیصلہ کیا اور ریسیور اٹھالیا۔

”تمہیں انکار ہی کرنا تھا تو پہلے ہی کردیتیں، میری امی کو بے عزت کرنے کی کیا ضرورت تھی؟“ احسن نے غصے سے کہا۔

”میں نے انکار کیوں کیا ہے، یہ نہیں پوچھوگے؟“ میں نے زہرخند سے کہا۔ ”وفا کا دم مجھ سے بھرتے رہے اور محبت کی پینگیں کسی اور کے ساتھ بڑھاتے رہے۔“

”یہ کیا بکواس کررہی ہو؟“ احسن بھی چیخ کر بولا۔

”یہ بکواس ہے تو پھر پرسوں طارق روڈ کے آئس کریم پارلر میں تمہارے ساتھ وہ کون تھی جس سے تم انتہائی لگاوٹ سے باتیں کررہے تھے؟“

”اچھا وہ..... وہ تو۔“

”بس!“ میں چیخ کر بولی۔ ”اب میں ایک لفظ بھی نہیں سن سکتی۔“

”میری پوری بات تو سن لو پھر تمہیں بھی...“

”شٹ اپ!“ میں نے اسے بری طرح جھڑک دیا۔ ”اور آئندہ کبھی مجھے فون کرنے یا مجھ سے ملنے کی کوشش مت کرنا۔“

”کیا یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے؟“ احسن بھی سرد لہجے میں بولا۔

”ہاں، یہ میرا آخری فیصلہ ہے، میں تم جیسے چھچھورے انسان سے کوئی رابطہ نہیں رکھنا چاہتی۔“ یہ کہہ کر میں نے ریسیور کریڈل پر پٹخ دیا۔

وہ بھی ضد کا پکا تھا اس نے بھی پھر مڑ کر خبر نہ لی۔ ایک دن ثریا سے اس کی ملاقات ہوگئی تو وہ بولا۔ ”انسان کو اپنے مقام سے نیچے نہیں گرنا چاہیے۔ میں جانتی نہیں کیوں اتنا نیچے گر گیا تھا۔ ڈیڈی ٹھیک کہتے ہیں میری کم عمری میری دشمن ہے۔ انسان اپنے مخصوص معاشرے میں ہی بھلا لگتا ہے۔ وہ میرے اسٹیٹس کی ہوتی تو اسے بولنے کی تمیز ہوتی۔ بڑوں سے کیسے باتیں کرتے ہیں اسے علم ہوتا مگر وہ گوٹھ کی پروردہ اسے تمیز کہاں سے آسکتی ہے۔ اجڈ دیہاتی ہمارے معاشرے میں ایڈجسٹ کرہی نہیں سکتی تھی پھر ایسی لڑکی جو میرے والدین کی بے عزتی شادی سے پہلے کردے اس سے رابطہ رکھنا بھی بے عزتی ہے۔“

میں نے بھی توجہ دینا اپنی ہتک سمجھا۔ اسے بھلانے کی کوشش کرنے لگی اور وقت گزرتا رہا۔

یوں ہی تین مہینے گزر گئے۔ ایک روز اخبار پڑھتے ہوئے مجھے شدید ذہنی دھچکا پہنچا۔ ایک تصویر دیکھ کر میں گم صم سی ہوگئی۔ تصویر کے نیچے کیپشن تھا۔ معروف بلڈر احسن خان اپنی دلہن ماریہ اور بہن تانیہ کے ساتھ۔

میں سکتے کی سی کیفیت میں اس تصویر کو دیکھتی رہ گئی۔ تانیہ کو میں پہلی ہی نظر میں پہچان گئی۔ وہ وہی لڑکی تھی جسے میں نے احسن کے ساتھ آئس کریم پارلر میں دیکھا تھا۔ میرا سر چکرانے لگا، وہ احسن کی بہن تھی۔ اب مجھے اپنی جلد بازی اور غصے پر پچھتاوا ہورہا تھا۔ میں نے تو احسن کو صفائی کا موقع بھی نہیں دیا تھا بلکہ اس کی امی کی بھی بے عزتی کردی تھی۔ میں نے اپنی خوشیوں کو خود ہی بربادیوں کی نذر کردیا تھا۔

پچھتاوؤں کی تھکا دینے والی طویل مسافت طے کرنے کے بعد بالآخر میں نے اپنی ذات سے یہ تسلیم کرلیا تھا کہ محبت کو کھو کر میں بڑے خسارے میں رہی ہوں۔ احسن کے بعد مجھے اپنے اور احسن کے رشتے کی حقیقت اور اہمیت کا صحیح معنوں میں ادراک ہوا تھا لیکن اب دیر ہوچکی تھی۔ پہلے میں اپنی ضد اور ہٹ دھرمی میں بے خبر تھی اور اب ادراک کے باوجود اپنی انا کی سربلندی کی خاطر مستقل خود سے جنگ کرتے ہوئے نڈھال ہوئے جارہی تھی۔ میں نے خود ہی احسن کو رد کیا تھا۔ اس کے اور اپنے رشتے کو بے توقیر کیا تھا۔ احسن کی ذات کی توہین کے ساتھ ساتھ اس کی شخصیت کو تسلیم کرنے سے بھی انحراف کیا تھا۔ مگر جلد ہی احسن کے رشتے کی مضبوطی اور پائیداری کا ادراک ہوگیا۔ اس شدت سے منکشف ہوا

تھا کہ میں بیٹے میں رہ گئی تھی اور کرنے کو کچھ بھی نہ رہا تھا۔ اب بہت دیر ہو چکی ہے۔ اب جدائی کی لمبی خلیج درمیان حائل ہو چکی ہے۔ یہ حقیقت تھی کہ احسن محبت بن کر میرے اندر اترتا جا رہا ہے۔

پچھتاؤں کی بھاری صلیب کا بوجھ میرے نازک دل پر روز بروز بڑھتا جا رہا تھا۔ اس کا شدت سے احساس تب ہوا جب مجھے ڈاکٹر نے کہا کہ میں ماں بننے والی ہوں۔ احسن کا ننھا روپ میرے اندر سانس لے رہا ہے۔

اب تک میں اپنی طبیعت کی خرابی کو ذہنی خلجان کا سبب سمجھ رہی تھی مگر ڈاکٹر نے مجھے تشخیص کے بعد جو بتایا وہ مجھے توڑ کر رکھ گیا تھا۔ میں احسن سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتی تھی۔ میں نے تو خود ہی اسے دھتکار دیا تھا۔ پھر اب وہ میری دسترس میں بھی کہاں رہا تھا۔ کسی اور کا بن چکا تھا۔ ابھی یہ غم تھا ہی کہ گاؤں سے ایک اور خبر آ گئی۔ شاشا بھابی کے ابو جی خبر لے کر آئے تھے۔ اس خبر نے تو مجھے بالکل توڑ ہی کر رکھ دیا۔

اس دن میں اپنے کمرے میں لیٹی ریڈیو پر کمرشل سروس پروگرام میں بج رہے نغمہ کو بغور سن رہی تھی۔ "بس گیا تو سوہنیا کے دوار بیجا کہاں ہے تیرا پیار بھا۔" کہ چچی اماں بوا نے آ کر خبر دی کہ گاؤں سے کوئی آیا ہے۔ میں نے جلدی سے چہرہ دھویا اور نیچے اتر آئی۔ مہران کے کمرے میں شاشا کے والد بیٹھے تھے۔ ان کا چہرہ غم و الم کا عکاس تھا۔ میرا دل انجانے خوف سے دھڑک اٹھا۔ میں نے پوچھا۔ "چاچا! کیسے آنا ہوا۔ سب خیریت تو ہے؟"

"بیٹی ہم لٹ گئے، برباد ہو گئے۔" وہ دھاڑیں مار کر رونے لگے۔

"کیا ہوا بھائی صاحب!" مہران نے گھبرا کر پوچھا۔

"سب قسمت کا دوش ہے۔ میری بیٹی بےگناہ ماری گئی۔" وہ بین کرتے ہوئے بولے۔

"کیا.....شاشا بھابی ماری گئی؟" میری چیخ بھی نکل گئی۔

"ہاں میری قسمت...میری بیٹی کو کاری کر دیا۔"

"کاری کر دیا؟ کس نے؟ بھائی نے؟" میں نے گھبرا کر پوچھا۔

"ارے اسی کا تو غم ہے۔ وہ اگر سو بار بھی کاری کرتا تو مجھے غم نہ ہوتا۔ اسے تو سازش کر کے مارا گیا۔ وہ کاری نہیں تھی۔"

"بھائی کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اس کو بھی مار دیا۔"

بھائی کا سنتے ہی مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے میرے دل کو مٹھی میں لے کر مسل دیا۔ خون کا دباؤ دماغ میں اتنا بڑھا کہ میں ہوش کھو بیٹھی۔

مجھے ہوش آیا تو میں اسپتال میں تھی۔ ڈاکٹروں نے بتایا تھا کہ مجھے شاک پہنچا تھا۔ تین دن بعد جب واپس آئی تو پوری کہانی پتا چلی۔ وڈیرہ سائیں کی چالاکی، مکاری، عیاری کا صحیح اندازہ ہوا۔ شاشا کے والد نے روتے ہوئے بتایا کہ سائیں نے اپنے ایک خاص آدمی اللہ ڈنو میر کو پٹی پڑھا دی۔ وہ ہماری برادری کا تھا اس لیے اسے کاری کرنے کا حق تھا، اسی کا اس نے فائدہ اٹھایا اور اس نے ایک دن جب تمہارا بھائی کھیت پر تھا اس نے گھر میں گھس کر میری پھول جیسی بیٹی پر الزام لگایا کہ اس نے ایک اجنبی کو اس گھر میں گھسا رکھا تھا جو اسے دیکھتے ہی بھاگ گیا پھر اس نے میری بیٹی کو کلہاڑی مار کر ختم کر دیا۔ یہ خبر تمہارے بھائی کو ملی تو وہ دوڑا ہوا آیا۔ اس نے جواب طلب کیا تو سائیں کے لوگوں نے اس پر حملہ کر دیا کہ وہ کاری کا حمایتی ہے۔ پھر گھر کو بھی مسمار کر دیا گیا۔ میں سب کچھ دیکھتا رہا کہ بزدل ہوں۔ بس یہ بتانے آیا ہوں کہ تم گوٹھ مت جانا ورنہ وڈیرا تم سے بھی اچھا سلوک نہیں کرے گا۔

اس سلسلۂ سانحات نے مجھے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ الم ناک واقعات و سانحات کا سیدھا اثر دماغ پر پڑتا ہے۔ دماغ جو باڈی کنٹرولر ہے وہی ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ بار بار غشی کے دورے پڑ رہے تھے۔ ڈاکٹر نے مشورہ دیا کہ مجھے ہل اسٹیشن چلے جانا چاہیے یا پھر کسی ایسی جگہ جہاں کوئی مجھے بیتی باتیں یاد نہ دلائے۔ مگر میں کہاں جاتی کہ میرے لیے پوری دنیا اندھیری ہو چکی تھی۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ اب میرا خرچ کہاں سے پورا ہوگا؟ یہ سوال بھی منہ پھاڑے کھڑا تھا۔ ایسے وقت میں ثریا نے حق دوستی ادا کیا اور اس نے مشورہ دیا کہ میں کچھ دنوں کے لیے اس کی خالہ کے گھر فیصل آباد چلی جاؤں۔ ثریا کے والدین جیکب آباد کے تھے مگر اس کے خالو کا تعلق پنجاب سے تھا۔ خالو سابق فوج سے ریٹائر ہوئے تھے۔ انہیں حکومت نے آباد کرنے کے لیے جیکب آباد میں زمینیں دی تھیں۔ ان کی زمین ثریا کے والدین کی زمینوں سے ملی ہوئی تھیں، اس وجہ سے قربت بنی تھی۔ اس قربت کو بعد میں رشتہ داری میں بدلا گیا۔ پھر خالو نے خود ہی زمینیں بھائی بھتیجوں کو سونپ دیں اور خود فیصل آباد منتقل ہو

گئے۔ وہیں ان کا انتقال ہوا۔ خالہ نے لوٹ کر جیکب آباد آنے کی بجائے وہیں رہ جانا مناسب سمجھا۔

ثریا کے مشورے کو میں نے مان لینے پر غور کرنا شروع کر دیا۔ یوں بھی میں مصائب کے گرداب میں پھنسی ہوئی تھی۔ بے والی وارث ہو چکی تھی۔ پھر جو مصیبت گلے پڑنے والی تھی وہ بھی قیامت کی تھی۔ شادی شدہ لڑکی ماں نہ بنے تو فکر میں لوگ ہلکان ہونے لگتے ہیں۔ اور اگر کنواری لڑکی ماں بن جائے تو اسے سنگسار کرنے پر اتر آتے ہیں۔ یہ خبر پھیلتے ہی مجھے کالج سے نکالنے میں انتظامیہ دیر نہیں کرے گی پھر شہر کے لوگ الگ پریشان کریں گے جب کہ فیصل آباد کے لوگ میرے بارے میں کیا جانیں گے؟ اس لیے میں نے وہاں جانے کا سوچ لیا۔ مگر اس کے لیے پیسوں کی ضرورت تھی۔ مجھے یاد آیا کہ احسن نے میرا اکاؤنٹ کھلوایا تھا۔ اس اکاؤنٹ میں ایک دو بار میں نے بھی اپنے پیسے جمع کرائے تھے۔ کل کتنے پیسے پڑے ہیں۔ یہ جاننے کے لیے میں نے بینک جا کر بیلنس مانگا۔ بینک والوں نے جو رقم بتائی اسے سن کر میں حیران رہ گئی۔ میں نے بیلنس شیٹ نکلوائی تو پتا چلا کہ میری رقم تو صرف سات ہزار ہے مگر احسن نے بہت بڑی رقم جمع کرا دی ہے۔ پہلی بار اس نے دو لاکھ روپے پھر صرف دو دن قبل دس لاکھ کی خطیر رقم اپنے اکاؤنٹ سے منتقل کی ہے۔ میں نے وہیں سے اسے فون کر کے استفسار کیا کہ اس نے اتنی بڑی رقم کیوں دی ہے تو وہ بولا۔ "یہ بارہ لاکھ کی رقم میری غلطی کا کفارہ ہے۔ میرے خیال سے تم جیسی لڑکیوں کی عزت کا مول یہی ہے۔"

اس کی بات سن کر میرے دماغ میں آگ بھر گئی۔ میں کچھ کہتی کہ اس نے کہا۔ "کل ثریا نے ایک اور بات بتائی جسے سن کر میں کانپ اٹھا ہوں۔ میں آنے والے مہمان کو اپنا نام نہیں دے سکتا مگر وہ میرا خون تو ہے اس لیے میں نے بعد والی رقم بھیجی ہے۔ اس رقم سے تم اس کی پرورش بہ آسانی کر سکتی ہو۔ میں یہاں کا کاروبار ختم کر رہا ہوں کینیڈا منتقل ہو رہا ہوں۔ میرے کاروبار میں اس کا جو حصہ بنتا تھا وہ میں نے ادا کر دیا ہے۔" کہہ کر اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ گویا وہ اب کوئی بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔

اس نے رابطہ منقطع کر کے تمام رشتے توڑ لیے تھے۔ اب میں کیا کروں؟ اس سوچ نے گھیر لیا۔ پھر یہ سوچا کہ روپے کی بڑی قیمت ہوتی ہے۔ وہ تو اب رشتہ استوار کرنے سے رہا تو میں کیوں خود کو ہلکان کروں؟ اب مجھے اپنی زندگی خود جینا ہے۔ زندگی کے میدان قتال میں خود فتح حاصل کرنا ہے۔ اس راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ غربت ہے۔ مگر اب میں غریب نہیں رہی۔ لکھ پتی بن چکی ہوں۔ تو کیوں نہ اسے دکھا دوں کہ میں اس کے بچے کو اس کے بغیر بھی پال سکتی ہوں۔ اس بچے کی خاطر مجھے کسی انجان جگہ پر جانا ہوگا تاکہ اس کے جنم کے بعد کوئی اسے گالی نہ سمجھے 'قانونی بچہ' سمجھے۔ ثریا سب کچھ جان رہی ہے اسی لیے وہ مجھے فیصل آباد جانے کا مشورہ دے رہی ہے۔ وہاں میں سات ماہ بہ آسانی گزار سکتی تھی۔

صرف بچے کی خاطر میں نے وہاں جانے کا فیصلہ کر لیا۔ ثریا نے میرے سامنے اپنی خالہ کو فون پر بتایا تھا کہ میرے والد وڈیرے سے ٹکرا گئے تھے۔ اسی لیے اس نے بطور سزا میرے گھر کے ہر فرد کو مروا دیا۔ جس رات گھر پر حملہ ہوا تھا میں کراچی آئی ہوئی تھی اسی لیے بچ گئی۔ اس حملہ میں میرا شوہر بھی مارا گیا ہے۔ میں ان کے یہاں محفوظ بھی رہوں گی اور اس غم کے گرداب سے نکل بھی آؤں گی۔

اس کی خالہ نے مجھے اپنے یہاں رکھنے کی ہامی بھر لی تھی۔ اس جھوٹی کہانی پر یقین بھی کر لیا تھا۔

میں نے بینک سے پچاس ہزار کی رقم نکلوائی اور فیصل آباد کے لیے چل پڑی۔ اسٹیشن تک ثریا مجھے سمجھاتی رہی تھی کہ مجھے کیسے وہاں والوں کے ساتھ رہنا ہے۔ کس کے ساتھ کیسا برتاؤ کرنا ہے۔ خالہ کی کس کس کمزوری سے کیا کیا فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

ثریا کے کہنے پر میں فیصل آباد آ تو گئی تھی مگر میرے ساتھ غم و الم بھی بندھے چلے آئے تھے۔ بھائی بھاوج کا غم، احسن کی بے وفائی کا غم۔ یہ سب غم مجھے دنیا سے دل لگانے نہیں دیتے تھے۔ ثریا کی خالہ ہمہ وقت میری دل جوئی میں لگی رہتی تھیں۔ وہ بہت اچھے دل کی مالک تھیں۔ مجھے اداس دیکھتیں تو کہتیں۔ "تم اگر اسی طرح رنج و غم کی چادر اوڑھے رہو گی تو اک نیا سانحہ جنم لے سکتا ہے۔ اب یہ زندگی صرف تمہاری نہیں رہی۔ اس آنے والے مہمان کی بھی ہے۔ اگر خوش رہنے کی کوشش نہیں کی تو تمہارے شوہر کی نشانی پر برا اثر پڑ سکتا ہے۔"

بچے کے واسطے نے مجھے خوش رہنے کی اداکاری کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔

غم زندگی کا حصہ بھی ہے اور زندگی کی علامت بھی کیوں کہ مردے بھی کبھی غم میں روتے ہلکان ہوتے ہیں؟ یا

خوشی میں بجتے ہیں؟ مگر یہی غم موت کا سبب بھی بن جاتے ہیں غم کی زیادتی موت کو کھینچ لاتی ہے۔ یہ غم کا ہی اثر تھا کہ میں نے مردہ بچے کو جنم دیا۔ احسن اور میری ننھی سی نشانی کو دنیا میں سانس لینے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ جنم لینے سے پہلے ہی دم توڑ دیا۔ ماں تھی اس لیے اپنی ننھی کی موت پر غمزدہ تھی مگر خوش بھی تھی کہ زندگی بھر اسے دیکھ دیکھ کر جو پشیمانی ہوتی اس سے نجات مل گئی۔

اسپتال سے گھر تک ثریا کی خالہ دل جوئی کرتی رہیں کہ جس کی امانت تھی اس نے لے لیا۔ اس میں اس کی کوئی مصلحت ہوگی اس لیے غم نہ کرو۔

اس چھ ماہ اکیس دن میں ان کا خوب اثر لیا تھا اسی وجہ سے میں ان کی باتوں کو ٹھکرا نہ سکی اور انہی کے اصرار پر میں زندگی کے ہنگاموں میں دلچسپی لینے کی کوشش کرنے لگی۔

ان کے گھر کا اصول تھا کہ ہر روز رات کے وقت آنگن میں چٹائی بچھا دی جاتی جس پر گھر کے تمام لوگ آ جاتے اور رات گئے تک محفل جمی رہتی۔ دنیا جہان کی باتیں ہوتیں۔ اس رات بھی محفل جمی ہوئی تھی۔ باتوں کا سلسلہ چل رہا تھا۔ میں نے ثریا کے خالہ زاد سے پوچھا۔ ”تمہارا کام کیسا چل رہا ہے؟“

”کیا بتاؤں باجی! آج کل کچھ زیادہ ہی پریشان ہوں۔ جہاں کام کرتا ہوں وہ فیکٹری آج کل نقصان میں چل رہی ہے۔ سننے میں آیا ہے کہ مالکان اسے بیچنے کی کوشش میں ہیں۔“

”کیوں؟ اس شہر کو تو پاکستان کا مانچسٹر کہا جاتا ہے۔ یہاں تو کپڑوں کے اتنے سارے کارخانے ہیں اس لیے یارن کے کام میں نقصان کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“ میں نے کہا۔

”بس باجی کیا بتاؤں۔ میرا مالک بے ایمانی سے آگے بڑھنا چاہتا تھا اس نے اس کی کشتی ڈوب رہی ہے۔ کوئی بھی پارٹی اس پر یقین کرنے کو تیار نہیں۔ یقین کریں میرے جوڑ کا ایک بھی کاریگر پورے فیصل آباد میں نہیں مگر میرا نام سن کر بھی لوگ مال نہیں اٹھاتے۔ اسی لیے مالکان فیکٹری کو بیچ رہے ہیں۔“

”تم خرید لو۔ اور خود مال تیار کر کے سپلائی کرو۔“ میں نے مشورہ دیا۔

”میرا دل یہی کرتا ہے۔ اماں کو کہا بھی کہ جیکب آباد میں ہمارا جو حصہ ہے اسے فروخت کر دیں۔ اس رقم سے میں فیکٹری کی زمین خرید لیتا ہوں مگر وہ مان کر نہیں دیتیں۔“

”کتنے میں وہ بیچ رہے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”زمین کی قیمت پانچ لاکھ اور دیگر اخراجات سے دو لاکھ مانگ رہے ہیں۔ پھر کام شروع کرنے کے لیے دو لاکھ چاہیے۔“

”گویا نو لاکھ میں تم کاروبار شروع کر سکتے ہو۔“

”اور کیا۔ میرا دعوا ہے کہ میں ایک ماہ میں فیکٹری سیٹ کر لوں گا۔ لوگ میرے بارے میں جانتے ہیں کہ میں کتنا ماہر ہوں۔ آپ دیکھ لینا یہ رقم میں ایک سال میں نکال لوں گا پھر وہ فیکٹری گویا مفت میں مل جائے گی۔“

”تو ٹھیک ہے تم بات کرو میں رقم دوں گی۔“

میرے کہنے پر نواز نے اگلے ہی دن بات کرلی۔ مالکان سے میری ملاقات بھی کرا دی۔ کاغذات تیار ہونے لگے۔ میں ایک دن کے لیے نواز کو ساتھ لے کر کراچی آئی۔ بینک سے دس لاکھ روپے فیصل آباد کے اپنے نئے اکاؤنٹ میں منتقل کیے اور لوٹ آئی۔ ایک ہفتے میں وہ فیکٹری میرے نام ہو گئی۔ اس فیکٹری کا نام میں نے کنول یارن فیکٹری رکھا۔ دو لاکھ روپے میں نے نواز کو دیے جس سے اس نے خام مال خریدا اور پھر کام شروع کر دیا۔

اس کا دعوا سچ تھا، صرف ایک ہفتے بعد اس نے کہا ”باجی میں نے تین فیکٹریوں سے آرڈر حاصل کر لیا ہے۔ میں دن رات محنت کروں گا۔ آپ دیکھیں گی صرف ایک سال میں پورے فیصل آباد کی فیکٹریوں میں میرا مال جانے لگے گا۔ لوگ جانتے ہیں کہ میں کوالٹی کے معاملے میں کتنا سخت ہوں۔“

واقعی اس نے ایک ماہ میں اپنی بات سچ کر دکھائی۔ فیصل آباد کی کئی پارٹیاں اس سے دھاگے خریدنے لگی تھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے کنول یارن فیکٹری کا نام مشہور ہوتا جا رہا تھا۔ ایک سال میں اس نے اتنا نفع کما کر دکھا دیا کہ میں خود حیران رہ گئی۔

حقیقت یہ ہے کہ ہمارے یہاں کمی نہیں ہے بس موقع چاہیے۔ نواز کو موقع ملا تھا اس نے اپنا فن دکھا دیا۔ مجھے صنعتی میدان میں اونچا مقام دلا دیا۔

فیصل آباد اب میرے لیے اجنبی نہیں رہا تھا۔ ان دو سال میں، میں یہاں کی بن گئی تھی۔ ثریا کی خالہ بھی مجھے اپنے گھر کا فرد ماننے لگی تھیں۔ میری وجہ سے گویا ان کے گھر میں خوشی کے چراغ جل اٹھے تھے۔ وہی نواز جو فیکٹری سے تین

ہزار روپے ماہانہ اٹھاتا تھا۔ میں نے اس کی تنخواہ پندرہ ہزار روپے کردی تھی۔ پھر جب ان کا گھر دو منزلہ بننے لگا تو میں نے تین لاکھ روپے دیے۔ گویا میری وجہ سے وہ لوگ معاشرتی طور پر اوپر اٹھ آئے تھے۔ خود میں بھی معروف صنعت کار بن گئی تھی۔ اسی دوران ثریا کی شادی کی تاریخ آگئی۔

میں شادی میں شرکت کرنے جیکب آباد آگئی۔ اس شادی پر میں نے دل کھول کر خرچ کیا۔ یوں بھی یہ پیسہ میرا اپنا کہاں تھا۔ میرے تو صرف بارہ لاکھ تھے۔ اس رقم کو بھی تو نواز نے کیا تھا۔ نواز ثریا کا کزن تھا۔ گویا نواز کی حاصل کردہ رقم میں نے ثریا پر خرچ کی تھی۔

رقم انسان کو عزت دلاتی ہے۔ جیکب آباد میں بھی میری خوب عزت بن گئی کہ ثریا کی سہیلی لکھ پتی ہے۔ بات غلط بھی نہیں تھی۔ کاروبار میں 80 لاکھ لگے ہوئے تھے۔ بینک میں بھی دس بارہ لاکھ پڑے ہوئے تھے۔ بزنس فیکٹری بن بر سارہی تھی۔ گویا میں سب کچھ کھو کر بھی خوش نصیب ٹھہری۔

شادی کے ہنگامے میں ہی وہ مجھے نظر آیا تھا اسے دیکھ کر میں چونک گئی تھی۔ پہلی نظر میں میں نے یہی سمجھا کہ وہ محسن ہے مگر بغور دیکھنے پر راز کھلا کہ وہ کوئی اور ہے۔ میں اسی کی طرف دیکھ رہی تھی کہ ثریا کی باجی قریب آگئیں۔ ان کے ساتھ ایک لڑکی بھی تھی۔ انہوں نے مجھ سے اس لڑکی کا تعارف کرایا۔ ”یہ ماروی ہے۔ کنول کے ابو کی تایازاد بہن یعنی میری نند۔ بہت بولتی ہے مگر باتیں پیاری ہوتی ہیں۔ وہ بھائی بہن ہیں۔ وہ رہا اس کا بھائی مراد علی سولنگی۔“

اشارہ پر میں نے دیکھا۔ وہ اسی لڑکے کی طرف اشارہ کررہی تھیں۔ گویا منزل خود میرے قریب آرہی تھی۔ میں نے جلدی سے کہا۔ ”باجی! جب یہ آپ کی رشتے دار ہیں تو میری بھی ہوئیں۔“ کہہ کر میں نے ماروی کی طرف دیکھا اور بولی ”میں نے غلط تو نہیں کہا؟“

ماروی کی کم عمری اس پر میرے بارے میں یہ شہرت کہ میں بہت دولت والی ہوں۔ وہ مرعوب لہجے میں بولی ”نہیں آپ تو ہیں ہی رشتے دار!“

”تو کیوں نہ اس رشتے کو مزید مضبوط کرنے کے لیے دوستی کا ”انمی“ شامل کردوں۔“

”جی ہاں... جی ہاں مگر آپ تو بہت امیر ہیں اور ہم لوگ... ہم لوگ بس ایویں سے گھرانے کے ہیں۔“

باجی اس کے اور میرے مکالمے کو دلچسپی سے سن رہی تھیں اور مسکرا رہی تھیں۔

”ارے، یہ کیا کہہ رہی ہو امیر ہونا کوئی بڑی بات تو نہیں۔ آج سے ہم پکی دوست۔ اور اس دوستی کو مستحکم کرنے کے لیے میری طرف سے یہ تحفہ قبول کرو۔“ کہہ کر میں نے اپنے گلے سے سٹ لڑا ہار اتار کر اس کے گلے میں ڈال دیا۔

اتنا قیمتی تحفہ دیکھ کر وہ حیران رہ گئی۔ یہ تحفہ باجی کی عزت میں اضافے کا سبب تھا اس لیے باجی نے بھی اس کی حوصلہ افزائی کی۔

اسی شام اس کی ماں آگئی۔ انہوں نے کہا ”ارے بچی اسے تم نے اتنا قیمتی ہار دے دیا؟“

”جی ہاں یہ میری دوست ہے تبھی اسے دیا ہے۔“

”مگر بچی یہ تو بہت قیمتی ہے۔“

”تو کیا ہوا۔ دوستی میں سب چلتا ہے۔ دیکھیے گا جب اس کی شادی ہوگی نا تو میں ایسا تحفہ دوں گی کہ اس کے سسرال والے بھی یاد کرتے رہ جائیں گے۔“

میں نے محسوس کرلیا تھا کہ اس دوستی پر اس کی ماں بھی بہت خوش ہے۔ تحفہ ہر انسان کو خوش کردیتا ہے۔ ابتدا میں جب ایسا قیمتی تحفہ دے رہی ہوں تو آگے چل کر تو بہت کچھ ملنے کی امید بندھ رہی تھی پھر وہ کیوں نہ خوش ہوتیں۔ اس دن سے میں نے تحفے کی لائن لگادی تھی۔ صرف مراد علی کے لیے۔ دراصل اسے دیکھ کر میرے دل کے زخم ہرے ہو گئے تھے۔ اس کی شباہت نے مجھے قسم توڑنے پر مجبور کردیا تھا۔ میں جو مردوں سے بیزار تھی اس کی طرف کھنچنے لگی تھی۔ وہ کسی پرائیویٹ فرم میں کلرک تھا۔ وہ شریف بھی تھا۔ اس نے شاید میری آنکھوں کی تپش محسوس کرلی تھی اسی لیے میرے قریب آنے سے کترا رہا تھا۔ دور رہنے کی کوشش کررہا تھا۔

یہ انسان کی فطرت ہے کہ جو چیز اس کی دسترس میں نہ آئے وہ اس کی طرف زیادہ لپکتا ہے۔ میں بھی اس کو حاصل کرنے کے لیے جی جان سے لگ گئی تھی۔ پہلے میرا ارادہ تھا کہ رخصتی کے تیسرے دن لوٹ جاؤں گی مگر اب میں نے ارادہ بدل دیا تھا۔ نواز کو کیلئے بھیج دیا تھا۔ جبکہ فیصل آباد میں میری ضرورت زیادہ تھی۔ نواز پروڈکشن دیکھتا تھا اور میں حساب کتاب۔ اس لیے میرا وہاں رہنا ضروری تھا پھر بھی میں نے اس سے کہہ دیا تھا کہ باقی کی رسموں میں بھی مجھے شرکت کرنا ہے اس لیے میں رک رہی ہوں اگر میری ضرورت پڑی تو فون کرلینا۔ مجبوراً وہ اکیلا ہی لوٹ گیا تھا۔

میں نے مراد کی طرف بڑھنا چاہا تو وہ بدک گیا۔ کسی

طور میرے قریب نہیں آرہا تھا۔اس کی بے رخی مجھے اپنی توہین لگی اور مجھے ضد چڑھ گئی کہ اسے میں شکست دے کر رہوں گی۔دراصل اس کے پیچھے بھی میرا کرب تھا۔اسے شکست دے کر میں احسن کا بدلہ چاہتی تھی۔اس کے لیے میں نے ماروی کو سیڑھی بنایا۔اسے سکھی بنا کر تحائف دے کر اس کے دل میں جگہ بنالی تھی۔یوں بھی ثریا کے تمام رشتہ دار میرے بارے میں جانتے تھے کہ میں بہت معلوم اور بہت پیسے والی ہوں۔ماروی بھی مجھ سے مرعوب تھی۔جب میں نے اس کی طرف نظر التفات ڈالی تو وہ میرے آگے پیچھے گھومنے لگی۔میں نے پہلے ہی دن ست لڑا ہار اسے بطور تحفہ دے کر اس کی اماں کو بھی مرعوب کر دیا تھا۔یہی وجہ تھی کہ اس کی امی نے بھی بیٹی کو کھلی چھوٹ دے دی تھی کہ وہ سارا دن میرے ساتھ گزارہ کرے۔ثریا کا سسرال اسی گاؤں میں تھا۔وہ میرا ماضی جانتی تھی مگر اس نے میرے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتایا تھا۔اسی لیے میں کھل کر ماروی کو اپنی طرف راغب کرنے میں لگی تھی۔صرف ایک ہفتہ میں میں نے اس پر دس ہزار لٹا دیا تھا۔وہ صبح ہوتے ہی آجاتی تھی۔اس کی فرسٹ کزن اور لڑکیاں بھی مجھ سے قریب ہونے کی کوشش کر رہی تھیں۔ان کو بھی میں چھوٹے موٹے تحفے دے دیا کرتی۔
اس دن بھی وہ سب صبح ہی صبح آگئی تھیں۔ہم باتیں کر رہے تھے کہ ماروی نے کہا"باجی!آپ نے اب تک شادی کیوں نہیں کی؟"

"یہ کام والدین کا ہوتا ہے۔انہیں اللہ جی نے چھین لیا پھر مجھے ایسا کوئی ملا بھی نہیں جسے دیکھ کر میں شادی کے بارے میں سوچتی۔"

"آپ کی کوئی پسند تو ہوگی۔اگر میں ڈھونڈوں تو کیسا لڑکا ہونا چاہیے؟"

"کیسا؟جیسا تمہارا بھائی ہے ویسا۔"میں نے اشارے میں دل کی بات کہہ دی۔

"اف اللہ!آپ نے تو میرے دل کی بات کہہ دی۔کاش ایسا ہو جائے۔آپ میری بھابی بن جائیں۔"

"مگر ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟"نزدیک بیٹھی رخسانہ بولی۔"تمہارے بھیا کی منگیتر سیما نے اگر سن لیا تو وہ تمہیں کچا کھا جائے گی۔"

ماروی نے پلٹ کر کہا"منگنی ہوئی ہے شادی نہیں کہ ٹوٹ نہ سکے۔لوگ تو کئی کئی بچوں کے بعد بھی طلاق دے دیتے ہیں۔مجھے بھی ان کے ایسی بھابی کی ضرورت ہے۔"

مراد کی منگنی ہو چکی ہے یہ سن کر مجھے دھچکا سا لگا مگر میں نے اسے ظاہر نہیں ہونے دیا اور ہنستے ہوئے بولی"تو ٹھیک ہے اگر ابھی تمہارا بھائی راضی ہو جائے تو میں اسی ہفتے شادی کرلوں۔"

اسی شام مراد تلملاتا ہوا میرے کمرے میں آیا"آپ خود کو کیا سمجھتی ہیں؟کیوں ہماری زندگی میں طوفان لانے کی کوشش کر رہی ہیں۔"

"ایسا کیا ہو گیا؟"میں نے پوچھا۔

"ماروی نے گھر میں طوفان اٹھا رکھا ہے۔"

"کیا ہوا؟آرام سے بتائیں!"میں نے کہا۔

وہ غصے میں یہ تک بھول گیا تھا کہ میں مہمان ہوں اور کسی لڑکی کے کمرے میں یوں بلا کھٹکے نہیں آیا جاتا۔مگر اس کے آنے سے مجھے خوشی ہوئی تھی۔

"اس نے شور مچا رکھا ہے کہ میں منگنی توڑ دوں کیوں کہ آپ مجھ سے شادی کرنے پر تیار ہیں۔"

"اچھا!"میں نے مسکراتے ہوئے کہا"وہ بالکل بیوقوف ہے۔میں نے مذاق میں جو کہا اس نے یقین کر لیا۔میں اسے سمجھا دوں گی۔"

"مگر آپ نے ایسا کہا کیوں۔آپ امیر ہیں،ہر چیز خرید سکتی ہیں مگر میں بکاؤ نہیں ہوں جسے مجھے خریدنے کی کوشش نہیں کیجیے گا۔"وہ شیر ہونے لگا۔سامنے والے کو کمزور پا کر ہر کوئی شیر ہو جاتا ہے۔پھر بھی میں نے اپنے لہجے پر قابو رکھا اور نرم لہجے میں بولی:

"اس میں ایسی کیا بات ہے جو آپ اس طرح غصہ ہو رہے ہیں۔"

"میں اور سیما بچپن سے ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔میں اگر شادی کروں گا تو اسی سے کروں گا۔"

"اچھی بات ہے کر لیجیے گا۔"میں نے کہا اور کمرے سے نکل کر آنگن میں آگئی۔اس کی تیز آواز پر باجی بھی نکل آئی تھیں اور اسے انہوں نے کمرے میں ہی گھیر لیا تھا۔ڈانٹنے لگی تھیں۔

"خوش قسمتی کسی کے دروازے پر صرف ایک بار دستک دیتی ہے۔اس موقع سے فائدہ نہیں اٹھاؤ گے تو بے وقوفی ہوگی۔"

میں ہمہ تن گوش ہوگئی تھی۔وہ دبی آواز میں ہنوز ڈانٹ رہی تھیں۔"فائدہ اٹھاؤ ورنہ زندگی بھر غربت کے غبار میں غرق رہو گے۔"

اس تمثیل پر مجھے ہنسی آ گئی اور میں دروازے سے ہٹ کر زویا کے سسرال کی طرف چل پڑی۔

مجھے ضد چڑھ گئی تھی کہ اسے جھکا کر ہی رہوں گی۔ تاریخ عالم گواہ ہے کہ عورت کو جھکنا پڑتا ہے مگر میں مرد کو جھکانے پر تلی ہوئی تھی۔ مجھے شادی کا شوق نہیں تھا صرف انتقاماً اسے حاصل کرنے کی کوشش میں تھی۔ ایک بار احسن نے مجھے دکھ دیا اور اب اس نے میری انا کو ٹھیس پہنچائی تھی۔ میں نے ماروی پر غیر محسوس انداز میں دباؤ ڈالنا شروع کر دیا۔ میرے پاس جو لڑکیاں آتی تھیں میں ان کے ذریعہ اس کی برین واشنگ کر رہی تھی۔ تین لڑکیوں کو الگ الگ اس کام پر لگا دیا تھا کہ وہ ماروی کو سمجھاتی رہیں۔ تینوں کو کہا تھا کہ اس راز میں صرف تم ہی شریک ہو۔ ان لوگوں نے اپنے طور پر ماروی اور اس کی ماں کو سمجھانا شروع کر دیا تھا کہ کسی بھی طرح مراد کو راضی کر لیں۔ بالآخر ماں بیٹی نے مراد پر دباؤ بڑھا دیا اور مراد کو جھکنا پڑا۔ ایک ہفتے میں ماروی دلہن بن کر مراد کی زندگی میں داخل ہو گئی۔

مجھے فیصل آباد سے آئے ایک ماہ ہو چکے تھے وہاں نواز پریشان ہو اٹھا تھا۔ اب یہاں رکنا فضول تھا اس لیے میں نے فیصل آباد چلنے کی تیاری شروع کر دی۔

اپنے ساتھ میں ماروی، اس کی ماں اور… مراد کو بھی لے آئی تھی۔ مراد کی نوکری چھڑوا دی تھی۔ اسے میں نے اپنے یہاں ہی وصولی کے کام پر لگا دیا تھا۔ پہلے یہ کام بھی نواز کے ذمے تھا۔ اس کی تنخواہ پندرہ ہزار مقرر کر دی تھی جو اس کی پہلے کی تنخواہ سے بہت زیادہ تھی۔ یہ تنخواہ اس کی جیب خرچ تھی۔ وہ سب بہت خوش تھے کہ ان کی زندگی بدل کر رہ گئی تھی۔ میں نے تو یہ شادی صرف انا کی تسکین کے لیے کی تھی مگر اب احساس ہونے لگا تھا کہ وہ میرے دل کا بھی مالک بن چکا ہے۔ میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتی۔

وقت بڑی تیزی سے گزرنے لگا تھا۔ اس دوران میں نے اپنی پسند سے ماروی کی شادی کرا دی تھی۔ لڑکا ڈاکٹری پڑھ رہا تھا اسے میں نے مزید تعلیم کے لیے امریکا بھیج دیا تھا۔ وہ جاتے وقت ماروی کو بھی ساتھ لے گیا تھا۔ وہاں رہنے کا خرچ بھی میں بھیج رہی تھی۔

دیکھتے ہی دیکھتے تین سال گزر گئے۔ اس دوران بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ مراد کی ماں کا انتقال ہو گیا، خالہ بھی منوں مٹی تلے جا سوئیں۔ مراد بھی دل و جان سے محنت کر رہا تھا۔ اس نے کراچی کی کئی پارٹیوں سے بات کی تھی۔ ان تک مال پہنچنے کی ذمے داری بھی اسی کی تھی۔ اب نواز بھی صرف اپنے کام سے کام رکھتا تھا۔ مراد ہر مہینے کراچی کا ایک چکر لگاتا تھا۔ مگر کچھ دنوں سے میں محسوس کر رہی تھی کہ وہ کچھ اداس اداس سا رہنے لگا تھا۔ جب جب کراچی سے آتا تھا کسی سوچ میں پڑا رہتا تھا۔ میں نے پوچھا بھی مگر اس نے جواب نہیں دیا تھا۔ میں یہی سمجھ رہی تھی کہ بہن کے امریکا چلے جانے کی وجہ سے اداس ہے کہ یہاں نہ ماں ہے نہ بہن۔ مگر کچھ دنوں ہی بعد راز کھل گیا۔ وہ رات مجھ پر قیامت ثابت ہوئی تھی۔

اس صبح جب میں سو کر اٹھی تو وہ بستر پر نہیں تھا۔ میں نے یہی سمجھا کہ وہ نماز پڑھنے مسجد گیا ہوگا۔ کبھی کبھی اس پر باجماعت نماز کا جنون چڑھ جاتا تھا۔ اس سرد موسم میں وہ ٹھٹھرتا ہوا گیا ہوگا۔ میں یہ سوچ کر کروٹ بدل رہی تھی کہ ڈریسنگ ٹیبل پر رکھے کاغذ پر میری نظر پڑی۔ وہ لپ اسٹک اس پر رکھے تھے ڈبے سے وہ باہر نکلا ہوا تھا۔ اسی بات نے مجھے چونکایا تھا اور میں اسے اٹھانے کے لیے بیڈ سے اتری اور کاغذ کو دیکھنے لگی۔ وہ میرے نام خط تھا۔ اسے پڑھتے ہی میرا سر چکرایا اور میں لڑکھڑا کر گری۔ میری نظروں میں دنیا اندھیری ہو گئی تھی۔ گرتے ہوئے میرا سر بیڈ سے ٹکرایا پھر چہرہ ٹیبل کے ڈبے سے ٹکرایا تھا۔ اور میں ہوش کھو بیٹھی۔

شاید میری چیخ سن کر نوکرانی آ گئی تھی۔ نوکرانی اور چوکیدار کے لیے میں نے ایک کمرا مختص کر رکھا تھا۔ وہ دونوں مجھے اسپتال لے کر آئے تھے۔ ایک ہفتے بعد جب میں گھر لوٹی تو دنیا اجڑی لگنے لگی تھی۔ نواز کی بیوی دو تین بار اسپتال آچکی تھی وہی مجھے گھر لے کر آئی تھی۔ اس نے مجھے بستر پر لٹا کر نوکرانی سے سوپ کا کہا تو مجھے خط یاد آ گیا اور میں نے خود اتر کر بیڈ کے نیچے دیکھا۔ وہ وہیں پڑا ہوا تھا۔ میں نے اسے اٹھایا اور پڑھنے لگی۔ مراد نے لکھا تھا "چنا صاحبہ! میں نے آپ کو کبھی بیوی نہیں سمجھا۔ آپ تو اپنی دولت کے سہارے مجھے خریدنے پر تلی تھیں۔ اماں اور ماروی کو آپ نے خرید لیا مجبوراً مجھے بکنا پڑا۔ مگر اب وہ لوگ اپنی منزل پا چکے ہیں تو میں بھی اپنی منزل کی طرف چل پڑا ہوں… میں نے اپنی منگ کو چھوڑا نہیں تھا۔ اسے کراچی میں ایک الگ فلیٹ لے کر دے رکھا تھا۔ اب اسے لے کر ایک دور دراز کے ملک جا رہا ہوں جہاں کوئی ہمارے پیار کے درمیان نہیں آئے گا…… اس کے آگے میں پڑھ نہ سکی اور آنکھوں سے بہتے پانی میں ڈوبتی چلی گئی۔"

دو گھڑی کی قربت

جناب معراج رسول
السلام علیکم!
کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ ایک نظر میں ہر کسی کو پہچان لیتے ہیں مگر میں نے یہ جانا ہے کہ عورت کو سمجھنا سب سے مشکل ہے۔ جس لڑکی سے میں نے شادی کی ہے اسی کی مثال لے لیں۔ اس کو دیکھ کر کون کہہ سکتا تھا کہ وہ ایک بہترین بیوی ثابت ہوگی مگر آج میں کہتا ہوں کہ اس سے اچھی کوئی عورت ہو ہی نہیں سکتی۔

نعمان ارشد
(فیصل آباد)

نہ جانے کیوں میرے دل میں آیا کہ میں ایک بار اس سے مل تو لوں۔

روشنی سے میرا رشتہ والدین نے طے کیا تھا۔اس کے بارے میں بہت کچھ سن چکا تھا کہ وہ بہت بولڈ اور الگ مزاج کی لڑکی ہے۔ وہ آنکھیں بند کر کے کسی کو اپنا ساتھی بنانے کی قائل نہیں ہے۔ نہ جانے کتنے لڑکوں سے اس کی دوستی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

روشنی کے بارے میں یہ ساری معلومات میرے ایک

جاننے والے نے فراہم کی تھیں جو اتفاق سے اس گلی میں رہتا تھا جس گلی میں روشنی کا مکان تھا۔

میں نے یوں ہی اس سے دریافت کیا تھا۔ "واقعی، ایک بات بتاؤ کیا تم روشنی کو جانتے ہو؟"

"کون روشنی؟"

"شاید وہ تمہارے ہی محلے میں رہتی ہے۔" میں نے بتایا۔ "اس کے والد کا نام خلیق ہے۔ دو بھائی ہیں اس کے۔"

"او تم اس لڑکی کی بات کر رہے ہو۔" اس نے کہا۔

"کیوں کیا تم جانتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"اس کو کون نہیں جانتا۔ پورے محلے میں اور پورے کالج میں اس کی شہرت ہے لیکن تمہیں اس سے کیا کام پڑ گیا۔"

"یار اس لڑکی سے میرا رشتہ طے ہوا ہے۔" میں نے بتایا۔

"کیا؟" وہ اچھل پڑا۔ "روشنی سے تمہارا رشتہ۔"

"کیوں اس میں ایسی کون سی بات ہو گئی۔" میں نے پوچھا۔

"نہیں اب میں تمہیں کیا بتاؤں۔ اس لڑکی کی شہرت ٹھیک نہیں ہے۔" اس نے کہا۔ "اس کے ساتھ بے شمار کہانیاں وابستہ ہیں۔"

"یہی تو پوچھنا چاہتا ہوں۔"

"میرا خیال ہے کہ تم اس کے چکر میں نہ پڑو تو بہتر ہے۔" اس نے کہا۔ "ایک بدنام لڑکی سے شادی کر کے پچھتاتے رہو گے۔"

"یار کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی کا ظاہر کچھ اور ہوتا ہے اور باطن کچھ اور۔ ہو سکتا ہے کہ وہ یہ نہ ہو صرف بدنام ہو۔ میں نے اس کی صرف کہانیاں سنی ہیں۔ دیکھا نہیں ہے۔ اس طرح تم نے بھی اس کو دیکھا تو نہیں ہو گا۔ اس کے بارے میں صرف سن رکھا ہو گا۔"

"ہاں یہ تو ہے۔" اس نے اعتراف کیا۔ "لیکن اتنا ضرور ہے کہ اس کو راستے میں آتے جاتے تو دیکھا ہے۔ بہت بے باک انداز ہوتا ہے اس کا۔"

"ہوں۔" میں نے ایک گہری سانس لی۔ "اگر ایسا ہے تو میں بھی سوچوں گا لیکن کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے ایک نظر اس کو دیکھنا ضرور چاہوں گا اور اگر موقع ملا تو اس سے ملاقات بھی کروں گا۔"

"تمہاری مرضی لیکن تم اس سے کس طرح ملو گے؟"

"یہ کوئی مشکل نہیں ہے۔ جب اس سے میرے رشتے کی بات چل رہی ہے تو اسے میرے بارے میں سب کچھ معلوم ہو گا؟ فون پر اس سے بات کروں گا۔"

اس نے پھر کچھ نہیں کہا۔

ویسے تو میرے دل میں روشنی کی طرف سے کھٹکا ہو گیا تھا۔ کون ایسی لڑکی سے شادی کرنا پسند کرے گا جس کی بدنامی کے چرچے ہو رہے ہوں۔

اس کے باوجود ایک ضد سی تھی کہ دیکھوں تو سہی اس لڑکی میں ایسی کون سی بات ہے کہ جس کی بدنامی ایک محلے سے دوسرے محلے تک سفر کرتی پھر رہی ہے۔

یہ سوچ کر میں نے اس کے گھر فون کیا۔ فون نمبر مجھے بتا دیا گیا تھا۔ اتفاق سے فون اسی نے ریسیو کیا تھا۔ "جی فرمائیں کس سے بات کرنی ہے؟" اس نے پوچھا۔

"روشنی سے۔" میں نے بتایا۔ "میں نعمان بول رہا ہوں۔"

"اوہ! نعمان صاحب آپ......!" وہ چہک اٹھی۔ "بالآخر آپ کا فون آ ہی گیا۔"

"کیا تم کو میرے فون کا انتظار تھا؟" میں نے پوچھا۔

"یقیناً۔" اس نے کہا۔ "ورنہ آج کل کے زمانے میں کون اتنا صبر کرتا ہے۔"

"روشنی میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔" میں نے اپنا مدعا بیان کیا۔

"مجھے یقین تھا کہ آپ کا دوسرا جملہ یہی ہو گا کہ میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔" اس نے کہا۔ "فرمائیں کب ملاقات کی سعادت نصیب ہو رہی ہے۔"

بہت بے دھڑک اور بے باک قسم کی لڑکی تھی۔ ورنہ عام طور پر لڑکیاں اپنے ہونے والے رشتے سے بات کرتے ہوئے شرمایا کرتی ہیں اور یہاں یہ حال ہو رہا تھا کہ خود مجھے خجالت ہونے لگی تھی۔

"بتائیں ناں کہاں بلا رہے ہیں مجھے۔" اس نے پوچھا۔ "خاموش کیوں ہو گئے؟"

"روشنی تم شام کو بلیو مون میں مل لو۔" میں نے کہا۔ "وہ ایک مشہور ریسٹورنٹ ہے۔"

"جانتی ہوں میں۔" وہ ہنس پڑی۔ "کئی بار جا چکی ہوں۔"

"تو پھر آ جاؤ وہیں انتظار کروں گا۔"

"مجھے کیسے پہچانیں گے۔" اس نے پوچھا۔

"میں نے تمہاری کئی تصویریں دیکھی ہیں۔" میں نے بتایا۔ "اس لیے کوئی پرابلم نہیں ہوگی۔"

"او کے تو پھر میں آرہی ہوں۔" اس نے کہا۔

دوسری شام میں ریسٹورنٹ میں تھا۔ روشنی مقررہ وقت پر آ گئی لیکن اس کے ساتھ ایک ہینڈسم سا نوجوان بھی تھا۔ اس کے ساتھ کسی کو دیکھ کر میں تھوڑا سا ٹھٹک کر رہ گیا تھا۔

"نعمان صاحب! یہ میرے دوست ہیں جمیل۔" اس نے تعارف کروایا۔ اور جمیل سے کہا۔ "جمیل! یہ ہیں نعمان صاحب جن سے میرے رشتے کی بات چل رہی ہے۔"

جمیل تو مسکرا دیا۔ لیکن میں بھنا کر رہ گیا۔ کم بخت کتنی بے باک لڑکی تھی بے دھڑک۔ وہ اس سے ملنے کے لیے آئی تھی جس سے رشتہ ہوا تھا اور اپنے ساتھ اپنے ایک دوست کو بھی لیتی آئی تھی۔

میں نے ایسی مثال پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔

"جی نعمان صاحب فرمائیں۔" اس نے میری طرف دیکھا۔

اس وقت مجھ سے برداشت نہیں ہو سکا۔ "کیا بات کروں تم سے؟ تم کو اکیلے آنا چاہیے تھا لیکن تم اپنے کسی دوست کو ساتھ لے کر آئی ہو۔"

"تو کیا ہوا۔ ہماری بات تو ویسے بھی ہو سکتی ہے۔"

"روشنی۔" اس کے دوست نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ نعمان صاحب ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں مجھے تمہارے ساتھ نہیں آنا چاہیے تھا سوری نعمان صاحب۔" اس نے کہا اور اٹھ کر چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد روشنی زور زور سے ہنسنے لگی۔

"بہت اچھا ہوا۔ میں تو یہی چاہتی تھی کہ کوئی اس کی بے عزتی کر کے اس کو بھگا دے۔ کم بخت چپک کر رہ جاتا ہے۔"

میں حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ کیسی زبردست ڈرامہ باز لڑکی تھی۔ ذرا سی دیر میں اس نے کیسا پینترا بدل لیا تھا۔

"تو یہ تمہارے ساتھ کیوں آیا تھا۔" میں نے پوچھا۔

"نہیں نعمان صاحب میں کیا پاگل ہوں جو اپنے ہونے والے سے ملنے جا رہی ہوں اور کسی کو گلے کا ڈھول بنا کر ساتھ لے آؤں۔ یہ تو مجھے ریسٹورنٹ سے باہر مل گیا تھا۔ لاکھ ٹالنا چاہا لیکن ساتھ ہو لیا۔ بس اتنی سی بات ہے۔"

خدا جانے اس کی باتوں میں کہاں تک صداقت تھی لیکن اتنا ضرور معلوم ہو گیا تھا کہ وہ واقعی ایک بولڈ اور بے

سید انشاء اللہ خان انشا

(1756ء۔1817ء)

اردو شاعر، والد حکیم میر ماشاء اللہ خاں دہلی کے رہنے والے تھے۔ مغلیہ سلطنت کے زوال پر مرشد آباد چلے گئے۔ انشاء کی ولادت وہیں ہوئی۔ فارسی، عربی، ترکی، پشتو، پوربی، پنجابی، مارواڑی، مرہٹی، کشمیری اور ہندی زبانیں جانتے تھے۔ شاہ عالم ثانی کے عہد میں مرشد آباد سے دہلی آئے اور دربار میں داخل ہوئے۔ دہلی کی تباہی کے بعد لکھنو کا رخ کیا۔ وہاں شہزادہ مرزا سلیمان شکوہ کی ملازمت اختیار کی اور مصحفی کی بجائے شہزادے کے کلام پر اصلاح دینے لگے۔ کچھ دن بعد تفضل حسین خاں علامہ کے توسط سے نواب سعادت علی خاں والی اودھ کے دربار سے وابستہ ہو گئے۔ نواب نے کسی بات پر ناراض ہو کر دوسرے امراء کے ہاں ان کی آمد و رفت پر پابندی لگا دی اور تنخواہ بھی بند ہو گئی۔ انہی دنوں ان کا جوان بیٹا فوت ہو گیا جس سے جنونی کیفیت پیدا ہو گئی۔ اسی حالت میں انتقال کیا۔ 1807ء میں پہلی قواعد اردو لکھی۔ ریختی کے موجد ہیں۔ تصانیف میں ایک کلیات ہے جس میں اردو غزلوں کا دیوان، دیوان ریختی، اردو فارسی قصائد، مختصر فارسی دیوان، مثنوی، بے نقط اور کئی دوسری مثنویاں، معمے، رباعیاں، قطعے، پہیلیاں، چیستانیں وغیرہ شامل ہیں۔ ایک نثری کہانی رانی کیتکی لکھی جس میں عربی، فارسی کا کوئی لفظ نہیں آیا۔ اردو کی پہلی قواعد دریائے لطافت آپ کی کاوش ہے۔

مرسلہ: نورین۔ سرگودھا

دھڑک قسم کی لڑکی ہے۔

خدا جانے اس سے شادی کے بعد زندگی کیسی گزرتی۔ میں شاید اس پر قابو پانے میں ناکام رہتا۔

"کیا سوچنے لگے؟" اس نے مخاطب کیا۔ "کہیں ایسا تو نہیں کہ مجھ سے شادی کا ارادہ ہی بدل دیا ہو۔"

"تمہارا کیا خیال ہے کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔" میں نے الٹا ہی سوال کر دیا۔

"فوراً بدل دینا چاہیے۔" اس نے کہا۔ "کیوں کہ میں آپ کے بس کی نہیں، شادی کے بعد بھی میں اپنے دوستوں سے ملتی رہوں گی اور آپ تلملاتے رہیں گے۔ پھر یہ ہوگا کہ ہردم کے جھگڑے۔ اس سے تو بہتر ہوگا کہ آپ اپنا فیصلہ ہی بدل دیں۔ دنیا میں لاکھوں کروڑوں لڑکیاں ہیں کوئی نہ کوئی نیک اور فرماں بردار قسم کی لڑکی مل ہی جائے گی۔"

نہ جانے کیوں اس وقت مجھے احساس ہوا کہ یہ لڑکی اپنے آپ کو جس طرح ظاہر کر رہی ہے ویسی نہیں ہے۔ کوئی نہ کوئی الجھن ضرور ہے اس کے ساتھ۔

اس لیے میں نے اس سے کہا۔ "روشنی تمہیں یہ جان کر حیرت ہوگی کہ میں نے اپنا ارادہ نہیں بدلا۔ بلکہ میں پہلے سے زیادہ مضبوطی کے ساتھ اپنے ارادے پر قائم ہوں۔"

"کیا!" اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ "یہ آپ کیا بے وقوفی کریں گے۔"

"یہ بے وقوفی نہیں عقل مندی ہوگی۔" میں نے کہا۔ "تم وہ نہیں ہو جو اپنے آپ کو پوری دنیا میں پوز کرتی پھر رہی ہو۔ تم کچھ اور ہو۔"

"اوہ۔" اس نے ایک گہری سانس لی۔ "آپ پہلے آدمی ہیں جس نے میرے اندر جھانک کر دیکھ لیا ہے۔ اس روشنی کو پہچان لیا ہے جو دنیا والوں کو نظر نہیں آتی۔"

"محترمہ اب آپ مجھے بتائیں گی کہ آپ ایسا کیوں کرتی ہیں۔" میں نے پوچھا۔

"ہاں اب تو میں آپ کو ضرور بتاؤں گی۔" اس نے کہا۔ "نعمان صاحب! میں ایڈز کی مریض ہوں۔"

"کیا!"

"ہاں۔" اس کی آواز میں بلا کا کرب تھا۔ "ایک بار ایکسیڈنٹ ہوا تھا میرا۔ خون کی ضرورت پیش آگئی تھی اور مجھے جو خون دیا گیا وہ ایڈز زدہ تھا۔ بس اس کے بعد میں بیمار ہوتی چلی گئی۔ آپ میری آنکھوں کے گرد حلقے دیکھیں جن کو میں نے میک اپ سے چھپانے کی کوشش کی ہے۔"

میں نے اس کی آنکھوں کی طرف دیکھا' گہرا میک اپ کر رکھا تھا اس نے۔

"میں نے ڈاکٹرز سے مشورہ کیا۔ اکیلی گئی تھی۔ انہوں نے بتایا کہ میں ایڈز زدہ ہوں اور جس کے قریب جاؤں گی اس کو بھی اپنے ساتھ لے مروں گی۔ میں نے اپنے گھر والوں کو بھی نہیں بتایا۔ اب بتائیں میں ایسی صورت میں شادی کیسے کر سکتی ہوں۔"

"اس لیے تم الٹی سیدھی حرکتیں کرتی ہو۔ اپنے آپ کو بدنام کرتی ہو تا کہ تم سے کوئی شادی نہ کرے۔"

"ہاں اسی لیے۔"

"لیکن مجھے افسوس ہے روشنی کہ میرے سلسلے میں تمہاری یہ خواہش پوری نہیں ہوگی۔ تم چاہے لاکھ بہانے بنا لو اب تو میں تم سے شادی کر کے ہی رہوں گا۔ تم کوئی ایڈز وغیرہ کی مریضہ نہیں ہو۔"

"اوہ خدا۔ آپ تو واقعی چپک ہی گئے۔" وہ ہنس پڑی۔

"لاکھ انکار کرتی رہیں، میں آپ سے زبردستی شادی کروں گا۔"

"جی!" اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

"اب یہ بتاؤ کہ تم ایسا کیوں کرتی پھرتی ہو۔"

"صرف اس لیے کہ مردوں کو اس بات کا احساس دلایا جائے کہ صرف ان ہی کو سب کچھ کرنے کا حق نہیں ہے۔ عورت بھی بہت کچھ کر سکتی ہے۔ کاش دنیا کے ہر مرد میں آپ ہی کی طرح برداشت کا مادہ ہوتا۔ فراخ دلی اور فیاضی کے ساتھ بیوی کی غلطیاں معاف کر دینے کا حوصلہ ہوتا۔ نعمان صاحب اس دنیا میں آپ جیسے مرد کتنی کے ہوں گے اور آپ ان میں سے ایک ہیں۔"

"میرا خیال ہے کہ پھر ہم دونوں ایک ساتھ خوش رہیں گے۔" میں نے کہا۔

"بہت زیادہ۔"

میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

میں نے روشنی کے ساتھ شادی کر لی۔ چار برس ہو گئے ہیں شادی کو اور پروین شاکر کا یہ شعر پڑھنے والوں کو سنا دینا ضرور سمجھتا ہوں کہ وہ فیصلہ کرنے میں جلدی نہ کریں۔

'حسن کے سمجھنے کو اک عمر چاہیے جاناں۔ دو گھڑی کی قربت میں لڑکیاں نہیں کھلتیں۔'

محترم معراج رسول
السلام علیکم!
1971ء میں ہمارا ملک ہی دو لخت نہیں ہوا تھا بلکہ لاکھوں دل دو لخت ہوگئے تھے۔ سانحہ سقوط مشرقی پاکستان کا میں بھی متاثر ہوں۔ وہ زخم جس پر وقت نے کھرنڈ جما دی تھی وہ گزشتہ دنوں ڈھاکا میں منعقد پاک بنگلہ میچ نے تازہ کردیا۔

معین الدین
(اسلام آباد)

مٹی بدنام ہوئی

ڈھاکا کے ائرپورٹ سے اندرون شہر جاتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ ڈھاکا کتنا بدل گیا ہے۔ سڑک کی دونوں جانب جدید تعمیرات نظر آرہی تھیں ان سے بخوبی اندازہ ہو رہا تھا کہ بنگلہ دیش سرکار نے ترقی و ترویج کی طرف بہت توجہ دی ہے۔

میں بنگلہ دیش میں پاکستان سے ہونے والے کرکٹ میچوں کی کوریج کے علاوہ بنگلہ دیش پر خصوصی فیچرز لکھنے اور فوٹیج تیار کرنے کے لیے اپنے ٹی وی چینل کی جانب سے ایک ٹیم کے ساتھ بھیجا گیا تھا۔ مجھے بھیجنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میں بنگالی زبان بول اور سمجھ سکتا ہوں۔ پاکستانی کرکٹ ٹیم پہلے آچکی تھی جسے بنگلہ دیش سے تین ون ڈے، ایک ٹی ٹوئنٹی اور دو ٹیسٹ میچ کھیلنے تھے۔

ڈھاکا کے میرپور اسٹیڈیم میں تین ون ڈے اور ایک ٹی ٹوئنٹی میچ کھیلا گیا۔ میں جب میرپور پہنچا تو میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ میرپور جسے میں نے غریبوں کی بستی کے طور پر دیکھا تھا۔ جس میں ایک نمبر سے بارہ نمبر میرپور تک پختہ اور نیم پختہ ایک منزلہ مکان تھے۔ اب وہاں دو تین تین چار چار منزلہ بلڈنگیں کھڑی تھیں۔ میں ایک نمبر پہنچ کر

رک گیا۔ یہاں سے بڑی تلخ یادیں وابستہ تھیں۔ بنگلہ دیش کی زبان میں شادھین (آزادی) اور پاکستان کی زبان میں سقوط ڈھاکا کے بعد جب معروف فلم ہدایت کار ظہیر ریحان یہاں آکر پراسرار طور پر غائب ہو گئے اور ان کا کوئی سراغ نہیں ملا تو میرپور کے اس ایک نمبر کے تمام اردو بولنے والے (غیر بنگالیوں) عورتوں مردوں بچوں کو پکڑ کر سوراپاڑا کیمپ اور جیل میں ٹھونس دیا گیا۔ آج یہاں اونچی اونچی عمارتیں کھڑی تھیں۔ شاپنگ پلازوں اور مارکیٹوں میں ہر طرف رونق تھی۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ کبھی یہاں کوئی خونی سانحہ بھی رونما ہوا تھا۔ میں اور آگے بڑھا دو نمبر کراس کیا اور چھ نمبر کی حدود میں آگیا۔ دو نمبر اور چھ نمبر کے درمیان نیو ٹاؤن ایکس چینج کے سامنے جو کھلا میدان تھا، جہاں کئی بار فٹ بال میچ دیکھنے آچکا تھا۔ اسی میدان میں اب ایک شاندار اسٹیڈیم سر اٹھائے کھڑا تھا۔

ون ڈے میچ شروع ہوا تو اسٹیڈیم تماشائیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ تماشائیوں کے چہرے بھی اپنے کھلاڑیوں کی طرح جوش سے روشن تھے۔ بنگلہ دیشی کھلاڑی ورلڈ کپ کے میچوں میں اپنی بہتر کارکردگی کی وجہ سے بہت پرامید تھے۔ جس طرح انہوں نے انگلینڈ کو ہرا کر ورلڈ کپ سے باہر کردیا تھا۔ اسی طرح وہ پاکستان کو بھی ہرا کر آؤٹ کلاس کرنے کے لیے پرعزم تھے۔ جب کہ پاکستانی ٹیم اس پریشر میں تھی کہ اگر جیت بھی گئے تو یہی کہا جائے گا کہ کون سا تیر مار لیا، اپنے سے کمزور ٹیم کو ہرایا۔ مقابلہ کوئی بھی ہو فتح عزم و ہمت کی ہوتی ہے۔ جو جیت کا ارادہ لے کر میدان میں اترتا ہے۔ وہی مرد میدان ہوتا ہے اور یہی ہوا۔ بنگلہ دیشی ٹیم کے پختہ عزم و ارادے نے پہلا ون ڈے جیت کر یہ ثابت کردیا کہ مد مقابل ڈر اور خوف کے حصار میں ہو تو اسے زیر کرنا مشکل نہیں ہوتا۔ پاکستانی کھلاڑیوں سے کچھ لوگوں کو امید تھی کہ دوسرا ون ڈے جیت کر ٹیم کو برابری کی سطح پر لے آئیں گے۔ مگر ایسا نہیں ہوا ان کے ارادے کی ناپختگی اور ان کے اندر کے خوف نے بنگال ٹائیگرز کے جبڑوں سے وہ اپنے آپ کو بچا نہ سکے۔ اس طرح سیریز کی کامیابی بنگلہ دیش کے حصے میں آگئی۔ اس فتح کے بعد میں نے اسٹیڈیم میں اور اسٹیڈیم کے باہر پورے شہر میں بنگلہ دیشیوں کو مسرت اور شادمانی کے نشے میں سرشار دیکھا۔ خوشی کی بات بھی تھی۔ پاکستانی ٹیم جو دنیا کی بڑی کرکٹ ٹیموں میں تھی، جس نے بنگلہ دیش کی ٹیم کو ہمیشہ شکست سے دوچار کیا، جس کے سامنے بنگال ٹائیگرز کی حیثیت جھاگ سے زیادہ نہیں تھی۔ آج اسی بنگال ٹائیگرز نے اسے سیریز کی شکست کا مزہ چکھا دیا تھا اور اس بات کے لیے پرعزم تھی کہ تیسرا ون ڈے بھی جیت کر گرین شرٹس کی ہزیمت سے بھی دوچار کریں گے۔ پاکستان میں اور یہاں بنگلہ دیش میں بھی کچھ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ پاکستانی کرکٹرز ہر ممکن کوشش کریں گے کہ ایسا نہیں ہونے دیں گے۔ سر دھڑ کی بازی لگا کر تیسرا میچ جیت جائیں گے اور کلین سوئپ کرنے کا بنگلہ دیشی ارادہ خاک میں ملا دیں گے۔ مگر "اے بسا آرزو کہ خاک شدہ" الٹی ہو گئیں سب تدبیریں، کچھ نہ دوا نے کام کیا۔ پاکستان تیسرا ون ڈے بھی ہار گیا اور کلین سوئپ کا داغ مقدر بن گیا۔

اس موقع پر میں نے دونوں ٹیموں کے کچھ کھلاڑیوں اور کچھ تماشائیوں کی رائے بھی معلوم کرنے کی کوشش کی کہ ایسا کیوں ہوا اس کی کیا وجہ تھی؟

پاکستانی کرکٹرز نے بہت محتاط انداز میں جواب دیا۔ "کرکٹ کو بائی چانس اسی لیے کہا جاتا ہے کہ اس میں سب کچھ ممکن ہے۔ میچ سے پہلے کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا کہ آج کیا ہوگا۔"

"اس سے زیادہ وہ اور کہہ بھی کیا سکتے تھے؟ ان کے بارے میں فیصلہ کرنے والوں کو اپنے دل کی بات کہہ کر وہ ناراض کیسے کرسکتے تھے؟ ہاں بنگلہ دیشی کھلاڑیوں نے کھل کر بات کی۔ ان کا کہنا تھا کہ پاکستانی سیاست کی طرح پاکستان کرکٹ بورڈ بھی اندرونی خلفشار کا شکار ہے۔ جس کے نتیجے میں ذمہ دار حضرات پاکستان کرکٹ کی اجتماعی بہبود اور بھلائی سے زیادہ اپنے مفادات کو مقدم رکھتے ہیں۔ ایسے میں ٹیم کا وہی حشر ہونا چاہیے جو ہوا۔ اگر ایسے ذمہ داروں کے خلاف فوری تادیبی کارروائی نہیں کی گئی تو زمبابوے سے بھی جیتنے کا خواب بھی شرمندہ تعبیر نہیں ہوگا۔"

تماشائیوں سے جب میں نے یہی سوال ان کی بنگالی زبان میں کیا تو وہ بڑے حیران ہوئے۔ میرے سوال کا جواب دینے سے پہلے بولے: پہلے یہ بتایئے آپ نے ہماری بھاشا کہاں سے سیکھی پاکستان میں یا...؟"

"نہیں نہیں اسی ڈھاکے میں، اپنی ایک گرل فرینڈ سے۔" میں نے جواب دیا۔ تب میرے سوال پر ان کا تبصرہ یہ تھا۔

"محض یہ راگ الاپنے سے کہ ہم جیتیں گے بھی جیتیں گے، کوئی ٹیم جیتتی نہیں۔ جیت کے لیے محنت کرنا پڑتی ہے

جس کا بہترین نمونہ ہمارے کھلاڑی ہیں۔ یہ وہ سونا ہیں جو شکستوں کی آگ میں جل جل کر کندن بن گئے ہیں۔ پاکستان میں کہا جاتا ہے تم جیتو یا ہارو ہمیں تم سے پیار ہے۔ جب ان کے ہارنے کے بعد بھی پوری نیشن ان سے پیار ہی کرے گی تو پھر انہیں جیتنے کے لیے مشقت کرنے کی کیا ضرورت؟ آپ کا بچہ اگر امتحان میں فیل ہو جاتا ہے تو آپ اس سے پیار نہیں کرتے۔ اس پر سختی کرتے ہیں۔ پاکستان میں کرکٹ کا معیار روز بروز اس لیے گرتا جا رہا ہے کہ پی سی بی کی گرفت ڈھیلی ہو گئی ہے۔ وہ ذمہ دار عہدے دار جو بڑی بڑی تنخواہیں لیتے ہیں۔ وہ اس کارکردگی کا مظاہرہ نہیں کرتے جس سے ٹیم مضبوط ہو، کھلاڑیوں کا مورال بلند ہو۔ وزیراعظم جو کرکٹ بورڈ کے چیف پیٹرن ہیں انہیں اپنے سیاسی جھمیلوں سے اتنی فرصت نہیں تھی کہ کرکٹ بورڈ کو صحیح طور پر منظم کر سکیں۔"

ون ڈے سیریز کے "اختتام کے بعد" واحد ٹی ٹوئنٹی میچ ہوا جس کی قیادت بوم بوم شاہد آفریدی نے کی۔ مگر افسوس کہ ان کی بوم بوم کی دھوم اس میچ میں بھی کچھ کرتی ہوئی نظر نہیں آئی۔ ان کی قیادت اس ٹیم کی کارکردگی پر دوسروں کی طرح تباہی و بربادی کا سبب بنی۔ نہ وہ خود کوئی کارنامہ سرانجام دے سکے نہ ان کی ٹیم نے کوئی تیر مارا۔ ہاں پاکستانی شائقین کرکٹ کے سینوں پر شکست کا وہ تیر مارا کہ وہ ہائے ہائے کر کے رہ گئے۔

ان میچوں کے اختتام پر سوچا کہ ذرا ڈھاکا کے شہر کا طواف بھی کیا جائے۔ تبدیلی اور بدلاؤ کے آثار ہر طرف نظر آ رہے تھے۔ گھومتے پھرتے اچانک خیال آیا کہ اس سلاٹر ہاؤس کو بھی ایک نظر دیکھ لیا جائے جہاں مجھے بھی پکڑ کر ایک کوٹھری میں بند کر دیا گیا تھا کہ اگلی صبح دیگر بدنصیبوں کی طرح مجھے بھی ذبح کر دیا جاتا تھا۔ یہ ایک الگ تھلگ اور شہری آبادی سے دور ایک غیر آباد علاقہ تھا۔ وہاں ایک بہت بڑا سا گڑھا کھود کر ایک مذبح خانہ بنایا گیا تھا جس کے پاس اردو بولنے والوں کو جو شہر سے گرفتار کیے جاتے تھے۔ نے جاکران کے گلوں پر اس طرح چھری پھیری جاتی تھی کہ سارا خون گڑھے میں گرے اور پھر ذبح ہونے والوں کو بھی اسی گڑھے میں پھینک دیا جاتا تھا۔ مکتی باہنی کے کارندے روزانہ دس بارہ غیر بنگالیوں کو پکڑ کر سلاٹر ہاؤس میں لاتے تھے اور ذبح کر کے گڑھے میں ڈال دیتے تھے۔ اس دن ہوا یہ تھا کہ میں ڈھاکا یونیورسٹی کے پاس سے گزر رہا تھا کہ

اچانک چند لڑکے مجھ پر جھپٹے اور مجھے بے بس کر کے سلاٹر ہاؤس پہنچا دیا۔ مجھے ایسے سلاٹر ہاؤسوں کے بارے میں علم تھا مگر یہ معلوم نہیں تھا کہ ایک دن مجھے بھی ان میں سے ایک سلاٹر ہاؤس لے جا کر قربانی کے بکرے کی طرح ذبح کر دیا جائے گا۔

رات اندھیری تھی اور میرے ساتھ کال کوٹھری میں بند اگلے روز قتل کیے جانے والے لوگ رو رہے تھے۔ کچھ دعا ورود و ذکر کر رہے تھے کہ ایک سرگوشی سی سنائی دی۔

"سوہن! ہمارے پاس آؤ... ہمارے پاس آؤ۔"

میں چپکے سے دروازے کی طرف بڑھا۔ وہ دو تھے۔ انہوں نے کال کوٹھری کے دروازے پر لگا تالا کھولا۔

"سوہن باہر آ جاؤ۔" یہ جملہ بھی بنگالی زبان میں کہا گیا تھا۔

میں چپکے سے باہر آ گیا۔ انہوں نے ایک ننھے سے ٹارچ سے میرے چہرے پر روشنی ڈالی اور اطمینان کا سانس لے کر تالا دوبارہ بند کر دیا۔ مجھے ساتھ لے کر اس جیپ کے پاس گئے جو تھوڑی دور کھڑی تھی۔ خود بیٹھے اور مجھے بٹھایا۔ میں حیران پریشان تھا کہ یہ لوگ مجھے کہاں لے جا رہے ہیں لیکن تھوڑی دیر بعد مجھے اس سوال کا جواب مل گیا۔ جیپ محمد پور کے قلب میں جا کر رکی اور مجھ سے کہا گیا۔ "جاؤ۔ تمہیں مکتی (آزادی) مبارک ہو۔" لائٹ پوسٹ کی روشنی میں، میں نے ان دونوں کو دیکھا اور انہیں پہچان لیا۔ یہ امینہ مجمدار کے بھائی تھے۔ ان میں سے ایک مجھے اغوا کرنے والوں میں بھی تھا۔

اگلے روز دن کی روشنی میں گھر کے باہر بیٹھا جب میں یہ سوچ رہا تھا کہ کال کوٹھری میں بند میرے ساتھی، پتا نہیں اب تک زندہ بھی ہیں یا جانوروں کی طرح مار دیے گئے کہ سامنے سے امینہ آتی ہوئی نظر آئی۔ قریب آ کر اس نے کہا۔ "تمہیں زندہ و سلامت دیکھ کر مجھے جو خوشی ہو رہی ہے میں اس کا اظہار نہیں کر سکتی۔"

"مگر یہ سب کچھ ہوا کیسے؟"

"وہ جو تم نے اردو کا ایک محاورہ سکھایا تھا نا۔ سیدھی انگلی سے گھی نہیں نکلتا۔"

"تو تم نے انگلی ٹیڑھی کر کے یہ گھی نکالا ہے؟"

"ہاں میرے بھائیوں نے مجھے گھٹ گھٹ جلانے اور تڑپانے کے لیے یہ بتایا تھا کہ تمہارا بہاری دوست بھی پکڑا گیا ہے اور سلاٹر ہاؤس پہنچا دیا گیا ہے۔ کل بنگلہ دیش کی آزادی کی دیوی پر اسے بھی بلی دان کر دیا جائے گا۔"

"مگر کیوں؟ وہ تو ہماری طرح بنگالی ہے۔ کہیں پیدا ہوا اس سے فرق نہیں پڑتا۔ بہرحال بنگالی ہے۔ جب کہ وہ بنگلہ دیش کی تحریک کا بھی کبھی مخالف نہیں رہا اور جارحین کا ساتھ بھی نہیں دیا۔" میں نے ان سے کہا۔ "وہ تو ہر 21 فروری کو شہید مینار پر نکلنے والے جلوس کے ساتھ ہمارے شہیدوں کو خراج تحسین پیش کرنے والوں کے ساتھ بھی ہوتا تھا۔"

"شریک ہوتا ہوگا۔ اپنی کسی مجبوری کی وجہ سے یا پھر تمہارے عشق میں مبتلا ہو کر۔ ورنہ وہ اوبنگالی ہے۔ اور پھر اوبنگالی کو ہم قابل گردن زدنی سمجھتے ہیں۔" ان کی یہ ظالمانہ بات سن کر میں نے سوچا۔ ان ظالموں کے ساتھ ظالمانہ سلوک ہی کرنا چاہیے۔ یہ سوچ کر میں نے انتہائی سخت لہجے میں کہا۔ "اگر کل موہن سلاٹر ہاؤس میں مارا گیا تو یاد رکھیں، میں آپ کے اور اپنے خاندان کے تمام بچوں بوڑھوں، عورتوں اور مردوں کو مار کر خودکشی کر لوں گی۔ میری یہ دھمکی کارگر ثابت ہوئی اور رات انہوں نے تمہیں یہاں پہنچا دیا۔"

میں نے پہلے تو امینہ کا شکریہ ادا کیا۔ پھر کہا۔ "اس زندگی کو لے کر میں کروں گا بھی کیا؟ تمہارے بغیر تو جینے سے بہتر مر جانا ہی ہے۔ تمہارے بڑوں نے ہماری تمہاری دوستی اور محبت کے درمیان جب نفرتوں کا پہاڑ رکھ دیا اور یہ کہہ دیا کہ تمہیں کسی طرح بھی ایک اوبنگالی کے ساتھ زندگی بسر کرنے نہیں دیا جائے گا تو جینے کا مطلب ہی فوت ہو گیا۔"

اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھر کر کہا۔ "اب ہم اپنے لیے نہیں۔ دوسروں کے لیے جئیں گے۔ تم فی الحال یہیں رہو۔ جیسے ہی حالات نارمل ہوں گے میں تمہیں بارڈر کراس کروا دوں گی۔ تم وہاں سے پاکستان چلے جانا۔"

امینہ مجمدار سے میری دوستی ڈھاکا یونیورسٹی میں ہوئی تھی۔ وہ سوشیالوجی کے شعبہ میں میری ہم جماعت تھی۔ ان دنوں میری طرح اس کی انگریزی بھی بہت کمزور تھی۔ انگریزی میں ہم کھل کر گفتگو نہیں کر سکتے تھے۔ اسے اردو اور مجھے بنگالی زبان نہیں آتی تھی۔ اس لیے ہم دونوں نے فیصلہ کیا کہ وہ مجھ سے اردو سیکھے اور میں اس سے بنگالی بھاشا۔ اس کوشش میں ہم دونوں بہت حد تک کامیاب ہوئے۔ میں بنگالی سمجھنے اور بولنے لگا اور وہ اردو۔ تھوڑی بہت اردو کی شدھ بدھ تو اسے تھی ہی میرے سکھانے پر تو اس نے اردو کے بہت سے اشعار بھی یاد کر لیے تھے۔ پھر جب ہماری دوستی محبت میں بدل گئی تو اس نے کہا۔ "ہمیں اتنی روانی سے ایک دوسرے کی بولی بولنی چاہیے کہ ہمارے بچوں کو دونوں بھاشا بولنے میں کوئی دشواری نہ ہو۔"

کئی مہینوں کے بعد جب کشیدہ حالات میں بہتری آئی تو اس نے اپنے اثر و رسوخ سے مجھے بارڈر کراس کروا دیا۔

اتنے برسوں کے بعد آج جب میں دوبارہ اس ڈھاکے میں تھا جس کے ایک سلاٹر ہاؤس میں سے قدرت نے مجھے موت کے شکنجے سے بچا لیا تھا۔ آج اس سلاٹر ہاؤس کو دیکھنے کی تمنا میں، میں سرگرداں تھا۔ جگہ کا اندازہ تو مجھے تھا اس لیے پوچھتے پاچھتے میں وہاں تک پہنچ گیا مگر بنگلہ دیش کی برساتوں نے وہاں سے اب سارے خون کے دھبوں کو دھو ڈالا تھا۔۔۔ وہاں نہ کوئی سلاٹر ہاؤس تھا نہ اس کا کوئی نشان یا آثار۔ یہ جگہ اب پہلے کی طرح ویران، غیر آباد اور آبادیوں سے دور نہیں تھی۔ بھری پری آبادی کا ایک حصہ بن گئی تھی۔ یہاں بسنے والوں کو گمان بھی نہیں ہوگا کہ یہاں کی زمین کتنے بے گناہ غیر بنگالیوں کے خون سے اپنی پیاس بجھا چکی ہے۔

یہاں آ کر امینہ مجمدار کی یاد مجھے بڑی شدت سے آئی۔ اس سے ملنے کی خواہش نے مجھے بے چین کر دیا مگر وہ کہاں ہے؟ کس حال میں ہے؟ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔ یہاں سے جانے کے بعد کچھ پرانے دوستوں اور جاننے والوں کی تلاش شروع کی تو چند ایک ہی ملے۔ اب یہ سب بھی میری طرح عمر رسیدہ ہو گئے تھے۔ ان سے پوچھا۔ "یار! امینہ مجمدار کہاں ہے؟ کس حال میں ہے؟ کچھ اتا پتا ہے؟"

"کون امینہ مجمدار؟"

"وہی جو سوشیالوجی کی اسٹوڈنٹ تھی۔"

"اچھا اچھا! وہ جس کا تمہارے ساتھ رومانس بڑا مشہور ہوا تھا۔"

"ہاں ہاں وہی۔"

"فارغ التحصیل ہونے کے بعد کئی برس ڈھاکے میں کچھ دنوں تک پڑھاتی رہی۔ پھر جب اس کی شادی راجشاہی یونیورسٹی کے ایک پروفیسر سے ہوئی تو وہ راجشاہی چلی گئی اور راجشاہی یونیورسٹی میں پڑھانے لگی مگر یہ بہت پہلے کی اطلاعات ہیں۔"

میرے لیے اتنی معلومات ہی کافی تھیں۔ میں نے سوچا جب ٹیسٹ میچ کھلنا میں ہوگا تو اس دوران راجشاہی

جا کر اسے ڈھونڈنے کی کوشش کروں گا۔

جب دونوں ٹیمیں کھلنا پہنچ گئیں تو ہم میڈیا کے تمام لوگ بھی کھلنا جا پہنچے۔ مجھے یہاں بھی ڈھاکے کی طرح بہت تبدیلیاں نظر آئیں۔ اپنی نوجوانی کے دور میں، میں نے جس کھلنا کو دیکھا تھا اب وہ کھلنا موجود نہیں تھا۔ ہر طرف ترقی اور ترویج کے آثار نظر آ رہے تھے۔ پہلے یہاں ناریل کے درختوں کی جو بہتات نظر آتی تھی اب نظر نہیں آئی۔ اب ان کی جگہ اونچی اونچی بلڈنگیں، پلازے، شاپنگ سینٹر موجود تھے۔ بازاروں میں رونق تھی۔ پہلے کے مقابلے میں آبادی کا تناسب بھی بہت بڑھ گیا تھا۔ پہلے یہاں کا بہترین قدرتی مشروب ڈاب (کچا ناریل) کا پانی ہوا کرتا تھا جو گلی کوچوں اور شاہراہوں میں بڑی آسانی سے اور بہت سستے داموں دستیاب ہوتے تھے۔ مرد، عورتیں، لڑکے اور لڑکیاں ڈاب ہاتھوں میں لیے موجود ہوتے تھے۔ اب ہر جگہ ہر طرف کول ڈرنکس دستیاب تھے۔ ڈاب بیچنے والے خال خال ہی نظر آتے تھے۔

کھلنا میں ٹیسٹ شروع ہوا تو شہر کی رونقوں میں اور اضافہ ہو گیا۔ ون ڈے سیریز اور واحد ٹی ٹوئنٹی میچ میں پاکستانی ٹیم کی شکستوں کے بعد توقع تھی کہ ٹیسٹ کے فارمیٹ میں پاکستانی شاہین ان شکستوں کا ازالہ کریں گے۔

بنگال ٹائیگر نے ٹاس جیت کر خود بیٹنگ کرنے کا فیصلہ کیا اور 20 اوورز میں پوری ٹیم 332 رنز بنا کر آؤٹ ہو گئی۔ اس اننگ میں امراالقیس 51، مومن الحق 80، محمود اللہ 49، مشفق الرحیم 32، سومیہ سرکار 33 کے نمایاں اسکورر رہے۔ پاکستانی بولرز کی کارکردگی مجموعی طور پر بہتر رہی۔ کسی بنگلہ دیشی بلے باز کو جم کر کھیلنے نہیں دیا۔

پاکستان کی پہلی اننگ 628 پر اختتام پذیر ہوئی۔ محمد حفیظ 224، اظہر علی 83، مصباح الحق 59، اسد شفیق 83 اور سرفراز احمد نے 82 رنز بنا کر اپنی بہترین کارکردگی کا ثبوت دیا۔ دونوں ٹیموں کی پہلی اننگز کے بعد پاکستانی ٹیم کو 296 رنز کی برتری حاصل تھی۔ مبصرین کا خیال تھا کہ اگر پاکستانی بالرز نے اسی طرح دوسری اننگز میں بھی بنگال ٹائیگرز کو آؤٹ کلاس کر دیا تو پاکستان کی فتح یقینی ہوگی مگر اس خیال اور اس توقع پر پاکستانی بولرز پورے نہ اتر سکے۔ دوسری اننگز میں بنگال ٹائیگرز ناقابل شکست چٹان بن گئے اور پاکستانی بولرز کو بے بسی کی تصویر بنا کر رکھ دیا۔ ریکارڈ رنز اوپننگ شراکت 312 پر ختم ہوئی۔ پاکستانی بولرز 312 رنز پر بنگلہ دیش کی پہلی وکٹ گرانے میں کامیاب ہوئے تو یہ آثار نظر آنے لگے تھے کہ بنگال ٹائیگرز شاہینوں کی فتح کے خواب پورے نہیں ہونے دیں گے۔ تمیم اقبال کی ڈبل سنچری 206، امراالقیس کی 150 شکیب الحسن کی 76 کے نمایاں اسکور نے بنگلہ دیشی عزائم کی مہر ثبت کر دی۔ میچ کے ختم ہونے تک 6 وکٹ کے نقصان پر 555 رنز اسکور بورڈ پر اس بات کا اعلان کر رہے تھے کہ پاکستانیوں کی فتح کا خواب چکنا چور ہو گیا ہے۔ یہ میچ ڈرا ہو گیا جسے مبصرین اور ناقدین نے ٹائیگرز کی فتح کے برابر قرار دیا۔

ہم میڈیا والے بھی حیران پریشان تھے کہ یہ سب کچھ کیسے ہو گیا؟ وہ بولرز جو پہلی اننگز میں ہیرو بن کر ابھرے تھے، دوسری اننگز میں زیرو کیسے بن گئے؟ بنگال ٹائیگرز نے یہ کیسا جادو کر دیا کہ پاکستانی بولرز بے بس ہو کر رہ گئے؟

پہلا ٹیسٹ میچ کسی بھی ٹیم کی جیت ہار کے بغیر ختم ہو گیا مگر اپنے پیچھے یہ سوال چھوڑ گیا کہ کیا پاکستان کرکٹ کا معیار اتنا پست ہو گیا ہے کہ اس کے کھلاڑی بنگلہ دیشی ٹیم کو بھی ہرانے اور شکست کا مزہ چکھانے کی صلاحیت سے محروم ہو گئے ہیں؟

پہلے ٹیسٹ کے اختتام کے بعد دوسرا ٹیسٹ تین دن بعد ڈھاکے میں ہونے والا تھا۔ میں نے سوچا اس دوران کیوں نہ راجشاہی کا ایک پھیرا لگا لیا جائے۔ امینہ مجمدار کو ڈھونڈ کر اس سے کچھ پرانی یادیں تازہ کر لی جائیں۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ”آپ لوگ ڈھاکا جائیں۔“

”کیا آپ نہیں جائیں گے؟“

”جاؤں گا۔ دوسرا ٹیسٹ شروع ہونے پر آپ لوگوں کو ڈھاکا میں جوائن کر لوں گا۔ اس وقت ذرا راجشاہی جا رہا ہوں۔“

”وہاں کوئی خاص کام ہے کیا؟“

”ہاں، ایک پرانے ساتھی کو ڈھونڈنا اور اس سے ملاقات کرنا ہے۔“

راجشاہی میں بھی پہلے کے مقابلے میں بہت خوشگوار تبدیلی نظر آئی۔ امینہ کو ڈھونڈ نکالنے کے لیے میں سیدھا راجشاہی یونیورسٹی پہنچ گیا۔ میں نے امینہ مجمدار کے بارے میں پوچھا تو حیرت کا اظہار کرتے ہوئے الٹا مجھ سے سوال کیا گیا۔ ”کون امینہ مجمدار؟“

”وہ جو یہاں پڑھاتی تھیں جن کے میاں بھی

پروفیسر تھے۔"

میرے جوان مخاطب نے ذرا سوچ کر کہا۔ "ذرا ٹھہریے، میں کسی سینئر اسٹاف سے آپ کی ملاقات کراتا ہوں۔"

سینئر صاحب نے مجھ سے کہا۔ "امینہ مجمدار تھیں، امینہ سرکار یہاں سوشیالوجی ڈیپارٹمنٹ سے انچارج تھیں۔ ان کے شوہر عبدالرؤف سرکار انٹرنیشنل افیئرز کے استاد تھے۔"

"جی ہاں، وہی مجھے مطلوب ہیں۔ میں چونکہ ان کو شادی کے پہلے نام سے جانتا ہوں اس لیے۔"

"مگر انھیں تو ریٹائرمنٹ لیے کافی عرصہ ہوگیا ہے۔"

"ان کا کوئی اتا پتا؟"

انھوں نے اپنے موبائل فون پر کسی سے رابطہ کیا اور مسز امینہ سرکار کا ایڈریس مانگا۔ ذرا دیر بعد ایک چپراسی ایک پرچہ لیے آیا۔ سینئر اسٹاف نے وہ پرچہ لے کر دیکھا پھر میری طرف بڑھا دیا۔ پرچے پر ریٹائرڈ مسز امینہ سرکار کے گھر کا پتا درج تھا۔ میں نے ان محترم کا شکریہ ادا کیا اور اس پتے کی تلاش میں چل پڑا۔ یہ پتا تلاش کرنے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔ شہر کے پوش علاقے میں ایک بڑے اور خوب صورت بنگلے کی صورت میں مل گیا۔ میں نے کال بیل پر انگلی رکھی اور کسی کے آنے کا انتظار کرنے لگا۔ ذرا دیر بعد ایک بارہ چودہ سال کا لڑکا نمودار ہوا۔ کچھ اس انداز میں کہ اس کے دونوں کانوں میں باریک تار اڑسے ہوئے تھے اور شاید جو گانا وہ سن رہا تھا وہی گنگنا بھی رہا تھا۔ "چکنی کلائیاں رے......"

"ارے چکنی کلائیاں! مسز امینہ سرکار گھر پر ہیں؟"

جانے میں کس دھن میں تھا کہ میں نے بھی اردو ہی میں اس سے سوال پوچھ لیا تھا۔ اس نے ایک کان کو تار سے آزاد کر کے جی پہ بھری (کیا) کہا۔

میں نے اپنا سوال دہرا دیا اور اس کے ہاں یا ناں کہنے سے پہلے یہ بھی کہہ دیا۔ "ان سے جا کر کہو پاکستان سے موہن بابو ملنے آئے ہیں۔"

ایک لمحہ اس نے مجھے سر سے پاؤں تک گھور کر دیکھا اور پھر بغیر کچھ کہے اندر بھاگا۔ چند منٹ ہی بمشکل گزرے ہوں گے کہ دو لڑکیاں میرے سامنے کھڑی تھیں۔ دونوں چودہ سولہ سال کی ہوں گی۔ دونوں نے ہاتھ جوڑ کر مجھے پرنام کیا اور بولیں۔ "آیئے۔"

ڈرائنگ روم میں بٹھا کر کہا۔ "آپ بیٹھیے۔ گرینڈ ماما بھی آتی ہیں۔"

میں بیٹھ کر چاروں طرف تجسس نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ ڈرائنگ روم بڑے جدید انداز میں آراستہ کیا گیا تھا۔ ہر چیز بہت صاف ستھری اور سلیقے سے سجائی گئی تھی۔ میں اس وقت اپنے خیالات سے چونکا جب ایک لڑکی نے ایک ٹرے میرے سامنے رکھ کر کہا۔ "آپ پانی کھایئے گرینڈ موموبس آنے ہی والی ہیں۔"

میں ہلکے سے مسکرایا۔ بنگالی زبان میں پانی اور جوس وغیرہ کو پینا نہیں کھانا کہتے ہیں لیکن وہ بھی کھائی جاتی ہے۔ یہ پانی نہیں کول ڈرنک تھی۔ میں گلاس اٹھا کر ہلکے ہلکے گھونٹ لینے لگا۔ لڑکی گلاس رکھ کر دروازے کے قریب کھڑی دو ساتھیوں کے پاس جا کر کھڑی ہوگئی اور وہ آپس میں بنگالی زبان میں کانا پھوسی کے انداز میں باتیں کرنے لگیں۔

"تو یہی وہ محترم ہیں جن کا نام لے کر گرینڈ پاپا انھیں اکثر چھیڑا کرتے تھے۔"

"ہاں نام تو وہی ہے جو گرینڈ پا انھیں تنگ کرتے ہوئے کہتے تھے۔ جب بھی وہ انھیں ذرا اداس دیکھتے تو کہتے "تمہیں وہ اپنا موہن پیارا تو یاد نہیں آرہا ہے؟"

"اگر یاد بھی آرہا ہے تو تم جل کر کباب کیوں ہورہے ہو؟" دوسری بوڑھی کہتی وہ کہتی تھیں۔

"مجھ سے تو تمہاری اداسی نہیں دیکھی جاتی۔ کہو تو تمہیں اس کے پاس بھجوا دوں یا اسے یہاں بلالوں کہ آجاؤ تڑپتے ہیں ارمان، اب عمر گزرنے والی ہے۔" پہلی والی نے لقمہ دیا۔ "گرینڈ موم جواب دیتی تھیں۔"

میں ان کی باتیں سن کر بہت محظوظ ہورہا تھا۔ وہ لوگ تو یہی سمجھ رہی ہوں گی کہ ان کی باتیں میرے پلے نہیں پڑ رہی ہوں گی۔

ابھی میں نے گلاس کا سارا مشروب ختم نہیں کیا تھا کہ امینہ ڈرائنگ روم میں نمودار ہوئی مگر وہ امینہ نہیں تھی جسے میں یہاں چھوڑ کر گیا تھا۔ یہ تو سفید ساڑی، جھریوں والے چہرے پر سنہری کمانی والے چشمے اور قدرے جھکی ہوئی کمر اور ہاتھ میں اسٹک تھامے ہوئے کوئی اور ہی امینہ تھی۔ امینہ مجمدار نہیں امینہ سرکار۔ میرے سامنے آکر امینہ سرکار بولی۔

"السلام علیکم! کیسے ہو موہن؟"

"وعلیکم السلام۔ بس ویسا ہی ہوں جیسا نظر آرہا ہوں۔"

"شاید تم کرکٹ میچ دیکھنے آئے ہو؟"

”دیکھنے بھی اور اپنے ٹی وی چینل کی کوریج کے لیے بھی۔“

”اوہ گڈ! تو تم نے جرنلزم کا پیشہ اختیار کر رکھا ہے۔“

”ہاں زندہ رہنے کے لیے کچھ تو کرنا چاہیے تھا نا۔“

امینہ ایک دم لڑکیوں کو مخاطب کر کے بولی۔ ”یہ میرے بوائے فرینڈ موہن ہیں۔“

اس عمر میں ان کے منہ سے مجھے بوائے فرینڈ کہنا کچھ عجیب سا لگا۔ لڑکیاں بولیں۔ ”وہی نا، جن کا نام لے کر گرینڈ پا آپ کو چھیڑا کرتے تھے؟“

”ہاں وہی، بالکل وہی۔“

ایک لڑکی جو اپنی ہمجولیوں سے چھوٹی تھی، بولی۔ ”گرینڈ ماما! مسلمان ہو کر آپ نے ایک ہندو سے کیوں پیار کیا؟“

”اوّل تو ہندو بھی انسان ہوتا ہے اور ہر انسان پیار کے قابل ہوتا ہے مگر یہ موہن، ہندو تھوڑی ہیں مسلمان ہیں۔ ان کا نام معین الدین ہے۔ اب تم کہو گی یہ موہن کیسے بن گئے؟ تو بیٹا! جن دنوں ہندوستان کی ہندو حکومت ہم بنگالیوں پر بہت زیادہ مہربان ہو گئی تھی اور ہمیں شاد ہین (آزادی) کا سپنا دکھانا شروع کر دیا تھا۔ ہم لوگ ان کے ہندوانہ رنگ میں ایسے رنگ گئے تھے کہ ہم لوگ اپنے اسلامی تشخص کو ان کے ہندو کلچر میں ڈھال کر گویا فخر محسوس کرتے تھے۔ انہی دنوں ارجمند خان کو ارجن، شگفتہ کو شیلا اور معین الدین کو موہن کہہ کر پکارا جانے لگا تھا۔ گویا ہمارے ہاں غیر ارادی طور پر مسلمان کو ہندو بنانا ایک امر ناز کی بات تھی۔“

لڑکیاں اپنی گرینڈ موم کی باتیں بہت توجہ سے سن رہی تھیں۔ میں نے امینہ سرکار سے کہا۔ ”یہ لڑکیاں وہاں کیوں کھڑی ہیں، انہیں بلا کر صوفے پر بٹھا لو۔“

ابھی وہ ہمارے قریب آ کر بیٹھی ہی تھیں کہ ویٹرز کا پہیّے والا ٹرالی دھکیلتا ہوا ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ اس کے پیچھے دو خواتین بھی تھیں۔ انہوں نے نزدیک آ کر دونوں ہاتھ جوڑ کر پرنام کرنا چاہا تھا کہ امینہ بیگم نے ٹوکا۔

”پرنام نہیں، سلام کرو۔ السلام علیکم کہو۔ یہ نام والے ہندو ہیں۔“

پھر میری طرف دیکھ کر کہا۔ ”معین الدین! یہ میری بہو فریدہ ہے اور یہ میری بیٹی کلثوم جو چند دنوں کے لیے میرے گھر آئی ہوئی ہے۔ یہ لڑکیاں میری نواسی اور پوتیاں ہیں اور یہ میوزک کا رسیا حسن۔۔۔ میرا پوتا ہے۔“

”کیسی عجیب بات ہے۔“ کلثوم بولی۔ ”ماما نے آپ سے انسیسی کو بھی پوشیدہ نہیں رکھا۔ ہم نے ہمیشہ پاپا کو آپ کے حوالے سے انہیں چھیڑ چھاڑ کرتے دیکھا۔ اس بات پر یہ کبھی برا نہیں مانتی تھیں۔ بلکہ کبھی کبھی پاپا کو جلانے اور ستانے کی نیت سے کہتی تھیں۔ ”میں تو اپنے من مندر میں آج بھی اپنے موہن کی پوجا کرتی ہوں۔“

”ماما۔“ اب کی امینہ کی بہو فریدہ نے اسے مخاطب کیا۔ ”اگر آپ دونوں ایک دوسرے سے اتنے کلوز ہو گئے تھے تو آپ لوگوں نے شادی کیوں نہیں کی؟“

بیٹا! ہم تو چاہتے تھے مگر ظالم سماج نے ہماری محبت میں ولن کا کردار ادا کیا اور کہا ”یہ شادی نہیں ہو سکتی۔“

”کیوں نہیں ہو سکتی؟ اس کی کیا وجہ بتائی آپ کے بڑوں نے؟“ یہ امینہ کی ایک پوتی کا سوال تھا۔

”ہاں بتائی۔“ انہوں نے کہا۔ ”وہ بہاری ہے۔“

”بہاری! ہم کچھ سمجھے نہیں گرینڈ ماما یہ کیسی بیماری تھی؟“

امینہ نے فوراً ہی جواب نہیں دیا۔ ذرا دیر تک اپنی بہو بیٹی اور ان کے بچوں کو دیکھا پھر بولیں۔ ”ہاں یہ بتانے کی بات ہے۔ جب 1947ء میں سب کانٹی نینٹ کا بٹوارہ ہوا۔ اس سے پہلے اور اس کے بعد پورے کہا نیڈ ہندوستان میں بہت خون خرابہ ہوا۔ انڈیا میں رہنے والے مسلمان اپنی جان بچانے کے لیے پاکستان آنے لگے۔ وہ حصہ جو اب بنگلہ دیش کہلاتا ہے، پارٹیشن کے بعد پاکستان بن گیا تھا۔ اس میں بھی انڈین مسلمان ہجرت کر کے آئے۔ اب یہ محض اتفاق تھا کہ مشرقی پاکستان میں آنے والے زیادہ مہاجر بھارتی علاقے بہار سے آئے تھے۔ اس لیے وہ بہاری کہلائے جس طرح بنگال میں رہنے والے بنگالی کہلاتے ہیں۔ مگر ستم ظریفی یہ ہوئی کہ مقامی لوگوں نے بعد میں کلکتہ، بمبئی، لکھنؤ اور دہلی سے آنے والوں کو بھی بہاری کہنا شروع کر دیا۔ گویا ہر او بنگالی کو بنگالی بہاری کہنے لگے۔ کچھ عرصہ تک تو بہاری اور بنگالی آپس میں مل جل کر بہت پیار محبت سے رہے مگر بعد میں جب لینگویج موومنٹ شروع ہوا اور سیاسی بازی گروں نے اپنی سیاست چمکانے کے لیے اس موومنٹ کو ہوا دی تو بنگالیوں کے دلوں میں بہاریوں کے خلاف نفرت کی آگ بھر دی۔“

”اوہ!“ کلثوم نے میری طرف اشارہ کر کے کہا۔ ”موہن بابو کو بھی بہاری کہہ کر آپ کے لیے ریجیکٹ کر دیا

گیا۔"

"ہاں! اگرچہ بیچارہ تو بنگال ہی میں پیدا ہوا تھا۔ اس لیے بنگالی ہوا پھر بھی میرے پرکھوں نے اس پر بہاری ہونے کی تہمت لگائی۔ اس لیے کہ اس کی مادری زبان اردو تھی۔"

"پھر تو واقعی بڑا ظلم ہوا۔" ایمہ کی نواسی بولی۔ "دو محبت کرنے والوں کو محض دو مختلف زبان بولنے کی وجہ سے ایک نہیں ہونے دیا گیا۔"

ذرا دیر کے لیے ڈرائنگ روم کی فضا سوگوار ہو گئی تھی۔ ایمہ نے اس کیفیت کا احساس کرتے ہوئے کہا۔ "ارے بھئی! چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔ سرو کرو نا۔" پھر مجھ سے کہا۔ "تم اب بھی گرم چائے پینے کے عادی ہو یا ..."

"نہیں اب ایسی باتوں پر دھیان دینے کا موقع کہاں ملتا ہے جو جب جیسا مل جاتا ہے استعمال کر لیتا ہوں۔"

تھوڑی دیر تک چائے کا دور چلتا رہا۔ میں نے محسوس کیا کہ ایمہ کا خاندان بہت روشن خیال اور ماڈرن ہے۔ جہاں دادی اور نانی کا عشق بھی ڈسکس کیا جاتا ہے وہاں...

"افسوس کہ گرینڈ پا زندہ نہیں۔" اچانک ایمہ کی پوتی بول پڑی اور میرے خیالات کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ "وہ اس وقت موجود ہوتے تو بڑا مزہ آتا۔ گرینڈ ماما، آپ سے لاگ لگاوٹ کی باتیں کر کے ان کی چھیڑ چھاڑ کا خوب انتقام لیتیں۔"

ایمہ سرکار نے ایک لمبی ٹھنڈی سانس لی۔ "وہ بہت اچھے انسان تھے۔ وہ میرے عشق کے بارے میں چھیڑ چھاڑ ضرور کرتے تھے مگر اس بات کا انھوں نے کبھی برا نہیں منایا۔ انھیں بھی اس بات کا افسوس تھا کہ دو پیار بھرے دلوں کو ایک ہونے کا موقع نہیں دیا گیا۔"

میں نے موضوع بدلنے کے بہانے کہا۔ "ارے بھئی! تمہارے بچے تو اچھی اردو بول بھی لیتے ہیں اور سمجھ بھی جاتے ہیں۔"

"ہاں۔" کہہ کر وہ لمحہ بھر کو رکی پھر کچھ یاد کرتے ہوئی بولی۔ "تمھیں یاد ہے موہن! میں نے تم سے کہا تھا۔ ہماری شادی ہو جائے گی تو ہم اپنے بچوں کو اردو زبان اور بنگالی بھاشا کی ایسی تعلیم دیں گے کہ وہ ہماری بات آسانی سے سمجھ سکیں۔ نہ انھیں تمہاری اردو سمجھنے میں دشواری ہو نہ میری بنگالی بولی سن کر وہ میرا منہ تکیں۔"

"ہاں! یاد ہے۔" میں نے دھیرے سے اقرار کیا۔

"ہائے... کیا کیا قول و قرار۔ عہد و پیمان اور منصوبہ بندی کی گئی ہوں گی۔" ایمہ کی نواسی ہمدردی تھی۔ "جو پورے نہیں ہو سکے۔"

"دو پریمیوں کو جدا کر کے، جیون بھر کے لیے ایک دوسرے سے دور کر کے کچھ لوگوں کو کیا مل گیا؟" فریدہ نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"بھری ماں!" ایمہ نے اسے جواب دیتے ہوئے کہا۔ "یہ تو اس نفرت کی ابتدا تھی جسے پروان چڑھا کر گندی سیاست کا کھیل کھیلنے والوں نے مسلمانوں کے ہاتھوں مسلمانوں کا خون بہایا۔ ایک دو نہیں لاکھوں مسلمانوں کو مسلمانوں کے ذریعے قتل کروا دیا۔ اسی نفرت کا نتیجہ تھا کہ مارنے والوں نے نہیں سوچا کہ ہم کس کو مار رہے ہیں؟ اگر سوچا تو صرف اپنی ذات کے بارے میں۔ اپنے قائد کے بارے میں، اپنی کرسی اور اقتدار کے بارے میں سوچا۔ وہ وقتی طور پر اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہوئے مگر ان کا انجام کیا ہوا؟ قدرت کے کھیل بھی بڑے نیارے ہوتے ہیں۔ وہ جو نفرت کی جوالا مکھی بھڑکا کر جاتی پتا بن گئے تھے۔ اسی جاتی (ذات) نے اس پتا (باپ) اور اس کے سارے خاندان کو خون میں نہلا کر اس کو اس کے انجام تک پہنچا دیا اور وہ جس نے اس نفرت کو ہوا دے کر بھائیوں کو بھائیوں سے لڑوایا۔ ان کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا۔ اس نے اپنے اس کارنامے پر سمجھا تھا کہ وہ رانی سے مہارانی بن جائے گی مگر ہوا کیا؟ وہ نفرت جس کی چنگاری میں اس نے پھونک ماری تھی۔ اسی نفرت کی آگ میں جل کر بھسم ہو گئی اور وہ جو......" ایمہ کہتے کہتے ایک دم رک گئی۔ پھر مسکراتی ہوئی بولی۔ "میں بھی کیا پرانی کہانی سنانے بیٹھ گئی۔"

"بڑی دیر ہو گئی۔" میں بول پڑا۔ "اب آپ لوگ مجھے اجازت دیں۔" یہ کہتے ہوئے میں کھڑا ہو گیا۔

"ٹھیک ہے جاؤ مگر ایک دن کھانے پر تو آؤ۔ میرے بیٹے سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔"

"نہیں مسز سرکار! اب میرا آنا ممکن نہیں۔ مجھے ڈھاکا پہنچ کر دوسرے ٹیسٹ میچ کی کوریج کرنی ہے۔" میں نے دل میں امنڈتے درد پر بند باندھتے ہوئے کہا۔

سارے لوگ کھڑے ہو گئے تھے اور باری باری مجھ سے مصافحہ کر کے خدا حافظ کہنے لگے۔ سب سے آخر میں ایمہ کے پوتے کی باری آئی تو اس نے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ "دشتی بدنام ہوئی ڈارلنگ تیرے لیے۔"

خط تنسیخ

محترم مدیر
السلام علیکم
یہ آپ بیتی میں نے بڑی مشکل سے لکھی ہے۔ جیل کی سلاخوں کے پیچھے کسی چیز کا حصول آسان نہیں پھر بھی میں نے کاغذ قلم حاصل کرکے وہ اہم بات لکھ دی ہے جس نے مجھے قاتلہ بنایا۔ اس وقت میں کس جیل میں ہوں یہ لکھنا نہیں چاہتی تاکہ کوئی میرا اصلی نام نہ جان لے۔

ثمرہ احمد
(مقام نا معلوم)

میں ان دنوں ایم بی بی ایس کے فائنل ایئر میں تھی۔ فائنل ایئر میں پہنچ کر طالب علم پورے ڈاکٹر بن جاتے ہیں۔ اسپتالوں میں ان کی ڈیوٹیاں شروع ہو جاتی ہیں۔ لوگ انہیں ڈاکٹر صاحب کہہ کر خطاب کرتے ہیں تو وہ فخر سے مزید پھول جاتے ہیں۔ ان دنوں میری ڈیوٹی بھی ملتان کے ڈسٹرکٹ اسپتال میں تھی۔ میں نائٹ ڈیوٹی کر رہی تھی۔
دو دن سے شدید سردی تھی۔ ملتان میں جتنی گرمی پڑتی ہے اس سے کہیں زیادہ سردی بھی پڑتی ہے۔ میں وارڈ

کا راؤنڈ لگا کر اپنے کمرے میں آگئی اور ہیٹر آن کر کے الیکٹرک کیتل میں کافی کے لیے پانی رکھ دیا۔

اچانک دروازے پر دستک ہوئی اور ڈاکٹر وجاہت اندر آگئے۔ ڈاکٹر وجاہت اسٹوڈنٹ نہیں تھے بلکہ خاصے سینئر ڈاکٹر تھے۔ میں ان کا بہت احترام کرتی تھی۔ وہ انتہائی ماہر سرجن تھے۔ ملتان کے کسی بڑے جاگیردار گھرانے سے ان کا تعلق تھا۔ وہ ملازمت محض انسانیت کی خدمت کے لیے کرتے تھے۔

میں نے مسکرا کر کہا۔ "آیئے سر! آپ اب تک گھر نہیں گئے؟"

"میں ابھی ابھی ایک آپریشن سے فارغ ہوا ہوں۔ آپریشن تو میں نے کر دیا ہے لیکن مریض کی حالت خطرے سے باہر نہیں ہے۔ میں اس وقت تک گھر نہیں جاؤں گا۔ جب تک مریض کو ہوش نہیں آجاتا۔" پھر وہ مسکرا کر بولے۔ "میں اس وقت صرف کافی پینے آپ کے پاس آیا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ مجھے اس وقت کافی اور اتنی شاندار کافی کہیں نہیں مل سکتی۔"

"یہ بات ہے تو آپ کو ایک نہیں بلکہ دو کپ پینا پڑیں گے۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

"اگر یہ آپ کی شرط ہے تو میں دو کپ بھی پی جاؤں گا۔" وہ مسکرا کر بولے۔

"اس دن شدید سردی تھی۔ ڈاکٹر وجاہت بھی سردی سے کانپ رہے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ ادھر میرے پاس آجائیں۔"

وہ کرسی لے کر میرے پاس بیٹھ گئے اور اپنے جوتے اتارتے ہوئے بولے۔ "ڈاکٹر ثمرہ! سردی میں میرے پیر ٹھنڈے ہو جاتے ہیں۔ اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو......"

"ڈاکٹر صاحب آپ آرام سے بیٹھیں۔" میں نے کافی کا مگ ان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "سردی میں میرے بھی پیر بہت ٹھنڈے ہو جاتے ہیں۔"

وہ کافی پیتے ہوئے بولے۔ "اصل میں آج صبح ہی سے مجھے اپنی طبیعت کچھ بوجھل بوجھل سی ...... محسوس ہو رہی ہے۔ میں نے دوا تو لے لی ہے مگر ابھی تک بخار کم نہیں ہوا۔"

"سر آپ کو بخار ہے؟" میں نے کہا اور بے اختیار اپنا ہاتھ ان کی پیشانی پر رکھ دیا۔ انہیں تو واقعی بہت تیز بخار تھا۔

"سر آپ ادھر بیڈ پر آجائیں۔" میں نے کہا۔ "دوا کے ساتھ ساتھ آرام بھی کریں گے تو بخار اتر جائے گا۔"

"لیکن ڈاکٹر آپ......"

"میں یہاں کرسی پر بیٹھ جاؤں گی۔ ویسے بھی میں رات کو کم ہی سوتی ہوں۔ رات میں کسی بھی وقت وارڈ میں میری ضرورت پڑ ہی جاتی ہے۔"

میرے اصرار پر ڈاکٹر وجاہت بیڈ پر لیٹ گئے۔ میں نے اپنا کمبل بھی انہیں دے دیا۔ میں ان کی جگہ کرسی پر بیٹھ گئی۔

تھوڑی ہی دیر میں ڈاکٹر وجاہت کو نیند آگئی اور وہ گہری نیند سو گئے۔ میں نے ایک گھنٹے بعد کافی کا ایک اور کپ پیا اور اطمینان سے بیٹھ گئی۔ میں نے ہیٹروں کے سامنے کرسی رکھ لی اور اپنے پیر پھیلا دیے۔ میں ہمیشہ ڈیوٹی نرس کو تاکید کر دیتی تھی کہ وارڈ میں کوئی ایمرجنسی ہو تو مجھے ضرور بتائے۔ نرسیں اور وارڈ بوائز عموماً ڈاکٹر کے آرام کی وجہ سے انہیں ڈسٹرب نہیں کرتے۔

میں تھوڑی دیر تک ایک میگزین پڑھتی رہی پھر میری آنکھیں بھی نیند سے بوجھل ہونے لگیں۔ میں نے ڈاکٹر وجاہت کی طرف دیکھا وہ اتنی گہری نیند میں تھے کہ مجھے ان پر ترس ہی آیا۔ وہ عموماً منہ اندھیرے اسپتال پہنچ کر آپریشن شروع کر دیتے تھے اور دن بھر آپریشن تھیٹر میں ہی رہتے تھے۔ میں نے انہیں سونے دیا۔ پھر نہ جانے کب مجھے بھی نیند آگئی۔

خواب میں کوئی میرے بالوں میں انگلیاں پھیر رہا تھا۔ پھر ایک نرس میرے پیر دبانے لگی۔ مجھے بہت سکون مل رہا تھا۔

اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ ایک لمحے کو تو مجھے یاد ہی نہیں آیا کہ میں کہاں ہوں۔ پھر فوراً ہی مجھے یاد آگیا کہ میں اسپتال کے کمرے میں ہوں۔ کمرے میں اس وقت گھپ اندھیرا تھا۔ میں نے اٹھنا چاہا تو کسی نے میرا بازو زور سے پکڑ کر مجھے دوبارہ لٹا دیا۔ پھر ڈاکٹر وجاہت کی آواز سنائی دی۔ "لیٹی رہو ثمرہ!"

"ڈاکٹر......" میں نے چیخ کر بولنا چاہا لیکن ڈاکٹر وجاہت نے اپنا ایک ہاتھ میرے لبوں پر رکھ دیا۔

پھر وہ کچھ ہو گیا جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اپنی بربادی پر میں بلک بلک کر رونے لگی۔

"ثمرہ پلیز! مجھے معاف کر دو۔ مجھے پتا نہیں کیا ہو گیا تھا۔"

میں نے سوچا کہ سارا قصور وجاہت کا نہیں تھا۔ اگر

میں شور مچادیتی۔ ڈاکٹر وجاہت کو جھڑک دیتی تو ان کی ہمت بھی نہ پڑتی لیکن میرے دل و دماغ پر تو وجاہت کب سے چھائے ہوئے تھے۔ میں چاہتے ہوئے بھی مزاحمت نہ کرسکی۔

ڈاکٹر وجاہت نے مجھ سے وعدہ کیا کہ میں نے غلطی کی ہے تو اس کی تلافی بھی اب میں کروں گا۔ میں تم سے شادی کرلوں گا۔

"ڈاکٹر وجاہت نے مجھ سے کہا تھا کہ تم اپنے گھر والوں کو بتادو کہ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ یہ تو تم بھی جانتی ہو ثمرہ کہ میں نے ابھی تک شادی نہیں کی ہے۔ میرا شادی کرنے کا کوئی ارادہ بھی نہیں تھا بس تمہیں دیکھ کر میرا ارادہ ڈانواڈول ہوگیا۔ میں تو تمہیں اس وقت سے چاہنے لگا تھا جب میں نے تمہیں پہلی دفعہ دیکھا تھا۔"

میں ہواؤں میں اڑنے لگی۔ ڈاکٹر وجاہت جیسا خوب رو اور مردانہ وجاہت سے بھرپور شخص مجھے چاہتا تھا۔ یہ احساس ہی مجھے بے خود کیے دے رہا تھا۔

وجاہت نے کہا تھا کہ میں اپنے گھر والوں کو بتا دوں۔ میرے گھر میں بھیا کے سوا تھا کون۔ پاپا اور امی کا اس وقت انتقال ہوگیا تھا جب میں میٹرک میں تھی۔ بھیا مجھ سے کافی بڑے تھے۔ انہوں نے مجھے امی اور پاپا کی کمی محسوس نہیں ہونے دی تھی۔ پھر انہوں نے شادی کی تو رخشانہ بھابی ہمارے گھر آگئیں۔ وہ بھی میرا بہت خیال رکھتی تھیں۔ میں نے انہیں بتا دیا کہ ڈاکٹر وجاہت مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہیں اور وہ ہمارے گھر رشتہ بھیجنا چاہتے ہیں۔

"ارے واہ تم تو بہت چھپی رستم نکلیں ثمرہ۔" بھابی نے کہا۔ "یہ بتاؤ کہ صرف ڈاکٹر وجاہت ہی تم سے شادی کرنا چاہتے ہیں یا تم بھی چاہتی ہو؟"

"بھابی!" میں ان سے لپٹ گئی۔

"اچھا تو گویا یہ فیصلہ ہے۔" بھابی مسکرا کر بولیں۔ "تم فکر مت کرو۔ تمہاری شادی وہیں ہوگی جہاں تم چاہتی ہو۔"

میں مطمئن ہوگئی۔ ڈاکٹر وجاہت سے اسپتال میں روز ہی ملاقات ہوتی تھی۔

ایک دن میں اسپتال پہنچی تو ڈاکٹر وجاہت پہلے کی طرح پھر میرے کمرے میں آگئے۔ وہ کچھ پریشان تھے۔ میں نے پریشانی کی وجہ پوچھی تو بولے۔ "ثمرہ! مجھے سرجری کے ایک کورس کے لیے نیویارک جانا ہے۔ صرف تین مہینے کی بات ہے۔ وہاں سے واپس آکے ہی میں امی کو تمہارے گھر بھیج دوں گا۔"

ان سے جدائی کے خیال سے میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ میں نے آنسو صاف کرتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

"وجاہت! زیادہ دیر مت لگائیے گا.... میں ....."

"ثمرہ! کیا بات ہے؟" وجاہت نے کہا۔ "تم کیا کہنا چاہتی ہو؟"

"وہ میں...... اُمید سے ہوں اور......"

"واقعی؟" وجاہت خوشی سے چہک اٹھے۔ "تو پھر تو میرا جلدی آنا بہت ضروری ہے۔ یوں سمجھو یوں گیا اور یوں آیا۔"

"آپ ٹیلی فون پر تو رابطہ رکھیں گے نا؟"

"یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے؟" وجاہت نے مسکرا کر کہا اور مجھے بازوؤں میں بھرلیا۔

ان کے جانے کے بعد دنیا گویا بے رنگ ہو کر رہ گئی۔ ہاں وہ رات کو ایک دفعہ ٹیلی فون پر بات ضرور کرتے تھے۔ ان کے بغیر ایک ایک پل میرے لیے ایک ایک صدی کے برابر تھا۔

ان کا کورس چار مہینے بعد ختم ہوگیا۔ انہوں نے مجھے ٹیلی فون پر بتایا کہ میں آج رات کو یہاں سے پاکستان کے لیے روانہ ہو جاؤں گا۔ کل صبح تم سے ملاقات ہوگی۔

میں پھر ہواؤں میں اڑنے لگی۔ خوشی سے رات بھر نیند بھی نہیں آئی۔

اس دن میرا آف تھا۔ میں گھر پر ہی تھی۔ رات کا جانے کون سا پہر تھا کہ ٹیلی فون کی کرخت گھنٹی سے میری آنکھ کھل گئی۔ ٹیلی فون لاؤنج میں ہوتا تھا لیکن میں رات کو اپنے بیڈروم میں رکھ لیا کرتی تھی کہ نہ جانے کب اسپتال سے میرا بلاوا آجائے۔

میں نے ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھایا اور کان سے لگا لیا۔ "ہیلو۔" میں نے غنودہ آواز میں کہا۔

"ڈاکٹر ثمرہ؟" مجھے فون پر ایک اجنبی آواز سنائی دی۔

"جی ہاں، میں بول رہی ہوں۔" میں نے پھر غنودہ لہجے میں کہا۔

"ڈاکٹر ثمرہ! میں نیویارک سے بول رہا ہوں۔ آپ کے لیے ایک بری خبر ہے۔"

میں گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ میری نیند اچانک ہوا ہوگئی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ "کیسی بری خبر؟"

پینگوئن عجوبہ قدرت ہے ایسا پرندہ ہے جو اڑ تا نہیں۔ تیرتا تو ایسے ہے کہ کیا مچھلی تیرے گی۔ غوطہ لگاتا ہے تو تیس فٹ کی گہرائی تک جبکہ 840 فٹ تک کی غوطہ خوری کا بھی ریکارڈ موجود ہے۔ یہ ریکارڈ بڑی قسم کی پینگوئن کا ہے جو Emperor Penguin کہلاتی ہیں۔ وہی کوتاہ گردن وہی گٹھا ہوا بدن وہی ٹھنڈے سے ہاتھ وہی بھدہ بھدہ کر کے چلنا' ہاں قد ان کا عام پینگوئن سے زیادہ ہوتا ہے۔ تقریباً ساڑھے تین فٹ اور وزن تقریباً سو پونڈ۔ کچھ لوگ ان کو کوتاہ گردن انگریزوں سے تشبیہ دیتے ہیں جو سفید قمیص اور کالا ٹیل کوٹ پہنے اور ٹھمک ٹھمک کر چل رہے ہوں۔

قدرت کا کرشمہ ہے کہ یہ ایمپرر پینگوئن ایسی سردی میں انڈے دیتے ہیں جب کڑاکے کا جاڑا پڑ رہا ہو اور درجہ حرارت منفی ایک سو بارہ ڈگری فارن ہائٹ۔ مادہ انڈا دیتی ہے تو نر اسے اپنے پنجوں پر رکھ لیتا ہے اور اپنی کھال کا ایک غلاف سا اس پر چڑھا دیتا ہے۔ مادہ خوراک کی تلاش میں نکل پڑتی ہے میلوں کا سفر طے کر کے کھا پی کر واپس آتی ہے نر سردی سے بچنے کے لیے آپس میں جڑ کر کھڑے رہتے ہیں اور دو مہینے کے عرصے میں بغیر غذا کے آدھے رہ جاتے ہیں' مادہ جب لوٹ کر آتی ہے تو انڈے کی ذمے داری سنبھالتی ہے اور اپنے بھرے ہوئے پوٹے میں سے بچے کو کھانا کھلاتی ہے۔

''ڈاکٹر قمرہ! میں ڈاکٹر وجاہت کا کورس میٹ ہوں ڈاکٹر سرین گپتا۔ ڈاکٹر وجاہت پاکستان جانے کے لیے ائرپورٹ جا رہے تھے کہ ان کی ٹیکسی ایک تیز رفتار وین سے ٹکرا گئی۔ آئی ایم سوری ڈاکٹر.....اب ڈاکٹر وجاہت اس دنیا میں موجود نہیں ہیں۔''

''نہیں.....نہیں۔'' میں نے چیخ کر کہا۔ ''آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔ آپ جھوٹ بول رہے ہیں نا؟'' میں نے چیخ کر کہا لیکن ٹیلی فون کی لائن بے جان ہو چکی تھی۔

میری چیخیں سن کر بھیا اور بھابی اپنے کمرے سے نکل آئے۔ بھیا نے گھبرا کر پوچھا۔ ''کیا ہوا قمرہ.....کیا ہوا تمہیں؟''

میرا ذہن اس وقت شاید مفلوج ہو گیا تھا۔ مجھے اپنی چیخوں پر اختیار نہیں رہا تھا۔ بھابی نے بمشکل تمام مجھے چپ کرایا۔ مجھے چپ کراتے کراتے بھابی خود بھی رونے لگیں اور بولیں۔ ''کیا ہوا قمرہ! تم اس انداز میں کیوں چیخ رہی ہو؟''

''بھابی.....وہ ڈاکٹر وجاہت.....''

''کیا ہوا ڈاکٹر وجاہت کو.....تم نے کیا کوئی خواب دیکھا ہے شاید؟''

''کاش یہ خواب ہی ہوتا۔'' میں نے روتے ہوئے کہا۔ ''ابھی نیویارک سے ٹیلی فون آیا تھا کہ ڈاکٹر وجاہت.....'' اتنا کہہ کر میں پھر رونے لگی۔

بھابی نے بستر پر گرا ہوا ریسیور ہاتھ میں دیکھا۔ انہوں نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا کہ دوسری طرف کوئی بھی نہیں تھا۔ بھابی نے مجھ سے وجاہت کا فون نمبر لیا اور نیویارک ٹیلی فون کر دیا۔ فوراً ہی ان کا رابطہ ہو گیا اور وہ کسی سے باتیں کرنے لگیں۔ ''ڈاکٹر گپتا.....جی ہاں ابھی آپ کی کال آئی تھی.....اچھا.....کیسے؟.....او کے ڈاکٹر۔'' یہ کہہ کر انہوں نے ریسیور رکھا اور مجھ سے لپٹ گئیں۔ میں ان سے لپٹ کر ایک بار پھر رونے لگی۔

صبح تک مجھے شدید بخار آ گیا۔ بھیا نے مجھے اسپتال سے چھٹی کرنے کو کہا۔ ڈاکٹر وجاہت کی موت کے بعد مجھے یہ پریشانی تھی کہ اب میں کیا کروں بدنامی کا عفریت منہ پھاڑے کھڑا تھا۔ ابھی تو صرف میں جانتی تھی لیکن بہت جلد دوسروں کو بھی معلوم ہونے والا تھا کہ میں ماں بننے والی ہوں۔ میں نے سوچا کہ مجھے بھابی کو بتا دینا چاہیے۔

میں نے ہمت کر کے بھابی کو سب کچھ بتا دیا۔ بھابی بھی بری طرح پریشان ہو گئیں اور بولیں۔ ''قمرہ اب ایک ہی راستہ ہے کہ تم بدنامی اور رسوائی کے اس طوق سے جلد از جلد نجات پا لو۔ کل تم میرے ساتھ چلنا۔ ہم کسی لیڈی ڈاکٹر سے مشورہ کریں گے۔''

دوسرے دن میں بھابی کے ساتھ ملتان کے ایک معروف ڈاکٹر سے ملی اور اسے بتایا کہ میں فی الحال بچہ نہیں چاہتی ہوں۔

لیڈی ڈاکٹر نے چونک کر مجھے دیکھا اور بولی۔ ''بی بی آپ کے ہسبینڈ کہاں ہیں؟''

مجھے اس سوال کی توقع پہلے ہی تھی۔ میں نے کہا۔

"میرے شوہر آج کل لاہور میں ہیں لیکن وہ میرے بلانے پر آجائیں گے۔"

"آپ کے شوہر کیا کرتے ہیں؟" لیڈی ڈاکٹر نے پوچھا۔

"وہ سرجن ہیں اور لاہور کے ایک اسپتال میں جاب کرتے ہیں۔"

لیڈی ڈاکٹر نے میرا معائنہ کیا اور بولی۔

"سوری.....اب یہ کام نہیں ہوسکتا۔ اب بہت دیر ہوچکی ہے۔ آپ کی جان بھی جاسکتی ہے۔"

"اوکے ڈاکٹر۔" میں نے کہا۔

"اور سنیے۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "شہر میں کئی مڈوائف اور ڈاکٹر پیسوں کے لالچ میں یہ کام کرتی ہیں لیکن پلیز ان کے پاس مت جایئے گا۔ وہ پیسے کی خاطر آپ کی جان کی پروا بھی نہیں کریں گی۔"

"میں خود ڈاکٹر تھی اور جانتی تھی کہ لیڈی ڈاکٹر جو کچھ کہہ رہی ہے سچ کہہ رہی ہے۔"

ہم وہاں سے نکلے تو بھابی کسی گہری سوچ میں گم تھیں۔ گھر پہنچنے تک وہ مسلسل سوچتی رہیں۔ پھر وہ کافی دیر بعد بولیں۔ "ثمرہ! اس کا ایک ہی حل ہے۔ فوری طور پر تمہاری شادی کروی جائے۔"

"بھابی یہ کام فوری طور پر کیسے ہوسکتا ہے۔ لڑکے بازار میں تو نہیں بکتے کہ جائیں اور جاکر خرید لیں۔ کیا میں لوگوں سے کہتی پھروں گی کہ اللہ کے واسطے مجھ سے شادی کرلو۔"

"اس کا ایک حل اور بھی ہے۔" بھابی نے کہا۔

"ڈلیوری تک تمہیں ملتان سے کہیں دور بھیج دیا جائے۔"

"ہاں یہ ہوسکتا ہے۔ بس ایک قباحت ہے۔ اگلے ہفتے فائنل ایئر کے امتحانات ہونے والے ہیں میں فی الحال ملتان نہیں چھوڑ سکتی۔"

"ارے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟" بھابی نے کہا۔ "ابھی کم از کم دو مہینے تک تو تم یہاں رہ سکتی ہو۔"

میں امتحانات سے فارغ ہوئی تو بھابی نے مجھے ایک دوست کے پاس کراچی بھجوا دیا۔ انہوں نے شاید بھیا کو بھی سب کچھ بتا دیا تھا اس لیے بھیا نے مجھ سے کچھ بھی نہ پوچھا۔

کراچی پہنچ کر میں بھابی کی دوست مائرہ باجی کے گھر میں رہی۔ ان کے شوہر جاوید بھائی بھی بہت اچھے انسان تھے۔ شاید بھابی نے مائرہ باجی کو بھی حقیقت بتادی تھی۔ انہوں نے مجھ سے شوہر کے بارے میں ایک لفظ بھی نہ پوچھا۔

میں نے کراچی کے ایک بہترین میٹرنٹی ہوم میں خوب صورت سی ایک بچی کو جنم دیا۔ وہ اتنی پیاری تھی کہ اسے چھوڑنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا لیکن اسے چھوڑنا میری مجبوری تھی۔

جاوید بھائی کے آفس میں ایک بیوہ زینب بیگم کام کرتی تھیں۔ وہ اکثر جاوید بھائی کے گھر آجاتی تھیں۔ ان کا دنیا میں کوئی نہیں تھا۔ پڑھی لکھی اور سمجھی ہوئی خاتون تھیں۔

مائرہ باجی نے ہم سے کہا۔ "ثمرہ! تم اپنی بچی کو زینت کے پاس چھوڑ دو۔ ہر ماہ اسے اخراجات کے پیسے دیتی رہنا۔ زینت کا یوں بھی اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ وہ خوشی خوشی اس پر راضی ہوجائے گی۔"

میں مزید ایک ماہ مائرہ باجی کے گھر رہی، پھر دل پر پتھر رکھ کر مریم کو زینت کے حوالے کردیا۔ میں نے اپنی اس بدنصیب بچی کا نام مریم رکھا تھا۔ میں نے اس سے وعدہ کیا کہ میں دو تین مہینے میں ایک دفعہ کراچی آکر مریم سے ملتی رہوں گی۔

وقت کا کام ہے گزرنا، وہ گزرتا رہا پھر میری شادی شہزاد سے ہوگئی۔

☆.....☆

میری شادی کو اب سولہ برس گزر چکے ہیں لیکن اس کے بعد پھر اللہ نے مجھے اولاد نہیں دی۔ میرے شوہر بہت اچھے آدمی ہیں۔ وہ ملتان کے ایک بڑے گھرانے کے چشم و چراغ ہیں۔ میرے پاس بے پناہ دولت ہے لیکن ذہنی سکون نہیں ہے۔

میری ساس نفیسہ خانم بہت غصے والی خاتون ہیں۔ حویلی میں ان کی مرضی کے بغیر کوئی تنکا نہیں ہل سکتا۔

انہوں نے ایک دن شہزاد سے کہا۔ "شہزاد! تم نے کبھی سوچا ہے کہ اس وسیع و عریض جائیداد کا وارث کون ہو گا؟"

"اماں! یہ میرے سوچنے کی بات نہیں ہے۔" شہزاد نے بیزاری سے کہا۔ "اگر یہ کام میرے بس میں ہوتا تو میں بہت پہلے کرلیتا۔"

"یہ کام تمہارے بس میں ہے شہزاد۔" اماں نے کہا۔ "تم دوسری شادی کرلو۔"

"نہیں اماں!" شہزاد نے صاف انکار کردیا۔ "میں ثمرہ پر سوکن نہیں لاؤں گا۔ میں اس پر ظلم نہیں کرسکتا۔"

"یہ ظلم نہیں ہے۔ ہماری ضرورت ہے۔ پھر

تمہارے باپ دادا تو چار چار شادیاں کرتے آئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ جائز کیا ہے۔"

"اماں! مجھے مجبور مت کریں۔" شہزاد نے کہا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ "میں اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتا۔" یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گئے۔

"میں باہر لاؤنج میں تھی اور سب کچھ سن رہی تھی۔ میں خود چاہتی تھی کہ شہزاد دوسری شادی کرلیں۔ شادی کے سولہ سال گزرنے کے باوجود ابھی تک وہ ویسے کے ویسے ہی تھے۔ خوب صورت اور باوقار، کوئی بھی لڑکی ان سے شادی کرکے فخر محسوس کرتی۔

شہزاد کے جانے کے بعد اماں میرے کمرے میں آگئیں۔ میں انہیں دیکھ کر اٹھ کے بیٹھ گئی اور جلدی سے بولی۔ "آیئے اماں۔"

وہ میرے بیڈ پر بیٹھ گئیں اور بولیں۔ "بہو! میں آج تجھ سے کچھ مانگنے آئی ہوں۔"

"اماں آپ حکم کریں۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "میرے پاس جو کچھ ہے سب آپ ہی کا ہے؟"

"بیٹا! مجھے اپنے لیے کچھ نہیں چاہیے۔ مجھے بس ایک پوتا چاہیے۔"

میں جواب میں کچھ کہنے ہی والی تھی کہ اماں نے مجھے روک دیا۔

"میں تمہیں الزام نہیں دے رہی ہوں بہو، یہ تو اس مولا کی مرضی ہے۔ میں صرف اتنا چاہتی ہوں کہ شہزاد دوسری شادی کرلے۔ تم اسے سمجھاؤ میری بات تو وہ سنتا ہی نہیں۔"

"میں خود بھی یہی چاہتی ہوں اماں۔" میں نے کہا۔ "اس وسیع و عریض جائیداد اور دولت کو ایک وارث کی ضرورت ہے۔ آپ کو ایک پوتے کی ضرورت ہے اور مجھے ایک بیٹا چاہیے۔ وہ دوسری بیوی کا سہی لیکن ہوگا تو شہزاد کا بیٹا! میں خود ان سے بات کروں گی اماں۔" میں نے کہا۔ "آپ پریشان مت ہوں۔ میں انہیں راضی کرلوں گی۔"

"بہو! مجھے غلط مت سمجھنا۔" اماں نے کہا۔ "میں تو خود تجھ پر سوکن لانا نہیں چاہتی تھی۔ میں نے سولہ سال تک انتظار کیا۔ اب میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔" پھر انہوں نے میرے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔ "بہو میں......"

"یہ کیا کررہی ہیں اماں؟" میں نے ان کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔ اگر شہزاد نے دوسری شادی نہ کی تو مجھ پر ظلم ہو گا۔ میں بھی اس گھر میں رونق دیکھنا چاہتی ہوں۔ بچوں کی قلقاریاں سننا چاہتی ہوں۔ میں شہزاد کو راضی کرلوں گی۔"

رات کو میں نے شہزاد سے بات کی تو وہ غصے سے اکھڑ گئے۔ "یہ تم کیا کہہ رہی ہو شمرہ؟" وہ بھڑک کر بولے۔ "تم خود اپنی ذات پر ظلم کرنا چاہتی ہو؟"

"یہ ظلم نہیں، مجھ پر احسان ہوگا شہزاد۔" میں نے کہا۔

"میں ابھی اللہ کی ذات سے مایوس نہیں ہوا ہوں۔ ہماری میڈیکل رپورٹس بالکل درست ہیں۔ بس اللہ ہی کی طرف سے دیر ہو رہی ہے۔"

"دوسری شادی کرکے بھی آپ اللہ کی مرضی کے خلاف نہیں کریں گے۔" میں نے کہا۔

"تم کیا واقعی دل سے یہ بات کہہ رہی ہو؟" شہزاد نے پوچھا۔

"ہاں! میں خلوص دل سے یہ بات کہہ رہی ہوں۔"

"تم ایک دفعہ پھر سوچ لو، بعد میں پچھتانے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔"

"میں نے اچھی طرح سوچ لیا ہے شہزاد۔" میں نے کہا۔

"کہیں اماں نے تمہیں مجبور تو نہیں کیا ہے؟" شہزاد چونک کر بولے۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "میں نے تو خود اماں سے کہا تھا کہ آپ شہزاد سے دوسری شادی کی بات کریں۔"

میں رات کو دیر تک انہیں سمجھاتی رہی۔ پھر ہم لوگ نہ جانے کب سو گئے۔

"دوسرے دن میں نے اماں کو خوش خبری سنادی کہ میں نے شہزاد کو نیم راضی کرلیا ہے۔ آپ بس خاموش رہیں۔ میں ان کی دوسری شادی کرا کے ہی دم لوں گی۔"

اماں نے مجھے ڈھیروں دعائیں دیں۔

سچی بات تو یہ ہے کہ میں سب کچھ اپنی خوشی سے نہیں کررہی تھی۔ بس میرے ضمیر پر ایک بوجھ تھا کہ میں نے شہزاد کو اس بات سے لاعلم رکھا تھا کہ میں کنواری نہیں ہوں۔ پھر میں انہیں اولاد کا سکون دینے میں بھی ناکام رہی تھی۔ میں ان کی دوسری شادی کرا کے اپنی غلطی کی تلافی کرنا چاہتی تھی۔

اس دن شہزاد کے جانے کے بعد میرے سیل فون کی گھنٹی بجی۔ سیل فون ابھی کچھ دن پہلے ہی شہزاد نے مجھے لا کر دیا تھا۔

میں نے اسکرین پر نمبر دیکھا۔ وہ کوئی لینڈ لائن نمبر تھا اور جانا پہچانا تھا۔ میں نے بٹن دبا کر سیل فون کان سے لگا لیا۔ "ہیلو!" میں نے کہا۔

"ہیلو! ثمرہ بی بی!" دوسری طرف سے زینت کی آواز آئی۔

"آپ کیسی ہیں زینت باجی؟" میں نے پوچھا۔ "مریم کیسی ہے؟"

"مریم بیٹیا بالکل خیریت سے ہے۔ میری طبیعت البتہ بہت خراب ہے۔"

"کیوں! آپ کو کیا ہوا؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"بس بی بی!" زینت باجی نے ٹھنڈا سانس لیا۔ "بڑھاپا تو خود ایک بیماری ہے۔"

"زینت باجی! آپ ابھی اتنی بوڑھی تو نہیں ہیں؟"

"پہلے میری بات سن لو ورنہ میں بھول جاؤں گی کہ میں نے تمہیں فون کیوں کیا تھا۔ اصل میں مریم اپنے کالج کے ساتھ پاکستان ٹور پر جا رہی ہے میں نے اس سے کہا ہے کہ وہ ملتان بھی جائے۔"

"وہ ضرور ملتان آئے زینت باجی۔" میں نے طویل سانس لے کر کہا پھر چونک کر بولی۔ "کہیں آپ نے اسے بتا تو نہیں دیا کہ وہ......"

"آپ کی مرضی کے بغیر میں اسے کیسے بتا سکتی ہوں ثمرہ بی بی!" زینت نے کہا۔ "لیکن اب میں چاہتی ہوں کہ اسے حقیقت کا علم ہو جانا چاہیے۔ میں اب زیادہ دیر آپ کی امانت کی حفاظت نہیں کر سکتی۔"

"اچھا! میں کچھ سوچتی ہوں۔" میں نے کہا۔ "آپ بتائیں کہ آپ کو پیسوں کی ضرورت تو نہیں ہے؟"

"نہیں ثمرہ بی بی!" زینت نے کہا۔ "آپ ہر مہینے اتنے ڈھیر سارے پیسے بھیج دیتی ہیں ان میں سے بھی بچ جاتے ہیں۔ وہ میں مریم کے اکاؤنٹ میں ڈال دیتی ہوں۔"

"اچھا! میں اگلے ماہ کراچی آؤں گی تو اس سلسلے میں بات کریں گے۔" میں نے کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

مریم ملتان آئی تو مجھ سے ملنے آئی۔ وہ مجھے آنٹی کہتی تھی اور مجھ سے بہت محبت کرتی تھی۔ وہ اتنی حسین ہو گئی تھی کہ میں اسے دیکھتے ہوئے ڈرتی تھی کہ مبادا میری ہی نظر اسے نہ لگ جائے۔ میں نے مریم کو پہلی دفعہ اپنی حویلی میں بلایا تھا۔ اماں اور شہزاد سے یہ کہا کہ مریم میری دور کی ایک

انسولین (Insulin)

ذیابیطس کی خاص دوا۔ ذیابیطس کا مرض عنق البلعوم (لبلبہ کی گردن) میں خرابی پیدا ہونے کی وجہ سے ہوتا ہے۔ صحت کی حالت میں عنق البلعوم سے ایک خاص رطوبت خارج ہوتی ہے جو نظامِ جسمانی میں شکر کے توازن کو قائم رکھتی ہے۔ خرابی پیدا ہو جانے سے کافی مقدار میں یہ مادہ پیدا نہیں ہوتا اور شکر مناسب طریقے سے ہضم ہوئے بغیر پیشاب کے راستے خارج ہونے لگتی ہے۔ عنق البلعوم سے جو مادہ پیدا ہوتا ہے اسے انسولین کہتے ہیں۔ اسے بچھڑوں کی کلیجی سے بھی بنایا جاتا ہے۔ ذیابیطس کے مریض کو اس کا ٹیکہ لگانے سے اس کی حالت بہتر ہو جاتی ہے۔ کیوں کہ یہ اس رطوبت کا نعم البدل ہے جو مریض کے جسم میں کافی مقدار میں پیدا نہیں ہوتی۔

مرسلہ: عابد صوفی۔ سلانوالی

انشائے ابوالفضل

شہنشاہ اکبر کے وزیر ابوالفضل کے مکتوبات کا مجموعہ جو اس نے بادشاہ کی طرف سے لکھے۔ ابوالفضل نے متعدد کتابیں لکھیں۔ مثلاً اکبر نامہ بشمول آئینِ اکبری، جامع اللغات، عیارِ دانش (کلیلہ و دمنہ کا ترجمہ) رقعاتِ ابوالفضل، رزم نامہ مہابھارت کا فارسی میں ترجمہ۔ انشائے ابوالفضل تین دفتروں پر مشتمل ہے۔ ان کو عبدالصمد افضل محمد نے مرتب کیا۔ پہلے دفتر میں وہ مکاتیب و فرامین ہیں جو مختلف فرمانرواؤں کو لکھے گئے۔ مجموعی تعداد 18 ہے۔ دفتر دوم اور دفتر چہارم بادشاہ کے ذاتی خطوط پر حاوی ہے۔ تیسرا دفتر ابوالفضل کی ذاتی یادداشتوں اور تحریروں پر مشتمل ہے جو اس نے زیرِ مطالعہ کتب یا مختلف حالات و واقعات سے اثر پذیر ہو کر اپنے استفادہ کی خاطر لکھے۔

مرسلہ: نورین۔ سرگودھا

کزن کی بیٹی ہے۔ ملتان گھومنے آئی تو یہاں بھی آ گئی۔

" اماں اس سے مل کر بہت خوش ہوئیں۔ شہزاد کو بھی مریم بہت پسند آئی تھی۔ انہوں نے مریم کو ملتان کے تمام تاریخی مقامات دکھائے اور اسے خوب تفریح کرائی۔ مریم بھی بہت خوش تھی۔ وہ رخصت ہونے لگی تو اماں نے اسے سونے کا ایک قیمتی سیٹ دیا کہ تم پہلی دفعہ ہمارے گھر آئی ہو یوں خالی ہاتھ نہیں جاؤ گی۔"

مریم کے جانے کے بعد میرا دل بہت اداس ہو گیا۔ کاش میں مریم کو ہمیشہ کے لیے اپنے پاس رکھ سکتی۔ میں دل مسوس کر رہ گئی۔

ایک دن شہزاد نے خود ہی کہا۔ "ثمرہ! تم میری دوسری شادی کرنا چاہتی ہو نا؟"

"ہاں! اماں نے آپ کے لیے ایک دو لڑکیاں دیکھی بھی ہیں۔ میں ایک دو دن میں ان کے ساتھ جاؤں گی۔"

شہزاد خاموش ہو گئے۔ پھر وہ کچھ سوچ کر بولے۔ "ثمرہ! میں شادی کسی بڑے خاندان میں نہیں کروں گا۔ بڑے باپ کی بیٹی آئے گی تو اس کے مطالبات بھی ویسے ہی ہوں گے۔ میں کسی عام سی لڑکی سے شادی کروں گا جو ہمارے قابو میں رہے۔"

"آپ کی یہ منطق میری سمجھ میں نہیں آئی۔" میں نے کہا۔ "کسی اچھے خاندان کی لڑکی اس گھر میں آئے گی مگر مجھے کیا نقصان پہنچائے گی؟"

"وہ ہر بات میں تمہاری برابری چاہے گی۔" شہزاد نے کہا۔ "میں دوسری شادی کے لیے راضی ہوا ہوں مگر تمہیں میری یہ بات ماننا ہوگی۔"

"اچھا، جیسے آپ کہیں گے ویسا ہی ہوگا۔"

ان دنوں شہزاد نے ٹرانسپورٹ کا کاروبار شروع کیا تھا۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے بارہ ٹرک اور تقریباً بیس بسیں لی تھیں۔ جو کراچی سے پشاور تک مختلف روٹس پر چلتی تھیں۔ اب کاروبار کے سلسلے میں شہزاد اکثر گھر سے باہر ہوتے تھے۔ وہ کبھی لاہور چلے جاتے کبھی اسلام آباد اور کبھی کراچی۔

اس دن بھی شہزاد لاہور گئے ہوئے تھے۔ اچانک میرے سیل فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے اسکرین پر نظر ڈالی تو اس پر زینت کا نام تھا۔ اب میں نے زینت کا نمبر محفوظ کر لیا تھا۔

"ہاں زینت؟" میں نے کہا۔

"ثمرہ بی بی! اب میں مریم آپ کی امانت کی حفاظت نہیں کر سکتی۔ آپ آ کر مریم کو لے جائیں۔"

"اچھا کیا ہو گیا زینت؟" میں نے پوچھا۔

"اب میں آپ کو کیا بتاؤں ثمرہ بی بی۔۔۔۔۔ وہ دراصل۔۔۔۔۔ مریم کسی کے عشق میں مبتلا ہو گئی ہے اور اس سے شادی کرنے والی ہے۔"

"یہ کیا کہہ رہی ہو زینت!" میں نے درشت لہجے میں کہا۔

"میں غلط نہیں کہہ رہی ہوں ثمرہ بی بی!" زینت نے کہا۔ "شاید میں ہی اس کی تربیت اچھی طرح نہیں کر پائی۔"

"تم نے اس لڑکے کو دیکھا ہے؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔" زینت نے کہا۔ "ایک دفعہ وہ زینت کو چھوڑنے آیا تھا حالانکہ میں نے اسے دیکھا تھا وہ مریم سے عمر میں بڑا لگ رہا تھا۔"

"یہ تو خیر ایسی بات نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"تم بہلا پھسلا کر مریم سے یہ معلوم کرو کہ وہ کون ہے؟ کس خاندان کا ہے؟ اس سے کہنا کہ اگر وہ شخص واقعی شادی کرنا چاہتا ہے تو اپنے گھر سے باقاعدہ رشتہ بھجوائے۔"

"میں نے اس سے یہی کہا تھا۔" زینت نے بتایا۔ "اس ہفتے وہ رشتہ بھجوا دے گا۔"

"تم پریشان مت ہو۔ میں کل پرسوں تک خود کراچی پہنچ رہی ہوں۔ میں خود چھان بین کروں گی کہ مریم کس سے شادی کرنا چاہ رہی ہے۔"

میں نے شہزاد کو فون کیا تو وہ لاہور میں تھے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ یہاں سے میں راولپنڈی اور پشاور جاؤں گا۔ مجھے واپسی میں ایک ہفتہ لگ سکتا ہے۔

میں نے سوچا کہ میں اماں سے کوئی بھی بہانہ کر کے کراچی جا سکتی ہوں۔ دو تین دن میں واپس آ جاؤں گی۔

میں نے ڈرائیور سے گاڑی نکالنے کو کہا اور خود ایک بیگ میں اپنا ضروری سامان لے کر بیٹھ گئی۔ میں جب گاڑی کے ذریعے کوئی لمبا سفر کرتی تھی تو احتیاط کے طور پر اپنے ہینڈ بیگ میں چھوٹا سا ایک پسٹل ضرور رکھتی تھی۔ بس اس سے ایک نفسیاتی سہارا ہو جاتا ورنہ یہ بات میں بھی جانتی تھی کہ اگر خدانخواستہ میری گاڑی پر ڈاکوؤں نے حملہ کیا تو چھوٹا سا پسٹل میرے کسی کام نہیں آئے گا۔

میں صبح منہ اندھیرے ملتان سے نکلی تھی اور دن ایک بجے تک کراچی پہنچ گئی۔ میں سیدھی گلشن اقبال پہنچی۔ میں نے زینت کو وہیں ایک فلیٹ خرید کر دیا تھا۔

زینت مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ اس دن وہ تنہا ہی تھی۔ میں نے اس سے مریم کے بارے میں پوچھا تو وہ بولی۔ ”اچھا ہوا آپ آگئیں ثمرہ بی بی! مریم نے تو اس شخص سے شادی کا پورا پلان بنالیا ہے، کل وہ اس شخص سے کورٹ میرج کررہی ہے۔ میں نے باجرہ بی بی سے بات کی تھی۔ وہ بھی سن کر بہت پریشان ہوگئی تھیں۔ جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ آپ کراچی آرہی ہیں تو وہ کچھ مطمئن ہوئی۔

”تم نے لڑکے کے بارے میں معلومات کیں زینت باجی؟“

میں نے کوشش کی تھی لیکن مریم نے سختی سے منع کردیا اور بولی۔ ”آپ لاکھ تحقیقات کرالیں وہ اچھا ہے یا برا۔ اس کا خاندان جیسا بھی ہے میں شادی تو اسی سے کروں گی پھر فضول میں محنت کیوں کریں گی آپ؟“

اس وقت مریم آگئی۔ اس نے مجھے سلام کیا اور سیدھی اپنے کمرے کی طرف بڑھی۔ مجھے اس کے رویے سے دھچکا سا لگا۔ وہ ہمیشہ مجھ سے والہانہ انداز میں لپٹ جاتی تھی۔ آج وہ اجنبیوں کی طرح میرے سامنے سے نکل گئی تھی۔

اس بات کو زینت نے بھی محسوس کیا۔ اس نے مریم کو آواز دی۔ وہ اس کی آواز پر اکھڑی اکھڑی سی باہر آگئی۔

”مریم بیٹا! کتنی بری بات ہے ثمرہ آنٹی اتنی دور سے آئی ہیں اور تم ان کے ساتھ یہ سلوک کررہی ہو؟“

”سوری آنٹی!“ مریم نے کہا۔ ”میں اصل میں ٹینشن میں ہوں۔“

”کوئی بات نہیں بیٹا۔“ میں نے کہا۔ ”تم ادھر میرے پاس آکر بیٹھو ابھی ساری ٹینشن ختم ہوجائے گی۔“

وہ میرے پاس آکر بیٹھ گئی۔

میں نے اس کے بالوں کو سہلاتے ہوئے کہا۔ ”مریم بیٹا! میں نے سنا ہے کہ تم شادی کررہی ہو؟“

مریم چونک اٹھی اور بولی۔ ”تو آپ کیا چاہتی ہیں میں شادی نہ کروں؟“

”میں یہ کیوں چاہوں گی بیٹا!“ میں نے افسردگی سے کہا۔ ”اور بھلا میرے چاہنے سے کیا ہوگا۔ تم کروگی تو وہی جس کا فیصلہ تم کرچکی ہو۔ میں تو بس ایک دفعہ تمہارے ہونے والے دولہا سے ملنا چاہتی ہوں۔“

”شادی کے بعد ملوا دوں گی۔“ مریم نے سرد لہجے میں کہا۔ ”ویسے بھی میرا آپ سے رشتہ ہی کیا ہے؟“

میرے دل پہ گھونسا سا لگا۔ مجھے مریم سے اس لہجے اور رویے کی امید نہیں تھی۔ میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”سوری بیٹا! مجھے تمہارے ذاتی معاملے میں دخل نہیں دینا چاہیے۔ میں بھول گئی تھی کہ میرا تم سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔“ پھر میں نے اپنے ہاتھوں سے سونے کے ٹھوس کڑے اور چوڑیاں اتار کے اس کے حوالے کردیں اور کہا۔ ”بیٹا مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم شادی کررہی ہو ورنہ کوئی اچھا سا گفٹ لے کر آتی۔ تمہارا گفٹ ادھار رہا۔ فوراً تو میری طرف سے چھوٹا سا یہ گفٹ۔“ میں نے کڑے اور چوڑیاں مریم کی طرف بڑھائیں۔ اس وقت شاید میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

”تھینک یو آنٹی!“ اس نے کہا۔ ”پلیز آپ روئیں مت۔“

پھر وہ کچھ دیر میرے ساتھ بیٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد میں نے زینت سے کہا۔ ”یہ ابھی دوبارہ باہر جائے گی۔ میں اس کا پیچھا کروں گی۔ ممکن ہے وہ اس لڑکے کی طرف جائے۔“

میرے اندازے کے عین مطابق ایک گھنٹے بعد مریم تیار ہوکر اپنے کمرے سے باہر نکلی اور مجھ سے بولی۔ ”سوری آنٹی میں زیادہ دیر آپ کے ساتھ نہیں بیٹھ سکتی۔ مجھے ابھی ایک ضروری کام سے جانا ہے۔“

”کوئی بات نہیں بیٹا۔“ میں نے کہا۔ ”میں تو کراچی آتی رہتی ہوں۔ اب آؤں گی تو آپ کے لیے شادی کا ایک زبردست گفٹ لے کر آؤں گی۔“

مریم گھر سے باہر نکلی تو میں محتاط انداز میں اس کے پیچھے نیچے اتری۔ بلڈنگ سے باہر نکل کر اس نے ایک ٹیکسی روکی اور اس میں بیٹھ کر روانہ ہوگئی۔ میں بھی جلدی سے گاڑی میں بیٹھی اور ڈرائیور سے کہا کہ اس ٹیکسی کے پیچھے چلو۔

ڈرائیور نے ٹیکسی کا تعاقب شروع کردیا۔

مریم کی ٹیکسی شیرٹن کے سامنے رک گئی۔ میں بھی گاڑی سے اتری اور مریم کا پیچھا کرنے لگی۔ مجھے حیرت تھی کہ مریم اس ہوٹل میں کس سے ملنے آئی ہے؟ وہ لفٹ کے انتظار میں کھڑی ہوگئی۔ اب میں اس لفٹ میں تو نہیں جاسکتی تھی۔ اس وقت بالکل رش نہیں تھا۔ مریم لفٹ پر اکیلی ہی تھی اس کے جانے کے بعد میں ان ہندسوں کو دیکھنے لگی جو فلور کی نشاندہی کررہے تھے۔ تھرڈ فلور پہ لفٹ رکی تھی اور دوبارہ نیچے آنے لگی تھی۔ میں جھپٹ کر دوسری لفٹ میں سوار ہوئی اور تھرڈ فلور کا بٹن دبادیا۔

تھرڈ فلور پر پہنچنے کے بعد میں چکرا کر رہ گئی۔ کوریڈور میں بالکل سناٹا تھا۔ مریم کا دور دور تک نشان نہیں تھا۔ میں یونہی کمرے کے نمبر دیکھتے ہوئے کوریڈور میں آگے بڑھنے لگی۔

اچانک میں ٹھٹک کر رہ گئی۔ روم نمبر تین سو اکیس سے مجھے مریم کی کھنکتی ہوئی ہنسی سنائی دی۔ پھر اس کی آواز آہستہ آہستہ معدوم ہو گئی۔ شاید وہ کمرے میں اندر کی طرف چلی گئی تھی۔

میں نے کئی دفعہ اس ہوٹل میں قیام کیا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ کمرے میں داخل ہونے سے قبل لابی ہے۔ پھر دوسرا دروازہ ہے۔ مریم اس لابی سے گزر کر کمرے میں داخل ہو چکی تھی اس لیے اس کی آواز بھی معدوم ہو گئی تھی۔

میں نے کچھ لمحے انتظار کیا پھر دروازے کی ناب تھما کر اسے اندر دھکیلا تو دروازہ کھلتا چلا گیا۔ میں آہستگی سے بے آواز چلتی ہوئی اندر داخل ہو گئی۔

آگے دوسرا دروازہ تھا۔ میں نے اسے دھکیلا تو وہ بھی کھلتا چلا گیا۔

اندر سے مریم کی کھنکتی ہوئی آواز آ رہی تھی۔ میں نے آواز پر کان لگا دیے۔ مریم کسی سے کہہ رہی تھی۔ ”کوئی ہماری شادی سے خوش نہیں ہے لیکن میں نے بھی تہیہ کر لیا ہے کہ شادی آپ ہی سے کروں گی۔ آپ نے مجھ پر کیا جادو کر دیا ہے۔ مجھ آپ کے بغیر اب ایک پل بھی نہیں رہ سکتی۔“

مریم کی جذباتی باتیں سن کر میرے دل میں تجسس پیدا ہوا کہ وہ ہے کون؟

میں ان کی باتیں سننے کے لیے مزید آگے بڑھی۔

کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اندر سے آنے والی آواز سن کر میں ٹھٹک کر رہ گئی۔ میرے کانوں میں سائیں سائیں ہونے لگی اور ایسا لگا جیسے میرا خون برف ہو گیا ہے۔ اس آواز کو میں لاکھوں میں پہچان سکتی تھی۔ وہ شہزاد کی آواز تھی۔ شہزاد جس کے ساتھ میں نے زندگی کے سولہ سال گزارے تھے وہی شہزاد اب میری بیٹی سے عشق جھاڑ رہا تھا اور مریم بھی اس کے عشق میں پاگل ہو رہی تھی۔

میرے حواس سلب ہو کر رہ گئے۔ بس ذہن میں ایک ہی خیال تھا کہ ان کی یہ شادی جائز نہیں ہے۔ مریم، شہزاد کی سگی بیٹی نہیں تھی لیکن وہ میری تو بیٹی تھی۔ اس رشتے سے وہ شہزاد کے لیے جائز نہیں تھی۔

میرا ذہن ماؤف ہو رہا تھا۔ میں نے غیر ارادی طور پر پرس میں ہاتھ ڈالا اور وہ پسٹل نکال لیا جس کے استعمال کی کبھی نوبت نہیں آئی تھی۔ میں نے پسٹل لوڈ کیا اور اچانک اندر داخل ہو گئی۔

مجھے دیکھ کر مریم اور شہزاد بری طرح چونک اٹھے۔ شہزاد نے حیرت سے کہا۔ ”ثمرہ...... تم...... تم کب......“

”ثمرہ آنٹی!“ مریم نے بھی حیرت کا مظاہرہ کیا۔ ”آ...... آپ......“

”یہ شادی نہیں ہو سکتی شہزاد...... یہ شادی نہیں ہو سکتی۔“

”ثمرہ...... میری بات تو سنو...... میں......“ میں نے اسے زیادہ بولنے کا موقع نہیں دیا۔ مریم کا نشانہ لیا اور فائر کر دیا۔ فائر کرتے ہوئے میرا ہاتھ کانپا تھا لیکن اس کے بارہ بور کی گولی مریم کے سینے میں پیوست ہو گئی۔

مریم نے ہلکی سی ایک چیخ ماری، اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔ اس کے سینے سے خون نکل کر بستر میں جذب ہو رہا تھا۔

”یہ تم نے کیا کیا پاگل عورت...... یہ کیا کیا تم نے؟“

”میں نے جو کچھ کیا وہ ٹھیک ہی کیا۔“ میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

”تم نے خود ہی تو مجھے دوسری شادی پر اکسایا تھا اور خود میں......“

”میں نے تمھیں دوسری شادی کرنے کے لیے ضرور کہا تھا لیکن...... یہ شادی جائز نہیں تھی شہزاد......“

”تم شاید پاگل ہو چکی ہو۔“ شہزاد نے بھنّا کر کہا۔

”میں پورے ہوش و حواس میں ہوں شہزاد!“ میں نے سرد لہجے میں کہا۔

اسی وقت ہوٹل سیکورٹی کے لوگ وہاں پہنچ گئے۔ کسی نے فائر کی آواز سن کر ہوٹل سیکیورٹی کو اطلاع دے دی تھی۔ ان لوگوں نے پسٹل سمیت مجھے گرفتار کر لیا۔ میں نے ایک بے گناہ کی جان لی تھی۔ کاش میں نے اسے بتا دیا ہوتا کہ میں تیری ماں ہوں۔ تو میری حقیقی بیٹی ہے۔ پھر وہ کبھی ایسی حرکت نہ کرتی اور شہزاد بھی اس فعل سے باز رہتے۔ کاش...... میں نے اپنا گناہ چھپانے کے لیے ان لوگوں کو اندھیرے میں نہ رکھا ہوتا۔ شہزاد زیادہ سے زیادہ مجھے طلاق دے دیتے۔ اس سے کیا فرق پڑتا۔ ہاں، میری بیٹی ضرور زندہ ہوتی۔

سوری

جناب معراج رسول
سلام تہنیت!
اس وقت ہمارا شہر ڈاکٹروں کا تختہ مشق بنا ہوا ہے۔ طرح طرح کی مہنگی دوائیں ٹیسٹ اور دیگر تدابیر نے غریبوں کو بیمار ہونے سے زیادہ بیماری کے خوف میں مبتلا کردیا ہے۔ میرے ساتھ بھی ایک واقعہ ہوا ہے اسے ہی تحریر کررہا ہوں۔

نوید
(کراچی)

مجھے اندازہ تھا کہ کچھ اسی قسم کی بات ہوگی۔

کئی دنوں سے تکلیف کچھ زیادہ ہو گئی تھی۔ یہ تکلیف پیٹ میں دائیں طرف ہوا کرتی اور وہ بھی اتنی شدید کہ میں تڑپ کر رہ جاتا۔

اس کی ابتدا کئی مہینوں پہلے ہوئی تھی۔ چونکہ ہمارے یہاں بدقسمتی سے ہر شخص اپنا علاج خود ہی کرلیا کرتا ہے۔ اس لیے میں نے بھی درد کی گولیاں کھالی تھیں۔ وقتی طور پر جب آرام ہوگیا تو میں نے سمجھا کہ قصہ ختم ہوگیا ہے۔

جس رات یہ تکلیف ہوئی اس کی دوسری صبح مجھے مہوش کو لے کر ایجوکیشن کے آفس جانا تھا۔ اس کی ڈگری پھنسی ہوئی تھی۔ یہاں تو ذرا ذرا سے کاموں کے لیے کتنی بھاگ دوڑ کرنی پڑتی ہے۔

میں اس شام اپنے فلیٹ میں تھا۔ جب مہوش کی کال آئی۔ "جانم! کل صبح تم کیا کر رہے ہو۔" اس نے دریافت کیا۔

اس کی عادت تھی کہ مجھے جانم کہہ کر مخاطب کیا کرتی۔ مہوش میری دوست تھی۔ میری محبوبہ تھی۔ پیار کے جتنے بھی رشتے ہو سکتے ہیں وہ اس کی ذات سے وابستہ تھے۔

میں سوچا کرتا تھا کہ اگر مہوش میری زندگی میں نہیں آئی ہوتی تو میرا کیا حال ہوتا۔ میں کہاں جاتا۔ اکیلے انسان کی زندگی بھی کیا ہوتی ہے۔ وہ تو کٹی پتنگ کی طرح فضا میں چکراتا پھرتا ہے۔

والدین کی موت کے بعد تنہائی میری ذات کا حصہ بن گئی تھی۔ میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھا۔ اس لیے تنہا ہو گیا۔

یہ خدا کا شکر ہے کہ ابو نے آخری دنوں میں میرے لیے ایک فلیٹ خرید لیا تھا اور وہی کام آ رہا تھا۔ ورنہ خدا جانے کرائے کے مکانوں میں میرا کیا حشر ہوتا۔

یہ بھی ایک اچھی بات تھی کہ میری تعلیم اچھی ہو گئی تھی۔ اس کے ساتھ میری جاب بھی بہت اچھی تھی۔ ایک فلیٹ والدین کا دیا ہوا اور ایک گاڑی اپنی محنت سے خریدی ہوئی۔ اس کے علاوہ تھوڑا بہت بینک بیلنس بھی تھا۔

یعنی بظاہر زندگی میں کوئی دشواری نہیں تھی۔ سوائے تنہائی کے۔ میرے رشتے دار وغیرہ تو بہت سے تھے لیکن وہ تنہائی کا علاج تو نہیں ہو سکتے تھے۔

تنہائی کا تو صرف ایک علاج ہوتا ہے اور وہ ہے کوئی ساتھی، کوئی محبت کرنے والا۔ کوئی خیال رکھنے والا اور مہوش کی شکل میں خدا نے مجھے یہ تحفہ دے دیا تھا۔

وہ سیرت اور صورت دونوں اعتبار سے خوب صورت تھی۔ اس نے ایک محبت کرنے والا دل پایا تھا۔ اس کو پا کر احساس ہو گیا تھا کہ میں نے زندگی میں صرف دکھ ہی نہیں اٹھائے۔ بلکہ کامیابیاں بھی ملی ہیں۔ خوشیاں بھی ملی ہیں۔

تو مہوش نے فون کر کے مجھ سے پوچھا۔ ”جانم کل صبح تم کیا کر رہے ہو؟“

”سوائے دفتر جانے کے اور کیا کر سکتا ہوں۔“

”کیا تم میرے لیے کچھ وقت نکال سکتے ہو؟“

”تمہارے لیے تو پوری زندگی نکال لی ہے۔“

”مذاق مت کرو۔ کل مجھے امیگریشن کے آفس جانا ہے۔ تنویر کو ضروری کام ہے۔ ورنہ اس کے ساتھ چلی جاتی۔ تمہیں زحمت نہیں دیتی۔“

”تو کیا اس میں چل رہا ہوں تمہارے ساتھ۔“ میں نے کہا۔ ”میرا انتظار کرنا۔“

لیکن دوسری صبح میں اس کے ساتھ نہیں جا سکا۔ کیوں کہ اس رات مجھے پیٹ میں شدید درد ہوا تھا۔ جس نے نڈھال کر کے رکھ دیا تھا۔ میڈیکل اسٹور جا کر دوائی لے لی تھی۔ کچھ سکون بھی مل گیا تھا لیکن رات بھر بے چینی رہی تھی۔ اس لیے دوسری صبح میں بہت دیر تک سوتا رہا تھا۔

میں نے دفتر فون کر کے بتا دیا۔ پھر جب مہوش کو فون کیا تو اس نے ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ ”میں جانتی تھی کہ تم اسی قسم کی حرکتیں کرو گے۔“

”سوری جان! میری طبیعت خراب ہو گئی تھی۔“ میں نے بتایا۔ ”اسی لیے رات بہت دیر تک جاگتا رہا تھا۔“

”خدا خیر کرے کیا ہو گیا تھا تمہیں؟“ وہ یہ سن کر بے چین سی ہو گئی تھی۔

”کوئی خاص نہیں، پیٹ میں درد ہو گیا تھا۔“

”اب کیسے ہو جانم؟“

”اب تو بالکل ٹھیک ہوں۔ میں نے رات ہی کو میڈیسن لے لی تھیں۔“

”چلو اپنا خیال رکھو۔“ اس نے کہا۔ ”شام کو ملتے ہیں ویسے میرا کام ہو گیا ہے۔ میں تنویر ہی کے ساتھ چلی گئی تھی۔“

اس رات کا کھانا ہم نے ساتھ ہی کھایا تھا۔ اس کی یہ بات بھی بہت اچھی تھی کہ وہ میری ذرا سی پریشانی سے خود بھی پریشان ہو کر رہ جاتی۔ میں اس بات کو اچھی بات اس لیے لکھ رہا ہوں کہ یہ سوچ کر سکون ملتا تھا کہ کوئی تو ہے جس کو میرا اتنا خیال رہتا ہے۔ کوئی تو ہے جس نے میرے دکھوں کے ساتھ شیئر کرنا سیکھ لیا ہے۔

جب کسی کو ایسی محبت حاصل ہو جائے تو پھر اسے کیا چاہیے۔

اس کے گھر والے بھی مجھے پسند کرتے تھے۔ میرا تو خیر کوئی قریبی رشتے دار نہیں تھا لیکن اس کے ماں باپ اور بھائی بہنوں نے ذہنی طور پر مجھے قبول کر لیا تھا۔

ان کا خیال تھا کہ ان کی بیٹی میرے ساتھ بہت خوش رہے گی۔ کیوں کہ محبت خود اپنا اظہار کر رہی تھی۔ میرا ارادہ تھا کہ میں اپنی خالہ کو ایک دن اس کے گھر لے جا کر باقاعدہ رشتہ مانگ لوں گا۔ جب ہم سب ایک دوسرے کو قبول کر ہی چکے تھے تو پھر کس بات کی دیر رہ جاتی تھی۔

ایک رات پھر میرے پیٹ میں درد اٹھا۔

میڈیسن لینے کے بعد درد تو ختم ہو گیا لیکن میں کھٹک گیا تھا۔ آخر پیٹ میں درد کیوں ہو رہا ہے۔ پہلے تو ایسا نہیں ہوتا تھا۔

اس رات درد کی شدت کچھ زیادہ ہی تھی۔ چنانچہ دوسرے دن میں ڈاکٹر کے پاس پہنچ گیا۔ میں نے دفتر والوں کو فون کر

کے بتا دیا تھا کہ میں ذرا دیر سے آؤں گا۔

ڈاکٹر محلے ہی کا تھا۔ کبھی کبھی میں جب نزلے بخار وغیرہ میں مبتلا ہوتا تو اس کے پاس چلا جاتا۔ اس لیے وہ مجھے پہچانتا تھا۔ اکبرنام تھا، ڈاکٹر اکبر۔

میں نے اسے اپنی تکلیف بتائی۔ اس نے پیٹ کو ٹھونک بجا کر دیکھا اور دوائیں لکھ دیں۔ "یہ استعمال کریں، ٹھیک ہو جائے گا۔"

"لیکن ایسا کیوں ہو رہا ہے ڈاکٹر صاحب؟" میں نے پوچھا۔

"ارے بھائی انسانی مشینری ہے۔ کبھی کبھی گڑبڑ کرنے لگتی ہے۔" اس نے کہا۔ "بس کھانے پینے میں احتیاط رکھیں سب خیریت رہے گی۔"

میں نے اس کی لکھی ہوئی دوائیں لے لیں اور استعمال کرنا شروع کر دیا۔ ٹھیک ہی رہا۔ اس کے بعد کئی دنوں تک کوئی شکایت نہیں ہوئی۔ میں نے پھر مہوش کو بھی کچھ نہیں بتایا۔ بے وقوف لڑکی خواہ مخواہ پریشان ہو جاتی۔ حالانکہ بات کچھ بھی نہیں تھی۔

لیکن دس بارہ دنوں کے بعد ایک رات پھر تکلیف ہوئی اور اس بار اس کی شدت پہلے سے کہیں زیادہ تھی۔ میں رات بھر میں نڈھال ہو گیا تھا۔

میرے پاس دوائی رکھی ہوئی تھی لیکن ان سے بھی کوئی فائدہ نہیں ہوا تھا۔ دوسری صبح پھر جب ڈاکٹر اکبر کو جا کر بتایا تو وہ بھی سیریس ہو گیا تھا۔ "تو یہ صاحب! اب آپ ایسا کریں کچھ ٹیسٹ کروا لیں۔" اس نے کہا۔

"کس بات کے ٹیسٹ؟"

"بس یوں ہی۔" اس نے کہا۔ "ویسے تو میں جانتا ہوں کہ کوئی خاص بات نہیں ہو گی لیکن احتیاطاً اگر ٹیسٹ ہو جائیں تو اس میں کیا برائی ہے۔ اگر کوئی بات ہے بھی تو سامنے آ جائے گی۔ پھر احتیاط سے علاج ہوتا رہے گا۔"

"چلیں جو آپ مناسب سمجھیں لکھ کر دے دیں۔"

اس نے لکھ کر دے دیے۔ اس نے تاکید کی تھی کہ میں یہ ٹیسٹ فوری طور پر کروا لوں لیکن ہوا یہ کہ یا تو مجھے فرصت نہیں ملی یا میں نے اس کی طرف دھیان نہیں دیا تھا۔

اور دس بارہ دنوں تک ویسے بھی خیریت ہی رہی تھی۔ اس لیے ٹیسٹ نہیں کروایا لیکن ایک رات جب پھر عذاب ٹوٹ پڑا تو اپنی غلطی کا احساس ہونے لگا۔

وہ رات واقعی پریشان کن تھی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے پیٹ میں انگارے بھر دیے گئے ہوں۔ اتنی تکلیف تھی جو بیان سے باہر ہے۔

خیر وہ کرب کی رات تو جیسے تیسے گزار لی اور صبح ہوتے ہی لیب پہنچ گیا۔ تاکہ مکمل ٹیسٹ ہو جائے۔ انھوں نے رپورٹ دینے کے لیے دوسرے دن بلایا تھا۔

اس رات درد نہیں ہوا۔ دوسری شام میں ٹیسٹ کی رپورٹ لے کر آ گیا اور رات کے وقت ڈاکٹر صاحب کے پاس پہنچ گیا۔

"خیر تو ہے۔" ڈاکٹر نے پوچھا۔ "آپ کو تو دوسرے یا تیسرے دن رپورٹس لے کر آنا تھا۔"

"ڈاکٹر صاحب فرصت ہی نہیں ملی۔" میں نے کہا۔

"بری بات ہے۔ انسان کو اپنی صحت کی طرف سے غافل نہیں رہنا چاہیے۔" اس نے کہا۔ "بہرحال اب دیکھ لیتے ہیں کہ آپ کو کیا پرابلم ہے۔"

رپورٹس پڑھ کر وہ بہت دیر تک سوچتا رہا تھا۔ میں اس کے تاثرات کا جائزہ لے رہا تھا اور جب بہت دیر تک اس نے کچھ نہیں کہا تو میں نے پوچھ ہی لیا۔ "خیر تو ہے ڈاکٹر صاحب! کیا کہہ رہی ہے میری رپورٹ۔"

"فرید صاحب! اللہ مالک ہے، شفا اس کے ہاتھ میں ہے۔ آپ میڈیسن استعمال کرتے رہیں۔"

"ڈاکٹر صاحب آخر کچھ تو بتائیے کہ مسئلہ کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ میں آپ کو کیسے بتاؤں۔" اس نے کہا۔

"ارے صاحب بتا ہی دیں۔ مجھ میں سب کچھ سن لینے کا بہت حوصلہ ہے۔"

"آپ ایسا کریں کسی اور کو بلا کر لے آئیں تاکہ میں اس کو کچھ سمجھا سکوں۔"

"ڈاکٹر صاحب اتفاق سے میں ایک تنہا انسان ہوں۔" میں نے کہا۔ "اس لیے آپ کو جو بھی کہنا ہو مجھ سے ہی کہہ دیں۔"

"ایک شک ہے مجھے۔"

"ارے صاحب بتا بھی دیں اب بہت سسپنس ہو گیا۔"

"آپ کو کینسر ہے۔" ڈاکٹر نے بتایا۔

یہ ایک بم تھا اگر کسی اور کو بتایا جاتا تو شاید اس کے ہوش اڑ جاتے لیکن نہ جانے کیوں میں جیسے سن ہو کر رہ گیا تھا۔

ایک طرح کی بے بسی سی ہو گئی تھی۔ اس کی مثال آپ یوں سمجھ لیں کہ کسی کو اگر زوردار چوٹ لگی ہے تو بہت دیر تک اس چوٹ کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ پھر آہستہ آہستہ اس کا احساس ہونے لگتا ہے اور آخرکار یہ درد بہت شدید ہو جاتا ہے۔

وہی میرے ساتھ ہو رہا تھا۔ اس وقت ایک بے حسی کی ایسی کیفیت تھی جیسے ذہن سن ہو کر رہ گیا ہو۔ میں کچھ نہیں کہہ رہا تھا۔ کچھ نہیں سن رہا تھا۔ ڈاکٹر شاید احتیاطی تدابیر بتا رہا تھا۔ دواؤں کے بارے میں ہدایات دے رہا تھا لیکن میں صرف اس کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔

پھر آہستہ آہستہ، بہت دیر کے بعد احساس ہونے لگا کہ ڈاکٹر کیا کہہ گیا ہے۔ کینسر موت کا دوسرا نام اور موت بھی کیسی سسکتی ہوئی موت۔

"ڈاکٹر صاحب کیا یہ سچ ہے؟" میں نے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"اسی لیے تو میں براہ راست آپ کو بتانا نہیں چاہ رہا تھا۔" ڈاکٹر نے کہا۔

"اب...... اب مجھے کیا کرنا ہے کیا موت کا انتظار؟"

"نہیں خوش رہنے کی کوشش۔ حالانکہ یہ بہت مشکل ہے۔ کیوں کہ آپ جان چکے ہیں پھر بھی آپ خوش رہیں۔ میڈیسن وقت پر استعمال کرتے رہیں۔"

"ایک بات بتائیں کیا دوائیں اس مرض میں فائدہ دیں گی؟"

"مکمل فائدہ تو نہیں ہوگا لیکن تھوڑا سکون مل جائے گا۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "صحت مند غذائیں استعمال کریں۔ پھلوں پر زیادہ توجہ دیں۔ کوشش کریں کہ یوگا کر سکیں۔"

"اور اس کے بعد پھر ایک سسکتی ہوئی موت مر جاؤں۔"

ڈاکٹر نے کچھ نہیں کہا۔ اس نے اپنی گردن جھکالی تھی۔

کچھ دیر بعد میں نے پھر پوچھا۔ "ڈاکٹر صاحب اس میں کیموتھراپی بھی تو ہوتی ہے۔"

"ہاں ہوتی ہے لیکن جب سچ بول ہی رہا ہوں اور آپ سچ سن رہے ہیں تو کیموتھراپی سے کوئی خاص فائدہ نہیں ہوتا۔ یہ مرحلہ بار بار سامنے آتا ہے۔ بعض حالات میں تو مرض تیزی سے بڑھ جاتا ہے۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ کوئی فائدہ نہیں ہے۔ کوئی راستہ نہیں ہے۔"

"ایک راستہ تو ہے دعا کا۔ وہ چاہے تو کچھ بھی ہو سکتا ہے۔"

"ہاں بس اب یہی راستہ ہے۔"

میں بازار سے دوائیں لے کر اپنے فلیٹ پر واپس آ گیا۔ دوائیں بھی خود کو تسلی دینے کے لیے لے لی تھیں۔ ورنہ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ اس مرض میں دوائی صرف دل کو بہلانے کے لیے کام آتی ہے۔ ہوتا وہی ہے جو یہ بھیانک اور موذی مرض چاہتا ہے۔

میری کہانی اچانک ہی ختم ہونے جا رہی تھی۔

کیا فائدہ تھا ایسی زندگی کا۔ میں نے تو ابھی اپنی محبت بھی حاصل نہیں کی تھی۔ مہوش کے ساتھ زندگی گزارنے کے خوب صورت خواب دیکھے تھے ان کا کیا ہوتا۔

وہ کہاں جاتے، میری اچھی ملازمت، میرا اپنا فلیٹ، میری گاڑی، فلیٹ کی دیواروں پر لگی ہوئی خوب صورت پینٹنگز، یہ ساز و سامان، کیا ہوتا ان کا؟ اب یہ میرے کس کام آنے والی تھیں۔ اب بجھتے ہوئے چراغ کو ان سب چیزوں کی کیا ضرورت تھی۔

میں نے اس دن مہوش کو فون نہیں کیا۔ یہ ہمارا دستور تھا کہ ہم دن میں کم از کم ایک بار ایک دوسرے سے ضرور بات کر لیا کرتے۔ ایک دوسرے کی خیریت معلوم کر لیا کرتے۔ لیکن اس دن میں بچ کر رہ گیا تھا۔ دل ہی نہیں چاہ رہا تھا کہ میں اس سے بات کروں۔ شاید اس سے بات کرتے ہوئے میں خود پر قابو نہیں پا سکتا اور وہ میری آواز اور میرے لہجے سے پہچان جاتی کہ میں کسی پریشانی میں ہوں۔

میں نے دو دنوں تک اس سے بات نہیں کی۔

ہاں دوسری رات پھر وہی تکلیف ہوئی تھی۔ میں نے میڈیسن اٹھا کر ایک طرف رکھ دی۔ خدا جانے میں نے ایسا کیوں کیا تھا۔ شاید اس لیے کہ جب معلوم ہی ہو چکا تھا کہ دواؤں سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا تو زیادہ دنوں تک اپنے آپ کو اذیت میں رکھنے کا کیا فائدہ ہوتا۔

اگر موت میری طرف بڑھ ہی رہی تھی تو اس کی رفتار کو تیز کیوں نہ کر دوں تاکہ جھنجٹ ہی ختم ہو جائے۔ اس لیے میں نے ایک انتہائی سخت فیصلہ کر لیا۔

میں اپنے ساتھ مہوش کو نہیں مار سکتا تھا۔

اس لڑکی نے ایک ایسے آدمی کے ساتھ اپنے خواب باندھ رکھے تھے جو ابھی جوان تھا اور بظاہر بہت دنوں زندہ رہنے والا تھا۔

لیکن اسے کیا معلوم تھا کہ اس نے جس کو اپنی زندگی کا

سہارا مجھ رکھا ہے وہ سہارا اچانک اس کا ساتھ چھوڑ جانے والا تھا۔

اسی لیے میرا آج فیصلہ یہ تھا کہ میں مہوش کے راستے سے ہٹ جاؤں۔ اس سے کنارہ کشی اختیار کرلوں اس کی زندگی کو برباد کرنے کا مجھے کوئی حق نہیں تھا۔

وہ جوان تھی۔ خوب صورت تھی۔ اس کے لیے راستے کھلے ہوئے تھے۔ مجھ سے اچھا کوئی صحت مند آدمی اسے مل سکتا تھا۔

ابھی تو ہماری شادی بھی نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے کچھ دنوں تک وہ روتی رہتی۔ اس کے بعد صبر کرلیتی۔ خاموش ہو جاتی۔ مجھے بھول جانے کی کوشش کرتی۔

اس راہ میں ایسا تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ لوگ ایک دوسرے کا ساتھ چھوڑ ہی دیتے ہیں۔ ہاں شادی کے بعد یہ فیصلہ بہت مشکل ہوجاتا ہے۔"

شادی کے بعد تو لڑکی کے پیروں میں زنجیریں پڑ جاتی ہیں۔ وہ معاشرے، شوہر کی اطاعت وغیرہ کی قیدی بن کر رہ جاتی ہے۔

مہوش ابھی قیدی نہیں بنی تھی۔ اس لیے اس کے لیے صبر کرلینا بہت آسان ہوتا۔ ویسے میں یہ بھی جانتا تھا کہ وہ ایسی ہے کہ میرے مرض کا معلوم ہوجانے کے بعد بھی میرا ساتھ نہیں چھوڑے گی۔ اس لیے میں اپنے دل پر پتھر رکھ کر اس کے لیے بے رحم ہوجاتا تو اچھا تھا اور میں نے یہی کیا۔

ایک بار اس کا فون آیا تو میں نے بہت اکھڑے اکھڑے انداز میں اس سے بات کرکے فون بند کردیا۔ خدا ہی جانتا ہے کہ اس وقت میرے دل کی کیا کیفیت تھی۔ میری آنکھیں خون کے آنسو رو رہی تھیں۔

ایک دو بار اور ایسا ہی ہوا۔ اور تیسری بار وہ خود میرے فلیٹ پہنچ گئی۔ وہ بہت حیران اور پریشان ہو رہی تھی۔ میں نے بہت روکھے انداز میں اس کا استقبال کیا تھا۔ "خیریت تو ہے تم یہاں کیوں چلی آئیں؟"

"تو یہ کیا ہوگیا ہے تمہیں یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"دیکھو مہوش بات یہ ہے کہ میں آج کل ذرا دوسرے معاملات میں الجھا ہوا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اس لیے تمہیں زیادہ وقت نہیں دے سکتا۔"

"یہ کیا بات ہوئی۔ پہلے بھی تو الجھے رہتے تھے لیکن میرے لیے تمہارے پاس ہمیشہ وقت ہوتا تھا۔"

"ہاں وقت وقت کی بات ہوتی ہے۔" میں نے اس کو نظرانداز کرتے ہوئے ایک کتاب اٹھا کر دیکھنی شروع کردی اور وہ بری طرح ٹوٹ کر رہ گئی۔

میں نے اس کی سسکیاں سنیں۔ وہ رو رہی تھی اور میرا دل ٹکڑے ہوا جا رہا تھا۔ یاخدا ایسا بھی دن آنے والا تھا کہ میں مہوش کے ساتھ ایسا سلوک کرتا۔

لیکن یہ میں اس کی بھلائی کے لیے کر رہا تھا۔

"تو یہ جا رہی ہوں۔" کچھ دیر بعد اس نے کہا۔

"ہاں جاؤ۔" میں اس کی طرف دیکھے بغیر بولا۔

وہ آہستہ آہستہ کمرے سے باہر چلی گئی۔ وہ بری طرح ٹوٹ چکی تھی۔ اس کے تصور میں بھی نہیں ہوگا کہ میں اس کے ساتھ ایسا بھی کرسکتا ہوں۔

اس کے جانے کے بعد میں خود بھی بہت دیر تک روتا رہا تھا۔

دوسری صبح جب میں دفتر پہنچا تو نرم کے باس نے فوراً مجھے اپنے کمرے میں بلا لیا۔ وہ اس وقت بہت خوش دکھائی دے رہا تھا۔

"مسٹر نوید تمہارے لیے ایک بہت بڑی خوش خبری ہے۔" اس نے کہا۔

"فرمائیں سر۔"

"فرم نے تمہاری پروموشن کا فیصلہ کرلیا ہے۔" اس نے کہا۔ "ہم تمہیں برانچ منیجر بنا کر سنگاپور بھیج رہے ہیں۔"

"واہ۔" میرے ہونٹوں پر ایک تلخ سی مسکراہٹ آگئی۔ کیا چیز ہے یہ زندگی بھی۔ جاتے جاتے بھی کیسے کیسے فریبوں میں مبتلا کرتی جاتی ہے۔ کس کس طرح دامن کو الجھاتی رہتی ہے۔

ایسی خبر اس وقت مل رہی تھی جب زندگی سے میرا رابطہ ختم ہونے والا تھا۔ مجھے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔

"کیا بات ہے تم خاموش کیوں ہو؟" باس نے پوچھا۔ "کیا تمہیں کوئی خوشی نہیں ہوئی؟"

"نو سر۔" میں نے کہا۔ "کیوں کہ میں نے جاب چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔"

"کیا؟" باس حیران رہ گیا تھا۔ "تم یہ جاب چھوڑ رہے ہو مگر کیوں؟"

"یوں ہی سر۔" میں نے باس کو کچھ نہیں بتایا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ لوگ مجھے رحم بھری نگاہوں سے دیکھیں۔ اس لیے میں کسی کو بھی نہیں بتانا چاہتا تھا۔

بات نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔ لیکن میں کیا سمجھتا۔ میرے لیے تو اب زندگی میں کوئی چارم ہی نہیں رہا تھا جو اس قسم کی باتیں میرا دل بہلا سکتیں۔

مختصر یہ کہ میں نے کچھ دنوں کے بعد اپنی ملازمت چھوڑ دی۔ مہوش کو میں نے مایوس تو کر ہی دیا تھا۔ اب کیا رہ گیا تھا۔ انتظار صرف انتظار۔ آنے والی موت کا انتظار۔ ویسے میرے پاس اتنے پیسے تھے کہ میں پانچ چھ ماہ آرام سے گزار لیتا۔ اس کے بعد اس کہانی کا انجام تو ہونا ہی تھا۔

کئی ہفتوں کے بعد مہوش کا فون آیا۔ وہ بہت ٹوٹی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ ''تو یہ کیا تم میری شادی میں بھی نہیں آؤ گے؟''

میرا دل ہی جانتا ہے کہ میں نے یہ خبر کیسے سنی ہوگی۔ کوئی اور موقع ہوتا تو اس خبر کو سن کر میں قیامت برپا کر دیتا۔ لیکن میں نے اس وقت صرف اتنا کہا تھا۔ ''مبارک ہو میں کچھ دنوں کے لیے شہر سے باہر جا رہا ہوں۔ اس لیے شریک نہیں ہو سکتا۔''

اب میں اسے کیا بتاتا کہ میں شہر ہی سے نہیں بلکہ دنیا سے باہر جا رہا ہوں۔

اس نے فون بند کر دیا۔ شاید اس وقت بھی وہ رو رہی ہوگی۔

ایک بار میرا ایک پرانا دوست مجھ سے ملنے آ گیا۔ وہ ملک سے باہر گیا ہوا تھا۔ وہ میرا حال دیکھ کر پریشان ہو گیا تھا۔ ''خدا کے بندے کیا ہو گیا ہے تمہیں تم نے اپنا کیا حال بنا رکھا ہے۔''

اس دوست سے کچھ چھپانے کا فائدہ نہیں تھا۔ کوئی تو ہوتا جس سے دل کی باتیں کہہ سکتا۔ ''میرے بھائی میں بہت تیزی سے موت کی طرف جا رہا ہوں۔ بس کچھ دنوں کی بات رہ گئی ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''مجھے کینسر ہے۔'' میں نے بتایا۔ ''اور میری کہانی ختم ہو رہی ہے۔''

وہ یہ خبر سن کر کچھ دیر کے لیے سکتے میں رہا تھا۔ پھر اس نے پوچھا۔ ''یہ تو تم نے کسی اور ڈاکٹر سے کنسلٹ کیا؟''

''کیا ضرورت تھی کسی اور کی۔''

''رپورٹس وغیرہ لے کر میرے ساتھ چلو۔'' اس نے کہا۔

''کہاں۔''

''میرے انکل بہت بڑے ڈاکٹر ہیں ہم ان کے پاس چلیں گے۔''

میرا دل تو نہیں چاہ رہا تھا لیکن اس کے کہنے پر اس کے ساتھ چل پڑا۔

اس کے انکل ڈاکٹر معین بہت دیر تک میری رپورٹس دیکھتے رہے۔ پھر غصے سے بولے۔ ''کس جاہل ڈاکٹر نے تمہیں کینسر بتایا تھا؟''

''کیا مطلب!'' میں چونک پڑا۔ ''کیا مجھے کینسر نہیں ہے؟''

''نہیں صرف اپنڈکس کا مسئلہ ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''ایک معمولی سے آپریشن کے بعد ٹھیک ہو جاتا ہے۔''

''لیکن اس نے تو یہ کہا تھا۔''

''جاہل ہے وہ تم اس پر کیس کرو۔ اس قسم کے ڈاکٹرز زندگی برباد کر دیتے ہیں۔''

اپنی تسلی کے لیے تو میں نے دوبارہ وہی ٹیسٹ کروائے اور شہر کے اور کئی ڈاکٹرز کے پاس گیا۔ سب کا یہی کہنا تھا کہ مجھے کینسر نہیں بلکہ اپنڈکس ہے۔

میں غصے میں بھرا ہوا ڈاکٹر اکبر کے پاس پہنچ گیا۔ مجھے دیکھ کر وہ چونک پڑا تھا۔ ''ارے بھائی کہاں غائب ہو گئے تھے تم تو بالکل غائب ہو گئے۔''

''ڈاکٹر صاحب آپ نے مجھے کیا بتایا تھا۔'' میں نے دوسرے ڈاکٹرز کی تشخیص اس کے سامنے رکھ دی۔ ''آپ تو مجھے کینسر کا مریض بتا رہے تھے۔''

''ہاں بھائی اس لیے تو تمہیں تلاش کر رہا تھا۔'' اس نے کہا۔ ''مجھ سے اس وقت غلطی ہو گئی تھی سوری۔''

''سوری!'' میں پھٹ پڑا۔ ''واہ کیا بات ہے آپ کے سوری کی۔ زندگی برباد کر کے آپ سوری کہہ رہے ہیں۔ آپ کے لیے تو یہ معمولی سی بات ہوگی لیکن مجھے تو برباد کر کے رکھ دیا آپ نے۔ تباہ ہو گیا ہوں میں۔ تباہ ہو گیا ہوں۔''

اگر میرا بس چلتا تو اس کم بخت کو جان سے مار دیتا۔ اسے گالیاں دیتا بکتا ہوا باہر آ گیا۔

کئی سال ہو گئے ہیں میں بالکل ٹھیک ہوں۔ اپنڈکس کا آپریشن ہو گیا ہے لیکن مہوش میری زندگی سے چلی گئی ہے۔

کاش اس قسم کے ڈاکٹرز حضرات یہ جان سکتے کہ اس قسم کے سوری سے گزرے لمحے واپس نہیں آتے۔

آگ

جناب مدیراعلیٰ سرگزشت

سلام مسنون!

یہ میری سرگزشت نہیں ہے۔ میرے ایک دوست کی سرگزشت ہے لیکن اس کہانی کا ایک کردار میں خود بھی ہوں۔ اسی لیے میں تفصیل سے ایک ایک بات رقم کرتا جارہا ہوں میرے اس دوست کو جلتے چولہے سے اتنا خوف کیوں آتا تھا آپ بھی ملاحظہ کرکے عبرت حاصل کریں۔

محمد محمود حسن
(لاہور)

وہ بہت عجیب آدمی تھا۔ حادو نام تھا اس کا۔ چالیس پچاس کی عمر۔ گٹھا ہوا جسم۔ چہرے پر بلکے بلکے داغ۔ کھوئی کھوئی آنکھیں اور ٹھہر ٹھہر کر باتیں کرنے کا عادی۔

ظاہری طور پر وہ ایک پڑھا لکھا اور مہذب انسان تھا۔

میری اس سے جان پہچان ایک عجیب واقعے سے ہوئی تھی۔

میں شیرا کے ہوٹل میں کھانا کھانے چلا گیا تھا۔

اس زمانے میں بیگم کچھ دنوں کے لیے اپنے میکے گئی ہوئی تھی۔ اس لیے ہوٹل سے کھانا کھانا پڑتا۔ وہ ایک اوسط

درجے کا ہوٹل تھا لیکن کھانا بہت مزے کا ہوتا تھا۔ شیراز خود کھانے بنانے کے مرحلوں کی نگرانی کیا کرتا۔ یعنی اپنے ہوٹل کا چیف شیف وہ خود ہی تھا۔

وہ کھانوں میں طرح طرح کے تجربات کرتا رہتا۔ جس کی وجہ سے اس کے ہوٹل کے کھانوں کا ذائقہ بہت منفرد ہوا کرتا تھا۔ دور دور سے لوگ اس کے یہاں آیا کرتے تھے۔

اس وقت بھی میں ہوٹل میں رات کا کھانا کھانے گیا ہوا تھا۔ اس دن میں نے ہوٹل میں ایک تبدیلی دیکھی۔ ہوٹل کے باہر یعنی کاؤنٹر سے کچھ فاصلے پر شیرا نے باربی کیو کا انتظام بھی کر دیا تھا۔ کوئلے دہکا کر سیخوں پر کباب اور تکے وغیرہ بنانے کی تیاری ہو رہی تھی۔

خاور میرے سامنے والی میز پر بیٹھا اس طرف دیکھ رہا تھا۔ جہاں کباب بنائے جا رہے تھے۔ آگ دہک رہی تھی کہ اچانک خاور کے بدن پر لرزہ طاری ہو گیا تھا۔

مجھے اندازہ ہو گیا کہ کس وجہ سے اس شخص کی طبیعت خراب ہو رہی ہے۔ وہ چونکہ میرے قریب ہی تھا۔ اس لیے میں اپنی کرسی سے اٹھ کر اس کے پاس آ گیا۔ "کیا ہوا بھائی صاحب آپ ٹھیک تو ہیں نا؟"

"خدا کے لیے..... خدا کے لیے....." اس نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ "خدا کے لیے مجھے اس ہوٹل سے باہر لے چلیں میں..... میں....."

"کوئی بات نہیں۔ آئیں میرا ہاتھ تھام لیں۔"

اس نے اپنا لرزتا ہوا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیا۔ میں بڑی مشکلوں سے اسے ہوٹل سے باہر لانے میں کامیاب ہوا تھا۔

باہر آ کر وہ ایک طرف فٹ پاتھ پر بیٹھ گیا۔ وہ گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔ انسانی ہمدردی کے تحت میں اس کے پاس ہی کھڑا رہا۔

پھر میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "چلیں بھائی صاحب میں آپ کو کسی ڈاکٹر کے پاس لے چلتا ہوں۔"

"شکریہ آپ کا۔" وہ میرے ہاتھ کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا۔ "میں اب ٹھیک ہوں۔ چلا جاؤں گا۔"

"کہاں رہتے ہیں آپ؟" میں نے پوچھا۔

"اسی محلے میں۔" اس نے جواب دیا۔ "ابھی نیا آیا ہوں۔"

"اوہ! اس لیے آپ کو میں نہیں دیکھا۔" میں نے کہا۔ "میں بھی اسی محلے میں رہتا ہوں۔ چلیں آپ کو آپ کے گھر تک تو پہنچا ہی دوں۔"

"ویسے میں اب ٹھیک ہوں۔" وہ دھیرے سے بولا۔ "یہ ایک وقتی کیفیت سی ہوتی ہے۔ جو کچھ دیر بعد خود ہی ٹھیک ہو جاتی ہے۔ ویسے آپ میرے گھر چلنا چاہتے ہوں تو شوق سے۔ بسم اللہ۔"

"چلیں، پھر کبھی سہی۔" میں نے کہا۔ "میرا نام محمود ہے وہ سامنے والی بلڈنگ میں رہتا ہوں۔" میں نے اس بلڈنگ کی طرف اشارہ کیا جس کے ایک فلیٹ میں میری رہائش تھی۔

"اور میں خاور ہوں۔" اس نے اپنا تعارف کروایا۔ "اور نزہت اپارٹمنٹ میں رہتا ہوں۔"

نزہت اپارٹمنٹس بھی اسی علاقے میں تھا۔

"اگر کہیں تو میں پہنچا دوں۔" میں نے پیشکش کی۔

"نہیں..... نہیں میں بالکل ٹھیک ہوں۔" اس نے کہا۔ "میں چلا جاؤں گا۔ چلیں آپ سے پھر ملاقات ہو گی۔"

خاور سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔

اس کے بعد بھی راستے میں آتے جاتے اس سے مڈبھیڑ ہوتی رہی۔ کیوں کہ ہمارا علاقہ ایک ہی تھا۔ ایک دو بار کے بعد اس نے بتایا کہ وہ کسی دفتر میں اچھے عہدے پر فائز ہے اور اس کی ابھی شادی نہیں ہوئی ہے۔ اس لیے وہ اکیلا رہتا ہے۔

وہ مجھے اکثر بلایا کرتا تھا۔ ایک شام میں اس کے پاس پہنچ ہی گیا۔ اس نے بہت تپاک سے استقبال کیا تھا۔

"اوہو! زہے نصیب میں تو یہ سمجھ رہا تھا کہ آپ بس یوں ہی آنے کا وعدہ کر دیتے ہیں۔"

"نہیں جناب آپ سے ملنے کو کئی بار دل چاہا لیکن فرصت نہیں مل رہی تھی۔"

"چلیں کوئی بات نہیں۔ دیر آئے درست آئے۔"

وہ مجھے اندر لے آیا۔ سلیقے سے سجا ہوا فلیٹ تھا۔ ڈرائنگ روم بھی بہت اچھا تھا۔

"تشریف رکھیں۔" خاور نے ایک صوفے کی طرف اشارہ کیا۔ "یہاں میرے علاوہ کوئی نہیں رہتا۔"

"کیا آپ نے شادی نہیں کی؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔ اس کی بھی ایک الگ کہانی ہے۔" اس نے کہا۔ "خیر باتیں تو ہوتی رہیں گی۔ میں آپ کے لیے پہلے

شربت لے کر آتا ہوں۔"

"خاور صاحب اگر شربت کی جگہ چائے ہو جائے تو بہت اچھا ہے۔"

"چائے!" وہ کچھ پریشان ہو گیا تھا۔ "چائے تو میں آپ کو نہیں پلا سکتا۔ کیوں کہ...... کیوں کہ میرے فلیٹ میں چولہا نہیں ہے۔"

"چولہا نہیں ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"جی ہاں وہ بات یہ ہے کہ چولہے میں آگ ہوتی ہے اور میں آگ کو دیکھ نہیں سکتا۔"

"اوہو! مجھے یاد آ گیا کہ شیرا کے ہوٹل میں آگ کو دیکھ کر اس کی کیا حالت ہوئی تھی۔ یہ بے ہوش ہونے لگا تھا۔ یہ بہت عجیب کی بات تھی۔"

"خیریت تو ہے خاور صاحب! آگ کو آپ کیوں نہیں دیکھ سکتے؟" میں نے پوچھا۔

"مجھے اس سے خوف محسوس ہوتا ہے۔ ذرا سی دیر میں میرا پورا جسم جیسے جھلسنے لگتا ہے۔ دم گھٹنے لگتا ہے میرا اس لیے میں آگ کے قریب ہی نہیں جاتا۔"

"حیرت کی بات ہے۔ پھر آپ کا کھانا کہاں سے آتا ہے۔"

"ہوٹل جا کر کھا لیتا ہوں۔" اس نے بتایا۔ "لیکن کبھی کچن کی طرف نہیں دیکھتا۔ چولہے کے پاس نہیں بیٹھتا۔"

"آخر کیوں؟"

"میں نہیں جانتا۔" وہ بے چین سا ہونے لگا تھا۔ "پلیز اب آپ اس قصے کو یہیں ختم کر دیں۔ میں آپ کے لیے شربت لے کر آتا ہوں۔"

وہ شربت لینے چلا گیا۔ جب کہ میں اس کے بارے میں سوچنے لگا۔ کیا تھا یہ سب؟ کیا یہ کوئی نفسیاتی مرض تھا۔ اگر ایسا ہے تو اس کی زندگی اجیرن ہو کر رہ گئی ہوگی۔ آگ تو زندگی ہے۔ اس کے بغیر تو زندگی گزارنے کا تصور ہی نہیں ہو سکتا۔

وہ شربت تیار کر کے لے آیا۔ میں نے بھی اس موضوع پر اس سے بات نہیں کی۔ وہ خوا مخواہ مزید پریشان ہو جاتا۔ آگ کا ذکر اس کی دکھتی رگ جیسا تھا۔

بہرحال وہ میرے لیے ایک دلچسپ کردار تھا اور میں نے اس قسم کا خوف پہلی بار دیکھا تھا۔ انسان بھی عجیب ہے کیسی کیسی پیچیدگیاں سمیٹ کر بیٹھا رہتا ہے۔

یہ سب انسانی ذہن کے کرشمے ہوتے ہیں۔ انسان کو الجھا کر رکھ دیتے ہیں۔ ویسے وہ ہر طرح سے نارمل تھا۔ بہت اچھی اور علمی باتیں کیا کرتا۔

اس نے بتایا۔ "محمود صاحب! میں تنہا تو ہوں لیکن میں نے تنہائی کو اپنے اوپر مسلط نہیں ہونے دیا ہے۔ کتابوں سے دوستی کر لی ہے میں نے۔ دوسرے کمرے میں میری لائبریری ہے۔ آپ دیکھیں گے تو حیران رہ جائیں گے۔ کہاں کہاں سے کتابیں جمع کر کے رکھی ہیں میں نے۔"

"وہ تو آپ کی باتوں سے ظاہر ہو رہا ہے۔" میں نے کہا۔ چونکہ مجھے بھی کتب بینی کا شوق رہا ہے۔ اس لیے ہمارے درمیان یہ ایک مشترکہ موضوع تھا۔ ہم بہت دیر تک ادب اور ادیبوں پر گفتگو کرتے رہے پھر میں اس سے اجازت لے کر آ گیا۔

اس کے بعد بھی اس سے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ یہ کہا جائے کہ ہمارے درمیان دوستی کا رشتہ استوار ہو گیا تھا تو غلط نہیں ہوگا۔

اس نے اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ اس کا تعلق ایک پڑھے لکھے دین دار گھرانے سے تھا۔ اس کے والد بہت بڑے خطیب تھے۔ جو لوگوں کو جہنم کی آگ سے رات دن خوف زدہ کرنے کی کوشش کیا کرتے۔ شاید یہی خوف اس کے ذہن میں بیٹھ گیا ہو۔

مگر یہ باتیں اس نے آہستہ آہستہ بتائی تھیں۔

ایک بار ایک تقریب میں میری ملاقات ایک سائیکاٹرسٹ سے ہو گئی۔ وہ شہر کے ایک بڑے اسپتال میں ہوا کرتے تھے۔ میں نے خاور کے خوف کے بارے میں سب کچھ بتاتے ہوئے کہا۔ "ڈاکٹر صاحب مجھے تو یہ بہت عجیب

معلوم ہوتا ہے۔"

"نہیں یہ کوئی عجیب بات نہیں ہے۔ یہ ایک فوبیا ہے اور آپ کا دوست جس فوبیا میں مبتلا ہے۔ ہم اسے Flriphobia کہتے ہیں۔ یعنی آگ کا خوف۔"

"یعنی یہ اس کا وہم نہیں ہے۔"

"نہیں، وہم نہیں ہے۔ بلکہ یہ باقاعدہ ایک مرض ہے۔" ڈاکٹر نے بتایا۔

"اور اس کا علاج کیا ہے۔"

"تحلیل نفسی۔" ڈاکٹر نے بتایا۔ "اس کے ساتھ وہ چار سیشن کرنے ہوں گے اس کے بعد اس کے اندر کے اس خوف کی وجہ سامنے آجائے گی۔ پھر علاج میں آسانی ہو جائے گی اور کچھ دنوں کے علاج کے بعد آپ کا دوست بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔"

"خدا کرے ایسا ہی ہو۔ وہ ایک پڑھا لکھا مہذب انسان ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ اپنے اس خوف سے نجات پالے۔"

"آپ اسے میرے کلینک لے کر آجائیں لیکن پرابلم یہ ہے کہ ایسے مریض خود کو چونکہ مریض ہی نہیں سمجھتے اس لیے وہ سائیکاٹرسٹ کے پاس جانے سے کترایا کرتے ہیں۔"

"چلیں میں اس سے بات کر کے دیکھتا ہوں۔"

لیکن ایسا نہیں ہوا۔ میں نے جب خاور سے اس بارے میں بات کی تو وہ فوراً تیار ہو گیا۔ "ہاں محمود صاحب یہ بہت اچھا ہوگا۔ میں تو خود ہی یہی چاہتا تھا کہ اس خوف سے نجات پاؤں۔ زندگی بے کار ہو کر رہ گئی ہے۔"

"تو پھر کسی دن چلیں میرے ساتھ۔"

"کیوں نہیں، جب کہیں میں چلنے کے لیے تیار ہوں۔"

اور ایک دن میں خاور کو ڈاکٹر صاحب کے پاس لے ہی گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھے اشارہ کیا کہ میں کمرے سے باہر چلا جاؤں۔ میں کمرے سے باہر آگیا۔

بہت دیر کے بعد خاور ڈاکٹر کے کمرے سے باہر نکلا تھا۔ اس کے چہرے پر ایسی کیفیت تھی جیسے بہت تھک چکا ہو۔ نڈھال نڈھال سا۔ بالکل خاموش۔ اس نے باہر آ کر صرف اتنا بتایا۔ "پرسوں پھر آنا ہوگا۔"

اس کے علاوہ اس نے اور کچھ نہیں کہا۔ میں نے بھی اسے کریدنا مناسب نہیں سمجھا۔ جو کچھ بھی تھا وہ بعد میں تو مجھے معلوم ہی ہو جاتا۔

اس کے بعد کئی دنوں تک اس سے ملاقات نہیں ہوئی۔ ایک شام اس سے ملاقات ہوئی تو اس نے کہا۔

"محمود صاحب! میرا ٹریٹمنٹ چل رہا ہے۔ میں تین بار ڈاکٹر صاحب کے پاس جا چکا ہوں۔"

"یہ بتائیں آپ کو کچھ فائدہ محسوس ہو رہا ہے۔" میں نے پوچھا۔

"ہاں بہت حد تک۔" اس نے کہا۔ "خوف کی وہ کیفیت نہیں ہے۔ جو پہلے تھی کچھ کمی آئی ہے لیکن......" وہ لیکن کے بعد خاموش ہو گیا تھا۔ جیسے کچھ اور بھی کہنا چاہ رہا ہو۔ لیکن اس نے کہنا مناسب نہیں سمجھا ہو۔ ایک دن مجھے نہ جانے کیا سوجھی کہ میں خود ڈاکٹر صاحب کے پاس پہنچ گیا۔

"جی ڈاکٹر صاحب فرمائیں کیا حال ہے آپ کے مریض کا؟" میں نے پوچھا۔

"محمود صاحب وہ بے چارہ تو آپ کا مریض ہے۔ آپ ہی اسے لے کر آئے تھے۔"

"لیکن علاج تو آپ کر رہے ہیں نا؟"

"ہاں علاج میں کر رہا ہوں اور مجھے خوشی ہے کہ اس کا خوف بہت حد تک کم ہو گیا ہے۔" ڈاکٹر صاحب نے بتایا۔ "میں اب اس کمرے میں اس سے اسٹوو جلوا کر چائے بنواتا رہتا ہوں اور وہ پرسکون ہو کر بیٹھا رہتا ہے۔"

"چلیں یہ تو بہت بڑی کامیابی ہے۔ لیکن ایسا کیوں تھا؟"

"بہت چھوٹی سی وجہ تھی میں نے جب اس کے لاشعور کو کریدا تو وہ وجہ سامنے آ گئی۔" ڈاکٹر صاحب نے بتایا۔ "اس نے اپنے بچپن میں ایک آدمی کو جلتے ہوئے دیکھ لیا تھا اس کے پڑوس میں آگ لگ گئی تھی۔ جلنے والا اس کا پڑوسی تھا۔ بس اس کے بعد سے اس کے ذہن میں آگ کا خوف بیٹھ گیا۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس کے علاج کا سفر کامیابی سے جاری ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں بظاہر تو ایسا ہی ہے لیکن .."

"لیکن کیا ڈاکٹر صاحب۔" میں نے پوچھا۔ "کیا اور بھی کچھ رہ گیا ہے۔"

"ہاں شاید بہت کچھ باقی رہ گیا ہے۔" ڈاکٹر صاحب نے کہا۔ "اس کے لاشعور کی صرف ایک پرت سامنے آئی ہے۔ صرف ایک حادثے کا پتا چلا ہے۔"

"تو آپ کے خیال میں کچھ اور گرہیں بھی باقی ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں کوئی اور گرہ بھی ہے۔ بہت مضبوط۔" ڈاکٹر نے بتایا۔

"تو آپ نے اس کو کریدنے کی کوشش نہیں کی۔"

"بہت کوشش کی لیکن اس کا لاشعور مزاحمت کرنے لگتا ہے۔ وہ کھل کر سامنے نہیں آتا۔ وہ اپنے آپ کو سنبھال کر خود پر قابو پالیتا ہے۔ اس لیے میں ناکام رہا ہوں۔"

"تو پھر پتا کیسے چلے گا؟"

"خود ہی تم اس کے دوست ہو۔ غیر محسوس طور پر اسے کریدنے کی کوشش کرو۔" ڈاکٹر نے بتایا۔ "یاد رکھو جہاں اسے یہ احساس ہوا کہ اس سے کچھ معلوم کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ وہ وہیں ہوشیار ہوجائے گا۔"

"آپ نے تو ایک مشکل کام دے دیا ڈاکٹر صاحب۔"

"یہی تو دیکھنا ہے کہ تم کس حد تک اپنے اس پروجیکٹ میں کامیاب ہوتے ہو۔" ڈاکٹر صاحب نے کہا۔ "اور جو کچھ معلوم ہو مجھے بھی ضرور بتانا۔ میرے لیے یہ ایک چیلنجنگ کیس ہے۔"

"ضرور ڈاکٹر صاحب۔"

اس کے بعد بھی خاور سے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ میں نے اس کے قریب ہونے کی کوشش کی۔ میں نے یہ دیکھا کہ اب اس نے اپنے گھر میں چولہا بھی لگوالیا تھا اور جب میں جاتا تھا وہ میرے لیے چائے بھی بنا کر لے آتا۔

یہ بہت بڑی تبدیلی تھی۔

ڈاکٹر صاحب نے اس کا کامیاب علاج کردیا تھا۔

لیکن یہ بظاہر والی بات تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا تھا کہ وہ پوری طرح ٹھیک نہیں ہوا ہے۔

اس کے لاشعور میں کچھ پوشیدہ ہے۔ کوئی ایسی بات جس کا اظہار وہ نہیں کرپاتا۔

ایک دن جب میں اس کے فلیٹ میں تھا اور وہ میرے لیے چائے لے کر آیا تو میں نے اس سے کہا۔

"مبارک ہو خاور تمہارا آگ والا خوف تو ختم ہوا۔"

"ہاں بظاہر ختم ہوگیا ہے۔ لیکن......"

"یار یہ لیکن کیا ہے۔ میں تو بھی دیکھ رہا ہوں کہ تم اب آگ کے قریب جانے لگے ہو۔ تم نے اپنے فلیٹ میں چولہا بھی لگوالیا ہے۔ تم اب خود ہی چائے بنانے لگے ہو۔ اب تمہاری وہ کیفیت نہیں ہوتی جو پہلے ہوا کرتی تھی۔ تو اب کیا رہ گیا ہے۔"

"ابھی بھی بہت کچھ ہے میرے دوست۔" خاور نے کہا۔ "جس آگ کا خوف میرے ذہن سے ختم ہوا ہے وہ تو سامنے کی آگ ہے۔ اصل آگ تو ابھی بھی جل رہی ہے اور جلائے جارہی ہے۔"

"خاور جو کچھ تمہارے سینے میں چھپا ہے، جو بھی ہے، وہ بتا کر خود کو ہلکا کرلو۔ ورنہ اندر ہی اندر بھسم ہوجاؤ گے۔ تمہاری حالت ٹھیک نہیں لگ رہی۔ تمہارا علاج خود تمہارے اپنے پاس ہے۔ تم ہی اپنا علاج کرسکتے ہو۔ تمہاری خاموشی تمہیں ماردے گی۔"

بہت دیر تک خاموش رہنے کے بعد اس نے میری طرف دیکھا۔ "ہاں میرے دوست۔ اب وقت آگیا ہے کہ میں اپنی اس آگ کے بارے میں بتادوں۔ جو میرے اندر ہے۔ تمہارے سائیکا ٹرسٹ دوست نے باہر کے فائر و فوبیا سے تو نجات دے دی ہے لیکن اندر کا فائر و فوبیا مجھے چین نہیں لینے دیتا۔"

☆......☆

پھر خاور نے مجھے اپنی کہانی سنائی۔

ویسے یہ کہانی ایک باضمیر شخص کی کہانی ہے۔ ورنہ اس قسم کے واقعات تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔ کون ان پر دھیان دیتا ہے۔

"میں نے شادی کی تھی۔" خاور نے بتانا شروع کیا۔ "ایسا نہیں ہے کہ میں غیر شادی شدہ رہا ہوں۔ نہیں، شادی ہوئی لیکن میری بیوی ایک مختلف عورت ثابت ہوئی۔ بے حس۔ اب تمہیں کیا بتاؤں بہت پیچیدہ مسئلہ ہے۔ بتاتے ہوئے بھی شرم آتی ہے لیکن پس منظر بتانا بھی ضروری ہے۔ ورنہ تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گا۔"

"ضرور بتاؤ۔ میں اسی لیے بیٹھا ہوں۔" میں نے کہا۔ "میں یہ چاہتا ہوں کہ تم اس کیفیت سے نکل آؤ۔"

"دیکھو میں ایک مکمل مرد ہوں۔ میرے اندر ایک آگ سی جلتی رہتی ہے۔ یہ وہ آگ ہے جسے فطری آگ کہا جاتا ہے۔ یعنی کسی سے وصال کی خواہش کی آگ۔ آسان الفاظ میں تم اسے سیکس کی آگ کہہ سکتے ہو۔ شادی ہوئی تو میں نے سوچا کہ اب اس آگ کا ازالہ ہوجائے گا۔"

"کیا شادی سے پہلے تم نے اس آگ کو بجھانے کی کوشش نہیں کی تھی؟" میں نے کریدا۔

"نہیں کبھی نہیں۔" اس نے جواب دیا۔ "بے پناہ تپش اور خواہش کے باوجود میں نے ہمیشہ خود کو سنبھال کر رکھا۔ میں اس کا جائز علاج چاہتا تھا اور وہ جائز اور سیدھا راستہ صرف شادی کا تھا۔"

"ظاہر ہے اس کے علاوہ دوسرے راستے غلط ہیں۔" میں نے کہا۔

"تو جب شادی ہوئی تو میں نے سمجھا کہ اب سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ میری یہ تشنگی ختم ہو جائے گی۔ غزالہ ایک خوب صورت لڑکی تھی۔ اس کا تعلق ہمارے خاندان سے ہی تھا۔"

میں اس کو پا کر بہت خوش تھا لیکن شادی کی پہلی ہی رات پتا چلا کہ وہ ایک پتھر ہے۔ جس پر کسی جذبے کا اثر نہیں ہوتا۔ جس کو کوئی بھی کیفیت مہمیز نہیں کر سکتی۔ تم اسے پتھر کا صنم سمجھ لو۔ اسے اس بات سے گھن آتی تھی کہ میں اس کے قریب آتا ہوں۔ اسے چھونے کی کوشش کرتا ہوں۔ وہ رونا دھونا شروع کر دیتی تھی۔ میرے لیے اس کا یہ رویہ بہت عجیب تھا۔

"میں نے جس شوق میں شادی کی تھی۔ وہ سب ختم ہو کر رہ گیا۔ تم یقین کرو اس کے پاس جا کر مجھ پر جنونی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ میں دیواروں سے سر ٹکرایا کرتا لیکن اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا اور یہ ایسی بات تھی کہ اس کے بارے میں کسی کو بتا بھی نہیں سکتا تھا۔ خواہ مخواہ شرمندگی ہوتی۔ لوگ میرا مذاق اڑاتے۔ بس اندر ہی اندر گھٹتا چلا گیا۔ میں نے اپنا بستر تک الگ کر لیا۔ دنیا کی نگاہوں میں ہم مکمل میاں بیوی تھے۔ لیکن یقین کرو ہم کچھ بھی نہیں تھے۔"

"اور خود اس کی کیا کیفیت تھی۔ کیا اسے کسی قسم کی الجھن یا پریشانی نہیں تھی۔" میں نے پوچھا۔

"نہیں کچھ بھی نہیں۔ وہ بالکل نارمل تھی۔ جیسے یہ کوئی بات ہی نہ ہو یا اس کی نظروں میں ان تعلقات کی کوئی اہمیت ہی نہ ہو میں نے کہا نا کہ وہ بالکل بے حس تھی ..... بالکل پتھر۔"

"میرے دوست میں تمہارے کرب کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

"اس کرب کو پوری طرح سمجھ سکتا ہے وہ جو خود بھی اس کرب اس عذاب سے گزرا ہو۔" اس نے کہا۔ "یہ ایسی بے چینی ہوتی ہے کہ آپ اس کو کوئی لفظ نہیں دے سکتے۔ کوئی اصطلاح اس کے لیے بن ہی نہیں سکتی ہے۔ پھر اس کے دو نتیجے ہوتے ہیں۔ یا تو انسان خودکشی کر لیتا ہے یا اس کو مار دیتا ہے۔ میں نے اسے مارا تو نہیں۔ لیکن طلاق ضرور دے دی۔ اس طرح وہ میری زندگی سے نکل گئی۔ اس کے بعد میں نے اب تک شادی نہیں کی۔"

"اب سمجھا تو تمہارے اندر جلنے والی آگ کا پس منظر یہ ہے۔" میں نے کہا۔

"نہیں یہ بھی نہیں ہے۔" وہ دھیرے سے بولا۔ "یہ پس منظر کچھ اور ہے۔"

"اور وہ کیا ہے۔"

"وہ ایک چیخ ہے جو میرے اندر گونجتی رہتی ہے۔ کچھ آنسو ہیں جو میرے دل پر گرتے رہتے ہیں اور وہی آنسو میرے وجود میں آگ لگا رہے ہیں۔ وہ آنسو پانی نہیں ہیں بلکہ پگھلی ہوئی آگ ہے۔ جس نے مجھے بھسم کر کے رکھ دیا ہے۔"

وہ خاموش ہو گیا۔ گہری سوچ میں چلا گیا۔ اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ جیسے کوئی احساس اسے اندر ہی اندر کھائے چلا جا رہا ہو۔

پھر اس نے آگے بولنا شروع کیا۔ اس بار اس کی آواز بہت مدھم تھی۔ ٹوٹی ہوئی۔ نڈھال سی آواز۔ وہ بتا رہا تھا۔

"اس گھر میں صرف تین آدمی تھے۔ ایک غریب ماں، جو محلے کے بچوں کو قرآن پڑھایا کرتی۔ ایک شاہدہ جو سلائی کر کے ماں کا ہاتھ بٹایا کرتی۔ بہت ہنر تھا اس کے ہاتھوں میں۔ بہت اچھی لڑکی تھی۔ بہت سمجھدار اور بہت مہذب اور بہت خوب صورت۔ اس کی عمر بھی اکیس برس کی ہو گی۔ بہت غریب لوگ تھے۔ میرے گھر سے کچھ فاصلے پر کچی آبادی میں رہا [illegible] تے۔ لڑکی کا باپ میرے دفتر میں چپراسی تھا۔ وہ بھی ایک [illegible] بہت شریف انسان تھا۔ ہم سب اس کا بہت خیال رکھا کرتے تھے۔"

"پھر ایک حادثہ ہوا۔ اس بے چارے کا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ جس کے نتیجے میں اس کی موت واقع ہو گئی۔ اس حادثے سے اس کے گھر والوں پر کیا گزری ہو گی یہ تو خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ کچھ دنوں کے بعد دفتر والوں نے آپس میں کچھ پیسے جمع کیے تاکہ اس بے چارے کی بیوی کو دیا جائے۔ یہ اتفاق تھا کہ اس کا گھر میں نے دیکھ رکھا تھا گھر تو نہیں بلکہ میں نے وہ محلہ اور وہ گلی دیکھی تھی جہاں وہ رہا کرتا تھا۔ وہ بھی اس طرح کہ ایک بار میں نے اسے ٹیکسی میں لفٹ دی تھی۔ اس وقت پتا چلا کہ وہ بھی میرے گھر کے قریب ہی رہتا ہے۔"

بہرحال تو یہ ذمے داری مجھے دی گئی کہ میں وہ لفافہ اس کی بیوہ کو پہنچا دوں۔" میں وہاں پہنچا اور شاہدہ کو دیکھتے ہی میرے اندر تشنگی کی آگ اچانک بھڑک اٹھی۔"

میرے اندر کا سویا ہوا پیاسا مرد جاگ اٹھا تھا۔ اس

وقت میں نے یہ ظاہر کیا کہ یہ سارے پیسے میں نے ہی دیے ہیں۔ بے چاری بیوہ بار بار میرا شکریہ ادا کر رہی تھی جب کہ شاہدہ میرے لیے چائے بنا کر لے آئی تھی۔

بہر حال میں نے بڑی ہوشیاری سے ان دونوں کو گھیرنا شروع کر دیا۔ اپنی مکمل شرافت کا یقین دلا دیا اور ایک دن آفر کر دی کہ شاہدہ میرے فلیٹ آ کر چھوٹا موٹا کام کر دیا کرے۔ اس کے عوض اسے پیسے مل جایا کریں گے۔

" دونوں ماں بیٹی کو مجھ پر اعتماد تو ہو ہی چکا تھا لہٰذا شاہدہ میرے فلیٹ آنے لگی۔ ایک ہفتے تک میں اس کے ساتھ بہت نرم دلی کا برتاؤ کرتا رہا۔ احساس ہی نہیں ہونے دیا کہ میں نے اس کے لیے اپنے سینے میں کیسی آگ دہکا رکھی ہے۔ بالآخر ایک دن جب وہ آئی تو میں نے وہی کیا جو تم نے ایسے واقعات میں سنا ہوگا۔"

"اوہ۔" میں نے ایک گہری سانس لی۔ تو اصل معاملہ یہ تھا۔

"وہ چیخ ابھی تک میرے وجود میں گونج رہی ہے۔ وہ آنسو آج بھی میرے دل پر برس رہے ہیں اور وہ آگ آج بھی مجھے جھلسائے جا رہی ہے۔ کہیں چین نہیں ملتا۔ کہیں سکون نہیں ہے۔ آگ آگ اور صرف آگ۔ ڈاکٹر نے باہر کی آگ تو بجھا دی اندر کی آگ کا کیا کروں۔ اس Fire fobla سے کیسے نجات پاؤں۔ کون دے گا نجات۔"

"او تم نے بہت برا کیا۔" میں نے کہا۔ "بہر حال تم اس کے ازالے کے طور پر اس بد نصیب کے گھر جا کر معافی مانگ سکتے تھے۔ شاید آگ کی شدت میں کچھ کمی ہو جاتی۔"

"میں گیا تھا۔ میرا ارادہ یہ تھا کہ شادی کی پیشکش کر دوں گا۔ اپنا لوں گا اس کو۔ لیکن وہاں جا کر پتا چلا کہ اس گھر میں جو لڑکی رہتی تھی۔ اس نے کسی نامعلوم وجہ سے خودکشی کر لی تھی اور وہ ماں اپنے بیٹے کو لے کر کہیں چلی گئی تھی۔ کہاں یہ کسی کو نہیں معلوم۔ کسی کو بھی نہیں۔"

اور اس نے اپنی آگ کی کہانی سنا دی تھی۔ وہ آگ جو فائرو فوبیا کی صورت اختیار کر گئی تھی وہ آگ اسے بے چین رکھتی تھی۔ وہ جلتا رہتا تھا۔

میں کیا شاید اب کوئی بھی اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

ایک دن میں ڈاکٹر کے پاس پہنچ گیا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ خاور کے سلسلے میں اگر کوئی بات مجھے معلوم ہو جائے تو میں اسے ضرور بتاؤں۔

میں نے خاور کی ساری کہانی سنا دی۔

ڈاکٹر نے بہت دھیان سے کہانی سننے کے بعد کہا۔

"یہ معاملہ صرف Fireophobia کا نہیں، بلکہ اور بھی بہت کچھ ہے۔ اس نے اپنی آگ سے بچنے کے لیے شادی بھی کر لی تھی لیکن بدقسمتی سے اسے ایسی عورت مل گئی جو جنسی طور پر بے حس تھی۔"

"ڈاکٹر صاحب کیا ایسا بھی ہوتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں ایسا بھی ہوتا ہے۔ جس طرح کچھ مرد نامکمل ہوتے ہیں اسی طرح کچھ عورتیں بھی نامکمل ہوتی ہیں۔ وہ اپنے شوہروں کو گھٹن کا مریض بنا کر رکھ دیتی ہیں۔ عام طور پر ایسی ہی عورتوں کے شوہر دوسری عورتوں کے پاس جایا کرتے ہیں اور عورتوں کو اس کمی کا احساس تک نہیں ہوتا۔ وہ صرف ایک بات کہتی رہتی ہیں۔ ارے واہ میں اتنی خوب صورت ہوں، اسمارٹ ہوں، سگھڑ ہوں۔ پھر بھی میرا شوہر دوسروں کے پاس جایا کرتا ہے۔ وہ ایک فلرٹ کا بے وفا ہے۔ ضرورت ہے کہ ایسی عورتوں کو یہ سمجھایا جائے کہ جس شخص کو گھر میں اچھا کھانا نہیں ملتا وہ ڈائنے کے لیے باہر جایا کرتا ہے۔ یہ انسانی نیچر ہے۔ اس میں کوئی شرم اور تکلف کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر عورت کو مناسب تعلیم دے دی جائے تو پھر وہ پتھر کا صنم نہیں رہے گی اور پھر گھر میں چھوٹے موٹے جھگڑے بھی نہیں ہوا کریں گے۔"

"ڈاکٹر صاحب زندگی واقعی ایسی ہی ہوتی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں ہمارے معاشرے میں پھیلتے ہوئے نفسیاتی امراض بہت شدت اختیار کرتے جا رہے ہیں اور کسی کو اس کا احساس تک نہیں ہے۔"

"ڈاکٹر صاحب یہ فرمائیں اس خاور کی آگ کا کیا ہو گا؟" میں نے پوچھا۔

"اس آگ سے بچانے اور اسے سکون دینے والا صرف ایک ہی ہے اور وہ ہے خدا۔ یا پھر وہ لڑکی جس کے ساتھ اس نے مجبور ہو کر زیادتی کی تھی... اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ دنیا کا کوئی سائیکاٹرسٹ اس آگ سے اس کو نہیں بچا سکتا۔"

میں نہیں جانتا کہ اس کے بعد کیا ہوا۔ خاور نے وہ فلیٹ چھوڑ دیا تھا۔ وہ کہاں ہے کیا کر رہا ہے۔ کیا اس کی آگ اسے اچانک خوفزدہ کر رہی ہے۔ یہ ایسے سوال ہیں جن کے جواب میرے پاس نہیں ہیں۔

رشتوں کا کرب

محترم ایڈیٹر سرگزشت،
سلام مسنون!
والدین اور بہن بھائی ان مقدس رشتوں کا نام ہے جن پر انسان آنکھیں بند کرکے بھروسا کرسکتا ہے مگر "جن پتوں پہ تکیہ تھا، وہی پتے ہوا دینے لگے" کے مصداق جب یہ رشتے لالچ اور خود غرضی کی چادر اوڑھ لیتے ہیں تو پھر تمام انسانی رشتوں پر سے کیسے اعتبار ختم ہوتا ہے یہ آپ اس سچ بیانی میں ملاحظہ کریں گے۔ میں نے تمام کرداروں کے نام تبدیل کردیے ہیں مگر کوشش کی ہے کہ واقعات کا تسلسل برقرار رہے تاکہ قارئین تشنگی محسوس نہ کریں۔

دانیہ صدیقی
(کراچی)

اسکول وین میں بچوں نے ایک ہنگامہ برپا کیا ہوا تھا۔ حالانکہ آج صبح سے شدید گرمی پڑ رہی تھی اور گرمی کے مارے سب کی حالت بری ہورہی تھی لیکن مجال ہے کہ بچوں کی مستیوں پر اس کے کچھ اثرات مرتب ہوئے ہوں۔ اس وقت دوپہر کے دو بجے تھے اور سورج سوا نیزے پر تھا۔ بچوں کے چہرے گرمی اور پسینے کی زیادتی سے تمتمارہے تھے اور یونیفارم بھیگ کر ان کے جسموں سے چپک گئے تھے مگر ان ننھے منے بچوں پر آفرین تھی جنھوں نے اس غضب کی گرمی میں بھی وین میں اچھل کود مچا رکھی تھی۔ ڈرائیور اب تک کئی بار انہیں ٹوک چکا تھا مگر کسی بچے کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی تھی۔ جب کوئی گیم کھیلتے ہوئے شور حد سے بڑھنے لگا تو فریحہ نے بچوں کو جھڑک کر خاموش کروادیا۔ بچے بس کی ڈانٹ سن کر دبک گئے۔ مونا جو فریحہ کے ساتھ ہی بیٹھی گپیں مار رہی تھی بچوں کو اس طرح سہم کر بیٹھے دیکھا تو اسے ہنسی کا مار کر مسکرانے لگی۔ جواباً فریحہ نے بھی مزاحیہ انداز میں آنکھیں گول گول گھما کر اس کا ساتھ دیا۔ آج ان لوگوں کو وین میں بیٹھے کافی دیر ہوچکی تھی، سڑکوں پر معمول سے زیادہ رش ہونے کی وجہ سے وین کو جگہ جگہ رکنا پڑ رہا تھا اوپر سے اتنی گرمی اور بچوں کے شور نے سر میں درد کردیا تھا۔

مونا اور فریحہ ایک ہی اسکول میں پڑھاتی تھیں اور آپس میں کولیگز ہونے کے ساتھ اب ان کی آپس میں اچھی دوستی بھی ہوگئی تھی۔ مونا اپنی تمام باتیں اور مسئلے مسائل فریحہ سے شیئر کرتی اور وہ بھی اسے ایک مخلص دوست کی طرح ہمیشہ اچھے مشورے سے نوازتی۔ دونوں شادی شدہ تھیں۔ مونا کے ہاں ابھی بچے نہیں ہوئے تھے البتہ فریحہ کی ایک بیٹی تھی جو اسی اسکول میں پڑھتی تھی۔ دونوں کے گھر قریب قریب ہونے کی وجہ سے وہ ایک ہی اسکول وین میں آتی جاتی تھیں۔

تھوڑی دیر مزید ٹریفک جام میں پھنسنے کے بعد وین اب تیزی سے بچوں کو گھر ڈراپ کررہی تھی۔ جیسے جیسے بچے کم ہوتے جارہے تھے ویسے ویسے وین میں شور بھی کم ہوتا جارہا تھا۔ مگر قریب آنے کے خیال سے مونا کی دل کی دھڑکنیں بھی ڈوبتی جارہی تھیں۔ فریحہ بھی مونا کے چہرے کی اڑی ہوئی سی رنگت دیکھ کر چپ ہوگئی تھی۔ آج اس نے بریک میں ویسے ہی مونا کو کافی سمجھایا تھا اس لیے وہ اب دوبارہ نصیحتوں کا پٹارا نہیں کھولنا چاہتی تھی۔ گھر آنے پر فریحہ اپنی بیٹی کا ہاتھ تھامے اتر گئی۔ اب مونا کے علاوہ اسکول وین میں دو بچے مزید تھے جن کو ڈرائیور اس کے بعد ڈراپ کرتا۔ کچھ سوچ کر مونا نے ڈرائیور سے کہا کہ وہ پہلے ان بچوں کو گھر ڈراپ کردے اور آخر میں وہ اسے ڈراپ کرے۔ وہ صرف یہ چاہتی تھی کہ تھوڑا سا وقت مزید گزر جائے اور اس کا گھر نہ آئے، لیکن آخر کب تک؟ ان دونوں بچوں کو ان کے گھر ڈراپ کرنے کے بعد جب وین گلی میں مڑی تو مونا کو اپنا دل بیٹھتا محسوس ہوا۔ روز کی طرح آخر وہ منحوس گھڑی پھر سے آگئی تھی جب اسے گھر میں داخل ہونا تھا۔

وین اس کی بلڈنگ کے سامنے رکی تو وہ اپنا جگی کرا کرکے وین سے اتری اور آہستہ روی سے اپنے فلیٹ کی سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ اس کا فلیٹ چوتھے فلور پر تھا اور لفٹ کی سہولت میسر تھی لیکن اس نے جان بوجھ کر سیڑھیوں کا راستہ اختیار کیا۔ آرام آرام سے زینہ طے کرنے کے باوجود وہ آخرکار اپنے فلیٹ کے دروازے پر پہنچ گئی۔ اس نے بڑی آس میں ادھر اُدھر نگاہیں دوڑائیں کہ اگر کوئی چڑوسن مل جائے تو اس کے ساتھ تھوڑی دیر باتیں کر کے مزید کچھ لمحے گزار دے لیکن دور دور تک کوریڈور خالی پڑا تھا۔ شدید گرمی کے باعث سب اپنے اپنے گھروں میں گھسے تھے اور معمول جو معمول سے آدھ گھنٹا دیر سے پہنچی تھی اس وقت پسینے سے تر بتر اور شدید تھکن کے باوجود ہاتھ میں فلیٹ کی چابی لیے اس کشمکش و پیچ میں مبتلا تھی کہ اندر جائے یا نہ جائے۔ پھر دل مضبوط کر کے اس نے ہینڈل میں چابی گھمائی اور ہلکی سی کلک کے ساتھ دروازہ کھل گیا۔ وہ ڈرتے ڈرتے اندر داخل ہوئی تو خلاف توقع لاؤنج میں کوئی نہ تھا وہ صد شکر کرتی جلدی جلدی دروازہ بند کر کے اپنے کمرے کی جانب بڑھی تو کچن سے نکلتی اس کی ساس سے اس کا سامنا ہو گیا۔ اس نے سلام کرنے کے لیے منہ کھولا لیکن ہمیشہ کی طرح ان کی کاٹتی ہوئی نظروں اور چہرے پر اپنے لیے نفرت کے تاثرات دیکھ کر چپ ہو گئی اور ان کو نظرانداز کرتی اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر داخل ہوئی اور جلدی سے اسے لاک کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے سینے سے اطمینان بھرا سانس خارج ہوا۔ آج کا مرحلہ بھی بخیر و عافیت طے ہو گیا تھا۔

اس نے دوپٹا اتار کر سائیڈ پر رکھا اور جونہی اس کی نظریں بیڈ پر پڑیں تو اسے احساس ہونے لگا کہ گرمی اور تھکن سے اس کی حالت کتنی بری ہے۔ وہ نہانے کے خیال سے باتھ روم میں گھس گئی۔ نہا کر نکلی تو خیال آیا نماز نہیں پڑھی ہے۔ نماز وغیرہ سے فارغ ہو کر جب وہ لیٹی تو سکون سے اس کی آنکھیں خود بخود بند ہونے لگیں۔ وہ اپنے کمرے کو لاک کر کے مکمل طور پر محفوظ تھی، اب اسے اپنی نڑاکا ساس اور کائیاں چودیور کا سامنا کرنے کی ضرورت نہیں تھی جب تک کہ فیصل کی آفس سے واپسی نہیں ہو جاتی تھی تب تک وہ اپنے کمرے میں مکمل طور پر محفوظ اور آزاد تھی۔ وہ پانچ بجے تک سوتی رہی پھر اٹھ کر اس نے عصر پڑھی۔ اب اسے پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ کمرے میں رکھے جگ میں پانی ختم ہو گیا تھا مگر وہ اتنی ہمت نہیں کر پا رہی تھی کہ کچن

سے پانی پی آئے۔ اس وقت لاؤنج سے ٹی وی چلنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ آوازوں سے اندازہ ہورہا تھا کہ اس کی ساس حسبِ معمول سازشی عناصر سے بھرپور کوئی انڈین ڈراما دیکھنے میں مصروف ہیں۔

پیاس اب ناقابلِ برداشت ہوتی جارہی تھی۔ لامحالہ وہ کمرے کا دروازہ کھول کر کچن میں گئی تو وہاں سے آتی آلو کے چپس کی اشتہا انگیز خوشبو نے اس کی بھوک بیدار کردی۔ فریج کے پاس ہی تازہ تازہ فرائی کیے ہوئے گرما گرم چپس رکھے تھے۔ صبح اسکول میں کھائے ایک سینڈوچ کے علاوہ اس نے اب تک کچھ نہیں کھایا تھا۔ بھوک سے بے تاب ہوکر اس نے بے اختیار چپس کی جانب ہاتھ بڑھایا مگر اسی لمحے کچن کی جانب سے ابھرتی چاپ سن کر اس نے اپنا ارادہ ملتوی کردیا۔ وہ گلاس میں اپنے لیے پانی نکال رہی تھی کہ اس کا دیور سمیر اندر داخل ہوا۔ سونا کو وہاں کھڑا دیکھ کر اس کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات آگئے۔ اس نے فریج میں سے کیچپ کی بوتل نکال کر پلیٹ کے پاس پٹخ دی اور وہیں کھڑے کھڑے موبائل پر اپنی کسی چہیتی کو ایس ایم ایس کرتے ہوئے یوں ظاہر کرنے لگا گویا اس وقت دنیا کے اہم ترین کام میں مصروف ہو۔

سونا اس سے زیادہ برداشت نہیں کرسکتی تھی۔ غصے کی ایک لہر نے اسے بری طرح جھنجھوڑ دیا۔ اس نے جواباً پانی کی بوتل زور سے پٹخی اور اس کے تاثرات دیکھے بغیر اپنے کمرے میں آگئی۔ بھوک، لاچاری اور بے عزتی کے احساس نے اس کا دماغ شل کردیا تھا۔ اپنے ہی گھر میں غیروں کی طرح رہتے اور کمرے کا قیدی بنے یہ اس کا تیسرا سال تھا۔ پچھلے تین سالوں میں خود پر اور فیصل پر بیتنے والی باتیں یاد کرکے بے اختیار اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

اس کی شادی ہوئے تقریباً چار سال گزر چکے تھے۔ پہلا ڈیڑھ سال تو ہنسی خوشی گزر گیا۔ سونا کی ساس کا رویہ بھی اس کے ساتھ اچھا تھا اور ہم عمر ہونے کی وجہ سے دیور کے ساتھ بھی اس کی خوب بنتی تھی۔ اس کی شادی شدہ نند بھی اپنے بچوں کے ہمراہ ہفتے میں ایک سے دو بار ضرور چکر لگاتی۔ وہ لوگ مل جل کر خوب باتیں کرتے اور اس کے بعد وہ کھانا یہیں کھا کر رات گئے اپنے شوہر کے ہمراہ گھر جاتی۔ سونا یہ نہیں جانتی تھی کہ یہ وقتی سکون تھا۔ بہت جلد ان کے چہروں پر لگا یہ منافقت کا نقاب اتر جائے گا اور ان کے حقیقی چہرے جب سامنے آئیں گے تو وہ ہکا بکا رہ جائے گی۔

فیصل دونوں بہن بھائیوں میں بڑے تھے۔ جب وہ محض چودہ سال کے تھے تو ان کے والد کو ہارٹ اٹیک آیا جس سے وہ جانبر نہ ہوسکے۔ اس میں کوئی شک نہ تھا کہ ان کے والد ترکے میں بہت کچھ چھوڑ کر گئے تھے لیکن کچھ ان کی والدہ کی بدانتظامی اور فضول خرچی اور کچھ قریبی عزیزوں اور رشتہ داروں نے موقع سے فائدہ اٹھایا۔ بہت جلد سب کچھ صاف ہوگیا اور یہ لوگ پریشانیوں کی لپیٹ میں آگئے۔ بڑا بیٹا ہونے کے ناتے فیصل نے پڑھائی کے ساتھ ساتھ نوکری کرنی شروع کردی۔ چھوٹا بھائی سمیر اس وقت پہلی جماعت کا طالب علم تھا جبکہ بہن بھی پڑھائی کررہی تھی۔ فیصل نے کم عمر ہونے کے باوجود جواں مردی سے حالات کا مقابلہ کیا اور اپنی زندگی ماں اور بہن بھائیوں کے نام وقف کردی۔

اس کے باوجود ان کی والدہ کبھی بھی ان سے مطمئن نہ ہوئیں۔ جب وہ اپنی پوری تنخواہ لے جا کر ان کی ہتھیلی پر رکھتے تو وہ ہمیشہ طعنہ دیا کرتیں۔ "بیا تنے سے روپے سے کیا ہوگا؟ اتنے خرچے پڑے ہیں!" والدہ کے روز روز کے طعنوں سے زچ آکر بالآخر انہوں نے ٹائٹ شفٹ کے ساتھ ساتھ شام میں بھی ایک انسٹیٹیوٹ میں پارٹ ٹائم نوکری کرلی۔ اب وہ صبح سات بجے فیکٹری سے گھر آتے۔ جلدی جلدی تیار ہوکر کالج جاتے وہاں سے لوٹ کر انسٹیٹیوٹ جاتے پھر وہیں سے فیکٹری نکل جاتے۔ سپروائزر ان کا دوست تھا اس لیے وہ رات کو وہیں فیکٹری میں تین چار گھنٹوں کی نیند لے لیتے ورنہ ان کی والدہ کو اس سے کوئی غرض نہ تھی کہ ان کا بیٹا کن مشکلوں سے پیسے کما رہا ہے۔ انہیں تو بس ہر مہینے آنے والی تنخواہ سے مطلب تھا۔ جس سے وہ اپنی اور اپنی دونوں اولادوں کی خواہشوں کو پورا کرسکیں۔

آہستہ آہستہ فیصل پر بھی اپنی امی کی خودغرضی واضح ہونے لگی۔ اب وہ اکثر اس بات کا برملا اظہار بھی کرنے لگی تھیں کہ فیصل ان کی بڑی اولاد اس لیے ان کا فرض بنتا ہے کہ وہ اپنی بیوہ ماں اور دونوں یتیم بہن بھائیوں کی پرورش کے لیے اپنی زندگی وقف کردے۔ فیصل مزاج کے کچھ تیز واقع ہوئے تھے رہی سہی کسر یکے بعد دیگرے پڑنے والی مصیبتوں نے پوری کردی۔ گھر میں وہ اکثر اپنی والدہ کی اس خودغرضی پر ان سے بحث کر بیٹھتے۔ ان کی والدہ اور بہن تو بس ہمیشہ سے ہی لڑنے کے لیے موقع کی تاک میں رہا کرتی تھیں۔ دونوں ماں بیٹی مل کر ان کے خلاف محاذ کھول لیتیں۔ گھر میں وہ غل مچ کر اماں، نتیجتاً چند دنوں کے لیے

ان کی اپنے گھر والوں سے بات چیت بند رہتی مگر وہ چونکہ تیز مزاج ہونے کے ساتھ ساتھ دل کے انتہائی نرم بھی واقع ہوئے تھے اسی لیے جلدی وہ اپنی والدہ کو منا لیتے۔

اسی طرح لڑتے جھگڑتے اور روٹھتے مناتے انہوں نے ایک کماتے پیچے گھرانے میں اپنی بہن کی شادی کردی۔ بہن اپنے گھر کی ہوئی تو فیصل کو احساس ہوا کہ کتنا وقت گزر چکا ہے۔ اس وقت تک انہوں نے بی ایس سی بھی مکمل کرلیا تھا اور اب ایک اچھی فرم میں ملازمت کررہے تھے۔ تنخواہ تو اس زمانے کے لحاظ سے اچھی تھی مگر ان کی والدہ کی شاہ خرچیوں کی بدولت بچت نہیں ہو پاتی تھی۔ اسی دوران میں فیصل کا کوئی دوست کینیڈا گیا تو ان پر بھی سوچ کے نئے در وا کرگیا۔ انہوں نے اس سے معلومات لے کر خود بھی ویزا کے لیے اپلائی کرنے کی ٹھانی۔ غلطی ان سے یہ ہوئی کہ جوش جذبات میں آکر اپنی والدہ سے اس کا ذکر کردیا۔ پھر کیا تھا، گھر میں بھونچال آگیا۔ ان کی والدہ واویلا کرنے لگیں، ایسے رونے لگیں جیسے بیٹا کینیڈا نہیں بلکہ سر پر کفن باندھ کر افغانستان جارہا ہو۔ انہیں اس بات کا قلق تھا کہ بیٹے نے ان سے پوچھے بغیر اتنا بڑا فیصلہ کیسے کرلیا۔ ان کی محدود سوچ یہ تھی کہ اگر وہ ایک مرتبہ کینیڈا چلا گیا تو ترقی کرکے کہیں سے کہیں پہنچ جائے گا اور بہت ممکن ہے کہ پیچھے میں اپنی بہن کی پیروی کرنے لگے۔ یہاں وہ اپنے چھوٹے بیٹے کے ساتھ اکیلی رہ جائیں گی جبکہ وہ کینیڈا میں اچھی زندگی گزارے گا۔

بہت سے قارئین شاید یقین نہیں کریں گے مگر المیہ یہ ہے کہ اس طرح کے خود غرض کردار واقعی آج کل کے زمانے میں موجود ہیں۔ ماں جسے ممتا اور رحمت کی ٹھنڈی چھاؤں کہا جاتا ہے اور جو اپنی آغوش میں اولاد کی ساری پریشانیاں سمیٹ لیتی ہے وہی اگر خود غرضی اور مادہ پرستی پر اتر آئے تو اپنی اولاد کو ایسے ایسے چرکے دیتی ہے کہ یقین کرنے کو دل نہیں چاہتا مگر کیونکہ یہ ایک سچی سرگزشت ہے اسی لیے لامحالہ میری طرح آپ کو بھی اس پر یقین کرنا ہی ہوگا۔

فیصل نے انہیں بہت سمجھایا، اپنے اور ان کے درخشاں مستقبل کے خواب دکھائے مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئیں۔ بہن کو اطلاع ہوئی تو وہ بھی ماں کی حمایت میں دوڑی چلی آئی اور دونوں نے مل کر فیصل کو بے نقط سنائیں کہ انہوں نے ایسا مذموم ارادہ کیا بھی کیسے جبکہ وہ جانتے تھے کہ ان کے بغیر ان کی والدہ ان کے اٹھارہ سالہ کم عمر بھائی کے ساتھ کس طرح کسمپرسی کی زندگی گزارتیں۔ ناچار فیصل نے اپنا ارادہ ترک کردیا تو ان لوگوں کو قرار آگیا۔ کچھ عرصہ بعد فیصل کو ایک اچھی جگہ نوکری مل گئی جہاں ملازمین کو تنخواہ کے علاوہ بونس اور دیگر مراعات بھی دی جاتی تھیں۔

گھر میں جس طرح بے حساب پیسا آنے لگا اسی بے دردی سے خرچ بھی کیا جانے لگا۔ ہر ماہ فیصل اپنی تنخواہ کا بڑا حصہ والدہ کے ہاتھ پر ان کے ذاتی خرچ کے نام پر رکھ دیتے۔ اس کے علاوہ فلیٹ کا کرایہ، ٹیلیفون، بجلی، پانی و گیس کے بلز اور گھر میں سودا سلف ڈلوانے کی ذمہ داری مکمل طور پر فیصل کی ہی تھی۔

والدہ کی شاہ خرچیوں کی سب سے معمولی مثال یہ تھی کہ کھانے کے وقت گھر پر کوئی مہمان آجاتا تو بڑی شان سے فیصل سے فرماتیں۔ "ہم انہیں لے کر گلشن کے اسی ریسٹورنٹ چلتے ہیں جہاں کا باربی کیو تمہیں بہت پسند ہے۔" اس ریسٹورنٹ میں ملنے والی معمولی سے معمولی ڈش کی قیمت بھی آٹھ سو سے شروع ہوتی تھی۔ فیصل اپنی امی کے اس فیصلے کو رد کسی چوں چرا کے مان جاتے کیونکہ انہیں اپنی والدہ کی خوشیاں بے حد عزیز تھیں۔ وہ لاکھ خود غرضی جتاتیں مگر یہ اپنی عادت سے مجبور ان سے بے پناہ محبت کیے جاتے اور ان کی یا اپنے بھائی کی ذرا سی تکلیف پر بے قرار ہوجاتے۔

ان کا بھائی سمیر اب تعلیمی طور پر بچہ نہیں رہا تھا۔ وہ جب اس کی عمر کے تھے تو ایک دن میں دو دو نوکریاں بھگتا رہے تھے لیکن انہوں نے کبھی اسے یہ احساس نہیں ہونے دیا تھا۔ اب وہ بھی گھر پر بیٹھ کر بیٹھ توڑنے کی بجائے کمانے میں ان کا ساتھ دے بلکہ ان کی حتی المقدور یہی کوشش تھی کہ وہ اسے زیادہ سے زیادہ مراعات دیں اور اسے ان پریشانیوں کا سامنا نہ کرنا پڑے جن سے وہ گزر رہے تھے۔ گھر پر پڑے پڑے وہ بالکل نکھٹو ہوگیا تھا۔ اس کا کام فون پر لڑکیوں سے لمبی لمبی باتیں کرنے کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ وہ دن بھر گھر پر پڑا رہتا لیکن باہر کا کوئی کام کرتے اسے موت پڑتی۔

گھر کا سارا کام حتیٰ کہ چھٹی والے دن دیواروں سے جالے اتارنے اور پنکھے صاف کرنے کی ذمہ داری بھی فیصل کی تھی۔ ایک مرتبہ ویکیوم کلینر خراب ہوگیا، والدہ نے فیصل سے کہا کہ اسے ٹھیک کروادیں انہوں نے حیرت سے اپنی والدہ سے کہا۔ "امی، میں کتنے بجے گھر آتا ہوں یہ آپ کے سامنے ہے۔ آفس سے آکر یہ کام بھی میں کروں؟ آپ سمیر سے کیوں نہیں کہتیں وہ تو دن بھر گھر پر ہی ہوتا ہے۔"

ان کے اس جواب کا انہوں نے سخت برا منایا اور تین دنوں تک فیصل سے یہ کہہ کر بات چیت بند رکھی کہ چھوٹے بھائی کے لیے ان کے دل میں کتنی کدورت ہے۔ آخر کار یہ کام دفتر سے چھٹی لے کر انہیں ہی کرنا پڑا۔ اس واقعے کے اگلے ہی مہینے جب ٹیلیفون کا چیختا چنگھاڑتا بل آیا تو فیصل کے ہوش اڑ گئے۔ انہوں نے سختی سے سمیر سے اس بل کی بابت پوچھا ۔۔۔ تو وہ بالکل معصوم بن گیا البتہ ہمیشہ کی طرح والدہ اسے بچانے کے لیے آگے آئیں اور فیصل کو بے نقط سنائیں کہ ان کی اتنی جرأت کیسے ہوئی کہ اس بن باپ کے بچے سے اس طرح کے سوالات کریں۔ اس معصوم نے اپنی زندگی میں کون سی خوشیاں دیکھی ہیں جواب کوڑی کوڑی کے لیے اپنے بھائی کے سامنے جوابدہ ہو۔ فیصل نے اپنا غصہ ضبط کر کے انہیں سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ پیسوں کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کے بھلے کے لیے اس پر سختی کر رہے ہیں کہ یہ رات گئے تک کس سے ٹیلیفون پر لگا رہتا ہے اور ان کے پیچھے دن بھر اس کی کیا مصروفیات رہتی ہیں جو وہ گھر کا کوئی کام کرنے کا اہل نہیں ہوتا مگر والدہ نے سمیر کو تنبیہہ کرنے کی بجائے الٹا فیصل کو ہی درشتی سے نہ صرف اپنے کام سے کام رکھنے کی تاکید کی بلکہ آئندہ گھریلو معاملات میں بولنے سے منع کر دیا۔ اس واقعہ کے بعد انہوں نے اپنے لاڈلے بیٹے کو موبائل دلوا دیا تاکہ بڑے بھائی کی محتاجی نہ رہے۔ یہ الگ بات تھی کہ اس کے لیے کارڈ کے پیسے وہ فیصل سے ہی لیا کرتا۔

ان حالات کو دیکھتے ہوئے اکثر فیصل کے دل میں یہ خیال آیا کرتا کہ انہیں گھر میں صرف پیسا کمانے کی مشین سمجھا جاتا ہے کیونکہ والدہ کی شہہ پر دونوں چھوٹے بہن بھائی ان کے منہ کو آتے تھے اور بڑے بھائی کا لحاظ کیے بغیر ان سے بدتمیزی کرتے تھے اور ماں بجائے ان کو سمجھانے کے الٹا ان کی آواز میں آواز ملا کر ان کا ساتھ دیتیں۔ اب تک وہ عمر کی بیس بہاریں دیکھ چکے تھے لیکن ان کی والدہ نے سوائے ایک دو بار سرسری طور پر ان کی شادی کا ذکر کرنے کے علاوہ کوئی عملی دلچسپی نہیں دکھائی تھی۔ جب فیصل نے گھر کے معاملات میں بولنا ختم کر دیا تو ان کی والدہ نے اپنی توجہ بیٹی پر مرکوز کر دی جو سسرال میں ماشاءاللہ ان کا نام خوب روشن کر رہی تھی۔ آئے روز کے جھگڑوں نے نہ صرف داماد کی زندگی جہنم بنائی ہوئی تھی بلکہ اس سے تو اس کے سسرال اور یہاں تک کہ محلے والے بھی پناہ مانگتے تھے۔ کوئی دن ایسا نہ گزرتا تھا جب اس کا کسی سے جھگڑا نہ ہوا ہو۔ حد تو یہ تھی کہ نابیہ کا نام سن کر خود ان کے خاندان والے بھی کانوں کو ہاتھ لگاتے ۔۔۔ ان کی کوشش یہ ہوتی کہ تقریبات میں ان ماں بیٹیوں کو کم سے کم بلایا جائے تاکہ وہ بغیر کسی بدمزگی کے خیر و عافیت ختم ہو جائیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ نابیہ نے جھگڑوں اور گھریلو سازشوں میں اپنی ماں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا تھا۔

شروع شروع میں جب مونا کی ساس اس کے سامنے بڑی لاچاری سے یہ کہتیں کہ میاں کی موت کے بعد میرے اپنے بہن بھائیوں نے بھی مجھ دکھیاری کا ساتھ چھوڑ دیا تو اس کا مہربان دل فوراً پسیج جاتا اور وہ بڑی محبت سے ان کا ہاتھ تھام کر کہتی۔ "نہیں آنٹی ما آپ ایسا کیوں ... سوچتی ہیں۔ ان کا ساتھ چھوڑنے سے کیا ہوتا ہے، اللہ ہی سب کا حامی اور مددگار ہوتا ہے۔ آپ کے لیے میں اور فیصل موجود ہیں نا پھر آپ دنیا کی فکر کیوں کرتی ہیں۔" اور ساس بڑی دیر تک خلاؤں میں نجانے کیا تلاش کرتی رہ جاتیں۔

فیصل اور مونا کی شادی کیسے ہوئی یہ ایک الگ کہانی ہے۔ ان دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور پہلی نظر میں ایک دوسرے کو پسند کر لیا تھا۔ گو مونا کے گھر والوں نے فیصل کے گھر کا ماحول دیکھتے ہوئے اس شادی کی مخالفت کی تھی مگر مونا نے ان کے فیصلے سے اختلاف کرتے ہوئے فیصل سے شادی کی تھی۔ خود فیصل کی والدہ اور بہن بھائیوں نے اس میں صرف شرکت کا فرض پورا کیا تھا۔ اتنا عرصہ نوکری کرنے اور فیصل کا اپنی والدہ کو ہر ماہ بھاری رقم دینے کے باوجود یہ عالم تھا کہ ان کے پاس بہو کو چڑھانے کے لیے سونے کی ایک بالی تک نہ تھی۔ یہاں تک کہ بری بھی وہ صرف خانہ پری کے لیے لے کر آئی تھیں۔ اس سے اچھی تیاری تو مونا نے اپنے گھر کام والی ماسی کو اپنے بیٹے کے لیے کرتے دیکھی تھی۔ فیصل کی والدہ تو بس اپنے بیٹے کی ضد پر جی کڑا کر کے اسے بہو بنا کر لے گئی تھیں ورنہ اگر ان کا بس چلتا تو ابھی مزید دس سال وہ اس ڈر سے فیصل کی شادی نہ ہونے دیتیں کہ بہو آئے گی تو بیٹے کی آمدنی بٹ جائے گی۔ مونا یہ سب دیکھ کر کڑھتی تھی لیکن شادی کا فیصلہ اس کا ذاتی تھا اس لیے کچھ بول بھی نہ سکتی تھی۔ اس کی سہیلیوں نے اس کی سستی سی بری کا خوب مذاق بنایا لیکن اس نے صبر سے سارے آنسو اپنے اندر ہی اتار لیے۔

فیصل نے شادی کے بعد اس پر یہ ثابت کر دیا کہ اس کا فیصلہ غلط نہ تھا۔ وہ اس سے بے تحاشا محبت کرتے تھے اور بدلے میں اس سے بھی صرف محبت کے طلبگار تھے۔ مونا ان

کی وارفتگی پر پھولے نہ سماتی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی محبت میں کمی آنے کی بجائے شدت آتی جا رہی تھی۔ فیصل بچپن ہی سے محبتوں کے متلاشی تھے۔ ماں اور بہن بھائیوں سے انہوں نے ہمیشہ دل سے محبت کی اور ان کے چہروں پر خوشیاں بکھیرنے کے لیے کئی مرتبہ اپنے ارمانوں کا گلا گھونٹ دیا مگر بدلے میں انہیں ہمیشہ طعنے اور دھتکار ملی اس لیے جب انہیں سونا جیسی مخلص شریک حیات کا ساتھ ملا تو وہ دوبارہ جی اٹھے۔

ہر گھر میں چھوٹے موٹے جھگڑے ہوتے ہی رہتے ہیں اس لیے شروع میں سونا نے بھی ان گھریلو چپقلشوں کو زیادہ اہمیت نہ دی۔ کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ اس کی ساس اور اس کے نکھٹو دیور نے ساتھ مل کر ان دونوں میاں بیوی پر بلاوجہ معمولی بات کا بتنگڑ بنا کر ٹھیک ٹھاک چڑھائی کر دی مگر سونا ہمیشہ اس توتو میں میں کے بیچ بالکل خاموش رہی۔ فیصل نے جب سونا کو ان ماں بیٹے کا تختۂ مشق بنا دیکھا تو انہوں نے اس کی صفائی میں کچھ جملے بول دیے۔ اس بات پر تو دونوں کے پتنگے لگ گئے کہ جو جورو آٹھ دن کی آئی ہوئی ہے اس کے لیے برسوں کا ساتھ دینے والے ماں اور بھائی کے خلاف کیسے اٹھ کھڑا ہوا۔ انہوں نے زبردستی سونا کو بھی بے بھاؤ کی سنا دیں۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ وہ بھی انہیں کچھ بول کر میاں کی نظروں میں بری بنے مگر مجال ہے جو اس نے ایک لفظ بھی منہ سے نکالا ہو۔ خاموشی سے بیٹھی ان کی الزام تراشیوں کو برداشت کرتی رہی۔ جب ساس نے دیکھا کہ سونا نے انہیں چپ کی مار دینے کی ٹھان لی ہے تو اسے گھنی اور میسنی جیسے القابات سے نوازتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

ایک روز فیصل میٹھے پان لیتے آئے۔ ان کی امی بھی پان شوق سے کھاتی تھیں۔ انہوں نے کمرے میں آ کر سونا کو یہ کہہ کر پیکٹ دے دیا کہ اس میں سے امی کو بھی پان دے دینا اور خود نہانے چلے گئے۔ سونا اس وقت کپڑے استری کر رہی تھی اسی لیے وہ پان وہیں رکھے رہ گئے۔ رات کو کھانے کے بعد فیصل کو پان یاد آئے تو انہوں نے سونا سے پوچھا۔ سونا سر پر ہاتھ مار کر جلدی سے کمرے میں بھاگی اور پیکٹ لا کر میاں کو دے دیا۔ انہوں نے اس میں سے پان نکال کر اپنی امی کو دیے اور ایک پان سونا کو بھی تھما دیا۔ سونا نے تو اسی وقت وہ پان کھا لیا البتہ اس کی ساس نے اپنے پان سائیڈ پر رکھ دیے اور ٹی وی دیکھتی رہیں۔ فلم دیکھتے دیکھتے فیصل نے انہیں دو مرتبہ یاد دلایا کہ امی پان کھا لیں ورنہ سونے سے پہلے کھائیں گی تو کہیں گلا نہ پکڑ لے۔ ساس ہاں ہوں کرتی رہیں مگر پانوں کو ہاتھ تک نہ لگایا۔ آخر جب فلم ختم ہوئی تو انہوں نے اٹھتے ہوئے وہ پان وہیں چھوڑ دیے۔ فیصل نے حیرت سے کہا۔ ”امی آپ نے ابھی تک پان نہیں کھائے؟“ ان کا اتنا کہنا تھا کہ وہ ایک دم بھڑک کر بولیں۔ ”مجھے نہیں کھانے یہ سفلی والے پان، پتا نہیں تمہاری بیوی نے اس پر کیا پڑھ کر دم کیا ہو۔ تم ہی کھا لو!“ اتنا کہہ کر وہ ان دونوں کو حیران پریشان چھوڑ کر اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ سونا نے شکوہ بھری نظروں سے فیصل کی جانب دیکھا تو وہ بھی بیچارگی سے کندھے اچکا کر رہ گئے۔ سونا کی عادت تھی کہ وہ پابندی سے عصر کی نماز پڑھنے کے بعد چاروں قل اور آیت الکرسی پڑھ کر گھر کے چاروں کونوں پر رحمت اور دافع بلیات کے خیال سے دم کر دیا کرتی اور کبھی کبھی پانی پر پڑھ کر کمروں کے کونوں پر اس کا چھڑکاؤ کر دیا کرتی۔ ساس نے سونا کے اس عمل کو بھی کالے جادو اور سفلی سے منسوب کیا تو تنگ آ کر اس نے یہ بھی چھوڑ دیا۔

ساس خود تو نماز اور روزوں کی بھی قائل نہ رہی تھیں، اپنے بچوں کی تربیت بھی انہوں نے اسی خطوط پر کی تھی۔ شادی کے بعد سونا کے لیے یہ سب کچھ حیرت انگیز ہونے کے ساتھ ساتھ انتہائی افسوسناک بھی تھا کہ رمضانوں کا بابرکت مہینا ہو یا جمعہ کا مبارک دن، گھر والوں کی وہی روش برقرار رہتی۔ ایسا لگتا ہی نہیں تھا کہ یہ ایک مسلمان گھرانا ہے۔ رمضانوں میں اطمینان سے کھایا پیا جاتا اور یہ سوچنے کی تکلیف بھی گوارا نہ کی جاتی کہ بلا عذر روزے چھوڑ کر وہ نہ صرف رحمتِ خداوندی کو ٹھکرا رہے ہیں بلکہ گناہِ عظیم کے بھی مرتکب ہو رہے ہیں۔ اس کے بہت سمجھانے بجھانے پر فیصل اب جمعہ اور عید بقرعید کی نمازوں کا اہتمام کر لیا کرتے مگر انہیں نماز اور روزوں کا عادی بنانے کے لیے ابھی اسے کافی محنت درکار تھی مگر وہ پُرعزم تھی کہ ان شاء اللہ آہستہ آہستہ انہیں سیدھی راہ پر لے ہی آئے گی۔

چند دنوں سے سونا کو اپنی طبیعت کچھ ناساز لگ رہی تھی۔ اس نے فیصل سے ڈاکٹر کے پاس لے جانے کی بات کی تو انہوں نے اس کی بے خبری میں آفس جانے سے پہلے اپنی امی سے اس کا تذکرہ کر دیا۔ ان کے آفس جانے کے کچھ دیر بعد جب وہ کچن میں کھڑی ناشتا بنا رہی تھی تو ساس تن فن کرتی ہوئی اس کے سر پر آ کھڑی ہوئیں۔ ”فیصل مجھے بتا رہا تھا کہ تم نے ڈاکٹر کے پاس جانے کی بات کی ہے۔ دیکھو

بی بی! اگر کوئی خوشخبری ہوئی تو مجھے بتاؤ پھر ڈاکٹر کے پاس لے چلیں گے تمہیں، ورنہ بیکار میں جا کر پیسوں کو کیوں آگ لگا رہی ہو۔"

موناکو ان کے اس انداز پر غصہ تو بہت آیا مگر وہ برداشت کر کے بولی۔ "آنٹی اس معاملے میں، میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ یہ تو چیک اپ کے بعد ڈاکٹر ہی بتائے گی۔"

ساس درشتی سے بولیں۔ "فضول باتیں مت کرو! اگر تمہیں پتا نہیں ہو گا تو کیا مجھے پتا ہو گا؟ اتنی معصوم کیوں بن رہی ہو؟ بہرحال ڈاکٹر کے پاس جانے کی ابھی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" اپنی بات مکمل کر کے وہ جس طرح آئی تھیں ویسے ہی واپس چلی گئیں۔

مونا ان کی باتوں پر دل ہی دل میں پیچ وتاب کھا کر رہ گئی۔ دل میں تو آ رہا تھا کہ صاف بول دے۔ "آنٹی میری شادی کو ابھی محض چھ ماہ کا عرصہ بیتا ہے اور شادی سے پہلے مجھے بچے پیدا کرنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا اسی لیے مجھے نہیں علم کہ آپ مجھ سے تجربہ کاری کی کون سی باتیں سننا چاہ رہی ہیں۔" مگر یہ الفاظ اس نے واپس اندر ہی اتار لیے اور ہمیشہ کی طرح اپنا غصہ پی گئی۔

گھر میں ہونے والے جھگڑوں میں اب روز بروز اضافہ ہی ہوتا جا رہا تھا۔ مونا کو اکثر اپنے اعصاب شل ہوتے محسوس ہوتے، خاص طور پر جب سمیر بھی نسوانی انداز میں اپنے ماں کے ساتھ تانیں بھینچ بھینچ کر فیصل سے لڑتا تو اسے کوفت ہونے کے ساتھ ساتھ ہنسی بھی آ جاتی۔ حالانکہ موصوف مارے باندھے بی کام کرنے کے بعد اب اس قابل تھے کہ بھائی کا سہارا بنتے کوئی چھوٹی موٹی نوکری ہی کر لیتے مگر ساس نے اسے بگاڑنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ اب وہ رات بھر اپنے موبائل میں گھسا نائٹ پیکجز کا بہترین استعمال کرتا ہوا اپنی ان گنت سم کے ذریعے ان گنت گرل فرینڈز کے ساتھ باتوں میں مصروف رہتا۔

ظاہر ہے جب بندہ رات بھر جاگے گا تو دن میں تو سوئے گا ہی، چنانچہ وہ لاٹ صاحب کی طرح دوپہر تک بیدار ہوتے۔ اماں بڑی محبت سے اپنے شہزادے کے لیے ناشتا بنا کر لاتیں جو وہ وہیں بیڈ پر بیٹھے بیٹھے تناول فرماتے۔ اس کے بعد وہ واپس اپنا موبائل تھام کر دراز ہو جاتے اور اپنے پسندیدہ مشغلے میں مصروف ہو جاتے، اگر کبھی ایسا اتفاق ہوتا کہ ان کی تمام گرل فرینڈز مصروف ہوتیں تو وہ اپنی امی کے ساتھ خاندانی سیاست پر بحث فرمانے لگتے اور انہیں اپنے بڑے بیٹے اور بہو کو قابو میں کرنے کی نت نئی ترکیب سے آگاہ کرتے۔ مونا کو کبھی کبھی اپنی ساس پر سخت حیرت ہوتی تھی کہ ان کو سمیر کے بگڑنے اور اس طرح وقت ضائع کرنے کی کوئی پروا نہ تھی۔ وہ دن رات ان کے پہلو سے چپکا یا تو ایس ایم ایس میں مصروف رہتا یا پھر ان کے ساتھ بیٹھ خاندان بھر کی غیبتیں کرتے۔ اسے خود بھی اس بات کی کوئی پروا نہ تھی کہ وہ اپنی بہترین عمر کو اس طرح گھر میں پڑے پڑے ضائع کر رہا ہے۔ فیصل کے بے انتہا زور دینے پر اس نے ایک ٹیکنیکل کورس کے لیے اپنا نام رجسٹر کرا لیا۔ ایڈمیشن فیس اور ماہانہ بھاری فیس کی ذمہ داری بھی ظاہر ہے فیصل کی تھی مگر سمیر نے وہ بھی ڈھنگ سے کرکے نہ دیا۔ جس دن کلاسز ہوتیں اس روز بہانہ بنا کر گھر میں پڑا رہتا یا پھر ادھر گھوم کر واپس آ جاتا۔ چار ماہ تک وہ پابندی سے فیس کے پیسے فیصل سے لیتا رہا مگر جب سرٹیفکیٹ ملنے کا وقت آیا تو آئیں بائیں شائیں کرنے لگا۔ فیصل نے زیادہ باز پرس کی تو حسب عادت اور حسب تربیت زبان درازی کرنے لگا۔ فیصل کو اندازہ ہو گیا کہ بھائی نے صرف پیسوں کو آگ لگائی ہے تو انہوں نے ہمیشہ کی طرح اپنے پیسوں پر فاتحہ پڑھ لی۔ اگر ملنے جلنے والے سمیر سے نوکری کے بارے میں سوال کرتے تو وہ بڑے مزے سے کہہ دیتا۔ "انکل آج کل تو کوکا کولا میں ملازمت چل رہی ہے۔ بس صبح کا گیا رات کو لوٹتا ہوں۔" فیصل اور آنٹی تو خیر شروع ہی سے اس کی ان شیخیوں کے عادی تھے البتہ مونا اس سفید جھوٹ پر ہر مرتبہ ششدر رہ جاتی۔ کبھی فیصل بھولے سے بھائی کی محبت میں آ کر اسے نوکری کرنے کی نصیحت کر بھی دیتے تو ساس ان کے ایسے لتے لیتیں کہ وہ کتنے دنوں تک ان دونوں سے بات چیت بند کر دیتے۔

سمیر کی حرکتیں نا قابل برداشت تھیں۔ وہ ایس ایم ایس میں اتنا مگن رہتا کہ اسے اپنے اردگرد کا کچھ ہوش نہ رہتا تھا۔ کبھی وہ چولہے پر چائے رکھ کر بھول جاتا، چائے کا پانی کھولتے کھولتے سوکھ جاتا یا چائے پک پک کر پینے کے لائق نہ رہتی۔ پھر وہ آتے، نئے سرے سے چائے چڑھاتے اور اگر دوسری بار یاد رہتا تو چائے ٹائم پر اتر جاتی ورنہ وہی مرحلہ دوبارہ دہرایا جاتا۔ اکثر وہ اتنا گم ہوتا کہ چولہا بند کرنا بھول جاتا۔ کبھی فریج کا دروازہ کھلا رہ جاتا تو کبھی فلیٹ کے دروازے کے باہر ہی چابیاں لگی چھوڑ آتا۔ مونا اور فیصل یہ دیکھ دیکھ کر کڑھا کرتے مگر اسے کچھ کہنا اپنی شامت کو دعوت

دینے کے برابر تھا۔ فیصل نے تو تنگ آ کر اب اس کے منہ لگنا ہی چھوڑ دیا تھا۔

روز روز کی چخ چخ سے تنگ آ کر سونا نے ایک نجی اسکول میں پڑھانا شروع کر دیا۔ اب اس کا آدھا دن تو وہیں گزرتا پھر گھر پہنچنے پر وہ اتنی تھکی ہوئی ہوتی کہ ان مسئلوں پر سوچنے کے لیے اس کے پاس وقت ہی نہیں ہوتا۔ ساس تو یقیناً اس اضافی کمائی سے بہت خوش تھیں۔ ویسے بھی ہر ماہ فیصل سے پندرہ سے بیس ہزار لینے کے باوجود مہینے کے آخری دنوں میں تنگی کا رونا روتے ہوئے مزید پیسے لیتیں جبکہ ان کے ذمہ صرف گوشت اور سبزیاں لانے کی ذمہ داری ہوتی، سمیر الگ حیلوں بہانوں سے پیسے بٹورا کرتا بلکہ اسے تو سونا سے بھی پیسے مانگنے میں کبھی شرم محسوس نہ ہوتی۔ فیصل کو جب علم ہوتا کہ اس نے سونا سے پیسے لیے ہیں تو ان کا پارہ چڑھ جاتا مگر سمیر کے حق میں آگے بڑھ بڑھ کر بولتیں اپنی امی کے سامنے انھیں چپ ہو جانا پڑتا۔ ابھی تک گھر کا ماحول ایسا تھا کہ گزارا ہو رہا تھا لیکن ایک دن کچھ ایسا ہوا جس نے سونا اور فیصل کی زندگیوں میں زہر گھول دیا اور انسانی رشتوں کی ایک اور ناقابل یقین مثال قائم ہو گئی۔

بات معمولی سی تھی۔ اس روز سونا کی نند مع اپنے بچوں کے ساتھ آئی ہوئی تھی۔ جب سونا تھکی ہاری اسکول سے گھر پہنچی تو اسے علم ہوا۔ اس وقت تک وہ لوگ دوپہر کا کھانا کھا چکے تھے۔ اس نے شام کو فریزر چیک کیا تو علم ہوا کہ رات کے کھانے کے لیے گوشت ناکافی تھا۔ سمیر کو کہنا تو بیکار تھا اور اسے خود دکانوں پر جانے کی عادت نہ تھی۔ اس نے فیصل کو فون کیا تاکہ وہ آفس سے آتے ہوئے سامان لے آئیں۔ فیصل نے یہ کہتے ہوئے اسے کھانا پکانے سے منع کر دیا کہ وہ آج آتے ہوئے۔ سب کی من پسند نہاری لیتے آئیں گے۔ یہ سن کر سونا نے سکون کا سانس لیا کیونکہ خود اس کی بھی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ وہ اتنی گرمی اور تھکن کے باوجود کچن میں گھس جائے۔ ساس نے جب دیکھا کہ سونا اب تک کچن میں نہیں گئی تو انہوں نے اس کے بیٹھے رہنے کی وجہ پوچھی۔ سونا نے انھیں بتایا کہ فیصل نہاری لیتے... آئیں گے تو سدا کی چٹوری اس کی ساس اور نند خوش ہو گئیں اور بڑی شدومد سے رات کے کھانے کا انتظار ہونے لگا۔ رات کو فیصل اور اس کے نندوئی فراز بھائی کی آمد ساتھ ہی ہوئی۔ سونا نے جلدی جلدی دسترخوان لگا کر نہاری سرو کی۔ مسئلہ یہ تھا کہ سونا کو بچپن ہی سے بیف اور مٹن یا اس سے بنی ڈشز پسند نہ تھیں۔ اسی لیے فیصل خیال سے اس کے لیے ایک پلیٹ چکن بریانی لیتے آئے تھے تاکہ وہ بھوکی نہ رہ جائے۔ کھانا شروع کرنے تک کسی نے اس سے یہ نہ پوچھا کہ وہ کیا کھائے گی۔ سونا جب کچن میں کھڑی بریانی کو ڈش میں نکال رہی تھی تو فیصل بھی آ گئے۔ اسے ڈش میں بریانی نکالتے دیکھ کر وہ چونک گئے۔ جواباً سونا نے کہا کہ اس طرح اکیلے کھاتے اچھا نہیں لگے گا اسی لیے وہ ڈش میں نکال رہی ہے تاکہ سب تھوڑی تھوڑی چکھ لیں۔ فیصل ہنس پڑے کہ ایک پلیٹ بریانی کو اگر سب چکھنے بیٹھ گئے تو پھر اسے کچھ نہیں ملے گا۔ انھوں نے تیقن سے کہا کہ سب کے لیے ان کی پسندیدہ... نہاری موجود ہے اسی لیے بریانی وہ کھا لے، کوئی اعتراض نہیں کرے گا۔

دسترخوان پر سب انہی کا انتظار کر رہے تھے۔ جب سونا بریانی کی پلیٹ لے کر بیٹھی تو ناہید نے گہری نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔ اس نے فوراً نند کو بریانی آفر کر دی لیکن اس نے یہ کہہ کر منع کر دیا کہ نہیں یہ تو فیصل بھائی تمہارے لیے لائے ہیں۔ سونا کو اس کا یہ انداز تھوڑا سا کھٹکا مگر اس نے نظر انداز کر دیا۔ اس روز نہاری معمول سے کہیں زیادہ مزیدار تھی اسی لیے منٹوں میں درجن بھر سے زیادہ تندور کی روٹیاں صاف ہو گئیں۔ اس کے بعد بچے کھیل کود میں لگ گئے جبکہ سونا برتن وغیرہ دھو کر کچن میں ہی کھڑی چائے بنا رہی تھی کہ جب اسے ساس کے کمرے سے ان کے اور ناہید کے زور زور سے بولنے کی آوازیں آنے لگیں۔ ابھی وہ ان آوازوں پر غور کر ہی رہی تھی کہ سمیر اور فیصل کی بھی آپس میں بحث کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ سونا دل ہی دل میں جل تو جلال تو کا ورد کرتی ہوئی چائے کی ٹرے تھامے کمرے میں داخل ہوئی تو اسے فراز بھائی اپنا سر تھامے بیٹھے نظر آئے جبکہ اس کی ساس، نند اور دیور نے مل کر فیصل اور سونا کے خلاف محاذ گرم کر رکھا تھا۔ وجہ انتہائی معمولی سی بریانی کی ایک پلیٹ تھی۔ ناہید چیخ چیخ کر فیصل سے کہہ رہی تھی۔ ”تم اور تمہاری بیوی کو تو مہمانی کی بھی تمیز نہیں۔ ہمیں تو جھوٹا کھانا کھلا دیا جبکہ اپنی بیوی کے لیے بریانی لیتے آئے۔ ہم تو تمہارے لیے کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتے۔“

اس کا یہ سفید جھوٹ سن کر سونا تو ہکا بکا رہ گئی۔ فیصل نے تیز لہجے میں کہا۔ ”وہ نہاری جھوٹی کس طرح تھی؟ تم لوگوں کے سامنے لایا ہوں اور جب تم لوگوں کو علم ہے کہ سونا گوشت نہیں کھاتی تو اس کو کیا بھوکا مرنے کے لیے چھوڑ دیتا؟“

آنٹی یہ سن کر فوراً اپنی کی مدد کو آ گئیں۔ "اگر تم بریانی لے کر آئے بھی تھے تو سب کے لیے لانی چاہیے تھی۔ غضب خدا کا! بیگم کی ایسی چاکری تو ہم نے نہ کبھی دیکھی نہ سنی۔"

فیصل تلملا کر بول پڑے۔ "امی! آپ بھی غلط بات میں ناہید کا ساتھ دے رہی ہیں؟ میں تو آپ لوگوں کے خیال سے ہی بریانی لے کر آیا تھا کیونکہ آپ بڑے دنوں سے فرمائش کر رہی تھیں۔ پھر یہ بھی شوق سے کھاتے ہیں۔ یہ ہم پر جھوٹے الزامات لگا رہی ہے۔ اور آپ ہیں کہ اس کا ہی ساتھ دے رہی ہیں۔ آپ بتائیں کہ کب میں نے یا سونا نے آج یا آج سے پہلے اسے باسی یا اپنا جھوٹا کھلایا ہے؟"

جواب میں ناہید ہاتھ نچا نچا کر لڑنے لگی۔ "امی سے کیوں پوچھ رہے ہو، میں سامنے کھڑی ہوں۔ مجھ سے بات کرو! اگر بہن کا آنا اتنا ہی برا لگتا ہے تو آئندہ سے میں اس گھر میں قدم نہیں رکھوں گی۔ مجھے اپنی اور اپنے شوہر کی عزت بہت عزیز ہے۔ اگر بہن کی مہمانی کھل رہی ہے تو صاف کہہ دو۔"

سونا نے آگے بڑھ کر اسے سمجھانے کی کوشش کی تو وہ الٹا اسی پر برس پڑی۔ ساس اور دیور بھی جاہلانہ انداز سے تالیاں پیٹ پیٹ کر زور و شور سے اس کا ساتھ دینے لگے۔ "فیصل تمہاری بیوی کے لچھن ایسے نہیں ہیں کہ یہ سسرال میں گزارا کر سکے۔ اگر بہن کی بات کا یقین نہ آئے تو کسی روز تم آفس سے جلدی آ کر کسی پردے کے پیچھے یا اپنے بیڈ کے نیچے چھپ جاؤ پھر تمہیں پتا چلے گا کہ تمہارے پیچھے یہ گھر میں کیا کرتی پھرتی ہے۔"

اس انوکھے مشورے پر جہاں فیصل اور فراز بھائی حیرت زدہ رہ گئے وہیں سونا کی کاٹو تو بدن میں لہو نہیں والی حالت ہو گئی۔ ناہید نے آج بے عزتی کی انتہا کر دی تھی۔ اس کے بعد فیصل نے سونا کے دفاع میں بہت کچھ بولا مگر سونا آنسو بہاتی اپنے کمرے میں آ گئی۔

اس روز یہ جھگڑا رات گئے تک جاری رہا جس میں سونا کی ذات کو ہی نشانہ بنایا جاتا رہا۔ پوری طرح کوشش کی گئی کہ کسی طرح فیصل کو سونا سے برگشتہ کر دیا جائے۔ اگر کوئی اور مرد ہوتا تو شاید اتنے الزامات سننے کے بعد اسے ان میں سچائی محسوس ہونے لگتی اور وہ سونا سے کوئی سوال ضرور کرتا مگر فیصل کو اپنی بیوی پر پوری طرح اعتماد تھا کہ وہ کوئی ایسی حرکت نہیں کر سکتی جس سے ان کے اعتماد کو ٹھیس پہنچے۔ اس جھگڑے کے بعد سے ناہید نے خود ہی ان کے گھر آنا بند کر دیا اور الزام فیصل پر لگایا کہ بھائی نے مجھے گھر آنے سے روک دیا ہے۔

اماں اور بھائی فیصل کو خوب برا بھلا کہتے کہ بیوی کی خاطر اپنی بہن کو بے عزت کر کے گھر سے نکال دیا جبکہ فیصل نے کبھی اس طرح کی کوئی بات نہ کی تھی۔ اس واقعہ کے بعد ساس اور دیور نے سونا سے مکمل طور پر بات چیت بند کر دی۔ اب وہ اس گھر میں غیروں کی طرح رہ رہی تھی۔ ایک طرح سے اس کے وجود کو مکمل طور پر نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ اس کو دیکھتے ہی ساس اور دیور کے چہرے پر غصے اور ناگواری کے تاثرات ابھر آتے۔ سونا جو ہمیشہ سے پُراعتماد شخصیت کی مالک تھی۔ ان کا سامنا کرتے ہوئے بھیگی بلی سی بن جاتی اور اس کو اپنے اعتماد اور ہستی کے پرخچے اڑتے محسوس ہوتے۔ اسکول سے لوٹ کر وہ بھوکی پیاسی ان کے رویوں سے خوفزدہ اپنے کمرے میں بند ہو جاتی اور فیصل کے آنے کے بعد ہی نکلتی۔ وہ اکثر فیصل کے سامنے گھر والوں کے برتاؤ پر روتی تو کبھی ان سے لڑ پڑتی۔ وہ بھی اپنی بیوی کے ساتھ اپنی ماں اور بھائی کا ہتک آمیز سلوک دیکھتے تھے مگر مجبور تھے۔ اگر وہ ماں اور بھائی کو کچھ کہتے تو گھر میدان جنگ بن جاتا۔ دوسرا راستہ یہ تھا کہ وہ سونا کو لے کر ان سے الگ ہو جاتے لیکن ایسی صورت میں وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ ان کا نکھٹو بھائی اس قابل نہیں ہے کہ ماں اور اپنا خرچا اٹھا سکے۔ اسی لیے وہ محبت کے ہاتھوں مجبور تھے۔ ایک طرف ان کی عزیز از جان بیوی تھی تو دوسری طرف خون کے رشتوں کی محبت تھی۔

گھر میں ہونے والے جھگڑوں میں تو اب مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ ناہید کا آنا جانا تو بند ہو گیا تھا مگر اب وہ اپنے گھر سے بیٹھے بیٹھے اپنی ماں اور بھائی کو نت نئی پٹیاں پڑھاتی رہتی۔ خود ساس کا کھانا بھی روز لڑے بغیر ہضم نہ ہوتا تھا اس لیے فیصل کے آفس سے آتے ہی وہ معمولی معمولی باتوں کو ایشو بنا کر ان پر چڑھ دوڑتیں۔ ان جھگڑوں میں نہ صرف وہ جی بھر کر چیختی چلاتیں بلکہ اب تو سمیر کو انہوں نے اتنا بے باک بنا دیا تھا کہ اب وہ بے غیرت اکثر بڑے بھائی پر ہاتھ چھوڑ بیٹھتا۔ فیصل یہ بات کہاں برداشت کرتے نتیجہ دونوں میں ہاتھا پائی شروع ہو جاتی۔ اس کے بعد بجائے یہ کہ وہ سمیر کو روکیں وہ جلتی پر اور تیل چھڑکتیں۔ دونوں کا جوان خون اور والدہ کی شعلہ بیانی! دونوں بھائی ایک دوسرے کے قتل کے درپے ہو جاتے۔ سونا اپنے

ڈوبتے ہوئے دل اور بکھرتے ہوئے اعصاب کو بمشکل سنبھالتی فیصل کو اپنی قسمیں دے دے کر الگ کرتی جبکہ ساس اس وقت اسے گندی گندی گالیوں سے نواز رہی ہوتیں۔ ایسے وقت میں وہ گونگی اور بہری بن جاتی۔ درود شریف کا ورد کرتے کرتے اس کا حلق سوکھ جاتا۔ فیصل کا غصہ ٹھنڈا ہونے میں کئی کئی دن لگ جاتے مگر تھوڑے دن ہی سکون سے گزرتے اور پھر کوئی نیا فساد ان کا منتظر ہوتا۔

ہر شخص کے لیے گھر، سکون اور آرام کی جگہ ہوتی ہے اور جب وہی کانٹا بن کر چبھنے لگے تو اس کے اثرات زندگی پر تو مرتب ہوتے ہی ہیں۔ آئے روز کے جھگڑوں اور گھر کے کشیدہ ماحول نے فیصل کو پریشان اور چڑچڑا رہنے لگے اور نتیجتاً آفس میں اپنے کولیگ سے تو جھگڑ بیٹھے۔ کچھ غلطی کولیگ کی بھی تھی کہ وہ کئی روز سے ان کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑا ہوا تھا۔ فیصل نے کئی بار زبانی سمجھایا کہ وہ ان سے دور رہے لیکن ایک دن اس نے کچھ زیادہ ہی بدتمیزی کر دی تو فیصل جو پہلے ہی بھرے بیٹھے تھے انہوں نے اس کے تھپڑ جڑ دیا۔ کولیگ باس کا قریبی رشتہ دار تھا چنانچہ باس نے ان کی تمام صفائیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے انہیں اسی دن نوکری سے برخاست کر دیا۔

کچھ دن تو جو جمع جتھا تھا اس سے گزارا ہوتا رہا۔ فیصل نوکری دیکھ رہے تھے مگر انہیں اپنے معیار کی نوکری نہیں مل رہی تھی۔ ساس اور دیور سب جانتے بوجھتے بھی انجان بنے ہوئے تھے۔ گھر کا سودا سلف فیصل ہی ڈلوا رہے تھے خرچ ویسے ہی شاہانہ انداز میں ہو رہا تھا۔ روزانہ شام کو ڈھیروں تیل میں فرنچ فرائز، پاپڑ، پکوڑے وغیرہ تلے جاتے۔ دن میں دس سے بیس بار چائے بنائی جاتی۔ مزے کی بات یہ تھی کہ یہ سب ساس اور دیور اپنے لیے بناتے۔ مونا اور فیصل کو جھوٹے منہ بھی نہ پوچھا جاتا۔ انہیں اس بات سے قطعی غرض نہ تھی کہ گھر مونا کی قلیل تنخواہ پر چل رہا ہے اس لیے وہ کچھ خیال سے خرچ کریں۔ فیصل اب یہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے ایک دو بار دبی زبان میں کوکنگ آئل وغیرہ کو احتیاط سے خرچ کرنے کی نصیحت کی تو سمیر تھے سے اکھڑ گیا۔ اس نے بدتمیزی کے اگلے پچھلے تمام ریکارڈ توڑتے ہوئے ایسی زبان درازی کی کہ فیصل مبہوت رہ گئے جبکہ آنٹی سکون سے بیڈ پر بیٹھیں اسے ڈانٹنے کی بجائے تھپکی دیتی رہیں۔

فیصل کو اپنے مطلب کی نوکری نہیں مل رہی تھی اور گھر کے خرچے منہ کھولے سامنے کھڑے تھے۔ مونا کی تنخواہ سے تو بمشکل کرائے اور بلز ہی بھرے جاتے اس کے بعد گھر کے ہزاروں کام جو پیسوں کی ایندھن سے چلتے، ان کے منتظر رہتے۔ بھائی اور ماں کی طرف سے مایوس ہو کر فیصل نے بڑے چاؤ سے خریدی گئی اپنی شیشے کی بڑی سی ڈائننگ ٹیبل بیچنے کا ارادہ کر لیا۔ جس روز وہ اونے پونے داموں فروخت ہو رہی تھی اس روز فیصل کا اترا ہوا چہرہ دیکھ کر مونا کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا مگر آفرین ہے ان کے بےحس گھر والوں پر جو کسی قسم کا ردعمل ظاہر کیے بغیر مزے سے ٹی وی دیکھنے میں مصروف تھے۔ اس روز مونا کے دل میں ان کے لیے نفرت کی ایک نہری اٹھی۔ اس کا جی چاہا کہ ساس کو جھنجھوڑ کر خواب غفلت سے بیدار کرے اور انہیں بتائے کہ دیکھو یہ ہے وہ تمہارا بیٹا جو تم سے کتنا مخلص ہے۔ جس نے کم عمری میں ہی گھر کا بوجھ کسی ذمہ دار مرد کی طرح اپنے ناتواں کندھوں پر اٹھا لیا۔ جس نے کبھی تم لوگوں کو یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ باہر کی دنیا کتنی ظالم ہے، کیسے کیسے مشکلیں سہہ کر اس نے ہمیشہ تم لوگوں کے لیے آسانیاں تلاش کیں اور ابھی تک یہی کر رہا ہے۔ اپنا بے لوث محبت کے ہاتھوں تمہارے اور تمہارے چھوٹے بیٹے کے ہاتھوں زندگی بھر ذلیل ہونے کے باوجود بھی اس نے یہ نہ سوچا کہ تم لوگوں کو تمہارے حالوں پر چھوڑ کر اپنی زندگی شروع کر دے۔ اس کی بجائے یہ مرتے دم تک اپنی ذمہ داریاں نبھائے گا۔ بدلے میں وہ تم احسان فراموشوں سے اپنے اور اپنی بیوی کے لیے صرف پیار اور عزت ہی تو مانگ رہا ہے۔ کیا اتنا بھی تمہارے بس میں نہیں ہے کہ اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر دو لفظ پیار اور شفقت کے ہی بول دو۔ مونا یہ سب دل میں ہی سوچتی رہی اور کڑھتی رہی۔ جب اس کی برداشت سے باہر ہو گیا تو اس نے باتھ روم میں جا کر خود کو لاک کر لیا اور نل چلا کر پانی کے ساتھ دیر تک آنسو بھی بہاتی رہی۔ جب دل ذرا ہلکا ہوا تو وہ منہ پونچھتی باہر آ گئی۔ ایسے موقع پر جب فیصل کو اس کی ضرورت تھی تو وہ ان کے سامنے آنسو بہا کر انہیں کمزور نہیں کرنا چاہتی تھی۔

مونا کی شادی کے بعد ہمیشہ سے ہی یہ عادت رہی تھی کہ وہ سسرال کی کسی بات کا کبھی بھی اپنے گھر والوں کے سامنے ذکر نہیں کرتی تھی۔ اس لیے اس کے گھر والے ابھی تک اس بات سے انجان تھے کہ مونا پر سسرال میں کیا گزر رہی ہے۔ وہ ہمیشہ کی طرح ہنستا مسکراتا چہرہ لے کر ان لوگوں

سے ملتی اور "سب اچھا ہے" کی عملی تفسیر بنی رہتی۔ اس کی امی نے کئی بار اس کو ساس اور دیور کے رویے کے بارے میں کریدا مگر اس نے باتوں باتوں میں اس ذکر سے پیچھا چھڑا لیا۔ اس کے پیچھے اس کی یہ سوچ تھی کہ والدین کو بتانے سے یہ مسئلے حل تو نہیں ہونے تھے۔ الٹا وہ اس کے لیے پریشان ہو کر اپنی طبیعت خراب کر لیتے، اسی لیے بہتر ہے کہ انہیں ان معاملات سے دور رکھا جائے۔ مشہور مثل ہے "جو پیا من بھائے، وہی سہاگن"۔ اور فیصل یقیناً اس سے بے تحاشا محبت کرتے تھے بلکہ جب وہ یہ دیکھتے کہ ان کی والدہ اور بھائی کی ہزاروں جلی کٹی سننے کے باوجود بھی وہ پلٹ کر جواب دینے کی بجائے بالکل خاموش رہتی ہے تو ان کے دل میں اس کے لیے محبت دگنی ہو گئی تھی۔ وہ تو اپنے بیرا جیسے بیوی کا حال دیکھ دیکھ کر کڑھا کرتے جس بیچارے کی زندگی ناہید اور ان کی امی نے مل کر جہنم بنائی ہوئی تھی۔

ان دنوں جب سونا تج کی تھکی سہ پہر تین بجے تک تھکی ہاری گھر آتی تو فیصل بھی گھر میں موجود ہوتے اور اس کو اس طرح تھکا ماندہ دیکھ کر شرمندہ ہو جاتے۔ ان کی والدہ نے گھر کے تمام کاموں سے ہاتھ اٹھا لیا تھا حالانکہ ماسی جھاڑو پونچھا اور ڈسٹنگ وغیرہ کر جاتی مگر پتا نہیں کیوں ان کے ذہن میں یہ بات سما گئی کہ گھر کے کام کاج میں بہو کا ہاتھ بٹانے سے ان کی عزت میں کمی ہو جانے کا خدشہ ہے۔ چنانچہ سونا اسکول سے آ کر کچھ دیر لیٹتی پھر شام کو سالن پکانے اور روٹیاں ڈالنے کی ذمہ داری مکمل طور پر اس کی تھی۔ گھر میں افراد ہی کتنے تھے اس لیے سونا کو زیادہ پریشانی نہیں ہوتی مگر وہ اکثر یہی سوچتی کہ کیا ہے اگر آنٹی بیٹھے بیٹھے اسے سبزی کاٹ کر ہی دے دیں۔ اس کا آدھا وقت بچ جایا کرے گا جس میں وہ اپنے اسکول سے لایا گیا کام نمٹا لیا کرے مگر آنٹی نے تمام لحاظ اور مروت بالائے طاق رکھ دی تھی۔ اور تو اور ایک دن طبیعت بوجھل ہونے کے سبب سونا نے فیصل سے کہہ کر باہر سے روٹیاں منگوائیں تو ان کے جانے کے بعد دونوں ماں بیٹا دیر تک بڑبڑاتے رہے۔ سمیر اسے سنانے کے لیے جان بوجھ کر اونچی آواز میں بول رہا تھا۔ "ان کے نخرے تو دیکھو۔ چار پیسے کما کر لاتی ہیں تو ہم پر احسان ہے۔ ان سے اچھی تو پڑوس کی زہرہ آنٹی ہیں۔ ان کی تو نوکری اس سے دگنی ہے اور انہوں نے کبھی گھر والوں پر احسان نہ جتایا۔ جبکہ ان کا تو کام ہی بس یہی ہے کہ محض چار پیسے کما کر لائیں اور ہمیں اپنی کمائی کے بل

بوتے پر فیصل بھائی کے سامنے ذلیل کریں۔ ہم کوئی بھوکے ہیں کیا؟ امی آپ بولیے؟"

جواب میں ساس صاحبہ بڑے زور و شور سے اس کی تائید کرتی ہوئی بولیں۔ "اور کیا۔ سچ کہہ رہے ہو۔ وہ زہرہ بھی تو آخر ان کی طرح بہو ہی ہے نا۔ جو صبح کی گئی شام کو واپس آتی ہے۔ کمائی ان سے دگنا ہے اور پھر گھر والوں کو ضرورت پڑنے پر پیسے بھی نکال کر دے دیتی ہے۔ ایک ہماری بہو نجانے کس مٹی کی بنی ہوئی ہے۔ ان کو تو میاں کے کان بھرنے سے فرصت ہی نہیں ہے۔ اتنی سی تنخواہ جو آتے ہی خرچ ہو جاتی ہے اس پر ان کے وہ نخرے اور احسان ہیں گویا لاکھوں کما رہی ہیں۔" سمیر نے ہنس کر آگے سے لقمہ دیا۔ "ارے چھوڑیں امی۔ ان چھوٹی ذہنیت کے لوگوں سے آپ اور کیا توقع رکھتی ہیں۔ زہرہ آنٹی جیسی بہوئیں تو قسمت والوں کو ملتی ہیں جو اتنا کما کر بھی سسرال والوں کے آگے بچھی جاتی ہیں۔"

سونا یہ سب کچھ صبر سے سن رہی تھی اور اس کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ سمیر کی سوچ کتنی گھٹیا تھی جو خود کمانے کی بجائے سکون سے نہ صرف اس کی کمائی کھا رہا تھا بلکہ اسے فیصل تنخواہ کے طعنے بھی دے رہا تھا۔ اور غضب ہے اس کی ماں پر جو اسے نوکری کرنے کی تلقین کرنے کی بجائے الٹا اس کی ہاں ہاں میں ملا رہی تھی۔ رات کو سونے سے پہلے سونا نے دکھے دل کے ساتھ فیصل کو بھی سمیر کی باتوں سے آگاہ کیا جسے سن کر وہ بھی افسوس سے سر ہلا کر رہ گئے۔

ایک دن فیصل کو کہیں انٹرویو کے لیے جانا تھا جبکہ اس کی ساس گزشتہ شام ناہید کے ہاں گئیں تو رات کو وہیں رک گئیں۔ سمیر بھی انہی کے ساتھ بہن کے گھر رک گیا تھا۔ سونا آج خوشی خوشی گھر واپس جا رہی تھی۔ بڑے دنوں بعد اسے یہ اطمینان تھا کہ کم از کم آج اسے گھر پہنچتے ہی روز کی طرح ان جلے بھنے چہروں کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ ریڈیو بھی راستے میں اس کی خوشی کا خوب ریکارڈ لگا رہی تھی۔ اس دن ویگن میں زیادہ بچے نہیں تھے اس لیے سونا معمول سے آدھ گھنٹہ پہلے ہی گھر پہنچ گئی۔ وہ وین سے اتر کر پہلے تو اسے خیال آیا کہ بیل بجا دے تاکہ فیصل دروازہ کھول دیں پھر اسے یاد آیا کہ وہ تو آج انٹرویو کے لیے نکلے ہوئے ہوں گے چنانچہ اس نے پرس سے چابی نکال کر لاک میں گھمائی مگر تالا نہ کھلا۔ سونا نے دو منٹ رک کر پھر چابی گھمائی اور ساتھ دروازے کو ہلکا سا دھکا بھی دیا۔ دروازہ اپنی جگہ جما رہا۔

اب اس کی سمجھ میں آیا کہ دروازہ لاکڈ نہیں بلکہ اسے اندر سے کنڈی لگا کر جان بوجھ کر بند کیا ہوا ہے۔ سونا بدحت تو حیران پریشان سی کھڑی رہی پھر اس نے ہمت کرکے بیل بجا دی مگر اندر سے کوئی جواب نہ آنے پر جھنجلا کر اس نے اس بار لمبی بیل دی مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ اس نے بیل بجانے کے ساتھ موبائل پر فیصل کا نمبر ملایا مگر دوسری طرف سے فون کاٹ دیا گیا یعنی فیصل اس وقت مصروف تھے۔ اس نے بیل پر سے ہاتھ ہٹایا اور کھٹکا دینے کے لیے ہاتھ بلند ہی کیا تھا کہ گھر کے اندر سے سرسراہٹ اور دبی دبی سرگوشیوں کی آوازیں آتی محسوس ہوئیں۔ ابھی وہ ان آوازوں پر غور ہی کر رہی تھی کہ اچانک کنڈی بجنے کی آواز آئی اور اگلے ہی لمحے اڑی اڑی سی رنگت لیے سمیر کا چہرہ نمودار ہوا۔ "بھابی، آج آپ اتنی جلدی کیسے آگئیں؟"

سونا نے اس کے استفسار پر حیرت سے اسے دیکھا۔ پچھلے دو سالوں کے بعد وہ آج اس سے مخاطب ہوا تھا اور ادب سے بھابی بھی کہہ رہا تھا ورنہ اب تو وہ فیصل کے سامنے سونا کو آپ کی بیوی یا "سونا" کہہ کر ہی مخاطب کیا کرتا تھا۔

سونا کوئی جواب دیے بغیر چپ چاپ اندر آگئی۔ اسے حیرت یہ ہو رہی تھی کہ وہ تو ساس کے ہمراہ ناہید کے ہاں ٹھہرا ہوا تھا پھر اس وقت وہ گھر پر کنڈی لگائے کیا کر رہا تھا۔ سونا اپنے کمرے کی جانب بڑھی تو اس کی نظریں بے ساختہ ساس کے کمرے کی جانب اٹھیں جو آج خلاف معمول بند تھا۔ ساس گھٹن اور گرمی کی وجہ سے کبھی اپنے کمرے کا دروازہ بھیڑتی تک نہیں تھیں، بند کرنا تو دور کی بات تھی۔ اس نے جب اپنے کمرے میں جانے کے لیے چپل اتاری تو چوکھٹ کے پاس رکھی زنانہ سینڈلز دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ تب تک سمیر جلدی جلدی کمرے میں گھس کر دروازہ بند کر چکا تھا۔ نجانے سونا کے دل میں کیا سمائی کہ اس نے ان سینڈلز کو پیروں سے دھکیل کر اپنے کمرے کے اندر کرلیا اور دروازہ بند کرلیا۔ اس نے کمرے میں پہنچ کر ان سینڈلز کا جائزہ لیا تو وہ اونچی ایڑی کی سستی سی گلابی رنگ کی سینڈلز تھیں۔ یہ سینڈلز لازمی طور پر ساس کی تو نہیں تھیں اور نہ ہی آنٹی جوڑوں کی تکلیف کے باعث ایسی سینڈلز پہنتی تھیں۔ کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی اس کے دل میں شرارت سی جاگی۔ "کیوں نہ میں یہ سینڈلز چھپا دوں، مزہ آئے گا!" یہ سوچ کر اس نے جلدی سے وہ سینڈلز اٹھا کر الماری کے نچلے خانے میں چھپا دیں۔

جب وہ نہا دھو کر لیٹنے کی تیاری کر رہی تھی تو اس کے کمرے کے دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی اور سمیر کی لگاوٹ بھری آواز ابھری۔ "بھابی، پلیز دروازہ کھولیے گا۔"

یہ ایک ہی دن میں دوسرا موقع تھا جب سمیر نے اس سے اس لہجے میں بات کی تھی۔ سونا نے دروازہ کھولا تو وہ جھٹ سے اندر آگیا۔ اس کی نظریں کمرے کے فرش پر کچھ تلاش کر رہی تھیں۔ "بھابی یہاں آپ نے پنک سینڈلز تو نہیں دیکھیں، وہ دراصل سارہ (ناہید کی آٹھ سالہ بیٹی) کی ہیں۔ اس کا اسٹریپ نکل گیا تھا تو اس نے کہا کہ ماموں یہ جڑوا کے لا دیجیے گا۔ موچی کے پاس لے جانے کے لیے یہیں رکھی تھیں میں نے، مگر اب کہیں نہیں مل رہیں۔" ساتھ ساتھ وہ بیڈ کے نیچے جھانک کر تو کبھی پردے اٹھا کر سینڈلز ڈھونڈتا جا رہا تھا۔ سونا خاموش کھڑی دل ہی دل میں اس کی پریشانی سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ اسے یوں پریشان دیکھ کر اس کے کلیجے میں ٹھنڈک سی پڑ رہی تھی۔ "اچھا ہے، اب تو ناہید کے ہاتھوں اس کی شامت آئے گی کہ اس کی بیٹی کی سینڈلز گما دیں۔" اس نے دل ہی دل میں ہنستے ہوئے سوچا۔ سمیر کافی دیر تک سینڈلز تلاش کرتا رہا مگر وہ سامنے ہوتیں تو ملتیں نا۔ اس کے کمرے سے جانے کے بعد سونا دروازہ بند کرکے بے اختیار ہنس پڑی۔ "اب مطلب تھا تو کیسے گلاب جھڑ رہے تھے موصوف کے منہ سے۔ بھابی بھابی کرتے منہ سوکھ رہا تھا۔ ورنہ تو کام والی ماسی جتنی تو اوقات کر رکھی ہے دونوں ماں بیٹے نے میری۔ اچھا ہے اب ناہید اس کی کلاس لے گی تو کتنا مزہ آئے گا۔"

سونا یہی باتیں سوچتے سوچتے سو گئی۔ شام سے ذرا پہلے فیصل کی بھی واپسی ہو گئی۔ جلدی جلدی کھانا تیار کرتے اسے دوپہر میں ہونے والی بات یاد ہی نہ رہی۔ آنٹی اور سمیر ابھی تک واپس نہیں آئے تھے۔ سونا برتن وغیرہ دھو کر اسکول کا کام لے کر بیٹھی تو اچانک فیصل کو یاد آیا۔ "تم نے مجھے دوپہر کو فون کیوں کیا تھا؟ بتایا تو تھا آج انٹرویو ہے میرا۔"

سونا کو دوپہر والی شرارت یاد آ گئی، اس نے مزے مزے سے ساری روداد اور اپنے فون کرنے کا مقصد فیصل کو بتایا تو خلاف توقع محظوظ ہونے کی بجائے ان کے چہرے پر سنجیدگی چھائی رہی۔ جب سونا نے بتایا کہ اس نے آنٹی کا کمرا بھی بند دیکھا تھا تو ان کی سنجیدگی مزید گہری ہو گئی۔

"مجھے وہ سینڈلز دکھاؤ جو بقول سمیر کے سارہ کی تھیں۔"

سونا نے وہ سینڈلز لا کر ان کے سامنے رکھ دیں۔ فیصل

خاموشی سے ان سینڈلز کو ہاتھ میں لے کر ان کا جائزہ لینے لگے پھر انہوں نے انکشاف کیا۔ "یہ سینڈلز سارہ کی نہیں ہیں۔"
مونا نے حیرت سے پوچھا۔ "تو کیا ناہید کی ہیں؟"
فیصل نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "یہ گیارہ نمبر کی سینڈلز ہیں۔ مونا تم خود سوچو یہ آٹھ سالہ سارہ کی سینڈلز کس طرح ہو سکتی ہیں؟ اور ویسے بھی ناہید کو تو سینڈلز میں گلابی رنگ بچپن سے سخت ناپسند ہے۔ جوتوں اور سینڈلز کے لیے نہ وہ خود یہ رنگ استعمال کرتی ہے اور نہ ہی سارہ کے پاس اس رنگ کی کوئی سینڈلز ہیں۔ دوسرے تم بتا رہی تھیں کہ وہ اس کو موچی کے پاس لے جانے والا تھا مگر یہ تو اے ون کنڈیشن میں ہیں۔"
مونا نے غور کیا تو اسے فیصل کی باتیں ٹھیک لگیں مگر وہ اب بھی کشمکش میں تھی۔ "پھر یہ سینڈلز کس کی ہیں؟ آپی تو کبھی بھی اونچی ایڑی نہیں پہنتیں۔"
فیصل نے تاسف سے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔
"ساری باتیں تمہارے سامنے ہیں مونا۔ دروازے پر کنڈی کا ہونا، ثمیر کا دروازہ دیر سے کھولنا۔ اس کی گھبراہٹ اور پریشانی میں مبتلا ہونا، امی کے کمرے کا دروازہ بند ہونا اور بقول تمہارے تم نے سرگوشیوں کی آوازیں سنی تھیں تو یہ باتیں تم نے نظرانداز کیوں کیں؟ اور پھر یہ سینڈلز؟" فیصل نے بات ادھوری چھوڑ کر اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا تو مونا کے پیروں تلے زمین کھسک گئی۔
"آپ کا مطلب ہے کہ وہ کسی لڑکی؟" اس سے آگے مونا سے بولا نہیں گیا۔
"جی مونا بیگم، یہ بات تو آپ کو اسی وقت سمجھ جانی چاہیے تھی جب آپ نے گھر میں سے آتی مشکوک سرگوشیاں سنی تھیں اور اندر جانے پر امی کے کمرے کا دروازہ بند پایا تھا۔" فیصل نے اس کی عقل پر ماتم کرتے ہوئے کہا تو مونا کو اندازہ ہوا کہ جس بات کو وہ اب تک مذاق کے طور پر لے رہی تھی وہ کتنی ہوش اڑا دینے والی ثابت ہوئی تھی۔ ثمیر لاکھ فلرٹ سہی مگر وہ اس کا اتنا گر جانے کی توقع نہیں کر سکتی تھی۔ اسے تو یہ سوچ کر گھن آنے لگی تھی کہ وہ اس لڑکی کے ساتھ اتنی دیر تک اس کے ساتھ والے کمرے میں موجود رہا اور اسے ذرا بھی شک نہ گزرا۔ رہی سہی تصدیق فراز بھائی نے کر دی جب انہوں نے فیصل کے پوچھنے پر بتایا کہ سارہ کی یا ناہید کی کوئی سینڈل ٹوٹی نہیں ہے اور بالفرض وہ ٹوٹی بھی ہوتیں تو ثمیر کب سے اتنا اچھا ہو گیا کہ وہ موچی کو چھوڑ کر گھر کے کام کرے۔
فیصل غصے میں بھرے دونوں کی واپسی کا انتظار کرنے لگے۔ اس بیچ مونا بار بار ان کو سمجھاتی رہی کہ زیادہ غصے میں نہ آئیں۔ اس کا دل یہ سوچ سوچ کر بیٹھا جا رہا تھا کہ آج کا معرکہ نجانے کیا گل کھلائے گا۔ دونوں ماں بیٹا کی واپسی رات گیارہ بجے کے قریب ہوئی۔ ثمیر کو دیکھ کر مونا اس کے بے اعتنائی بے حسی شاکرابیت کو برداشت نہ کر سکی اور اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ پانچ منٹ بعد ہی دوسرے کمرے سے زور زور سے لڑنے کی آوازیں بلند ہونے لگیں جن میں سب سے اونچی آواز اس کی ساس کی تھی۔ مونا دم سادھے اپنے کمرے میں ہی بیٹھی رہی کیونکہ اس وقت اس کی ذات کو نشانہ بنایا جا رہا تھا۔ "اسے یہ ہے۔ تو پہلے ہی دن سے ان کوششوں میں ہے کہ بھائی کو بھائی سے جدا کر دے۔ یہ تو میری کوششیں ہیں۔ جن کی وجہ سے یہ رشتے قائم ہیں ورنہ اس کا تو بس نہ چلے مجھے اور میرے معصوم بیٹے کو چٹکی کی فرصت میں نکال باہر کرے۔ اتنا بڑا الزام لگا دیا اس نے ثمیر پر اور شوہر بے غیرتوں کی طرح اب بھی بیوی کی وکالت کر رہا ہے۔ پتا نہیں کس کی سینڈلز کو اس نے ثمیر کے ساتھ نتھی کر دی ہیں۔" ساتھ ساتھ ثمیر کی زور زور سے چیخنے کی آوازیں آ رہی تھیں جو با آواز بلند مونا اور اس کے پورے خاندان کو گندی گندی گالیوں سے نواز رہا تھا۔ فیصل اسے لگاتار جواب میں بند کرنے کا کہہ رہے تھے۔ مونا اپنے کمرے میں بیٹھی کسی سوکھے پتے کی طرح لرز رہی تھی اور اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ تھوڑی دیر یہ ہنگامہ جاری رہا لیکن اچانک چھناکے کی آواز نے اسے کمرے سے باہر دوڑ جانے پر مجبور کر دیا۔ ایک مرتبہ پھر دونوں بھائی بری طرح دست و گریباں تھے۔ اس کو کمرے میں آتا دیکھ کر اس کی ساس جنونیوں کی طرح چیخنا شروع ہو گئیں۔ "تم نے مردود، تیری وجہ سے آج بھائی بھائی کی جان کو آ رہا ہے۔ اب یہاں کیا تماشا دیکھنے آئی ہے [illegible] نکل جا یہاں سے ورنہ میں تجھے جان سے مار دوں گی۔" اس وقت ان کا سانس جذبات کی شدت سے دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ [illegible] سمت کر چہرے پر آ [illegible] پڑے تھے۔ اس [illegible] تھیں۔ مونا نے ہمیشہ [illegible] اور روتی ہوئی [illegible] فیصل [illegible] ثمیر ایک دوسرے [illegible] سے

مظالمات کا ایک سمندر بہہ رہا تھا۔ اس کی اس زیادتی اور الٹا چور کوتوال کو ڈانٹنے والے رویے کو دیکھ کر فیصل بھی اپنا آپا کھو چکے تھے اور جواباً ان کے منہ سے بھی غصہ گالیوں کی صورت میں برآمد ہو رہا تھا۔

بڑی مشکلوں سے روتی بلکتی مونا نے فیصل کو ہاتھ پکڑ کر ان سے الگ کیا۔ وہ بھی شدید غصے کے باوجود اسی لیے تو ٹال چھوڑنے پر آمادہ ہو گئے تھے کہ کہیں مونا کو کوئی زخم نہ پہنچے۔ ساس ہمیشہ کی طرح پیچھے ہٹ کر بد دعائیں دے رہی تھیں۔ کسی طرح کھینچ کھانچ کر مونا فیصل کو کمرے میں لے جانے میں کامیاب ہوئی مگر مونا کے پیچھے پیچھے ہی آنٹی کی زہر بھری باتیں سن کر وہ بے تاب ہو کر ان کے کمرے کی جانب ہو گئے۔ دراصل یہ بات دونوں ماں بیٹا اچھی طرح جانتے تھے کہ مونا فیصل کی کمزوری ہے اور وہ اس کے خلاف کوئی غلط بات برداشت نہیں کر سکتے۔ ان کی اسی بنیادی کمزوری کا فائدہ اٹھا کر وہ دونوں ہمیشہ مونا کی ذات کو نشانہ بناتے تھے تاکہ فیصل آپے سے باہر ہو جائیں اور لڑ کر ان کے کلیجوں میں ٹھنڈ پڑے۔

جب مونا انہیں کسی طرح سمجھا بجھا کر دوبارہ کمرے کی جانب لے کر آئی تو اعصابی جنگ سے لڑتے لڑتے اس کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑنے لگے۔ اس کے لب سفید پڑ گئے اور جسم ٹھنڈا ہونے لگا۔ غالباً اس کا بی پی لو ہو گیا تھا۔ فیصل نے اس کی یہ حالت دیکھی تو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اس کی جانب لپکے۔ جلدی جلدی اسے پانی پلایا مگر جب اس کی حالت غیر ہونے لگی اور سمیر اور آنٹی کی زبانیں بند نہ ہوئیں تو فیصل اونچی آواز میں اس قدر زور سے دھاڑے کہ اس سے پہلے کسی نے ان کی اتنی بلند آواز نہیں سنی تھی۔ ساس کی گھٹی گھٹی چیخیں ایک دم بند ہوئیں۔ فیصل نے ایک ایک لفظ چبا کر کہا۔ "میں قسم کھاتا ہوں کہ اگر آج مونا کو تم لوگوں کی وجہ سے کچھ ہو گیا تو میں اس گھر کو اور تم لوگوں کو آگ لگا دوں گا۔" فیصل کی دھمکی میں نجانے کیا بات پوشیدہ تھی کہ سمیر کی فراٹے بھرتی زبان کو اچانک بریک لگ گئے اور وہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ فیصل واپس کمرے میں آئے اور اب دھیرے دھیرے اس کی ہتھیلیوں کی مالش کرتے ہوئے پیار سے مونا کو آوازیں دے رہے تھے۔ مونا کے حواس اب بتدریج بحال ہونے لگے تھے۔ اس نے سب سے پہلے ہی فیصل کا ہاتھ تھام لیا اور سینے سے لگا لیا۔ جب بھی اس کی طبیعت خراب ہوتی تھی گھر میں بیٹے نے ... وہ ... بھی یہ

سکتے تھے۔ اس کی مجبوریاں اور سسکیاں ان کا دل چھید رہی تھیں مگر ماں اور بھائی کی خود غرضی اور احسان فراموشی کے باوجود تو ان سے اپنے ہی اور وہ انہیں اس طرح چھوڑ کر جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔

مونا بھی فیصل کے جذبات کو سمجھتی تھی اس لیے کبھی گھر سے الگ ہونے کا مطالبہ کرتی ضرور تھی مگر انہیں زیادہ مجبور نہیں کرتی تھی۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ فیصل کبھی بھی اپنے گھر والوں سے الگ ہونا پسند نہیں کریں گے اور اپنی ذات کی خوشی کے لیے وہ انہیں دکھ نہیں پہنچانا چاہتی تھی۔ دن اسی طرح پر گزر رہے تھے۔ فیصل کو ایک جگہ نوکری مل گئی تھی مگر اب ان کی تنخواہ پہلے سے کافی کم تھی اور گھر کے اخراجات اور ابا کی دوائیں بھی تھیں جنہیں مگر فی الوقت گزارے کے لیے مجبوراً یہ نوکری کرنی ضروری تھی۔ سمیر بھی کسی فیکٹری میں ملازمت کرنے لگا تھا مگر اس نے قلیل تنخواہ کا بہانہ بنا کر گھر میں برابر کا حصہ دینے سے صاف منع کر دیا تھا۔ فیصل نے یہی غنیمت جانا کہ کم از کم اسے اپنی ذمہ داریوں کا احساس تو ہوا تھا۔ جب سے سمیر کی نوکری شروع ہوئی تھی آنٹی تو ہواؤں میں اڑنے لگی تھیں۔ اب رفتہ رفتہ انہوں نے اپنا کھانا پینا الگ کر لیا تھا۔ حالت یہ تھی کہ شام کو ایک ہی چولہے پر دو الگ الگ ہانڈیاں چڑھا کرتیں جن میں سے ایک میں مونا اپنے اور فیصل کے لیے کھانا پکاتی جبکہ دوسری میں آنٹی اپنا اور سمیر کا کھانا پکاتیں۔

انہوں نے جس دن اس شرمناک حرکت کا آغاز کیا تھا فیصل نے انہیں بہت سمجھایا تھا کہ اس طرح کر کے وہ دلوں میں فرقوں کو مزید ہوا دے رہی ہیں مگر انہوں نے ایک نہ سنی۔ دلچسپ بات تو یہ تھی کہ گھر میں سودا سلف تو فیصل ہی ڈلواتے تھے مگر وہ مزے سے وہی چیزیں استعمال کرتے ہوئے اپنی اور سمیر کی ہانڈی علیحدہ سے پکاتی تھیں اور پکانے کے بعد وہ سالن لے کر اپنے کمرے میں چلی جاتی تھیں۔ اپنے کمرے کے ایک کونے پر انہوں نے آٹے کی بوری رکھی ہوئی تھی۔ اس میں سے وہ آٹا ناپ کر لاتیں اور اپنی اور سمیر کی روٹیاں ڈال کر وہ بھی کمرے میں لے جاتیں۔ مونا چپ چاپ یہ انوکھے تماشے دیکھتی رہتی۔ فیصل سے کچھ کہنا بیکار تھا۔ وہ بھی آنٹی کو صرف سمجھا ہی سکتے تھے مگر دنیا میں آج تک وہ شخص ہی پیدا نہیں ہوا تھا جس کی بات وہ سمجھ سکیں۔ ایک طرح سے فیصل پر خرچے کا مزید بوجھ پڑ گیا تھا۔ ظاہر ہے جب گھر میں ایسی حرکتیں ہوتی ہیں تو رزق سے

برکت بھی لازمی اٹھ جاتی ہے۔

مونا تو صبح سویرے اٹھ کر اسکول چلی جاتی تھی۔ فیصل اس کے جانے کے ڈھائی تین گھنٹے بعد جاب پر جانے کے لیے نکلتے تھے مگر ان کی امی انہیں جھوٹے منہ ناشتے کو بھی نہ پوچھتی تھیں۔ وہ خود ہی اپنے لیے چائے بنا لیتے اور الٹا سیدھا ناشتا کر کھا لیتے یا کبھی بغیر ناشتے کے ہی چلے جاتے مگر ان کی امی کو کوئی پروا نہ ہوتی البتہ روز صبح سمیر کے لیے وہ باقاعدگی سے گرما گرم ناشتا اور چائے تیار کر کے فیصل کو ان دیکھا کرتے ہوئے ٹرے کمرے میں لے جاتیں۔ جہاں دونوں ماں بیٹا مل کر مزے سے ناشتا کرتے جبکہ فیصل اپنے کمرے میں بیٹھے انسانی رویوں پر غور کرتے رہ جاتے۔

ایک روز فیصل چھٹی کر کے گھر پر تھے تو انہوں نے سوچا کہ کیوں نہ گھر کے کچھ پلمبنگ کے کام مکمل کروا لیے جائیں۔ سمیر تو ویسے ہی جہاں بھر کا کاہل اور کام چور تھا اوپر سے اب تو نوکری کا بھی بہانہ تھا۔ چنانچہ انہوں نے پلمبر کو بلوا کر کام کروایا۔ جب وہ کام کر کے جانے لگا تو انہوں نے اسے ہزار کا بندھا نوٹ دیا۔ اتفاق سے اس کے پاس چینج نہیں تھا۔ فیصل نے اپنے پاس چیک کیا تو ان کے پاس بھی بندھے ہوئے نوٹ تھے۔ وہ اپنی امی کے کمرے میں گئے اور ان سے تین سو روپے مانگے۔ انہوں نے سب سے پہلے دریافت کیا کہ آیا وہ پیسے واپس کردیں گے کہ نہیں، جز بز ہوتے فیصل نے یقین دلایا کہ وہ ابھی دکان سے چینج کروا کر انہیں پیسے واپس کردیں گے فی الحال پلمبر کو تو نمٹائیں۔ اس پر وہ پیسے نکالنے بڑھیں پھر کچھ سوچ کر رک گئیں اور فیصل سے کہا۔ "چلو تم باہر جاؤ۔ تمہارے سامنے میں پیسے نہیں نکالوں گی ورنہ تم دیکھ لوگے کہ میں پیسے کہاں رکھتی ہوں۔"

فیصل اتنی بے عزتی سہنے کے بعد چپ چاپ ان کے کمرے سے باہر آگئے۔ پلمبر کو لے کر نیچے گئے اور وہاں دکان سے اسے چینج کروا کر پیسے دے دیے۔ اس طرح کے نجانے اور کتنے چھوٹے بڑے واقعات تھے کہ جن کے بعد فیصل کا ان خون کے رشتوں سے اعتبار اٹھتا چلا گیا۔

گھر کا وہی ٹینشن زدہ ماحول برقرار تھا۔ اب تو آنٹی نے ایک نیا وتیرہ اپنا لیا تھا۔ جب کوئی جھگڑا ہوتا تو اس کے بعد جا نماز بچھا کر بیٹھ جاتیں اور دامن پھیلا پھیلا کر فیصل اور مونا کو با آواز بلند بددعائیں دینے لگتیں۔ "اللہ کرے تو سدا بے اولاد رہے۔ خدا تجھے اولاد کی خوشیاں دیکھنا نصیب نہ کرے۔ تو ہمیشہ پریشان رہے۔" اور نجانے کس کس طرح کی کتنی بددعائیں وہ منہ بھر بھر کر دیتے جاتیں جو کوئی ماں اپنی اولاد کو دینے کا تصور بھی نہیں کرسکتی تھی۔ مونا کا دل ان کی باتیں سن کر دہل تو جاتا مگر اس کا ایمان پختہ تھا۔ اسے یقین تھا کہ اللہ تعالیٰ ایسے ہی اپنے بے قصور بندوں کے لیے کی گئی بددعا اس کو قطعی قبول نہیں کرتا۔ ان حرکتوں کے بعد تو وہ مزید ان لوگوں کی نظروں سے گر گئیں تھیں۔

درمیان میں ایک واقعہ ایسا ہوا جس نے فیصل کو بھی کچھ سوچنے پر مجبور کر ہی دیا۔ اتوار کا دن تھا۔ مونا اور فیصل کمرے میں بیٹھے باتیں کررہے تھے جب سمیر نے آکر جھانکا اور فیصل کو امی کے کمرے میں آنے کا کہہ کر چلا گیا۔ فیصل ان کے کمرے میں چلے گئے۔ مونا چپ چاپ بیٹھی ان کی واپسی کا انتظار کرتی رہی۔ اندر دھیمی انداز میں باتیں کی جارہی تھیں اس لیے مونا اندازہ نہیں لگا پائی کہ کون سا موضوع زیر بحث ہے۔ فیصل تقریباً ایک گھنٹے بعد کمرے سے برآمد ہوئے۔ اس وقت ان کے چہرے کے تاثرات انتہائی سنجیدہ تھے۔ مونا نے کسی نئی پریشانی کے خیال سے دھڑکتے دل کے ساتھ اس طویل مشاورت کی وجہ پوچھی تو وہ بیزاریت سے بولے۔ "پتا نہیں یار۔ روز نیا تماشا کھڑا کردیتے ہیں یہ لوگ۔ اب بول رہے ہیں کہ ناہید کا آج صبح فون آیا تھا۔ اسے یقین ہے کہ تمہارا اور فراز بھائی کا آپس میں افیئر چل رہا ہے۔"

مونا کو لگا اس کے آس پاس زوردار دھماکے ہوئے ہوں اور اس کا وجود ٹکڑوں کی صورت اڑ گیا ہو۔ ان لوگوں نے تو اخلاقی گراوٹ کی تمام حدیں پار کرلی تھیں اور ہر طرف سے مایوس ہو کر اب اس کی کردار کشی پر اتر آئے تھے۔ فراز بھائی کو اس نے ہمیشہ بھائی کی نظر سے دیکھا، خود وہ اس کی بے تحاشا عزت کرتے تھے اور کئی بار فیصل سے اس کی تمیز و تہذیب کی تعریف کرچکے تھے۔ غم و غصے کے مارے مونا کا وجود لرزنے لگا۔ فیصل نے جو اس کی حالت دیکھی تو اس کا ہاتھ تھام کر نرمی سے بولے۔ "دیکھو مونا تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں۔ میرے گھر والے یہ اوچھے ہتھکنڈے صرف اس لیے استعمال کررہے ہیں کہ تمہیں میری نظروں سے گرا سکیں۔ وہ بس یہ چاہتے ہیں کہ میں کسی طرح تمہیں طلاق دے دوں مگر میں انہیں اس گھناؤنے مقصد میں کبھی کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔ یہ بات تو انہوں نے کی ہے نا، اگر فرشتے بھی آکر مجھ سے یہ بات کہتے تو میں کبھی یقین نہ کرتا۔ خدا گواہ ہے مونا، مجھے تم پر

اور تمہارے کردار پر ذرا برابر بھی شک نہیں ہے۔ یہ چاہے کتنی بھی کوششیں کرلیں مجھے تم سے الگ نہیں کرسکتے۔ ابھی سمیر مجھ سے کہہ رہا تھا کہ میں تم پر نظر رکھا کروں کہ تم اسکول کے بہانے کہاں کہاں جاتی ہو اور کس سے ملتی ہو۔ ناہید نے تم پر یہ الزام لگائے ہیں کہ تم فراز بھائی کو رومینٹک ایس ایم ایس اور غزلیں بھیجتی ہو۔ میں ان سب کی گھٹیا سوچ اور سازشوں پر لعنت بھیج آیا ہوں۔ بس یوں سمجھ لو، اب میں ان کے ساتھ رہ تو رہا ہوں مگر آج کے بعد یہ لوگ میرے لیے پہلے جیسے نہیں رہے۔ انہوں نے خود کو میری نظروں میں اس قدر گرالیا ہے کہ اب میں جلد ہی کوئی فیصلہ کروں گا۔ بس تم مجھ پر اور میری محبت پر بھروسا رکھنا، جس طرح مجھے تمہاری وفاؤں پر رتی بھر بھی شبہ نہیں ہے چاہے یہ تمہارے خلاف دنیا بھر کے گواہوں کو میرے سامنے لا کھڑا کریں۔"

سونا یہ سب سن کر بے اختیار رو پڑی، کہ فیصل نے اس کے خلاف تمام الزامات کو جھٹلا دیا تھا لیکن اگر وہ بھی دوسرے بے شمار مردوں کی طرح کانوں کے کچے ہوتے تو اس وقت تک تو سونا طلاق کا جھومر سجائے اپنے میکے جا کر بیٹھ چکی ہوتی مگر ہمیشہ کی طرح اس بار بھی فیصل نے اس پر اور اس کی بے گناہ ذات پر بھروسا کرتے ہوئے اپنے گھر والوں کو جھوٹا قرار دے دیا تھا۔ اس وقت سونا کا دل چاہ رہا تھا کہ جا کر اونچی آواز میں اپنے سسرالیوں سے لڑے جنہوں نے اس کے پاکدامنی پر محض اپنے مفاد اور تفریح طبع کی خاطر کیچڑ اچھالنے کی کوشش کی تھی۔ عزت اور ذلت دینے والی پاک ذات تو بے شک اللہ تعالیٰ کی ہے۔ اس روز پہلی مرتبہ سونا کے دکھے دل سے آہ نکلی۔ "یا اللہ! جس طرح انہوں نے مجھے ذلیل کیا ہے۔ تو بھی ایک دن ان کو ویسے ہی ذلیل کرنا۔"

اس دن اور اس کے بعد کافی ہنگامے ہوئے۔ خود فراز بھائی بے چارے بھی اپنے بچوں کی خاطر ناہید کے ساتھ گزارا کر رہے تھے۔ ورنہ اس نے جس طرح انہیں روز روز بلاوجہ جھگڑے کر کے ذہنی مریض بنا دیا تھا اس کے بعد تو خود فراز بھائی کے گھر والے ان پر زور دے رہے تھے کہ وہ ناہید سے الگ ہو جائیں۔ فراز بھائی اور فیصل کی آپس میں گاڑھی چھنتی تھی۔ اس افسوسناک واقعہ کے بعد جہاں وہ شرمندہ تھے وہاں انہوں نے اعتراف کیا کہ وہ ناہید کو اسی وقت چھوڑ دیتے مگر انہیں فیصل اور سونا کا خیال آ گیا جو ویسے ہی گھر میں اذیت ناک زندگی گزار رہے تھے۔ اس پر سونے پر سہاگہ ناہید بھی آ کر ان کے گھر بیٹھ جاتی تو وہ دونوں تو آ گئے

ڈاکٹر سیموئیل جانسن

(1709ء_1784ء)

انگریز ادیب اور لغت نویس۔ تاجر کا بیٹا تھا آکسفورڈ میں تعلیم حاصل کی۔ زندگی کا آغاز ایک بورڈنگ اسکول کے اجراء سے کیا جو چل نہ سکا۔ لندن میں رہائش اختیار کی اور رسالوں میں مضامین لکھنا شروع کیے۔ پارلیمنٹ کے مباحث بھی رپورٹ کیے۔ 1740ء کے لگ بھگ انگریزی لغت کا آغاز کیا جو 1755ء میں شائع ہوئی۔ اپنی ماں کی تجہیز و تکفین کے مصارف کے لیے ایک ناول Rasselas لکھا۔ 1762ء میں قرضوں کی وجہ سے قید ہوا مگر اسی سال حکومت کی طرف سے تین سو پاؤنڈ سالانہ پنشن مقرر ہو گئی۔ تنقیدی مضامین اور گفتگی کے باعث شہرت پائی۔

مرسلہ: نوروز فیروز۔ پشاور

روز ہونے والے ڈراموں سے زچ ہو کر خودکشی ہی کرلیتے۔ سونا کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ یہ کیسی ماں ہیں جو اپنے بچوں کو برباد ہوتے دیکھ کر خوش ہوتی ہیں۔ انہوں نے کبھی ناہید کو یہ سمجھانے کی کوشش ہی نہیں کی تھی کہ اس طرح اپنے میاں کو تنگ کرنے کا انجام کتنا بھیانک ہو سکتا ہے۔ الٹا وہ ایسے موقعوں پر بیٹی کی حمایت میں داماد سے لڑنے پہنچ جاتی تھیں اور دونوں ماں بیٹی مل کر فراز بھائی جیسے شریف النفس انسان کی خوب بے عزتی کرتیں۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ کوئی دبو اور بزدل قسم کے مرد تھے۔ کئی مرتبہ ناہید اپنی زبان درازیوں کے سبب ان سے تھپڑ بھی کھا چکی تھی مگر اس کی ڈھیٹ پن کی انتہا تھی کہ وہ کچھ دن سنبھل کر پھر اپنی تخریبی کارروائیوں پر اتر آتی تھی۔ ابھی تک وہ صرف اس لیے نباہ کرتے آئے تھے کہ بچوں سے دور ہونا انہیں گوارا نہ تھا اور ان کی اسی کمزوری کا دونوں ماں بیٹی بھرپور فائدہ اٹھاتی تھیں۔ ناہید اس زعم میں تھی کہ فراز بچوں کی خاطر اسے کبھی نہیں چھوڑیں گے اور ابھی تک ہونے والے بڑے سے بڑے واقعات پر ان کا درگزر کرنا اس کے یقین کو مزید مستحکم کرتا تھا۔

پچھلے کچھ روز سے سونا دیکھ رہی تھی کہ دونوں ماں بیٹی میں کوئی کھچڑی پک رہی ہے۔ آج کل ناہید کے گھر کے چکر

بھی کھانی لگنے لگے تھے مگر کچھ پتا نہیں چل پا رہا تھا کہ معاملہ کیا ہے۔ ایک روز شام کو فیصل آفس سے واپس آئے ہی تھے کہ سمیر نے فرمائش کر کے ان سے عید کا کرتہ مانگا۔ پوچھنے پر بتانے لگا کہ آج دوست کی شادی پر پہن جاؤں گا اور امی بھی میرے ساتھ چلیں گی۔ سونا کو دال میں کچھ کالا لگ رہا تھا۔ اس نے فیصل سے ذکر بھی کیا مگر انہوں نے کوئی خاص توجہ نہ دی۔ ویسے بھی اب وہ ان لوگوں کی کسی بات میں دلچسپی نہیں لیا کرتے تھے۔ ساتھ رہنا مجبوری تھی ورنہ کب کے چھوڑ کر جا چکے ہوتے۔ رات گیارہ بجے جب وہ دونوں ٹی وی دیکھ رہے تھے تو فراز بھائی کا فون آیا۔ انہوں نے یہ حیرت انگیز اطلاع دی کہ آج سمیر کی منگنی ہے اور یہ سارے وہیں گئے ہوئے ہیں۔ سونا نے دیکھا کہ فیصل کے چہرے پر یہ خبر سن کر ایک لمحے کو دکھ کے سائے لہرائے پھر انہوں نے خود کو نارمل کر لیا۔ جب ان کی اپنی ماں اور ماں جائے نے انہیں اس قابل ہی نہ سمجھا تھا تو غیر کے سامنے کیا شکوہ کرتے۔ اگر فراز بھائی نہ بتاتے تو شاید انہیں یہ اطلاع ملتی بھی نہیں۔ رات گئے جب ان دونوں کی واپسی ہوئی تو سمیر کا کھلا کھلا چہرہ فراز بھائی کی خبر کی تصدیق کر رہا تھا۔ سونا نے ان دونوں کے چہروں پر کہیں شرمندگی یا ندامت تلاش کرنے کی کوشش کی مگر وہاں دور دور تک صرف بے نیازی اور خود غرضی نے ڈیرے ڈالے ہوئے تھے۔

فیصل نے ماں اور بھائی سے کوئی شکوہ نہ کیا اور انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا۔ اب وہ ان لوگوں سے بات بھی بہت کم کیا کرتے تھے۔ بہت ضرورت کے تحت اگر بات کرنی بھی پڑ جاتی تو کم سے کم الفاظ میں ان کے کمرے کے دروازے پر کھڑے کھڑے بولتے اور وہیں سے بات مکمل کر کے الٹے پاؤں لوٹ جاتے۔ بڑے بیٹے کی حیثیت گھر میں دو کوڑی سے زیادہ نہ تھی، اب وہ یہ بات اچھی طرح جان گئے تھے۔

سونا دیکھ رہی تھی کہ آج کل شادی کی تیاریاں عروج پر تھیں۔ روزانہ ہی دونوں کہیں نہ کہیں شاپنگ کے لیے نکل پڑتے اور سامان ایسے چھپا چھپا کر گھر لایا جاتا کہ جیسے اگر فیصل یا سونا کی نظریں اس پر پڑ گئیں تو وہ جل کر بھسم ہو جائے گا۔ جو آئے گئے کو چھپے چھپے سامان دکھایا جاتا اور فوراً لپیٹ کر چھپا دیا جاتا کہ مبادا سونا کی حاسد نظروں سے ان کی خوشیاں برباد نہ ہو جائیں۔ سونا ان کی اس بچگانہ سوچ پر مسکرا کر رہ جاتی۔ اب تو اس نے بھی ان باتوں کی پروا کرنا اور سی جلانا چھوڑ دیا تھا۔ وہ خوش تھی کہ اب ان کی مصروفیت کی وجہ سے گھر میں آئے روز کے جھگڑے ختم ہو گئے تھے اور سکون کی فضا قائم تھی۔ البتہ وہ یہ ضرور سوچتی کہ جس طرح آنٹی چپ چھپاتے اپنی دانست میں ان سے پوشیدہ رکھ کر سمیر کی شادی کر رہی ہیں۔ دلہن آئے گی تو اسی گھر میں، آخر وہ شادی کی بات اس طرح کب تک چھپائیں گی۔ مگر فی الحال تو وہ صرف تحمل اور تحمل کی دھار کو دیکھ رہی تھی۔

ایک دن سونا کچن میں کھانا پکانے جا رہی تھی کہ جانے کیسے اس کا پاؤں رپٹا اور وہ گر پڑی۔ ٹخنے میں اٹھتی درد کی شدید لہر نے اسے بے ساختہ کراہنے پر مجبور کر دیا۔ بڑی مشکلوں سے وہ اٹھی اور اپنی چیزوں کو دبائی، لنگڑاتی ہوئی آ کر اپنے بیڈ پر لیٹ گئی۔ درد کے مارے اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ فیصل تھوڑی ہی دیر میں واپس آنے والے تھے مگر بے پناہ درد میں مبتلا اس کا جی چاہ رہا تھا کہ کوئی اس کے پاس دو منٹ کو آ کر بیٹھے اور کچھ نہیں تو تھوڑا دلاسہ ہی دے دے۔ ساس اپنے کمرے میں بالکل انجان بنی بیٹھی تھیں۔ سونا بیڈ پر پڑی آنسو بہاتی رہی۔ اس نے اپنا پیر کمبل کے نیچے چھپا لیا تھا تاکہ ہوا لگنے سے درد حد سے نہ بڑھے۔ فیصل پندرہ بیس منٹ بعد آ گئے مگر سونا کو ایسا لگا جانے اتنی دیر میں اس نے اذیت کے کیسے کیسے سمندر عبور کر لیے ہوں۔

فیصل نے جو اس کی یہ حالت دیکھی تو گھبرا گئے۔ اس وقت تک سونا کا ٹخنہ سوج کر کپا ہو گیا تھا اور ہلکا سا نیلا پن بھی واضح ہو رہا تھا۔ انہوں نے پہلے آئیوڈیکس کی اور پھر گرم تیل کی بھی مالش کی مگر اسے آرام نہیں آیا۔ درد کش دوا کھا کر اسے کچھ آرام ملا تو رات کے کھانے کی فکر ہوئی۔ آنٹی سب جانتے بوجھتے بھی ہمیشہ کی طرح اپنا کھانا پکا کر کمرے میں لے گئی تھیں۔ سونا نے افسوس سے کہا۔ "مجھے نہیں تو کم سے کم آپ کو ہی کھانے کا پوچھ لیتیں۔ میں تو غیر ہوں مگر آپ تو ان کی اولاد ہیں نا۔" فیصل بھی اپنی امی کے برتاؤ سے رنجیدہ تھے، بولے۔ "مجھے تو اب شک ہونے لگا ہے کہ واقعی میں ان کی سگی اولاد ہی ہوں یا انہوں نے مجھے کسی یتیم خانے سے گود لیا تھا کیونکہ ان کے سلوک سے تو ایسا ہی لگتا ہے جیسے میں کسی اچھوت یا ان کے کسی نوکر کا بیٹا ہوں۔"

رات بھر سونا درد سے تڑپتی رہی۔ صبح کو فیصل اسے اسپتال لے گئے جہاں ڈاکٹر نے معائنے کے بعد تصدیق کر دی کہ ہڈی میں بال آنے کی وجہ سے ٹخنہ فریکچر ہو گیا

ہے۔ اس نے پلستر چڑھا دیا اور تاکید کی کہ ڈیڑھ دو ماہ تک چلنے پھرنے اور زیادہ دیر تک کھڑے ہونے میں احتیاط کرنی ہوگی۔ مونا جب فیصل کے ہمراہ گھر پہنچی تو آنٹی بیٹھی پڑوسن کو شادی کی شاپنگ دکھا رہی تھیں۔ ان لوگوں کو آتا دیکھ کر وہ جلدی جلدی سامان سمیٹنے لگیں اور پڑوسن کے ہمراہ کمرے میں چلی گئیں۔ انہوں نے دو منٹ رک کر پوچھنے کی تکلیف بھی گوارا نہ کی کہ مونا کی طبیعت اب کیسی ہے یا پاؤں پر پلستر کس نوعیت کا ہے۔

اس کے بعد مونا اور فیصل کے لیے ایک تکلیف دہ زندگی کا باب کھل گیا۔ مونا پلستر کے باعث کھانا نہیں پکا پاتی تھی جبکہ آنٹی نے بمشکل ایک دو ہفتے ان لوگوں کے لیے کھانا پکانے کے بعد وہی پرانی روش اختیار کرلی تھی۔ فیصل بازار سے کھانا لے آتے تھے مگر روز روز تو باہر کا کھانا نہیں کھایا جاسکتا تھا۔ بازاری روٹیاں کھا کھا کر الگ ان دونوں کے معدے خراب ہوگئے تھے۔ گھر کے اخراجات بھی اب پہلے کی طرح فیصل کے ذمے تھے کیونکہ سمیر اپنی تنخواہ شادی کی تیاریوں میں خرچ کررہا تھا۔ اب صورت حال یہ تھی کہ فیصل آفس سے آکر مونا کو سہارا دے کر کچن میں لے جاتے، جہاں وہ بیٹھے بیٹھے آٹا گوندھتی اور روٹیاں بیل کر انہیں دیتی جاتی جبکہ وہ توے پر سے کچی پکی روٹیاں اتارتے جاتے۔ اس کے بعد ساس جو احسان کو پتیلے میں تھوڑا سالن چھوڑ دیتی تھیں اس سے کھا لیتے۔ یا بھی بازار کے بدمزہ اور غیر معیاری سالن پر بھی گزارا کرنا پڑتا۔ زندگی گزرنے کا نام ہے اور وہ گزر ہی جاتی ہے مگر اپنے پیچھے گزرے ہوئے لمحوں کے انمٹ نقوش چھوڑ جاتی ہے۔ خاص طور پر جن پر گزری ہوتی ہے ان سے تو یہ لمحے بھلائے نہیں بھولتے۔

ابھی مونا کا پلستر کھلے پندرہ دن بھی نہیں ہوئے تھے اور وہ مکمل طور پر صحت یاب نہیں ہوئی تھی کہ ساس نے ایک روز فیصل کو بلا کر اپنی دانست میں یہ انکشاف کیا کہ وہ عنقریب سمیر کی شادی کرنے والی ہیں اور چونکہ اس کے سسرال والے کھاتے پیتے لوگ ہیں اس لیے وہ اپنی بیٹی کو جہیز میں فلیٹ بھی دے رہے ہیں۔ اب وہ مہینہ بھر کے اندر سمیر کے ساتھ اس کے فلیٹ میں شفٹ ہوجائیں گی۔ ان کی توقعات کے برعکس فیصل نے ان کی کوئی منتیں نہیں کیں اور نہ ان سے کہا کہ وہ رک جائیں اور اس طرح انہیں چھوڑ کر نہ جائیں۔ اس کے برخلاف وہ بولا۔

"جو آپ کو مناسب لگے امی۔" کہہ کر وہاں سے اٹھ آئے۔ مونا کو جب انہوں نے بتایا تو وہ سناٹے میں آگئی۔

"مگر وہ اس طرح جانے کا فیصلہ کیسے کرسکتی ہیں۔ ہمیشہ تو وہ آپ کے ساتھ رہیں، ہر دکھ، درد اور تکلیف میں آپ نے ان کا ساتھ دیا۔ ان کی دواؤں تک کا خرچا تو آپ اٹھاتے ہیں۔ سمیر کو پال پوس کر جوان کیا اور اب جبکہ وہ اس قابل ہوا ہے کہ آپ کا ساتھ دے سکے تو اپنی الگ دنیا بسانے چل پڑا۔ اتنے خود غرض۔ اگر آپ ہوتے فیصل تو آج آپ بھی ترقی کرکے کہیں کے کہیں پہنچے ہوتے۔ ان رشتوں کی خاطر آپ نے اپنا مستقبل قربان کیا اور بدلے میں آپ کو تو سدا محرومیاں ہی ملیں۔ اب دیکھیں، یہ تو چل دیے اماں کو بھی ساتھ لے کر اور ماں نے بھی ذرا تامل نہ کیا کہ میں اپنے اس بیٹے کا ساتھ کیسے چھوڑ دوں جس نے نہ دھوپ دیکھی نہ بارش اور ہمارے لیے ہمیشہ کھڑا رہا۔ خاندان بھر میں الگ ہم دونوں کو رسوا کیا ہوا ہے کہ ہم ان کی عزت نہیں کرتے۔ ان کا خیال نہیں رکھتے۔ خالی ہاتھ تو ہم رہ گئے! فائدے کا سودا تو سمیر نے کیا ہے۔" مونا ابھی جذبات میں آکر اور بولتی مگر فیصل نے اسے چپ کروا دیا۔

"دیکھو مونا، میں نے جو کچھ کیا وہ میرا فرض تھا۔ اجر دینے والا اللہ ہے اور تم کیا سمجھتی ہو یہ جس طرح سمیر اور امی بہو کے کہنے میں آکر مجھے اور میری محبت کو ٹھکرا کر جا رہی ہیں تو کیا خوش رہ سکیں گی؟ نہیں، ابھی تم صرف چپ چاپ تماشا دیکھو اور شکر کرو کہ یہ لوگ خود ہی اپنی سازشی ذہنیت سمیت ہمارے سروں سے ٹل رہے ہیں۔"

اس کے بعد سب کچھ نہایت تیزی سے ہوا۔ آنٹی جلدی جلدی سامان کی پیکنگ کرتی چلی گئیں اور اس میں انہوں نے اس بات کا خاص خیال رکھا کہ گھر میں موجود کوئی مہنگی اور قیمتی چیز نہ چھوٹ جائے چنانچہ جانے تک وہ فیصل کی لائی گئی جدید فوڈ فیکٹری، قیمتی ڈیک، کمپیوٹر اور یہاں تک کہ ٹی وی بھی پیک کرنا نہیں بھولی تھیں۔ یہ سارا سامان گھر میں فیصل کا لایا ہوا تھا مگر وہ بالکل خاموشی سے انہیں یہ سب سمیٹتا دیکھتے رہے۔ مونا کے توجہ دلانے پر وہ بس اتنا بولے۔ "انہیں جو کچھ لے جانا ہے، لے جانے دو مونا۔ کل کو یہ مجھ سے یہ شکوہ نہ کریں کہ فلاں چیز رہ گئی۔ چند مادی اشیاء کی خاطر یہ حقیقی رشتوں اور چاہتوں کو ٹھکرا رہی ہیں۔ کب تک چلائیں گی یہ چیزیں؟ انہیں روکو مت! اگر ان کی زندگی میں یہی چیزیں اہمیت رکھتی ہیں تو کرلینے دو ان کو

اپنے ارمان پورے۔"

جس روز وہ لوگ جارہے تھے۔اس دن تو آنٹی بس تتلی بنی اِدھر اُدھر اڑتی پھررہی تھیں۔خوشی ان کے انگ انگ سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔کچن میں موجود سارا سامان بشمول تمام مصالحے، کوکنگ آئل، چاول، تمام برتن، چمچے اور یہاں تک کہ روٹی ڈالنے کا توا بھی انہوں نے اپنے سامان میں لے جانے کے لیے ساتھ رکھ لیا تھا۔ان کا تو بس نہیں چل رہا تھا کہ کچن کیبنٹ اور پنکھے وغیرہ بھی اکھاڑ لے جاتیں مگر وہ مالک مکان کی ملکیت تھی اس لیے چاروناچار انہیں یہ چھوڑنا پڑا۔جب سمیر سوزوکی لے آیا اور سامان رکھا جانے لگا تو فیصل نے ان کے پاس جا کر انتہائی افسردگی سے کہا۔"امی آپ مجھے چھوڑ کر تو جارہی ہیں۔دیکھیے کہیں آپ کو اپنے اس فیصلے پر پچھتانا نہ پڑے۔"

یہ سن کر وہ زہر خند لہجے میں بولیں۔"چلو چلو دیکھا جائے گا۔میں کیوں پچھتانے لگی! اب پچھتاؤ گے تو تم لوگ جب ہمارے بغیر رہنا پڑے گا تو عقل ٹھکانے آجائے گی۔"

فیصل کو ان کی یہ غلط فہمی اور فرسودہ خیالات جان کر زیادہ حیرت نہ ہوئی۔جانے سے پہلے نہ سمیر ملا اور نہ ہی آنٹی نے بیٹے کو الوداع کہنا ضروری سمجھا۔سونا اور فیصل گیلری میں کھڑے ان کی گاڑی کو دور جاتا دیکھتے رہے۔فیصل کو صدمے کی حالت میں کھڑا دیکھ کر سونا نے شرارت سے انہیں کہنی مارتے ہوئے چھیڑا۔"چلو بھئی، خس کم جہاں پاک۔" جواباً وہ بھی اداس سی ہنسی ہنس پڑے۔

کچھ دنوں بعد خاندان والوں کے ہی ذریعے اطلاع آئی کہ سمیر کی شادی ہوگئی ہے۔ہر ایک نے فیصل کو فون کر کے شرکت نہ کرنے کی وجہ پوچھی تھی۔کسی کو یقین نہ آرہا تھا کہ انہیں علم ہی نہ تھا کہ سمیر کی شادی کب اور کس تاریخ کو ہے۔آنٹی نے سب کو یہ کہانی سنائی تھی کہ فیصل کے پاس کارڈ لے گئی تھی مگر اس نے آنے سے صاف انکار کردیا۔ جبکہ فیصل کے فرشتوں کو بھی علم نہ تھا کہ شادی کب تھی۔سونا کو شروع شروع میں جاب کے ساتھ گھر سنبھالنے میں مشکل تو ہوئی پھر اس کا پیر بھی ابھی بہتر نہیں ہوا تھا اور وہ اکثر درد اور تکلیف سے بے حال ہو جاتی۔فیصل ہمیشہ کی طرح اس سے بہت کوآپریٹ کرتے۔بے شک اللہ بہت بڑا ہے۔رفتہ رفتہ سب کچھ سیٹ ہوتا چلا گیا۔جاتے جاتے آنٹی کچن پورا خالی کر گئی تھیں۔ایک ایک چیز نئے سرے سے خریدی گئی تو کچھ سامان سونا نے اپنے جہیز کا نکال لیا۔چار ماہ بغیر ٹی وی کے گزارنے کے بعد ان لوگوں نے بالآخر چالیس انچ کا جدید ایل سی ڈی خرید لیا۔دو افراد کا خرچا ہی کتنا ہوتا ہے اوپر سے ڈھیر سارا ذہنی سکون جس کے لیے سونا اور فیصل ترس گئے تھے۔دیکھتے دیکھتے انہوں نے پہلے سے بہتر لائف اسٹائل اپنا لیا۔

دونوں ایک دوسرے کے ساتھ بے انتہا خوش تھے۔سمیر کی شادی کے آٹھ ماہ بعد اچانک ایک دن آنٹی کا فون آگیا۔فیصل حیران تو ہوئے، بہرحال انہوں نے کافی دیر تک فیصل سے باتیں کیں۔دراصل اب وہ پچھلی تمام تلخیاں بھلا کر پھر سے ملنا چاہ رہی تھیں۔فیصل نے بھی فوراً انہیں ویک اینڈ پر مدعو کرلیا۔سونا نے ان کے اس فیصلے کی مخالفت کی مگر ظاہر ہے وہ ان کی ماں کو گھر آنے سے روک نہیں سکتی تھی۔دعوت والے دن سمیر تو نہیں آیا مگر اس کی دیورانی خوب بنی سنوری ساس کے ساتھ آئی تھی۔جی کڑا کر کے سونا نے انہیں ریسیو کیا مگر بجائے ڈرائنگ روم میں جانے کے اس کی ساس عجیب سے انداز میں گھر میں اِدھر اُدھر تاک جھانک کرنے لگیں۔اب سونا اور فیصل پر یہ بات واضح ہوئی کہ وہ دراصل ان کی محبت میں نہیں بلکہ یہ دیکھنے آئی تھیں کہ ان لوگوں کے بغیر یہ دونوں کس طرح سروائیو کررہے ہیں۔ایل سی ڈی اور کیبورڈ تو دیکھ کر ان کے چہرے پر مایوسی چھا گئی۔اس کے بعد بھی وہ باتوں ہی باتوں میں کئی بار یہ پوچھنے سے باز نہ رہ سکیں کہ ان لوگوں کی روٹین اب کیا ہے۔کام والی ماسی کب آتی ہے اور سونا کو اب پریشانی تو ہوتی ہوگی وغیرہ وغیرہ مگر جب فیصل نے ان کی تمام امیدوں پر اوس گراتے ہوئے خوشدلی سے کہا۔
"ارے امی ہم دو میاں بیوی کا مسئلہ ہی کیا ہے۔مل بانٹ کر سارے کام کرلیتے ہیں اور اگر کوئی معمولی مسئلہ آ بھی جائے تو ویک اینڈ پر نمٹا لیتے ہیں۔"

ان کی شکل مزید بجھ گئی۔سونا دل ہی دل میں فیصل کی سیاست سے خوب لطف اندوز ہو رہی تھی حالانکہ آنٹی نے آتے ہی گھر کی تبدیلیاں نوٹ کرلی تھیں مگر فیصل جان بوجھ کر انہیں گھر کا مفصل سروے کروا کر لائے۔سونا کو ساس کی مضحکہ خیز حالت دیکھ کر ہنسی آرہی تھی۔وہ تو یہ سوچ کر گھر آئی تھیں کہ وہ لوگ ان کے بغیر کسمپرسی کی زندگی گزار رہے ہوں گے اور اتنا قیمتی سامان ارینج کرتے انہیں سالوں بیت جائیں گے۔اب اداس سی صورت بنائے بیٹھی تھیں۔جب

ان سے کچھ نہ بن پڑا تو فیصل سے بے وجہ کسی بات پر الجھنے لگیں۔ اتنے دن سکون سے گزارنے کے بعد اب مونا میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ اس بیچ میں الجھتی۔ اسی لیے جب تک وہ اونچی آواز میں بولتی رہیں۔ مونا کچن میں ہی مصروف رہی۔ اس کی دیورانی بھی خاموش بیٹھی یہ تماشا دیکھتی رہی۔ جب لڑ لڑا کر انہیں کچھ تقویت ہوئی تو مونا نے کھانا نکال دیا۔ اس کے کچھ دیر بعد وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ان کے جانے کے بعد بھی مونا اور فیصل کافی دیر تک ان کا ذکر کر کے ہنستے رہے۔

اب آنٹی کا وقتاً فوقتاً فون آجایا کرتا تھا جس میں وہ اپنے نئے فلیٹ کی تعریفوں میں زمین آسمان کے قلابے ملا رہی ہوتیں۔ نئی بہو اور سمیر کی پیسے والی سسرال کا ذکر کرتے کرتے ان کا منہ سوکھ جاتا۔ لامحالہ فیصل کو ان کی یہ تمام باتیں سننی پڑتیں اور وہ تابعدار بیٹے کی طرح آدھا آدھا گھنٹا یہ سب سنا کرتے۔ اب آنٹی بڑی رقت سے کہا کرتیں کہ تم بہن بھائی ایک ہو جاؤ کیوں ایک دوسرے کے خلاف دل میں نفرتیں پال رکھی ہیں وغیرہ۔ جب انہوں نے ایک تواتر سے اس بات کا ذکر کرنا شروع کر دیا تو ایک دن فیصل بول پڑے۔ "امی نفرتوں کے بیج تو آپ نے ہی بوئے ہیں... ہمارے درمیان۔ اب یہ درخت پھل پھول گئے ہیں اب آپ کہہ رہی ہیں انہیں جڑ سے کاٹ دوں تو سوری امی یہ میرے لیے ممکن نہیں ہے۔ سب دور دور ہیں تو خوش ہیں اس لیے دور دور ہی رہنے دیں تو بہتر ہے۔ میں دوبارہ سے وہی کہانیاں شروع نہیں کرنا چاہتا۔" فیصل کے دوٹوک لہجے کو سن کر وہ خاموش ہو گئیں۔ ویسے بھی انہیں فیصل سے الگ ہو کر اچھی طرح احساس ہو رہا تھا کہ انہوں نے کتنی بڑی غلطی کی ہے۔

سمیر نے فون کر کے اور پھر ایک دن آکر فیصل سے معافی مانگی۔ مونا اس وقت گھر پر نہیں تھی۔ سمیر نے بھائی سے ہی کہا کہ وہ بھابی تک بھی اس کی معافی پہنچا دیں۔ مونا کو جب فیصل نے سمیر کی آمد اور شرمندگی کا بتایا تو وہ صرف اس کے رویے اور زبان درازیوں کا سوچ کر رہ گئی۔ اس کے کانوں میں سمیر کی گالیاں اور طعنے گونجنے لگے۔ کتنے آرام سے اس نے مونا سے معافی طلب کر لی تھی۔ اس نے کچھ نہ کہا اور اللہ پر سارا معاملہ چھوڑ دیا۔ کچھ دنوں بعد آنٹی اور سمیر کے بہت اصرار کرنے پر عید کے موقع پر مونا اور فیصل ان کے گھر گئے۔ فلیٹس اور ان کا گھٹا گھٹا اور تاریک ماحول دیکھ کر وہ دونوں حیران رہ گئے۔ بجلی کا کنکشن بھی کنڈے ڈال کر غیر قانونی طریقے سے دیا گیا تھا اور پانی کا شدید مسئلہ تھا۔ گھر میں وہ سب بہت اچھی طرح ملے۔ دیورانی نے بھی کھانا گرمجوشی سے سرو کیا۔ وہ لوگ کچھ دیر مہمانوں کی طرح بیٹھے اور پھر جانے کے لیے کھڑے ہوئے تو سمیر کی بیوی فیصل سے کہنے لگی۔ "کبھی کبھی چکر لگا لیا کریں فیصل بھائی آنٹی آپ کو بہت یاد کرتی ہیں۔"

آنٹی بے اختیار بولیں۔ "ظاہر ہے بڑی اولاد ہے میری، بھلا کیسے نہیں یاد کروں گی اسے۔"

فیصل نے یہ سن کر صرف مسکرانے پر اکتفا کیا۔ اتنا کچھ دیکھ لینے اور سہہ لینے کے بعد اب وہ ایسی ان جذباتی باتوں میں آنے والے نہیں تھے۔

فیصل نے اتنا کچھ سہا تھا کہ اب وہ جذباتی طور پر پتھر ہو گئے تھے۔ انہیں اب مونا کے علاوہ کسی کی پروا تھی۔ ایک وہی تھی جس نے پچھلے آٹھ سالوں میں ہر سرد و گرم میں ان کا ساتھ دیا تھا۔ اور ہر پریشانی میں ان کے شانہ بشانہ کھڑی ہوئی تھی جبکہ ان کے گھر والے تو صرف خوشیوں کے ساتھی اور موقع پرست نکلے تھے۔ جب تک ان کی ضرورتیں فیصل سے وابستہ رہیں وہ ان سے چپکے رہے اور جب انہوں نے دیکھا کہ اب فیصل کو ان کی ضرورت ہے تو پہلی فرصت میں ان سے دامن چھڑا لیا۔ فیصل کو یقین تھا کہ سمیر کا شادی کے بعد بھی وہی لاابالی پن برقرار ہے اور وہ اب بھی ڈھنگ کی نوکری نہیں کرتا ہے بلکہ اکثر جاب لیس ہی رہتا ہے۔ گھر کا تو آدھے سے زیادہ خرچ اس کے سسر اٹھاتے ہیں اور فلیٹ اس کی بیوی کے نام تھا اور خرچ بھی اس کے والد اٹھا رہے تھے تو وہ بھلا کیوں اپنی ساس اور نند کی تیوریاں برداشت کرتی۔ ناہید نے سمیر کے گھریلو معاملات میں مداخلت کی لازمی طور پر کوششیں کی تھیں مگر نئی آنے والی بھاوج میں مونا والا لحاظ اور مروت نہیں تھا۔ ڈر کے مارے اب تو آنٹی جیسی شخصیت بھی اس سے دبنے لگی تھیں اور فراز بھائی نے ہی ایک روز ہنستے ہوئے فیصل کو بتایا تھا کہ آنٹی کو اب مونا کی قدر ہونے لگی ہے۔

مونا کو ان تمام باتوں سے کوئی غرض نہ تھی کہ اس کی ساس کو اب اس کی قدر ہو رہی ہے یا وہ اپنے رویے پر شرمندہ ہیں۔ اسے ان لوگوں کی شکلیں دیکھ کر اپنی وہ اذیت بھری زندگی یاد آنے لگتی تھی جب ان لوگوں نے مل کر فیصل اور مونا کا سکون سے سانس لینا بھی محال کر دیا تھا۔ وہ اور

پہلے انہوں نے خاموشی سے اپنے ایک دوست کے وساطت سے اس کے سارے کال اور ایس ایم ایس ریکارڈز نکلوا لیے تھے جس میں انجان نمبر پر گھنٹوں باتیں اور 'جانو' اور 'ڈارلنگ' والے ایس ایم ایس کے تمام ریکارڈز موجود تھے، جب یہ ثبوت انہوں نے نامیہ کے منہ پر مارے تو اس نے یہ بھی ان کی سازش قرار دے کر جھٹلا دیے۔ بہرحال فراز بھائی نے اسے اس کی حمایت میں کھڑی ماں کے سامنے طلاق دے کر بالآخر سکھ کا سانس لیا۔

فراز بھائی نے یہ موبائل ریکارڈز فیصل کو بھی دکھائے تھے۔ جب آنٹی نے فراز بھائی کو کافی برا بھلا کہا تو فیصل نے دبے لفظوں میں بہن کے کردار کی جانب اشارہ کیا اور ان کال ریکارڈز کا بھی ذکر کر دیا۔ پہلے تو وہ یہ سن کر سناٹے میں آ گئیں کہ فیصل اور سونا اندر کی ساری کہانی جانتے ہیں۔ ان کے لیے یہ سہنا بہت مشکل بات تھی کہ جو باتیں انہوں نے بھی بے قصور سونا کے خلاف بنائی تھیں وہی باتیں ان کی بیٹی کی طلاق کا موجب بنی تھیں۔ جبکہ نامیہ کا تو ان حرکتوں میں ملوث ہونے کا کھلم کھلا ثبوت بھی موجود تھا۔ جب ان سے کچھ نہ بن پڑا تو ہمیشہ کی طرح فیصل پر چڑھ دوڑیں۔ "اچھا اب میں سمجھی تو وہ ریکارڈز تم نے ہی نکلوا کر فراز کو دیے تھے۔" فیصل ان کا یہ الزام سن کر بھونچکا رہ گئے۔ انہیں ایک بار پھر اندازہ ہوا کہ ان کی ماں کے دل میں ابھی بھی ان کے خلاف کتنا زہر بھرا ہے۔

اس کے بعد کافی عرصے تک نہ آنٹی کا فون آیا اور نہ فیصل نے انہیں فون کیا۔ نامیہ اپنے بچوں سمیت اپنے فلیٹ میں ہی رہ رہی تھی۔ فراز بھائی نے اپنے بچوں کے رُل جانے کے خیال سے یہ قربانی دے دی تھی کہ فلیٹ نامیہ کے پاس ہی رہنے دیا تھا اور ان کی فیس وغیرہ کا خرچ بھی اٹھاتے تھے۔ فیصل اکثر سونا کے سامنے افسوس کا اظہار کرتے کہ نامیہ نے اپنی حرکتوں کی بدولت نہ صرف انہیں فراز بھائی کے سامنے شرمندہ کیا بلکہ خود بھی اتنا محبت اور خیال کرنے والا شوہر گنوا دیا۔

اس کے کافی عرصے بعد تک فیصل کے گھر والے ناراض رہے۔ ایک دن میسر کا میسج آیا کہ امی کی طبیعت خراب ہے، آپ فوراً اسپتال پہنچیے۔ فیصل جب اسپتال پہنچے تو [illegible] سے [illegible] کر رہی تھیں۔ انہیں سانس لینے میں [illegible] تھی۔ فیصل اس رات وہیں رکے۔ اگلے روز [illegible] ایک مرتبہ انہوں نے دوائی اور

ٹیسٹس کے خرچے کے لیے میسر کو دس ہزار روپے بھی دیے کیونکہ ان کو اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کا ہاتھ تنگ ہے۔ وہیں نامیہ سے بھی ملاقات ہوئی۔ وہ اب گھر چلانے کے لیے دن میں دو دو نوکریاں کر رہی تھی۔ مکافاتِ عمل بہت تیزی سے ان لوگوں کو اپنے شکنجے میں جکڑ رہا تھا۔ ان کی ماں اور بھائی ان کی محبت اور خلوص کو دھتکار کر اور بڑے بلند و بانگ دعوے کر کے گئے تھے مگر ان کا یہ حال تھا کہ خوشیوں میں تو کبھی ان کو یاد نہ کیا مگر پریشانی آئی اور خرچے کا وقت آیا تو سب سے پہلے فیصل ہی یاد آئے۔ چند دن اسی پریشانی میں گزر گئے۔ جس روز ان کی امی اسپتال سے ڈسچارج ہوئیں اس روز بھی ٹیکسی میں آنے جانے کا کرایہ اور دوائیں فیصل نے ہی خریدیں۔

جب یہ لوگ ٹیکسی میں بیٹھے گھر جا رہے تھے تو ان کی امی سے رہا نہ گیا اور وہ راستے بھر [illegible] کے باوجود بول پڑیں۔ "تم تو کافی امیر ہو گئے ہو۔"

فیصل کو ان کا انداز کچھ برا لگا مگر وہ بولے۔ "میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا امی؟"

"امی دیر سے دیکھ رہی ہوں تمہارے آفس سے فون پر فون آ رہے ہیں۔ انہوں نے موبائل بھی دے رکھا ہے اور ابھی بھی تم نے اتنے خرچے کیے میرے علاج معالجے میں۔ خیر چھوڑو یہ بتاؤ تم نے اپنے گھر میں کوئی نئی چیز ڈالی؟"

فیصل ان کی باتیں سن کر دنگ تھے۔ امی طبیعت خرابی کے باوجود انہیں سب سے پہلا خیال فیصل کے پیسوں کا ہی آیا تو۔ فیصل کے دل میں آیا کہ ان سے کہیں۔ "امی میں نے یا سونا نے تو کبھی آپ سے نہیں پوچھا کہ میرے گھر میں کون کون سی نئی چیزیں ڈالی ہیں۔ ہمیں شادی میں کیوں نہیں بلایا، بیٹی کے عقیقے میں مدعو نہیں کیا۔ چپ چاپ سالگرہ کیں اور دعوتیں اڑائی گئیں۔ کبھی آپ کو بڑے بیٹے اور بہو کا خیال نہیں آیا۔ اب جبکہ دکھ اور تکلیفیں آ گئی ہیں تو سب سے پہلے فیصل کی یاد آ گئی۔" مگر وہ یہ اور بہت سارے دوسرے شکوے اپنے اندر ہی دبا گئے کیونکہ شکوے انہی سے کیے جاتے ہیں جو اپنے ہوں۔ ان لوگوں نے فیصل کو کبھی اپنا سمجھا ہی کب تھا۔ فی الوقت تو انہوں نے امی کو یہ کہہ کر ٹال دیا کہ "آپ جب گھر آئیں گی تو خود دیکھ لیجیے گا۔"

امی کی ڈسچارج ہو کر تو آ گئیں مگر ان کی طبیعت اکثر خراب رہتی تھی۔ وہ اپنا [illegible] کرنے [illegible] تھیں۔ اب حالت یہ تھی کہ میسر وقت بے وقت [illegible] کر کے یا

فون کر کرکے فیصل کو پل پل کی خبریں دیا کرتا۔ مثلاً ”اب امی کا بی پی لو ہوگیا ہے۔ انہیں ٹھنڈے پسینے آرہے ہیں... سوچ رہا ہوں ایمبولینس بلوالوں۔“

فیصل گھبرا کر آنٹی کو فون کرتے تو وہ نارمل ہوتیں اور کہتیں۔ ”ہاں بی پی تھوڑا لو ہے۔ ابھی دوا کھائی ہے، سنبھل جائے گی کیفیت! یہ سمیر تو بس فوراً پریشان ہو جاتا ہے۔“ کبھی اس کا فون آتا۔ ”امی کی طبیعت سنبھل نہیں رہی ہے۔ شوگر بہت ہائی ہے اور سانس بھی نہیں آرہا آپ دعا کریں۔“ فیصل کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے۔ آنٹی سے بات کرنے پر پتا چلتا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی سمیر یا اس کی بیوی سے لڑ جھگڑ کر فارغ ہوئی ہیں۔ ظاہر ہے ان کا جسم کمزور تھا اس لیے ان کی حالت جلد بگڑ جاتی تھی۔ پھر فیصل ان کو کافی دیر سمجھاتے اور اپنے غصے پر کنٹرول کرنے کی تلقین کرتے۔ اب تو وہ بھی بڑی محبت سے شہد آگیں لہجے میں فیصل کی ہر بات کی تائید کیا کرتی تھیں۔ فیصل بھی ان کے لہجے میں اترتی اس بناوٹی مٹھاس اور شیرینی کے پس منظر سے اچھی طرح واقف تھے۔ مونا کو آثار کچھ ٹھیک نظر نہیں آرہے تھے۔ جس طرح اب اس کی ساس اور دیور فیصل سے میٹھی میٹھی باتیں کرنے لگے تھے اس سے ایک نئی کھچڑی پکتی نظر آرہی تھی۔ خود مونا کی دیورانی نے ایک دو بار دبے الفاظ میں اس سے کہا تھا کہ ہمارے پاس تو ہر وقت خرچے کا رونا ہی لگا رہتا ہے۔ میں تو سمیر سے کہتی ہوں کہ اگر ابھی ہم فیصل بھائی کے ساتھ رہ رہے ہوتے تو یہ مسئلے مسائل نہ ہوتے۔ یہ سن کر تو مونا کے کان کھڑے ہوگئے تھے۔ ان لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات آگئی تھی کہ ان کی تمام معاشی مشکلات کا حل فیصل کے پاس ہے اور اس کے بعد تو سمیر اپنی بیوی اور بچی کی ذمہ داری بھی ان کے کاندھوں پر ڈال کر مطمئن ہو جاتا جبکہ اماں انہیں اپنا اور ماں جائے کا واسطہ دے دے کر مجبور کردیتیں کہ وہ لامحالہ وہ دو گھروں کا بوجھ اٹھائیں۔ ابھی بھی وہ آنٹی کی بیماری کے دوران میں بہانے بہانے سے بھی حالات کا رونا رو کر تو کبھی جذباتی بلیک میلنگ کرکے فیصل سے کئی بار پیسے اینٹھ چکا تھا اور وقتاً فوقتاً ایسی ڈرامائی صورت حال پیدا کرنے کی کوشش کرتا تھا کہ فیصل اسے مزید پیسے دے دیں یا اپنی امی کو چیک اپ کے لیے ڈاکٹر کے پاس لے جائیں تاکہ اس کی بچت ہو جائے۔

فیصل بھی کوئی دودھ پیتے بچے نہ تھے۔ ماں اور بھائی کی محبت اپنی جگہ لیکن وہ ان کے چہروں کے پیچھے چھپے لالچ اور خود غرضی کو اچھی طرح پہچانتے تھے۔ سمیر نے کئی بار طویل میسج کے ذریعے فیصل کو یہ بتایا تھا کہ کیسے اور آنٹی نے مل کر ان دونوں میاں بیوی کی زندگی حرام کی ہوئی ہے۔ وہ انتہائی معصومیت سے جب پوچھتا کہ بتائیں میری بیوی کو کیوں برا بھلا بولتی ہیں امی جبکہ وہ تو ان کا اتنا خیال رکھتی ہے تو مونا کلس کر رہ جاتی۔ اسے سمجھ نہیں آتا تھا کہ واقعی لوگوں کی یادداشتیں اتنی کمزور ہوتی ہیں یا پھر وہ جان بوجھ کر فرشتہ بننے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو انتہائی مظلوم ثابت کرنے کے لیے جذباتی ڈائیلاگ لکھتا۔ ”انہوں نے تو میرا جینا مشکل کر رکھا ہے۔ آپ ہی ان کو لے کر اب ڈاکٹر کے پاس جایئے گا کیونکہ انہیں تو مجھ پر اعتبار ہی نہیں ہے۔“ وغیرہ وغیرہ۔ مگر فیصل دودھ کے جلے اب چھاچھ بھی پھونک پھونک کر پیتے تھے۔ ویسے بھی ان کے پاس آفس سے لیٹ آنے کے بعد اتنا ٹائم نہیں ہوتا تھا کہ وہ یہ جھگڑے بھی نمٹاتے رہیں۔ سمیر کو کئی بار پیسے دینے کے بعد ان کا اپنا ہاتھ تنگ ہو رہا تھا۔ گھر کا کرایہ اور دیگر خرچے کرنے کے بعد وہ بالکل بچت نہیں کر پا رہے تھے۔ بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ دو گھروں کے خرچے اٹھائیں، نہ ان کی جیب اس بات کی اجازت دیتی تھی اور اب نہ ہی دل ان لوگوں کی جانب مائل ہوتا تھا۔ جب وہ تمام جھگڑوں اور بدتمیزیوں کے باوجود ان لوگوں کے ساتھ رہنا چاہتے تھے تو ان کو دھتکار دیا گیا اور اب جب وہ ان کی زندگیوں سے دور سکون سے اپنی زندگی گزار رہے تھے تو اس میں بھی انہیں چین و قرار نہ تھا۔ عجب فطرت پائی تھی ان کی امی اور چھوٹے بھائی نے!

جب سمیر اور آنٹی کی دخل اندازیاں ناقابلِ برداشت ہونے لگیں اور سمیر نے بہانے سے پیسے بٹورنے کا سلسلہ جاری رکھا تو بالآخر فیصل نے اپنی زندگی کا ایسا جذباتی فیصلہ کیا کہ مونا بھی حیران پریشان رہ گئی۔ ایک دن فیصل آفس سے واپس آئے تو کافی غصے میں لگ رہے تھے۔ مونا کے پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ آج پھر سمیر نے فون کرکے پیسے مانگے ہیں۔ اس کے بعد فیصل نے اسے اپنے جس فیصلے سے آگاہ کیا اس نے مونا کو بھی چکرا دیا۔

چند دنوں بعد مونا نے فریحہ کو فون کیا اور اسے اطلاع دی کہ وہ دونوں اب آسٹریلیا میں سیٹل ہونے جارہے ہیں۔ فریحہ یہ سن کر بہت خوش ہوئی اور ان دونوں کے لیے اپنی نیک خواہشات کا اظہار کیا۔ اس کے دو دن بعد وہ

دونوں کراچی سے روانہ ہوگئے۔ آسٹریلیا جا کر بھی سونا اپنے اسی نمبر سے انٹرنیشنل رومنگ کے ذریعے کچھ دنوں تک تو فریحہ سے کانٹیکٹ میں رہی۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ وہ اپنی زندگی میں مصروف ہوگئی۔ اب چھ سال گزر جانے کے بعد بھی فریحہ کو کبھی کبھی سونا کی یاد آجاتی تھی تو وہ اس کے لیے اور فیصل بھائی کے لیے دعا کرنا نہ بھولتی تھی جنہوں نے اپنوں کے ہاتھوں وہ زخم سہے تھے کہ دشمن بھی اپنی دشمنی بھول گئے تھے۔

☆...☆

فریحہ کی بیٹی کافی عرصے سے گھومنے کے لیے شہر سے باہر جانے کی ضد کر رہی تھی مگر مصروفیت میں ٹائم ہی نہیں مل پاتا تھا۔ چنانچہ اس مرتبہ گرمیوں کی چھٹیوں میں ان کا شمالی علاقہ جات گھومنے کا پلان بن گیا۔ وہ لوگ خوب گھومے پھرے اور علاقے کی صاف وشفاف آب و ہوا کا لطف اٹھاتے رہے۔ ان کا ارادہ تھا کہ دو روز مری میں قیام کرکے وہ لوگ واپسی کی راہ لیں گے۔ اس دن مری پہنچ کر فریحہ نے صبح کو اپنے میاں اور بیٹی کو نیند سے جگانے کی بہت کوشش کی مگر دونوں ہی اس کے ساتھ نیند کی قربانی دے کر شاپنگ پر جانے کو آمادہ نہ ہوئے تو وہ تنگ آکر خود ہی خریداری کے لیے نکل گئی۔

فریحہ اپنے لیے شالز کی خریداری کر رہی تھی تو اسے اپنے پیچھے ایک مانوس سی نسوانی آواز سنائی دی۔ ''کیا کرو گی اتنی شالز خرید کر؟ کراچی میں تو اتنی سردی بھی نہیں پڑتی۔'' فریحہ چونک کر مخاطب کی جانب پلٹی اور اگلے ہی لمحے۔ ''سونا تم یہاں!'' کا فلک شگاف نعرہ لگا کر اس سے لپٹ گئی۔

دونوں دوستوں میں بڑی دیر تک شکوے شکایتیں ہوتی رہیں۔ اس کے بعد جب سونا نے اسے اپنے گھر چلنے کی آفر کی تو وہ حیرت سے اچھل پڑی۔ ''تمہارے گھر؟ پر تم تو آسٹریلیا گئی تھیں نا؟ میں تو سمجھی تم بھی یہاں ہماری طرح گھومنے پھرنے آئی ہو۔''

فریحہ کے سوالات سن کر سونا نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور آنکھیں نچاتی ہوئی بولی۔ ''ہاں ہاں۔ دنیا کی نظروں میں تو ہم وہاں ہیں مگر حقیقت میں ہم یہاں ہیں۔'' فریحہ ابھی بھی ہونق نظروں سے اسے دیکھتی رہی تو وہ اس کا ہاتھ تھام کر چل پڑی۔ ''چلو میرے ساتھ سارا قصہ سناتی ہوں تمہیں۔ ویسے بھی تم جانتی ہو کہ تمہیں دیکھ کر میرے پیٹ میں مروڑ اٹھنے لگتے ہیں اور میں زیادہ دیر تک راز کو راز نہیں رکھ پاتی اس لیے تمہیں تو بتاؤں گی ہی کہ یہ کیا قصہ ہے۔''

فریحہ سونا کی جانب غور سے دیکھتی رہی۔ مری کی آب و ہوا نے اس پر بھی خوشگوار اثرات مرتب کیے تھے۔ اب وہ نکھری نکھری اور فریش نظر آتی تھی۔ وہ پہلے والی اداسی اور اس کی اور بجھے ہوئے چہرے والی سونا کا تو دور دور تک کوئی نام و نشان نہ تھا۔ اب وہ بات بات پر قہقہے لگا رہی تھی۔ خوشی تھی کہ اس کے چہرے سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔

جب فریحہ اس کے ہمراہ چھوٹے سے خوبصورت کاٹیج میں داخل ہوئی تو اس کی سادہ سی ڈیکوریشن نے اسے بھی متاثر کیا۔ سونا نے جلدی جلدی اس کے ہاتھ سے شاپر لے اور فریحہ کے ناکو منع کرنے کے باوجود خاطر تواضع کی غرض سے کچن میں گھس گئی۔ جب فریحہ نے زیادہ اصرار کیا تو وہ اس کا ہاتھ تھام کر لجاجت سے بولی۔ ''کرنے دو فریحہ۔ اتنے دنوں بعد تو میرا کوئی اپنا آیا ہے۔ کتنا ترستی ہوں میں ایسے موقعوں کے لیے، تمہیں کیا پتا۔''

یہ سن کر فریحہ چپ ہوگئی۔ چائے اور دیگر لوازمات بنانے تک دونوں وہیں کچن میں کھڑی باتیں کرتی رہیں۔ فریحہ دیکھ رہی تھی کہ وہ بار بار گھڑی کی جانب دیکھ رہی ہے۔ جب اس نے دوبارہ گھڑی کی جانب دیکھا تو فریحہ اسے چھیڑنے کی غرض سے بولی۔ ''بار بار ٹائم دیکھا جارہا ہے۔ لگتا ہے اس حسین رت میں دوست کباب میں ہڈی بن گئی ہے۔'' سونا بے ساختہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔

''ارے نہیں پاگل۔ دراصل بلال کی چھٹی ہونے والی ہے۔ پلے گروپ میں ہے نا، اسی لیے صبح نو بجے لے جاتی ہوں اور گیارہ یا ساڑھے گیارہ بجے تک واپس لے آتی ہوں۔''

فریحہ کو خوشگوار حیرت کا جھٹکا لگا۔ ''ارے مبارک ہو! تمہارا بیٹا بھی ہوگیا۔ کتنی بدتمیز ہو کہ مجھے بتایا تک نہیں، ابھی آتے ہوئے اس کے لیے چاکلیٹس ہی لے لیتی۔'' سونا مسکراتی ہوئی بولی۔ ''کوئی بات نہیں، ابھی اسے لینے چلیں گے تو جو جی چاہے خرید لینا۔''

فریحہ نے اپنے میاں کو فون پر اطلاع دے دی تھی کہ وہ اس کے لیے پریشان نہ ہوں بلکہ سونا نے ضد کرکے انہیں بھی رات کے کھانے پر مدعو کرلیا تھا۔ بلال بہت پیارا بچہ تھا۔ شکل وصورت میں بالکل فیصل بھائی پر گیا تھا۔ سونا نے اسے کھلونے وغیرہ دے کر مصروف کردیا اور خود اطمینان سے فریحہ کے پاس آبیٹھی۔ دونوں ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگیں پھر فریحہ کے پوچھنے پر سونا نے بتایا۔ ''اس روز فیصل

آفس سے آئے تو ان کا موڈ سخت آف تھا۔ سمیر نے ان سے فون پر کافی بدتمیزی کی تھی کہ انہیں اپنی ماں کا خیال نہیں ہے۔ پیسے پر ان کی جان جا رہی ہے۔ ان کو اس بات کی پروا نہیں ہے کہ ماں پر کیا گزر رہی ہے بس وہ اپنی بیوی کے ساتھ عیش و آرام میں مصروف ہیں۔ اس کے علاوہ بھی اس نے کافی باتیں کیں جو میں دُہرانا نہیں چاہتی۔ فیصل نے خاموشی سے اس کی بدتمیزی برداشت کی اور دل میں ایک فیصلہ کرلیا۔ فیصل نے مجھ سے بھی ایک بار ذکر کیا تھا کہ ان کے باس کئی دنوں سے کہہ رہے تھے کہ فیصل کمپنی کی ایک برانچ جو مری میں ہے اسے سنبھالیں کیونکہ وہ کسی قابل اعتبار بندے کو اس پوسٹ پر بھیجنا چاہ رہے تھے اور ان کی نظروں میں فیصل موزوں ترین بندے تھے۔ اس سے پہلے وہ وہاں جانا نہیں چاہ رہے تھے۔ ان کا دل اپنی والدہ کو چھوڑ کر جانے کو آمادہ نہ تھا مگر اس واقعہ کے بعد انہوں نے باس سے وہاں جانے کی ہامی بھرلی۔ اب وہ اپنے چھوٹے بھائی اور ماں کے ہاتھوں مزید ذلیل نہیں ہوسکتے تھے جن کے لیے وہ ویسے ہی اپنی آدھی سے زیادہ زندگی برباد کرچکے تھے۔ انہوں نے مجھے اپنے فیصلے سے آگاہ کیا کہ ہم ایک ہفتے بعد مری شفٹ ہورہے ہیں جہاں پر گھر کا انتظام آفس والے کردیں گے مگر ہم امی اور سمیر کو یہی بتائیں گے کہ ہم یہاں سے ہزاروں میل دور آسٹریلیا جارہے ہیں، جہاں جاکر واپس آنا اتنا آسان نہیں ہوتا اور صرف فون کال پر بھی اچھے خاصے پیسے خرچ ہوتے ہیں۔ فیصل نے ان سے یہی کہا کہ بعد میں مستقل پتا اور فون نمبر آپ کو بتادیں گے فی الحال وہ خود فون کرکے ان کا حال احوال دریافت کرتے رہیں گے۔ اس وقت ان دونوں ماں بیٹا کی حالت ایسی ہورہی تھی فریحہ کہ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ندکر ہمارے ساتھ ہی آسٹریلیا چلے جائیں۔ ساس کی پھٹی پھٹی آنکھیں میں اب بھی تصور کرتی ہوں تو ہنسی پر کنٹرول نہیں کرپاتی۔ خود فیصل مجھ سے واپسی پر کہہ رہے تھے کہ تم نے دیکھا کیسے امی اور سمیر کے چہروں سے ان کے دلوں میں موجود حسد اور جلن واضح ہورہی تھی۔ ان کے رویے دیکھ کر اب تک مجھے اپنے فیصلے پر جو تھوڑا بہت دکھ تھا وہ بھی اب نہیں رہا۔ اللہ کا شکر ہے کہ میں ان مطلبی لوگوں سے دور جارہا ہوں۔

" بہرحال ہم دونوں ان لوگوں سے دور یہاں آکر بس گئے۔ فیصل نے ان سے شروع شروع میں تو بات چیت رکھی مگر ان کی وہی سطحی اور منافقانہ ذہنیت کے اعلیٰ مظاہرے دیکھنے کے بعد انہوں نے اپنا نمبر چینج کروالیا اور اس کے بعد آج پانچ سال ہونے کو آئے، ان لوگوں سے رابطے میں نہیں ہیں۔ وہ خود کہتے ہیں کہ سونا میرا دل نہیں مانتا کہ ان لوگوں سے کوئی تعلق بھی رکھوں۔ ان لوگوں نے زندگی بھر مجھے زخم دینے کے سوا اور کیا ہی کیا ہے۔ ان لوگوں سے دور میں بہت خوش ہوں اور چاہتا ہوں اپنی باقی زندگی بھی ان لوگوں کی منافقت سے دور گزاروں۔ حتیٰ کہ میرے بے پناہ اصرار کے باوجود انہوں نے بلال کی پیدائش کی خبر تک انہیں نہیں دی ہے۔ وہ نہیں چاہتے کہ ہمارے بیٹے پر ان لوگوں کا سایہ بھی پڑے۔ کراچی میں مقیم اپنے دوستوں سے وہ ان لوگوں کے بارے میں پوچھتے رہتے ہیں۔ آخری اطلاعات کے مطابق ان لوگوں کی زندگی میں کوئی مثبت تبدیلی نہیں آئی ہے۔ ابھی بھی وہ ویسے ہی ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے اپنی زندگیاں گزار رہے ہیں۔ آنٹی اکثر فیصل کو یاد کرکے روتی ہیں مگر اب ان آنسوؤں کا کیا فائدہ، جب وہ ان کے پاس موجود تھے تو پاؤں کی جوتی سے زیادہ اہمیت نہ دی مگر اب دور ہوئے تو ان کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوا۔ میرے گھر والے اکثر یہاں آتے ہیں اور میں بھی ان سے ملنے کراچی چکر لگاتی رہتی ہوں مگر فیصل جس دن سے یہاں آئے ہیں اس کے بعد سے انہوں نے کراچی کی شکل نہیں دیکھی ہے کیونکہ انہیں اس شہر سے بھی ان لوگوں کی وجہ سے نفرت سی ہوگئی ہے۔ بچارا فیصل بھی ایسے نہ تھے مگر ان کی اپنی ماں اور بھائی نے انہیں ایسا بننے پر مجبور کردیا ہے۔"

اپنی بات مکمل کرتے ہوئے سونا کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ فریحہ رشتوں کی اس انوکھی داستان کو سن کر گنگ بیٹھی تھی۔ بلال کو شاید نیند آرہی تھی اس لیے وہ رونے لگا تو سونا آنسو پونچھتی اس کے لیے کھانا بنانے اٹھ گئی۔

ہوسکتا ہے بہت سے قارئین کو فیصل کا یہ فیصلہ جذبات سے بھرپور اور بچکانہ لگے مگر جس پر گزرتی ہے وہی جانتا ہے کے مصداق اس نے وہی کیا جو اس کو اپنے اور اپنی بیوی کے لیے بہتر لگا۔ یہ دنیا ایسے ہی بناوٹی اور مصنوعی رشتوں کی حیرت انگیز کہانیوں سے بھری پڑی ہے۔ جب دلوں میں حرص و طمع پیدا ہوجاتی ہے تو ایسی ہی افسوسناک داستانیں جنم لیتی ہیں۔ فیصل نے اپنے گھر والوں سے دور ہوکر اپنی زندگی کا بہترین فیصلہ کیا۔ ویسے اگر آپ فیصل کی جگہ ہوتے تو کیا کرتے؟